جزیرے کا سمندر
خاص نمبر
اشتیاق احمد

دو باتیں

دسویں خاص نمبر کی دو باتیں حاضر ہیں ــ کوشش کروں گا، ان کا شیطان کی آنت سے دور کا بھی واسطہ نہ رہے ـــ ننھی سی جھلک میں لکھا گیا تھا، یہ خاص نمبر ۹۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگا اور مبلغ /۳۰ روپے کا ہوگا ــ اس کے جواب میں بے تحاشا خوشی کا اظہار بھی کیا گیا اور جلی کٹی بھی سنائی گئیں ـــ جلی کٹی تو مجھے اور بھی کئی سلسلوں میں سننا پڑ رہی ہیں ــ آپ پوچھیں گے، وہ کون سے سلسلے ہیں تو جناب پوچھنے سے پہلے ہی کیوں نہ سُن لیں۔ وہ سلسلے وادیٔ مرجان، بند محل اور ہیرا دلیری جیسے ناولوں کے ہیں۔ حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوتی ہے کہ میرے ناول اب اختلافی مسائل کی روشنی میں بھی دیکھے جانے لگے ہیں۔

میں بات کر رہا تھا جلی کٹی کی ــ ہاں تو کچھ لوگوں نے یہ جلی کٹی لکھ ماری کہ لو جی، اب خاص نمبر نو سو صفحات کا ہوگا اور تیس روپے کا ہوگا۔ لوٹنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے ــ آخر یہ مصنف کا بچہ چاہتا کیا ہے۔

معاف کیجیے گا، اول تو میں مصنف کا بچہ نہیں۔ خود ہی مصنف

دوسرے مذاہب کے لوگ جو پاکستان میں رہتے ہیں، [illegible] بھی پاکستان کا مفاد ہی عزیز ہونا چاہیے، آخر وہ اسی ملک میں رہتے ہیں۔

دو باتیں خشک ہو چلیں، حالانکہ ابتدا سے ہی میں نے کوشش کی تھی کہ خشکی پاس نہ پھٹکے — پھر دامن جھٹک کر آگے بڑھتا ہوں: دنیا کے قیدی میں شوکی برادرز کی بزدلی تقریباً تقریباً سبھی کو پسند نہیں آئی تھی، جب کہ یہ ان کے حالات کے عین مطابق تھی — بہرحال جزیرے کا سمندر میں آپ یہ بات محسوس نہیں کریں گے، کیوں محسوس نہیں کریں گے، اس کی وجہ ناول میں ہی جان سکیں گے۔

خاص نمبر کی خاص ضخامت کی وجہ سے میں خاص لیٹ ہو گیا ہوں۔ یہ لیٹ ہو گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ آئندہ ماہ کے ناول بھی کچھ لیٹ ہو جائیں گے۔ اس لیے اطلاعاً عرض کیے دیتا ہوں، بیس جنوری کو سٹالوں کے چکر کاٹنا نہ شروع کر دیجیے گا اور کچھ نہیں تو آٹھ سات روز ضرور صبر کے گھونٹ بھر لیجیے گا — صبر کے گھونٹ تو یوں بھی میٹھے لگیں گے۔ اس [illegible] کے مزدور گزشتہ [illegible] ہیں اور آج کل یہی گھونٹ بھرنا ان کے لیے مشکل ہے، تاہم آپ اپنے محبوب کرداروں کو جھوٹ بولتے [illegible]

اس بار کا خاص نمبر — اب اس کے بارے میں کیا [illegible] کے لیے آپ کیا کم ہیں؟ [illegible] کر لینے کی تیاری بھی شروع کر لی ہے۔ یہ خطرہ بھی [illegible]

کی بجائے ڈاک کا سیلاب اپنے ساتھ بہا نہ لے جائے — اگر ایسا ہو گیا تو پھر تو ستائیس اٹھائیس جنوری کیا، بیس فروری کو بھی آپ ناول کی صورت نہیں دیکھ سکیں گے، لہٰذا دعا کیجیے، میں اس سیلاب میں بہنے سے بال بال بچ جاؤں — لیجیے، دو باتیں میں بھی محاورہ کود پڑا۔ ابھی تو آپ کو محاورات، قہقہوں اور مہمات کا ایک سمندر عبور کرنا ہے۔ یہ سمندر عبور کرنا اتنا آسان تو ہو گا نہیں۔ اس سلسلے میں دو باتیں کا دفتر بند کرتا ہوں، کہیں آپ انہی میں نہ الجھ کر رہ جائیں اور سمندر بے چارہ سوکھتا رہے —

ارے مگر نہیں، ابھی تو ایک بہت ضروری بات رہی جاتی ہے۔ آپ اس ضروری بات کو خوشخبری بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن چونکہ یہ خوش خبری پورے ملک کے قارئین کے لیے نہیں ہے، اس لیے میں اسے صرف ضروری بات ہی کہوں گا — ہاں، لاہور اور لاہور کے آس پاس کے پڑھنے والوں کے لیے ضرور یہ ایک خوش خبری کا درجہ رکھے گی، لیجیے، اصل بات بتانے کی بجائے میں ضروری، غیر ضروری خوش خبری اور غیر خوش خبری کے چکر میں پڑ گیا، ہے کوئی بات — ہاں تو سنیے، لیکن نہیں۔ پہلے کچھ تفصیل ہو جائے — کچھ عرصہ گزرا، "روزنامہ جنگ" فورم میں میرے ساتھ ایک شام منائی گئی تھی، جس کا اعلان صرف اخبار میں کیا گیا تھا — کیونکہ جب ان کا پروگرام بنا، اس وقت تک کتابیں پریس میں جا چکی تھیں، لہٰذا کتابوں میں اعلان نہیں کیا جا سکا۔ صرف

اخبار میں اشتہار دیا گیا — اس کے باوجود جنگ فورم ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہ بچی، اس قدر قارئین آئے کہ کھڑے رہنے کی بھی جگہ نہ مل سکی اور بہت سے باہر ہی کھڑے رہ گئے اور جو ہال کے اندر بیٹھنے کی جگہ نہ پا سکنے کی بنا پر دو گھنٹے تک کھڑے رہ کر پروگرام میں حصہ لیتے رہے — ان کے لیے میں اپنے دل میں بے پناہ درد محسوس کرتا رہا ہوں، لہٰذا اب ایک موقع لاہور کے ایجنسی ہولڈر رفیق مغل صاحب کی مہربانی سے ہاتھ آ رہا ہے کہ آپ سبھی کو اطمینان سے بیٹھ کر مجھ سے ملاقات، بات چیت اور سوال وجواب کا آزادانہ موقع ملے، لہٰذا یہ خوشخبری انھی کے زیرِ اہتمام آپ کو سُنا رہا ہوں، تو خوش خبری یہ ہے:

لاہور اور آس پاس کے رہنے والے میرے قارئین، میرے ناولوں سے دل چسپی رکھنے والے حضرات مورخہ ۲۷ دسمبر ۸۴ء بروز جمعرات دوپہر دو بجے علامہ اقبال ٹاؤن میں مجھ سے ملاقات کریں گے۔ اس سلسلے میں خاص نمبر کے آخر میں تفصیلی اشتہار دیا جا رہا ہے۔ آپ اسے پڑھ رہی لیں گے۔ اس طرح لاہور کے بے شمار پڑھنے والوں کی یہ شکایت بھی رفع ہو جائے گی کہ میں نے لاہور میں ملاقات کا کوئی پروگرام نہیں بنایا، جیسا کہ دوسرے شہروں میں بنا چکا ہوں؛ حالانکہ یہ بات سرے سے غلط ہے۔ میں خود تو کسی شہر میں ملاقات کا پروگرام بناتا ہی نہیں۔ یہ تو آپ قارئین کی محبت ہے جو مجھے بلاتی ہے، بلکہ کھینچ لے جاتی ہے — جنگ فورم کی ملاقات کے بعد میں نے تو یہی خیال

کیا تھا کہ چلو لاہور والوں کا حساب بھی چکا دیا گیا، لیکن ہال چھوٹا رہ گیا اور ملاقاتی باہر رہ گئے یا اندر کھڑے رہنا پڑا اور جن لوگوں کو کتابوں میں اشتہار شائع نہ ہونے کی وجہ سے خبر نہ ہو سکی، وہ بھی شامل نہ ہو سکے، ان سب کے لیے یہ پروگرام ترتیب دیا گیا ہے، لہٰذا آپ سبھی کو دعوتِ عام ہے۔ کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں۔ پاس کارڈ بھی اسی لیے جاری کیے جا رہے ہیں، تاکہ ہمیں یہ اندازہ ہو جائے کہ کتنی کرسیوں کا انتظام کیا جا سکے — کہیں جنگ والا حال ہی نہ ہو جائے۔ چنانچہ جتنے قارئین کارڈ حاصل کریں گے، ہم اسی تعداد سے کچھ زائد کرسیوں کا انتظام کریں گے، تاکہ جو بچے اور بڑے کسی وجہ سے کارڈ نہیں حاصل کر سکے، انھیں بھی جگہ مل سکے، لہٰذا آپ یہ خیال نہ کر لیجیے گا، کہ اگر ہم نے کارڈ حاصل نہ کیا تو تقریب میں شریک بھی نہیں ہو سکیں گے — یہ ایک عام تقریب ہو گی — سہولت کے پیشِ نظر یہ اقدام کیا گیا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے یہ پسند نہیں؛ بہرحال تقریب کا انتظام کرنے والوں کی آسانی کی خاطر میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ کارڈ ضرور حاصل کر لیں۔ شکریہ، اور ہاں — ذرا دلچسپ سوال سوچ کر آئیں —

لیجیے، اس خوش خبری نے خاص نمبر کی دو باتیں کو آخر شیطان کی آنت بنا ہی دیا، جس بات کا ڈر تھا، وہ ہو کر رہی۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے، اب تو بن چکیں اور آپ کو انہیں پڑھنا ہی

پڑ گیا۔۔ خیر، اس طرح جو آپ کو الجھن ہوتی، ناول شروع کرتے ہی پر لگا کر اڑ جائے گی۔۔ ہے نا عجیب بات، اب الجھنیں بھی پر لگا کر اڑنے لگیں۔۔ آگے آگے دیکھیے، ہوتا ہے کیا۔

پہلا حصّہ

یہ مہر ہے بے مہریٔ صیاد کا پردہ
آئی نہ مرے کام میری تازہ صفیری!
رکھنے لگا مرجھائے ہوئے پھول قفس میں
شاید کہ اسیروں کو گوارا ہو اسیری!

(اقبالؒ)

ہیلو انکل

آئی جی شیخ نثار احمد کا چہرہ دُودھ کی طرح سفید تھا، جیسے اُن کے جسم سے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ ڈی آئی جی افتخار احمد خان بھی ان کے سامنے ساکت بیٹھے تھے۔ آخر شیخ صاحب بولے:

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم نے کوئی خواب دیکھا ہو۔"

"جی۔ کیا مطلب۔ خواب۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟" خان صاحب بھونچکے رہ گئے۔

"ٹھہریے۔ پہلے تو یہ تصدیق کر لی جائے کہ کہیں ہم نے خواب تو نہیں دیکھا تھا۔"

یہ کہہ کر اُنھوں نے فون کا ریسیور اُٹھایا اور نمبر گھمانے لگے، پھر سلسلہ ملنے پر بولے:

"ہیلو پروفیسر صاحب۔ میں شیخ نثار احمد بول رہا ہوں۔ کیا آپ ذرا دیر کے لیے زحمت فرما سکتے ہیں۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کو تکلیف دے رہا ہوں اور خود آپ کی خدمت میں حاضر نہیں

ہو رہا ، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں شدید اُلجھن میں مُبتلا ہُوں — اس اُلجھن کو رفع کرنے میں آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں ، میں اس لیے آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکتا کہ تھوڑی دیر بعد کانفرنس روم میں چھوٹے بڑے سبھی آفیسر موجود ہوں گے ۔"

دوسری طرف کا جواب سننے کے بعد انھوں نے شکریہ کہا اور ریسیور رکھ دیا :

"پروفیسر صاحب آ رہے ہیں۔"

"یہ اچھا ہے — ابھی صرف ساڑھے نو بجے ہیں — میٹنگ دس بجے شروع ہو گی — اس وقت سے پہلے ہی وہ پہنچ جائیں گے ، لیکن میں اب تک حیران ہوں — یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"یہی بات تو مجھے چکرائے دے رہی ہے —" شیخ صاحب بڑبڑائے —

ٹھیک بیس منٹ بعد پروفیسر داؤد ان کے دفتر میں داخل ہوئے اور ان کے چہروں پر نظر پڑتے ہی دھک سے رہ گئے :

"خیر معلوم نہیں ہوتی — ورنہ آپ دونوں حضرات کے رنگ اس حد تک اُڑے ہُوئے نہ ہوتے۔" اُنھوں نے پریشان ہو کر کہا۔

"آپ کا خیال ٹھیک ہے — لیکن — ہو سکتا ہے — فکر اور پریشانی والی کوئی بات نہ ہو اور ہم بلا وجہ پریشان ہو رہے ہوں۔"

"کک — کیا مطلب — یہ کیا بات ہوئی — یعنی آپ حد درجے

فکر مند بھی ہیں اور یہ بھی خیال کر رہے ہیں کہ شاید فکر مند ہونے والی بات نہیں ہے۔"

"جی ہاں ! معاملہ کچھ ایسا ہی ہے — آپ تشریف رکھیے۔"

"میری بے چینی بہت بڑھ گئی ہے — ذرا جلدی بتایئے۔" پروفیسر داؤد نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آج سے قریباً تین ماہ پہلے آپ میرے پاس تو نہیں آئے تھے ؟" شیخ نثار احمد نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

"قریباً تین ماہ پہلے — یہ کیا سوال پوچھا آپ نے — میں تو آپ سے ملنے کے لیے عام طور پر آتا ہی رہتا ہوں — خاص طور پر جب کسی ایجاد کو محفوظ کرانے کا معاملہ ہو تو فوراً آپ کا رُخ کرتا ہوں، تین ماہ پہلے میں آیا تھا — اس میں کوئی شک نہیں۔" اُنھوں نے جلدی جلدی کہا۔

"اور آپ مجھ سے مل کر واپس چلے گئے تھے — ٹھیک ہے نا۔"

"مل کر واپس تو خیر جانا ہی ہوتا ہے ، لیکن میں آپ کو اپنی ایک جدید ترین ایجاد سونپنے آیا تھا — تاکہ کسی دُشمن مُلک کا کوئی جاسوس اسے اُڑانے کا خیال تک دل میں نہ لا سکے۔"

"بالکل ٹھیک ، تو آپ ایجاد کا فارمولا لے کر میرے پاس آئے تھے۔" آئی جی صاحب کی آواز میں کپکپی شامل ہو گئی۔

"ہاں — اس میں کوئی شک نہیں — آپ نے میرے سامنے ہی

تو ایجاد کو اس خاص کمرے میں رکھا تھا ۔ جو اسی قسم کی چیزوں کے لیے بنایا گیا ہے ۔ جس کے آگے پیچھے تین دروازے ہیں ۔ گویا اگر کوئی شخص ایک دروازہ کھول بھی لے تو دوسرے دروازے کو کھولنے کی کوشش کرے گا، پھر تیسرے کو، لیکن اتنی دیر تک نگرانوں کو خبر ہو جاتی ہے ۔۔ خفیہ الارم بجتے چلے جاتے ہیں ۔ یہ تو امکانی بات ہے ۔ ویسے ان دروازوں کو کھولنا بھی آسان نہیں ۔ وہ کمرہ آگ، گولی، بم وغیرہ سے محفوظ ہے، لیکن آپ یہ عجیب و غریب باتیں مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔"

"میرا اور خان صاحب کا خیال یہ تھا کہ شاید آپ ہمارے پاس کوئی ایجاد لے کر نہیں آئے تھے؛ البتہ ہم نے اس قسم کا کوئی خواب ضرور دیکھا تھا ۔ مطلب یہ کہ ہم نے خواب دیکھا کہ آپ ایک ایجاد کا فارمولا لے کر ہمارے پاس آئے اور پھر ہم نے اسے آپ کے سامنے اس کمرے میں رکھا ۔"

"یہ ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، بھلا اس قسم کا بھی کوئی خواب دیکھا جا سکتا ہے۔" پروفیسر داؤد نے بوکھلا کر کہا۔

اگر کوئی اور موقع ہوتا تو پروفیسر صاحب کے اس جواب پر انھیں مسکرانا ضرور پڑتا، لیکن اس وقت تو ان کی جان پر بنی تھی ۔ آخر آئی جی بولے:

"وزارتِ خارجہ کے سیکرٹری صاحب نے ایک بہت اہم فائل اس

کمرے میں رکھنے کے لیے بھیجی تھی ۔ ہم دونوں جب وہ فائل رکھنے کمرے میں داخل ہوئے تو آپ کی ایجاد کا خیال بھی آیا ۔ بس ہم نے اس خانے کو کھول کر دیکھ لیا جس میں آپ کی طرف سے ملنے والی چیزیں رکھی جاتی ہیں ۔ اور ۔ اور ۔"

"آپ کا یہ اور اور مجھے ڈرائے دے رہا ہے۔" پروفیسر داؤد کانپ کر بولے ۔

"ہاں! لیکن کیا کیا جائے ۔ اصل بات تو آپ کو بتانا ہی پڑے گی ۔ آپ کی ایجاد اس خانے میں سے غائب ہے۔"

"کیا!!!" پروفیسر داؤد چیخ کر بولے اور پھر ان کا سر میز پر آ ٹکا ۔۔ وہ بے ہوش ہو گئے تھے ۔ اسی وقت ایک آفیسر اندر داخل ہوا ۔ اور کمرے کا منظر دیکھ کر بوکھلا اٹھا ۔۔

○

"ہائے افسوس!" فاروق نے سرد آہ بھری ۔

"خیر تو ہے ۔ صبح صبح سرد آہیں شروع ہو گئیں ۔" محمود نے اسے گھورا ۔۔

"ناشتا کم کیا ہو گا ۔۔ باقی کام آہوں سے چلائیں گے۔" فرزانہ نے گویا محمود کی معلومات میں اضافہ کیا ۔

"اوہ سمجھا — تو یہ بات ہے، لیکن ناشتے میں سے تو ابھی بہت کچھ بچا ہوا ہے۔" محمود نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"افسوس — صد افسوس — لیکن نہیں — میں نہیں رہ سکتا۔" فاروق نے پُراسرار انداز اختیار کیا۔

"پھر وہی افسوس — آخر تمہیں کس بات پر افسوس ہے اور سرد آہیں کس خوشی میں بھری جا رہی ہیں۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"ایک طرف پوچھ رہے ہو، کس بات پر افسوس ہے، دوسری طرف کہہ رہے ہو، کس خوشی میں آہیں بھری جا رہی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے تمہارا دماغ چل گیا ہے — بھلا آہیں بھی کسی خوشی میں بھری جا سکتی ہیں۔" فاروق نے جل بھن کر کہا۔

"اوہو — آج تو جلنے بھننے میں فرزانہ کو بھی پیچھے چھوڑ رہے ہو — کمال ہے۔"

"گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں ہر وقت جلتی بھنتی رہتی ہوں، اور جلنے کے سوا کوئی کام نہیں کرتی — بلکہ جلنے میں مَیں دوسروں سے دو ہاتھ آگے ہوں — کیوں ٹھیک ہے نا —" فرزانہ کاٹ کھانے والے لہجے میں بولی۔

"بالکل ٹھیک ہے — محمود یہی کہنا چاہتا ہے۔" فاروق نے فوراً کہا —

"تم چپ رہو — مجھے محمود کا جواب سننے دو۔" فرزانہ اس کی

طرف اُلٹ پڑی۔

"کم از کم میں نے ہر وقت کا لفظ استعمال نہیں کیا — تم مجھ پر الزام عاید کر رہی ہو۔" محمود نے اپنا بچاؤ کیا۔

"خیر ایک بات واضح طور پر سُن لو — اور وہ یہ کہ جلتی ہے میری جوتی۔" فرزانہ نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

"اس بات کو سُنانے کی ایسی کیا ضرورت تھی — یہ تو ہم پہلے ہی جانتے ہیں — کیوں فاروق؟" محمود نے فاروق کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا —

"پتا نہیں — تم دونوں کی لڑائی میں مَیں کیوں کودوں — تم دونوں میرا کب ساتھ دیتے ہو — اگر میرا جھگڑا تم میں سے ایک سے ہو تو دوسرا میرا ساتھ نہیں دیتا، دوسرے سے جھگڑا ہو تو پہلا میرا ساتھ نہیں دیتا — گویا مجھے تنہا چھوڑ دیتے ہو — اب میں کیوں تم میں سے کسی ایک کی تائید کروں — دونوں لڑو، جھگڑو — اور خود ہی فیصلہ کرو۔"

"اچھا اچھا — زیادہ ہیرو بننے کی کوشش نہ کرو — یہ بتاؤ — وہ سرد آہیں کہاں سے ٹپک پڑی تھیں۔"

"آ گئی ہوں گی بحرِ منجمد شمالی سے۔" فاروق گنگنایا اور دونوں بے ساختہ مسکرا دیے۔

"خیر جانے دو — تم جانو، تمہاری سرد آہیں جانیں۔" فرزانہ [illegible]

کندھے اچکائے۔

"ہاں ٹھیک ہے — میں جانوں اور میری سرد آہیں جانیں۔" فاروق نے بھی اسی کے انداز میں کہا اور پھر فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا — جلد ہی اس نے کہا:

"ہیلو انکل — فاروق بول رہا ہوں — اور سرد آہوں پر سرد آہیں بھر رہا ہوں۔"

"وہ کیوں — خیر تو ہے — کہیں تمہیں نمونیہ تو نہیں ہو گیا —" دوسری طرف سے خان رحمان کی بلند آواز آئی۔

"جی نہیں انکل — سرد آہوں کا سٹاک تو انھوں نے بحرِ منجمد شمالی سے اُدھار منگوایا ہے۔" فرزانہ ریسیور کے قریب مُنہ کرتے ہوئے بولی۔

"اوہو — تو ہماری بیٹی بھی نزدیک ہی موجود ہے — فرزانہ خیر تو ہے — فاروق کو کیا ہُوا؟"

"جی ہاں — اس میں تو کوئی شک نہیں کہ سو فیصد خیریت ہے — لیکن یہ معلوم نہیں کہ فاروق کو کیا ہُوا ہے۔"

"ارے — تمہیں معلوم نہیں — یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"جی ایسے کہ فاروق کے ذہن میں کیا ہے — میں، یا محمود کس طرح جان سکتے ہیں۔"

ہاں، بات تو ٹھیک ہے — کیا مصیبت ہے۔" خان رحمان کی آواز

میں اچانک جھنجلاہٹ پیدا ہو گئی۔

"جی — بات تو ٹھیک ہے — کیا مصیبت ہے — یہ کیا بات ہوئی انکل —" فاروق بھونچکا رہ گیا۔

"کیا مصیبت ہے، میں نے ظہور سے کہا تھا — اچانک میرے سر پر آ کھڑا ہوا —"

"ارے باپ رے — آپ کے سر پر — بس ظہور میں یہی بُری بات ہے — بات بے بات آپ کے سر پر آ کھڑا ہوتا ہے۔" فاروق گڑبڑا کر بولا۔

"ہاں، تم اپنی بات پوری کرو — اس سے تو میں بعد میں سمجھوں گا۔" خان رحمان بولے۔

"جی — کیا سمجھیں گے — کہیں خدانخواستہ فرزانہ کی طرح آپ بھی تو الجبرے میں — ارے باپ رے —" فاروق پکار اُٹھا۔

"کیا کہہ رہے ہو بھئی —" خان رحمان حیرت زدہ لہجے میں بولے۔

"جی وہ — فرزانہ نے اپنا نام سُن کر میری کمر پر ایک مُکّا دے مارا تھا — دراصل یہ نہیں چاہتی کہ میں آپ کو یہ بات بتاؤں۔"

"کون سی بات؟"

"جی یہی — الجبرے والی — الجبرے میں بہت کمزور ہے نا یہ۔"

"لاحول ولا قوۃ — بات کیا ہو رہی تھی — اور پہنچ گئی کہاں؟"

"جی بس — یوں کہہ لیں کہ سرد آہوں سے الجبرے پر پہنچ گئی،

ویسے کچھ غلط بھی نہیں پہنچی۔"

" یار — صاف صاف کہو — ایک تو میں ظہور سے تنگ آگیا ہوں، وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہا۔"

" جی کیا مطلب — انھیں کیا ہوا؟" فاروق چونکا۔

" اپنی بیگم کے ساتھ فلم دیکھنے کی اجازت مانگ رہے ہیں یہ حضرت — اب تم ہی بتاؤ — میں یہ اجازت کس طرح دے سکتا ہوں — جب کہ میرا سارا گھرانہ فلم جیسی چیزوں سے بالکل پرہیز کرتا ہے۔"

" بات تو ٹھیک ہے — آپ تو واقعی اسے اجازت نہیں دے سکتے — اور دیں بھی نہ — ہاں، تو انکل میں سرد آہیں اس لیے بھر رہا ہوں کہ یہ چند چھٹیاں بالکل بے کار جا رہی ہیں — ان چھٹیوں کا کوئی تو فائدہ ہونا چاہیے۔"

" کمال ہے۔" خان رحمان کے منہ سے نکلا۔

" کمال ہے — لیکن کہاں۔" فاروق حیران ہو کر بولا۔

" حامد نے بھی تھوڑی دیر پہلے بالکل یہی بات کہی تھی — جو تم کہہ رہے ہو۔"

" اوہ — اس کا مطلب ہے — یہ بات ٹھیک ہی ہے۔" فاروق چونک کر بولا۔

" کون سی بات؟" خان رحمان اس سے بھی زیادہ زور سے

چونکے —

" یہی کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے — ہاں تو انکل — پھر — ان چھٹیوں کا کیا بنے گا۔"

" فکر نہ کرو — میں نے سوچ لیا ہے — بس تم اسی وقت میرے ہاں آ جاؤ — جمشید کو میں خود سنبھال لوں گا۔"

" بھئی واہ — انکل — آپ جیسے انکل دنیا کے تختے پر نہیں ملیں گے۔"

" چاپلوسی نہیں چلے گی — بس تم آ جاؤ — ابھی مجھے اس ظہور کے بچے سے بھی نبٹنا ہے۔"

" اللہ تعالیٰ آپ کو اُن سے نبٹنے کی توفیق عطا فرمائے — ہم آ رہے ہیں۔"

" تو یہ بات تھی — واقعی بوریت تو ہم بھی محسوس کر رہے تھے۔" محمود نے اس کے ریسیور رکھنے کے بعد کہا۔

" ٹھیک ہے — چلنا ہی ہوگا۔"

" تو پھر آؤ — پہلے باورچی خانے کے دروازے تک ہو آئیں۔" فاروق بولا — محمود اور فرزانہ مسکرا دیے — تینوں باورچی خانے کے دروازے پر آئے:

" امی جان! ذرا ہم انکل خان رحمان کے ہاں جا رہے ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"میں فون پر تمہاری گفتگو سن چکی ہوں اور یہ بھی جان چکی ہوں کہ تم حسبِ معمول پھر گھر سے غائب ہونے کا پروگرام بنا رہے ہو۔" انھوں نے بُرا سا منہ بنایا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر آپ بھی چلیے نا۔" محمود مسکرایا۔

"نہ بابا۔ میں ان جاسوسی جھمیلوں میں نہیں پڑ سکتی۔"

"جاسوسی جھمیلوں میں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے امی جان، ہم تو انکل خان رحمان کے ساتھ چھٹیوں کا کوئی پروگرام ترتیب دینے کے ارادے سے جا رہے ہیں۔"

"جانتی ہوں، لیکن تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ تمہارا بنایا ہوا تفریح کا ہر پروگرام جاسوسی کی نذر ہو جاتا ہے۔"

"ہاں امی جان۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔" فاروق نے سرد آہ بھری۔

"بھئی اب اتنی بھی سرد آہیں نہ بھرو کہ پورا گھر ہی ٹھنڈا ہو جائے۔" محمود نے منہ بنایا۔

"چلو اچھا ہی ہے، ایر کنڈیشنز لگانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔" فرزانہ بولی۔

"خیر۔ تو ہمیں اجازت ہے نا امی جان۔"

"ہاں بالکل۔ خان رحمان تم لوگوں کو بلائیں اور میں اجازت نہ دوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، بیگم خان رحمان کو میرا سلام کہنا۔"

"جی بہتر۔ آؤ بھئی چلیں۔"

آدھ گھنٹے بعد محمود نے خان رحمان کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھلا اور ظہور کی صورت نظر آئی۔ اس پر زلزلے کے آثار طاری تھے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے انکل۔ آپ پہلے ہی دروازے کے ساتھ لگے کھڑے تھے۔" محمود حیران ہو کر بولا۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔"

"لیکن کیوں۔ پہلے سے آ کر کھڑے ہونے کی کیا ضرورت تھی؟"

"خان صاحب کا حکم۔ فون پر آپ لوگوں سے بات ہوتے ہی مجھ سے کہا۔ جاؤ۔ دروازے پر کھڑے ہو جاؤ۔ آپ لوگ آنے والے ہیں۔ میں نے کہا بھی۔ کہ ابھی آپ کے آنے میں کم از کم آدھ گھنٹا لگے گا، لیکن وہ خان صاحب ہی کیا جو میری بات مان لیں۔ کہنے لگے۔ جو کہا ہے، وہ کرو۔ دروازے پر جا کر کھڑے ہو جاؤ۔"

"اور وہ فلم کا کیا مسئلہ ہے؟" محمود مسکرایا۔

"فلم دیکھنے کی اجازت نہیں دے رہے۔ آپ ہی سفارش کر دیں۔"

"افسوس! ہم اس بات کی سفارش نہیں کر سکتے۔"

"کیوں۔ کیوں۔ آپ کا کیا حرج ہے؟"

"بہت بڑا حرج ہے۔ ہم خود فلمیں نہیں دیکھتے۔ تو آپ کو کس طرح اجازت دلوا دیں۔ آئیے اندر چلیں۔" فاروق بولا۔

ظہور بُرے بُرے مُنہ بناتا اُن کے ساتھ اندر کی طرف چلا، خان رحمان اپنے کمرے میں تھے۔ حامد، سرور، ناز اور بیگم خان رحمان بھی وہیں تھے:

"السلام علیکم انکل۔"

"وعلیکم السلام۔ آؤ بھئی آؤ۔ تمھارا فون بہت زور دار تھا۔ میں تو بس پھڑک ہی اٹھا، لیکن بھئی۔ اُلجھن یہ ہے کہ بیگم اور بچّے ہمارا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔"

"جی۔ وہ کیوں؟" فرزانہ چونکی۔

"اس لیے کہ ان کے نانا جان کچھ بیمار ہیں اور اُنھوں نے اِنھیں بُلایا ہے۔ یہ جانے کے لیے بس تیار ہی بیٹھے ہیں۔ میں انھیں ایرپورٹ تک چھوڑ آؤں، پھر بیٹھ کر پروگرام بنائیں گے۔"

"جی بہتر۔" انھوں نے ایک ساتھ کہا، پھر فرزانہ بیگم خان رحمان سے بولی:

"اور ہاں آنٹی۔ امّی جان نے سلام کہا تھا۔"

"وعلیکم السلام۔"

"جانے سے پہلے میں صرف اتنا بتا دوں کہ اس بار ہم ایک

میلے میں شرکت کریں گے۔ جاسوسی میلے میں۔"

"جی کیا مطلب۔ جاسوسی میلے میں۔" محمود نے کہا۔ تینوں حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

لیکن وہ تو حامد وغیرہ کو لے کر دروازے کی طرف بڑھ چکے تھے۔ آج خان رحمان انھیں بہت پُراسرار لگ رہے تھے۔ ایرپورٹ سے واپسی پر انھوں نے کہا:

"ہاں بھئی۔ کیا سوچا ہے تم نے۔"

"جی۔ ہم تو ابھی تک یہی سوچ رہے ہیں کہ یہ جاسوسی میلہ کیا بلا ہے، ہم نے تو آج سے پہلے کبھی اس قسم کے کسی میلے کا نام تک نہیں سُنا۔ یہ کہاں لگتا ہے۔ اور ہمیں اس کے بارے میں پہلے کسی نے کیوں نہیں بتایا، جب کہ جاسوسی کا اور ہمارا چولی دامن کا ساتھ ہے۔" فاروق جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔

"توبہ ہے۔ اسے کہتے ہیں۔ نہ رُکنے والی زبان۔" فرزانہ تلملا اُٹھی۔

"انکل۔ میری بے چینی بہت بڑھ گئی ہے۔ مہربانی فرما کر جاسوسی میلے کی وضاحت کر دیں۔" محمود بولا۔

"ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔ ابھی لو۔" اُنھوں نے کہا۔

عین اُسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ خان رحمان فون کی طرف مُڑے اور ریسیور اُٹھاتے ہوئے بولے:

"ہیلو۔ خان رحمان بول رہا ہوں۔"

"اور یہ میں ہوں انسپکٹر جمشید۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ محمود، فاروق اور فرزانہ یہاں ہیں۔" دوسری طرف سے انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں! تمھاری معلومات غلط نہیں ہیں، لیکن یہ کیا۔ تمھیں دفتر پہنچتے ہی ان کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"ابھی تو خیر ضرورت نہیں پڑی، لیکن کسی وقت بھی پڑ سکتی ہے۔ انھیں چاہیے۔ فوراً دفتر پہنچ جائیں۔"

"اگر کوئی سنگین معاملہ ہو تو میں بھی آ جاؤں۔"

"کوئی حرج نہیں۔ ضرور آ جاؤ۔" انھوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"لو بھئی۔ ہمارا جاسوسی میلے والا پروگرام خاک میں ملتا نظر آتا ہے۔" خان رحمان مسکرائے۔

"میلوں کا اور خاک کا یوں بھی تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔" فاروق بڑبڑایا۔

"کیا مطلب۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ فون شاید ابا جان کا تھا"

"شاید نہیں۔ یقیناً۔ انھوں نے تم لوگوں کو فوری طور پر دفتر بلایا ہے۔ ساتھ میں میں بھی چلوں گا۔"

"اوہ۔ خیر دیکھتے ہیں کیا بات ہے۔ آئیے چلیں، لیکن انکل ہم جاسوسی میلے والی بات ابھی تک نہیں سمجھ سکے۔"

"بات دراصل صرف اتنی سی ہے کہ میں نے ایک بے آباد ساحل پر بنا ہوا ایک بہت پرانا بنگلہ خریدا ہے۔ جگہ بہت پُرسکون اور پُر فضا ہے۔ دُنیا کے جھمیلوں سے دُور ہے۔ لہٰذا میں نے سوچا تھا کہ ہم یہ چھٹیاں وہاں گزاریں گے۔ اس جگہ کسی جاسوسی چکر کے چلنے کا بھی امکان نہیں۔" خان رحمان نے گھر سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"لیکن۔ انکل۔ یہ جاسوسی میلہ کس طرح ہو گیا؟"

"بھئی میرا ارادہ ہے۔ انسپکٹر کامران مرزا، ان کے بچے اور منور علی خان بھی اس جگہ پہنچ جائیں۔ نہ صرف وہ لوگ۔ بلکہ شوکی برادرز بھی۔"

"جی۔ کیا فرمایا۔ شوکی برادرز۔" محمود حیران ہو کر بولا۔

"ہاں۔ آخر وہ بھی جاسوس ہیں۔ اور اپنے علاقے میں ان کی بھی ایک شہرت ہے اور پھر پچھلی مہم میں ہمارے ساتھ رہ چکے ہیں۔"

"بہت خوب صورت اور پُر لطف پروگرام رہے گا، لیکن۔ شاید اب ہم اس پروگرام پر عمل نہ کر سکیں، کیونکہ ابا جان کسی خاص وجہ سے ہی ہمیں دفتر بلایا کرتے ہیں۔"

"بات یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن تم فکر نہ کرو۔ اگر حالات سازگار ہوئے تو میں اس پروگرام کو عملی شکل دے کر رہوں گا۔ اور ہاں مجھے یاد آ گیا۔ میں نے کسی کو وقت دے رکھا ہے۔ وہاں سے

فارغ ہو کر دفتر پہنچوں گا۔"

وہ دفتر میں داخل ہوئے، لیکن انسپکٹر جمشید یہاں نہیں تھے، البتہ اکرام ضرور اپنی کرسی پر بیٹھا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پتھر کا بت بن کر رہ گیا ہو۔ ان کے اندر داخل ہونے پر بھی اس کے جسم میں حرکت نہ ہوئی تو وہ گھبرا اُٹھے۔

"اوہو۔ کہیں انکل پر سکتے کی حالت تو طاری نہیں ہو گئی؟" محمود گھبرا گیا۔

"ٹھہرو۔ میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔" فاروق جلدی سے فون کی طرف بڑھا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں ٹھیک ہوں، لیکن آج شاید سارا دفتر پتھر کا بت بن کر رہے گا۔"

"جی۔ کیا مطلب۔ اتنا بڑا بت کس طرح بن سکتا ہے۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"حد ہو گئی۔ جب دیکھو مذاق۔ دیکھتے نہیں۔ انکل کس قدر سنجیدہ ہیں۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے آج تک انکل کو اتنا سنجیدہ کبھی نہیں دیکھا۔ کیوں انکل؟" یہ کہتے ہوئے فاروق نے اکرام کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے انکل۔ خیر تو ہے؟"

"نہیں۔ خیر نہیں ہے۔ محکمہ سراغرسانی کی عمارت میں ایک بہت ہی خاص کمرہ ہے۔ یہ کمرہ بم پروف، آگ پروف اور ہر قسم کی ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ ہے۔ اس میں بہت ہی خفیہ اور اہم قسم کے کاغذات وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ پروفیسر داؤد صاحب کی بھی چند ایجادات اس کمرے میں محفوظ ہیں۔ تین ماہ پہلے ایک خاص ایجاد کا فارمولا اسی کمرے میں پروفیسر صاحب والے خانے میں رکھا گیا، لیکن۔ اب وہ فارمولا وہاں نہیں ہے۔ نہ صرف وہ فارمولا۔ بلکہ دوسرے بھی۔ اور نہ صرف یہ کہ پروفیسر صاحب کے فارمولے غائب ہیں۔ بلکہ تمام اہم ترین ریکارڈ بھی غائب ہے۔"

"کیا!!!" وہ اتنے زور سے چیخے کہ کمرہ جھنجنا اٹھا۔

بُری خبروں کا دِن

"انھیں کیا ہُوا سر!" آفیسر نے حیران ہو کر کہا۔

"ایجاد کے فارمولے کی گم شُدگی کا سُن کر بے ہوش ہو گئے ہیں۔ میں ڈاکٹر انصاری کو فون کرتا ہوں۔ آپ فرمائیے۔ کیا سب تیاریاں مکمل ہو گئیں؟" آئی جی صاحب نے فون کے ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ڈی آئی جی صاحب اس وقت تک اُٹھ کر پروفیسر داؤد کو سنبھال چکے تھے۔ اور پھر چپراسی بھی اندر آگیا۔ اس نے بھی پروفیسر صاحب کو سنبھالا۔ دونوں نے مل کر انھیں صوفے پر لٹا دیا۔

"جی ہاں! سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"افسوس۔ اب ہم پروفیسر صاحب کے ہوش میں آنے کے بعد ہی کچھ کر سکیں گے۔ آپ چلیں۔"

آفیسر کمرے سے نکل گیا۔ اسی وقت انسپکٹر جمشید اندر داخل ہوئے، اُن کا چہرہ دُھواں ہو رہا تھا۔

"کوئی نئی خبر جمشید۔"

"یس سر۔ ایک بہت ہی ہیبت ناک خبر۔ اتنی کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں سُنی ہو گی۔" انھوں نے کانپتی آواز میں کہا، پھر چونک کر بولے:

"ارے۔ یہ پروفیسر صاحب کو کیا ہوا؟"

"مَیں نے فارمولے کی گم شُدگی کی اِطلاع دی تو یہ بے ہوش ہو گئے۔"

"اوہو۔ یہ تو اور بھی عجیب بات ہے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"کیا مطلب۔ اور بھی عجیب بات ہے؟" افتخار احمد خان حیران ہو کر بولے۔

"جی ہاں! مَیں پروفیسر صاحب سے اچھی طرح واقف ہوں، ان کی طبیعت اور عادت کو بھی جانتا ہوں، کسی فارمولے کی گم شُدگی کی اِطلاع سُن کر یہ بے ہوش نہیں ہو سکتے، ہاں حیرت زدہ اور فکر مند ضرور ہو سکتے ہیں، ان میں بہت بڑا حوصلہ ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایجاد کوئی بہت ہی اہم۔ بلکہ اہم ترین ایجاد تھی۔"

"اوہ!" ان دونوں کے مُنہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"یا اللہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس خاص کمرے سے سارا ریکارڈ

غائب ہے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے؟"

"یہ کام معمولی کام نہیں۔ کسی ایک آدمی کا کام نہیں۔ تاہم ریکارڈ روم کے انچارج اور نگران کو ہٹائے بغیر یا انھیں اپنے ساتھ ملائے بغیر یہ ممکن نہیں۔ سب سے پہلے انھیں چیک کرنا ہو گا۔ کیا آپ ڈاکٹر صاحب کو فون کر چکے ہیں؟"

"ہاں۔ وہ آ رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ذرا ان دونوں کو چیک کرنے جا رہا ہوں۔ اُمید ہے۔ میٹنگ روم میں وقت پر پہنچ سکوں گا۔"

"جلدی کرنا جمشید۔ میں بہت فکر مند ہوں، اور اگر ان دونوں پر ذرا بھی شک ہو تو ان پر ہر طرح کی سختی کی جائے، اور وہ ہیبت ناک خبر بھی رہی جاتی ہے۔ خیر وہ بعد میں بھی سُنی جا سکتی ہے۔"

"ایسا ہی ہو گا۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید باہر نکلے۔ یہاں اکرام اور اس کے ماتحت کھڑے تھے۔

"ان دونوں کو دفتر میں لے آؤ۔"

"جی بہتر۔" اکرام بولا۔

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید اپنے کمرے میں آئے اور کُرسی پر بیٹھ گئے۔ گہری سوچ میں گم تھے۔ پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے۔ ریکارڈ روم سے۔ وہ بھی ایسے ریکارڈ روم سے جسے ہر

طرح محفوظ بنایا گیا تھا۔ تمام اہم ترین ریکارڈ کا چوری ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ یہ تو ایک ایسا واقعہ تھا کہ پورا محکمہ لرز اُٹھا تھا۔ اور ابھی تو انسپکٹر جمشید نے آئی جی صاحبان کو وہ خبر نہیں سُنائی تھی۔ وہ بھی حد درجے ہولناک تھی۔

اسی وقت اکرام اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی انسپکٹر جمشید اُچھل کر کھڑے ہو گئے۔

"کیا مطلب۔ کیا وہ دونوں فرار ہو گئے۔"

"جج۔ نہیں۔ انھوں نے۔ انھوں نے خودکشی کر لی۔"

"خودکشی کر لی، لیکن کیسے۔ ان کے سروں پر تو نگران موجود تھے۔ میں نے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کریں۔" انسپکٹر جمشید تلملا اُٹھے۔

"جج۔ ہاں۔ آپ نے بے شک یہ ہدایت کر رکھی تھی، لیکن۔ آپ نے یہ ہدایت نہیں دی تھی کہ وہ اپنی جیبوں میں بھی ہاتھ نہ ڈالیں۔ ان کی تلاشی پہلے ہی لی جا چکی تھی۔ نگرانوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے غیر محسوس طور پر جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور ایک شیشی میں سے ایک ایک کیپسول نکال کر کھا لیا۔ کیپسول نگلتے ہی وہ ذرا دیر کے لیے تڑپے اور ختم ہو گئے۔"

"تلاشی کے وقت کیا ان کیپسولوں کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی؟" انسپکٹر جمشید بھنا کر بولے۔

"جی نہیں۔ انھوں نے بتایا تھا کہ وہ دونوں شوگر کے مریض ہیں، اس لیے کیپسولوں کی شیشیاں ان کے پاس رہنے دی گئیں۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ کیپسول، موت کے کیپسول ہوں گے۔"

"یہ بہت بُرا ہُوا اکرام۔ بہت بُرا۔ آج کا دن شاید بُری خبروں کا دن ہے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے فون کا ریسیور اُٹھایا اور گھر کے نمبر ڈائل کیے:

"ہیلو۔ بیگم۔ فون ذرا محمود کو دو۔"

"سوری۔ میں یہ کام نہیں کر سکوں گی۔ وہ اس وقت خان رحمان کے گھر ہیں۔"

"ارے۔ وہ وہاں کیسے پہنچ گئے۔ خیر۔" یہ کہہ کر انھوں نے سلسلہ بند کیا اور خان رحمان کے نمبر ڈائل کیے۔ انھیں فون کر کے اکرام کی طرف مڑے:

"تم یہیں ٹھہرو اکرام۔ میٹنگ کا وقت ہو چلا ہے، مَیں واپس آکر ان کی لاشوں کا معائنہ کروں گا۔ اس کمرے میں کوئی شخص داخل ہونے کی کوشش کرے تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔"

"جی بہت بہتر۔" اکرام نے کہا اور انسپکٹر جمشید کمرے سے نکل کر

لمبے لمبے ڈگ بھرتے میٹنگ روم میں داخل ہوئے۔

آئی جی صاحبان آ چکے تھے۔ اور پروفیسر داؤد بھی ان کے ساتھ ہی نظر آئے۔ ان کا رنگ بالکل زرد تھا۔ ان پر نظر پڑتے ہی اُداس سی مُسکراہٹ ان کے چہرے پر رینگ گئی۔ انسپکٹر جمشید بھی ان کی طرف ہی بڑھ گئے:

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے پروفیسر صاحب؟"

"بس جمشید۔ ٹھیک ہی ہوں۔"

"کیا وہ کوئی بہت ہی خاص ایجاد تھی؟"

"ہاں جمشید۔ خاص سے بھی دو ہاتھ آگے، تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ ایک ایسے بم کا فارمولا تھا۔ جو دشمنوں کے بموں کو فضا میں ہی بے کار کر سکتا ہے۔ ایسے بم ہم بہت بڑی تعداد میں نہایت آسانی سے بنا سکتے تھے، لیکن افسوس۔"

"واقعی۔ یہ ایک بہت خاص اہمیت والی ایجاد تھی۔ خیر آپ زیادہ فکر مند نہ ہوں۔ جن لوگوں کا یہ کام ہے، ہم ان کے خلاف کارروائی شروع کر چکے ہیں۔ یہ میٹنگ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید شیخ صاحب کی طرف مڑے:

"کیا کسی کا انتظار ہے سر؟"

"ہاں۔ وزیر خارجہ اور وزیر داخلہ تشریف لانے والے ہیں، ریکارڈ روم کے انچارج اور نگران کے سلسلے میں کیا ہوا؟"

"دونوں اب اس دُنیا میں نہیں۔ انھوں نے خُودکشی کرلی ہے۔"

"ارے۔ کیا۔" ان کے منہ سے حیرت کی زیادتی کی وجہ سے نکلا۔

عین اسی وقت باہر سائرن کی آواز سنائی دی:

"لو۔ وُہ آگئے۔" شیخ صاحب اُٹھتے ہوئے بولے۔

پانچ منٹ بعد دونوں وزیر بھی میٹنگ روم میں موجود تھے۔

"کارروائی شروع کی جائے۔ اتنا بڑا حادثہ کس طرح ہوگیا؟" وزیرِ خارجہ نے گفتگو شروع کی۔

"ریکارڈ روم کے انچارج اور نگران کی غداری سے۔ وُہ دونوں خودکشی کرچکے ہیں۔"

"تب ہمیں ان لوگوں کا سراغ تو لگانا ہوگا۔ جنھوں نے ان دونوں کو خودکشی کرنے پر آمادہ کیا۔" وزیرِ داخلہ بولے۔

"یس سر۔ اب ہم یہی کام کریں گے۔"

"ریکارڈ روم سے جو کچھ گیا، اس کی تفصیل کیا ہے؟"

"بیرونی ممالک سے کیے جانے والے تمام خفیہ معاہدات چرائے جا چکے ہیں۔"

"اُف اللہ۔" وزیرِ خارجہ کانپ اُٹھے۔

"اور پروفیسر داؤد صاحب کی اہم ترین ایجادات اڑا لی

گئی ہیں۔"

"نہیں!" وزیرِ داخلہ کے منہ سے نکلا۔

"ان میں سے ایک ایجاد اتنی اہم تھی کہ آیندہ ہونے والی جنگ میں ہم اس ایجاد کی وجہ سے بہت بہتر پوزیشن میں رہتے۔"

"یہ انتہائی ہولناک خبریں ہیں۔ فوری طور پر صدرِ مملکت کے علم میں لانا ہوں گی۔ ہم اب یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔ جہاں تک ممکن ہو۔ جلد ان کا سراغ لگایا جائے۔ اگر وُہ لوگ ریکارڈ بیرونِ ملک لے جانے میں کامیاب ہوگئے۔ تو ہم بہت بڑے نقصان میں رہیں گے۔" یہ کہتے ہوئے دونوں وزیر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسے میں آئی جی صاحب کو کچھ خیال آیا۔ وُہ انسپکٹر جمشید کے کان پر جھکے:

"اور وُہ ہولناک خبر جمشید۔"

"کیا آپ چاہتے ہیں۔ میں وُہ خبر بھی سب کے سامنے سُنا دوں۔"

"ہاں! یہی بہتر ہے۔"

"لیکن۔ ابھی سرکاری طور پر اس خبر کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ مجھے ایک گمنام فون موصول ہوا تھا۔"

"جلدی بتاؤ جمشید۔ تاکہ دونوں وزراء صاحبان کے میٹنگ روم

سے نکلنے سے پہلے میں یہ فیصلہ کر سکوں کہ وُہ خبر سُنائی جائے یا نہیں ۔"

" تو پھر سُنیئے ۔ ہم نے اپنے دوست مُلک چمپان سے سونا خریدا تھا ، وُہ سونا ایک بحری جہاز کے ذریعے روانہ کیا گیا تھا ۔ بحری جہاز ابھی ہمارے ملک کی سمندری حدود میں داخل نہیں ہوا، لیکن آج صبح ناشتے کی میز پر مجھے ایک فون موصول ہوا ۔ فون کرنے والے نے اپنا نام نہیں بتایا ۔ اس نے کہا کہ سونے کا جہاز غائب ہو گیا ہے ۔"

" کیا کہا ۔" آئی جی صاحب چیخ اُٹھے ۔

دونوں وزیر چیخ سُن کر ان کی طرف مڑے ، ان کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے ۔ ان کی موجودگی میں ان کے ماتحت آفیسر اس طرح چیخ پڑیں ۔ ناگوار سی بات تھی ، لیکن جب اُنھوں نے آئی جی صاحب کی آنکھوں میں دیکھا تو وہاں حیرت اور خوف کے ملے جُلے ایسے آثار تھے کہ دھک سے رہ گئے ۔

" خ ۔ خیر تو ہے شیخ صاحب ۔"

" ایک اور بھیانک خبر ۔ لیکن ابھی اس خبر کی تصدیق نہیں ہو سکی ۔"

" جلدی بتایئے ۔ تاکہ تصدیق کی جا سکے ۔"

" دوست ملک سے بھیجا جانے والا سونے کا جہاز اپنے راستے

پر نہیں ہے ۔"

" نہیں !!!" ان کے منہ سے اس قدر خوف زدہ انداز میں نکلا کہ پورے کمرے میں خوف دوڑ گیا ۔

○

" ہاں ! اور حیرت کی بات یہ کہ یہ کام ریکارڈ روم کے انچارج اور نگران کے ذریعے لیا گیا ۔ انسپکٹر صاحب کا خیال فوری طور پر ان کی طرف گیا تھا ۔ لہذا انھیں حراست میں لے لیا گیا اور ایک الگ کمرے میں رکھا گیا ، لیکن انھوں نے خُودکشی کر لی ۔"

" خودکشی کر لی ۔ کیسے ؟" فرزانہ چونک کر بولی ۔

" ان کے پاس کیپسول تھے ۔ بس وُہ انھوں نے مُنہ میں رکھ لیے ۔ میٹنگ کے بعد انسپکٹر صاحب ان کی لاشوں کا معائنہ کریں گے ۔"

" تو ہم پہلے ہی کیوں نہ ان کا معائنہ کر لیں ۔ وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے ۔" محمود بول اٹھا ۔

" دیکھ لیں ۔ کہیں انسپکٹر صاحب بُرا نہ مانیں ۔"

" جب وُہ بُرا مانیں گے ، اس وقت دیکھ لیں گے ۔ اس وقت کیسے دیکھ لیں ۔" فاروق نے مُنہ بنایا ۔

"ہاں! یہ تو خیر ٹھیک ہے۔ تو پھر آؤ۔ ذرا لاشیں دیکھ ہی لیں۔"

اکرام نے کندھے اچکائے اور انھیں لے کر کمرے سے نکلا۔

"آپ شاید ڈر رہے ہیں؟" محمود مسکرایا۔

"نہیں۔ ڈرنے کی کیا بات ہے۔" اکرام بولا۔

وہ اس کمرے میں داخل ہوئے جس میں دونوں لاشیں پڑی تھیں۔ کمرے کے باہر مسلح نگران چوکس کھڑے نظر آئے تھے۔ دونوں لاشیں فرش پر پڑی نظر آئیں۔

"ارے۔ ان کا رنگ تو نیلا ہو گیا۔"

"وہ کیپسول زہر کے ہوں گے۔ کچھ زہر انسان کو نیلا کر دیتے ہیں، عام طور پر سانپ کا زہر۔" محمود نے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔ ان کیپسولوں میں سانپ کا زہر بھرا گیا ہو۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"ہاں! اس کا بھی۔ ارے۔" فاروق کہتے کہتے رُک گیا۔ اس کی نظریں مُردہ جسموں کے چہروں پر جم کر رہ گئی تھیں۔

"کیا بات ہے۔ صبح ہی صبح ارے۔"

"ہاں! بے چارے ارے کو تو شام کو آنا چاہیے تھا۔" فرزانہ نے مُنہ بنایا۔

"ان کے تمام جسم نیلے پڑ چکے ہیں، لیکن ناک کی نوکیں بالکل

سُرخ ہیں۔ آخر کیوں؟

"ناک کی نوکوں پر زہر کا اثر نہیں ہوا ہو گا۔ یہ کون سی ایسی حیران ہونے کے قابل بات ہے۔"

"لیکن ناک کی نوکوں کا رنگ خون کی مانند سُرخ ہے۔ جب کہ عام حالات میں ناک کی نوک خون کی مانند سُرخ نہیں ہوتی۔" فاروق نے اعتراض کیا۔

"تب یہ اس زہر کا اثر ہو گا۔"

فاروق کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے آگے بڑھ کر ان میں سے ایک لاش پر جھک گیا۔ اس کا ہاتھ مردہ شخص کی ناک کی نوک کی طرف بڑھا ہی تھا کہ فرزانہ چلا اُٹھی:

"خبردار۔ یہ کیا کر رہے ہو؟"

"ذرا ناک کی نوک کو چھو کر دیکھ رہا ہوں۔ کیا اس میں بھی کوئی خطرہ ہے۔" فاروق نے مُنہ بنایا۔

"بالکل۔ خطرہ ہو سکتا ہے۔"

"خیر۔ ہم کسی تنکے کی مدد سے ناک کی نوک کو چھو کر دیکھ سکتے ہیں۔" محمود تنگ آ کر بولا اور کمرے میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں، پھر دیوار کے ساتھ لگی میز پر سے پلاسٹک کا پیمانہ اٹھا کر لاش کی طرف بڑھا۔

"ہم تو اس سے اس طرح ڈر رہے ہیں جیسے یہ ہمیں کرنٹ

ہی تو مار دے گی۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"یہ کسی عجیب قسم کے زہر سے ہلاک ہوئے ہیں۔ زہروں کی تاثیریں ہم نے بہت عجیب عجیب سُنی ہیں ۔ خود ہم بھی کئی خوفناک مناظر دیکھ چکے ہیں ۔ بعض زہر تو آدمی کو پانی بنا دیتے ہیں۔" فرزانہ نے جلدی جلدی کہا ، اس وقت تک محمود پیمانے کی نوک سے ناک کی نوک کو چھو چکا تھا ۔ دُوسرے ہی لمحے وُہ تھرا اُٹھے ۔ پیمانے کی نوک ناک میں دھنستی چلی گئی ۔ محمود نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کھینچا ۔ وُہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پیمانے کی نوک غائب ہو چکی تھی ۔

" اُف خُدا ۔ ان کا تو پورا جسم زہریلا ہو چکا ہے ۔ گویا زہر ہی زہر بھرا پڑا ہے ۔"

" ہاں ! ان لاشوں کو ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا ۔ میرا خیال ہے ۔ ہم ان کی لاشوں کے ذریعے کوئی سراغ نہیں لگا سکتے ۔ ہمیں تو ان کے گھر پہنچنا چاہیے ۔ ان کے گھر والوں سے سوالات کرنے چاہییں۔"

" ٹھیک ہے ۔ انکل ۔ کیا ان دونوں کے گھروں کے پتے مل سکتے ہیں ؟"

" ضرور کیوں نہیں ۔ یہ کیا مشکل ہے ۔ ان کے گھروں میں جا کر تفتیش کرنا مفید بھی رہے گا ۔ کیونکہ ابھی ان لوگوں کو یہ بات

معلوم ہی نہیں کہ یہ لوگ مر چکے ہیں ۔" اکرام نے پُر جوش لہجے میں کہا ۔

" تو کیا آپ بھی ہمارے ساتھ چل رہے ہیں ۔"

" افسوس ۔ جب تک انسپکٹر صاحب واپس نہیں آ جاتے ۔ مجھے دفتر میں ہی بیٹھنا ہو گا ۔"

" خیر کوئی بات نہیں ۔"

پہلے وُہ نگران کے گھر پہنچے ۔ انھوں نے دیکھا ، گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا ۔ محمود نے ساتھ والے مکان کے دروازے پر دستک دی ۔ آنکھوں پر عینک لگائے ایک بوڑھے آدمی نے دروازہ کھولا :

" السلامُ علیکم جناب ۔ یہ آپ کے ساتھ والے کہاں گئے ہیں ؟"

" جانا کہاں تھا ۔ گھر میں ہی ہیں۔"

" لیکن دروازے پر تو تالا لگا ہوا ہے ۔"

" تھوڑی دیر پہلے تو یہیں تھے ۔ ان کی لڑکی لہسن مانگنے آئی تھی ۔ گویا ان کا ہنڈیا چڑھانے کا پروگرام تھا ۔ اس صورت میں بھلا وُہ کہاں جا سکتے ہیں ۔"

" یہ تو واقعی حیران کُن بات ہے ۔ اچھا جناب ۔ بہت بہت شکریہ ۔ ہم نے آپ کو زحمت دی ۔"

بڑے میاں نے اپنا مُنہ اندر کر لیا اور دروازہ بند کر دیا ۔

"عجیب بات ہے ۔ یہ لوگ اچانک کہاں چلے گئے؟" محمود بڑبڑایا ۔

فرزانہ کو نہ جانے کیا سوجھی ۔ بند دروازے پر جا کر کان اس کے ساتھ لگا دیا ۔

"ہاں ہاں ۔ سُن لو ۔ اندر کی آوازیں ۔ گھر والوں کے فرشتے تو اندر موجود ہوں گے ہی۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"وقت ضائع کرنے کی بجائے ہمیں انچارج صاحب کے ہاں جانا چاہیے ۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے جانے سے ان کے دروازے پر بھی تالا لگا دیا جائے۔"

"کیا مطلب ۔ کیا یہ تالے ہمارے استقبال میں لگائے جا رہے ہیں۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"اور نہیں تو کیا ۔ استقبال کا ایک یہی طریقہ تو رہ گیا ہے۔" محمود نے کہا، پھر فرزانہ کی طرف مڑتے ہوئے بولا:

"آؤ فرزانہ چلیں ۔ اس بند دروازے سے تمھیں کچھ نہیں ملے گا ۔"

"اور کیا، ہمیں تو کھُلے دروازوں سے کچھ نہیں ملتا۔" فارُوق نے کہا ۔

فرزانہ نے جیسے ان کی باتیں سُنی ہی نہیں ۔ بدستور کان لگائے کھڑی رہی:

"ہائیں! کہیں تمھارا کان دروازے سے چپک تو نہیں گیا۔" فارُوق کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی، فرزانہ نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا ۔ یہ دیکھ کر محمود چونک کر آگے بڑھا اور اس نے بھی کان دروازے سے لگا دیا ۔

"یک نہ شد، دو شد ۔ ایک فرزانہ کو دروازے سے ہٹانا ہی مشکل ہو رہا تھا ۔ کہ اب یہ حضرت بھی جا لگے دروازے سے۔" فارُوق نے جھلا کر کہا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اچانک ایک آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ فاروق نے چونک کر ادھر دیکھا ۔ ایک موٹا تازہ، ہٹا کٹا آدمی اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

"جی ۔ ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے ۔ کیا یہ آپ کا گھر ہے؟"

"نہیں ۔ کیا یہ تمھارا گھر ہے۔" اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"نہیں، ہمارا بھی نہیں ہے۔"

"تو کیا تم چور ہو؟" اس نے پُوچھا۔

"چور اس طرح دن دہاڑے لوگوں کے گھر میں نہیں گھستے ۔" فارُوق نے منہ بنایا۔

"تو پھر ۔ آخر تم کیا کر رہے ہو؟"

"پہلے تو آپ بتائیں ـ آپ ہیں کون ؟"

عین اسی وقت محمود خوف زدہ انداز میں مڑا اور فاروق سے بولا :

"فاروق ـ اندر کچھ گڑبڑ ہے ـ ہمیں فوری طور پر اندر داخل ہونا ہے ـ شاید ہم کسی کی زندگی بچا سکیں۔"

"یہی میں کہنا چاہ رہی تھی۔" فرزانہ بول اٹھی۔

"تو روکا کس نے تھا ـ" فاروق نے جل بھُن کر کہا اور مکان کے پچھلے حصّے کی طرف جانے کے لیے دوڑ لگا دی ـ محمود نے فرزانہ سے کہا :

"فرزانہ تم ادھر ہی ٹھہرو ـ میں فاروق کے ساتھ جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وُہ بھی دوڑ پڑا۔

"یہ ـ یہ کیا ہو رہا ہے ؟" ہٹا کٹا آدمی ہکلایا۔

"مہربانی فرما کر اپنا کام کریں ـ ابھی تو خود ہمیں بھی نہیں معلوم کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں ـ"

"ضرور کوئی گڑبڑ ہے ـ مجھے پولیس اسٹیشن جا کر اطلاع دینی چاہیے۔" اس نے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا ـ فرزانہ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی ـ ضرورت بھی کیا تھی روکنے کی ـ فاروق اور محمود کو گئے قریباً پانچ منٹ گزر گئے ـ فرزانہ کی بے چینی انتہا کو پہنچ گئی ـ اور پھر وُہ بھی دروازے پر

کھڑی نہ رہ سکی ـ پچھلے حصّے کی طرف دوڑ پڑی ـ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ محمود اسے صدر دروازے پر رُکنے کی ہدایت کر گیا ہے ـ

گلی عبور کرنے کے بعد ایک اور تنگ گلی مڑتی نظر آئی ـــ آگے جا کر یہ گلی بند تھی ، لیکن یہاں محمود تھا نہ فاروق ـ فرزانہ دھک سے رہ گئی ـــ

باس کا غلام

میٹنگ روم میں موت کا سناٹا طاری ہو گیا۔ وزراءِ صاحبان جو جانے کے لیے اُٹھ چکے تھے۔ دھم سے اپنی کرسیوں میں گر گئے۔

"یہ۔ یہ ہم نے کیا سُنا۔" وزیرِ داخلہ مُردہ آواز میں بولے۔

"مجھے گمنام فون پر یہی اِطلاع ملی تھی۔ اگر اس وقت آئی جی صاحب کا فون نہ ملتا اور یہ مجھے یہاں فوری طور پر حاضر ہونے کا حکم نہ دیتے تو میں اسی وقت اس جہاز کی گم شُدگی کی تصدیق کے لیے کوشش شروع کر دیتا۔"

"حیرت ہے۔ کسی کو گمنام فون کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" شیخ نثار احمد بولے۔

"اس پر تو مجھے بھی حیرت ہے۔ بہر حال مَیں اب اس اِطلاع کی تصدیق کروں گا۔ ابھی ان لاشوں کا جائزہ بھی لینا ہے۔ یک دم کئی باتیں اچانک ہو گئیں۔ اور سب کی سب انتہائی خوفناک۔ کمال ہے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"شیخ صاحب۔ سب لوگ کوشش شروع کر دیں اور ہمیں پل پل کی رپورٹ دیں۔ جونہی سونے کے جہاز کی کوئی اِطلاع ملے فون پر خبر کریں۔" وزیرِ خارجہ بولے۔

"بہت بہتر سر۔" آئی جی بولے۔

وزراءِ صاحبان چلے گئے تو انسپکٹر جمشید، پروفیسر داؤد کو ساتھ لے کر اپنے دفتر کی طرف لپکے، عین اسی وقت خان رحمان دفتر کے دروازے پر پہنچے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئے:

"ہائیں۔ خان رحمان۔ تم۔ تم لوگ اب پہنچے ہو۔ جب کہ تمھیں تو بہت پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

"ہاں۔ واقعی۔ لیکن صرف میں پیچھے رہ گیا تھا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ توکب کے یہاں آ چکے ہیں۔ اور یہ پروفیسر صاحب کیوں تمھارے ساتھ نظر آ رہے ہیں؟"

"ایک انتہائی سنگین معاملہ ہے خان رحمان۔ آؤ اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

تینوں اندر داخل ہوئے، لیکن وہاں صرف اکرام کو بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گئے:

"کیوں۔ تینوں کہاں چل دیے۔"

"اُنھوں نے دونوں لاشوں کو دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ مجبوراً

مجھے دکھانا پڑا۔ لاشوں کے معائنے کے بعد وہ ان کے گھر والوں سے ملنے چلے گئے ۔ ان کا کہنا تھا کہ دفتر میں بیٹھ کر وقت کیوں ضائع کیا جائے۔" اکرام نے بتایا۔

"ہوں! چلئے تو خیر وہ بیٹھ ہی نہیں سکتے۔ آؤ ۔ ذرا میں بھی لاشوں کو ایک نظر دیکھ لوں۔"

"چلیے۔" اکرام بولا۔

وہ جب لاشوں والے کمرے میں آئے ۔ ان کی ناکوں کی نوکیں اب پہلے سے بھی زیادہ سُرخ نظر آ رہی تھیں۔ انسپکٹر جمشید چونک اُٹھے:

"یہ تو کوئی عجیب زہر معلوم ہوتا ہے ۔ اس [illegible] میں بھی سراغ لگانا پڑے گا ۔ ان کیپسولوں میں یہ زہر [illegible] سے آگیا ۔" وہ بڑ بڑائے۔

"تو پھر زہروں کے ماہر ڈاکٹر تنویر نیازی سے بات [illegible] ۔ وہ فوری طور پر بتا دیں گے۔" پروفیسر داؤد فوراً بولے۔

"کیا آپ کے ان سے دوستانہ تعلقات ہیں؟" [illegible] جمشید بولے ۔

"نہیں ۔ مجھے تو بس یہ بات معلوم ہے کہ وہ زہروں کے ماہر ہیں ۔ اور ایسے ویسے ماہر نہیں ۔ بہت بڑے ماہر ہیں۔"

"تب تو انہیں ضرور فون کرنا چاہیے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"زہروں کے بارے میں تو اپنے منور علی خان بھی بتا سکتے تھے، لیکن وہ تو اس وقت نہ جانے کہاں ہوں گے۔" خان رحمان بڑ بڑائے۔

ڈائریکٹری میں دیکھ کر ڈاکٹر تنویر نیازی کے نمبر ڈائل کیے گئے۔ دوسری طرف سے فوراً آواز سنائی دی:

"ہیلو۔ ڈاکٹر احسان بھٹہ بول رہا ہوں۔ فرمائیے۔ آپ کون صاحب ہیں؟"

"ذرا ڈاکٹر تنویر نیازی سے ملوا دیجیے۔" انھوں نے اپنا پورا تعارف کرانے کے بعد کہا۔

"وہ تو اس وقت دفتر میں نہیں ہیں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"آپ کی تعریف۔"

"میں ان کا ساتھی ڈاکٹر ہوں۔"

"شکریہ۔ تو پھر مہربانی فرما کر آپ ہی یہاں آ جائیں۔ ایک بہت اہم کام ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"ڈاکٹر تنویر نیازی تو ملے نہیں۔ احسان بھٹہ آ رہے ہیں۔" وہ ریسیور رکھ کر بولے۔

"وہ بے چارہ کیا بتا سکے گا۔" پروفیسر بڑ بڑائے۔

" تب پھر ہمیں تنویر نیازی کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اور اتنا وقت ہمارے پاس ہے نہیں ۔"

" اوہ — پھر کیا کیا جائے ؟"

" خیر۔ دیکھتے ہیں ۔"

دس منٹ بعد ایک نوجوان ڈاکٹر اندر داخل ہوا ،

" مجھے احسان بھٹہ کہتے ہیں ۔"

" شکریہ — ذرا ان دو لاشوں کو دیکھیے ۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ انھیں کون سا زہر دیا گیا ہے ؟"

" جی ۔ بہتر ۔" یہ کہہ کر احسان بھٹہ لاشوں کی طرف مُڑا — انسپکٹر جمشید اس کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ انھوں نے محسوس کیا۔ دونوں لاشوں کو دیکھ کر احسان بھٹہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے ہیں —

" خیر تو ہے ۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ۔"

" جج — جی — جی ہاں — میں بالکل ۔"

اس کے الفاظ درمیان میں رہ گئے — سب نے مڑ کر دیکھا — اسی وقت ایک جملہ کسی نے کہا تھا :

" ڈاکٹر بھٹہ ، آپ یہاں کیا کر رہے ہیں — ویسے یہ آپ نے اچھا کیا کہ چٹ لکھ کر چھوڑ آئے تھے ۔"

ڈاکٹر احسان بھٹہ آواز سُن کر جلدی سے مڑا اور بولا :

" اوہو — نیازی صاحب — یہ آپ ہیں — اچھا ہی ہوا سر۔ آپ آ گئے — انسپکٹر صاحب ان لاشوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں کہ انھیں کون سا زہر دیا گیا ہے ۔"

" ٹھیک ہے — آپ لیبارٹری چلیے — آپ کی وہاں موجودگی ضروری ہے — ان لاشوں کو میں دیکھ لوں گا ۔"

" او کے سر ۔" احسان بھٹہ نے کہا اور اپنا بیگ اُٹھا کر چلا گیا۔ اب تنویر نیازی نے لاشوں کو دیکھا۔ دیکھتے ہی وہ زور سے اُچھلا — پھر اس کے چہرے پر حیرت اور خوف کے آثار اُبھرے، اس نے کانپتی آواز میں کہا :

" اف خدا — یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں ؟"

" جی — کیا دیکھ رہے ہیں ؟" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے ۔

" ان کی موت سمندر کے ایک سانپ کے زہر سے ہوئی ہے ، ایک انتہائی زہریلے سانپ کے زہر سے — اس کے زہر کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ ناک کی صرف نوک خون کے رنگ کی ہو جاتی ہے — باقی جسم نیلا پڑ جاتا ہے — وہ بھی چند گھنٹوں کے لیے — اس کے بعد جسم پانی بننے لگ جاتا ہے — بہتر ہو گا ، آپ فوری طور پر ان لاشوں کو ٹھکانے لگوا دیں — اگر یہ یہیں پانی بن گئیں تو بہت دشواری ہو گی — اس پانی کو صاف کرنے والے بھی زہر کا شکار ہو سکتے ہیں — ان جسموں کو اُٹھوانے

کے لیے بھی خاص انتظام کرنا پڑے گا، کیونکہ جسم اس وقت تک بالکل گل سڑ چکے ہیں — سالم جسم کا اٹھوایا جانا بہت مشکل کام ثابت ہوگا۔ اور کچھ دیر بعد تو بالکل ناممکن ہو جائے گا۔ لہذا بہتر ہو گا۔ پہلے ان لاشوں کو یہاں سے ہٹوانے کا انتظام کریں۔ مجھ سے جو کچھ معلوم کرنا ہو، میری لیبارٹری آکر کر لیجیے گا۔" ڈاکٹر نیازی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ان لاشوں کو دیکھ کر ڈر گئے ہوں۔

"بہت بہتر۔ آپ تشریف لے جائیے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

ڈاکٹر نیازی چلا گیا۔ انسپکٹر جمشید نے لاشوں کو اٹھوانے کے لیے جلدی جلدی ہدایات دیں۔ ٹھیک دس منٹ بعد وہاں رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ انسپکٹر جمشید نے جلدی سے ریسیور اٹھایا اور بولے:

"ہیلو۔ انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔"

"مم۔ میں۔ بب۔ ججھ۔ خر۔ خر۔ خر۔"

انسپکٹر جمشید اچھل پڑے۔ ان کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

فرزانہ نے جلدی جلدی نظریں دوڑائیں اور پھر جان لیا کہ نگران کا مکان کون سا ہو سکتا ہے، کیونکہ اس طرف بھی اوپر والی منزل پر ایک کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ اس کا رنگ وہی تھا جو دروازوں کا تھا۔ اور اس کھڑکی تک پانی کا ایک پائپ اُوپر جا رہا تھا۔ فرزانہ فوراً سمجھ گئی کہ محمود اور فاروق مکان میں اُتر چکے ہیں۔ اب وہ مزید انتظار نہیں کر سکتی تھی — جوتوں سمیت پائپ پر چڑھنے لگی۔ اور اس تیزی سے چڑھی کہ اگر اس وقت فاروق نیچے موجود ہوتا تو یہ ضرور کہتا:

"آج تو شاید فرزانہ میں میری رُوح حلول کر گئی ہے۔"

کھڑکی تک پہنچ کر اس نے چوکھٹ پر ہاتھ ڈال دیا، پھر دوسرا ہاتھ بھی جما دیا اور پیر پائپ پر سے ہٹا لیے — دُوسرے لمحے چوکھٹ پکڑے لٹک رہی تھی، پھر وُہ دونوں بازوؤں کے بل پر اُوپر اُٹھی اور اپنا دھڑ کھڑکی کے اندر ڈال دیا۔ آدھ منٹ بعد وُہ کمرے کے فرش پر کھڑی اپنا سانس دُرست کر رہی تھی۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ چند سیکنڈ رُک کر وُہ دروازے کی طرف بڑھی۔ باہر جھانک کر دیکھا تو ایک برآمدہ نظر آیا، برآمدے کے دُوسرے سرے پر زینہ تھا، اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ برآمدہ طے کیا اور سیڑھیاں اُترنے لگی۔ نیچے ایک کھلا صحن نظر آیا اور صحن میں

ایک عجیب منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ محمود اور فاروق بُت بنے کھڑے تھے اور صحن میں تین لاشیں موجود تھیں۔ بالکل ویسی ہی لاشیں جیسی وہ دفتر میں دیکھ چکے تھے۔ یعنی ان کے جسم نیلے پڑ چکے تھے، لیکن نوک کے پاس سے ناک کے حصے سُرخ تھے۔ بالکل خون کی مانند سُرخ۔

"اُف خدا، پھر وہی زہر۔" فرزانہ بڑبڑائی۔ اس کی آواز سُن کر محمود اور فاروق چونکے۔

"تو تم بھی آگئیں۔" محمود نے کہا۔

"کیا قاتل بھاگ نکلا۔"

"کم از کم ہم نے اسے بھاگتے نہیں دیکھا۔"

"اوہ۔ تب تو۔ وہ ابھی اندر ہی ہو سکتا ہے۔" فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں! ضرور ہو سکتا ہے، لیکن اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ وہ اکیلا ہے اور ہم تین۔ بھلا ہمارا کیا بگاڑے گا۔"

"وہ اس وقت تک پانچ چھے افراد کو ٹھکانے لگا چکا ہے۔ اس پر خون سوار ہے۔ ہمیں اس سے بچنے کا انتظام کر لینا چاہیے۔" فرزانہ بولی۔

"تم شاید اب حساب میں بھی کمزور ہو چلی ہو۔ یہاں صرف تین لاشیں موجود ہیں۔ پانچ چھے نہیں۔"

"میں الجبرے میں ضرور کمزور ہوں۔ حساب میں نہیں، تم بھلا کس طرح کہہ سکتے ہو کہ قاتل پہلے انچارج کے گھر نہیں گیا ہو گا۔"

"اوہ۔ ہاں۔ واقعی۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔"

"لیکن اب تم لوگوں کو دیر ہو چکی ہے۔ بچنے کا انتظام کرنا اب ممکن نہیں رہا۔"

ایک سرد آواز اُبھری۔ انھیں اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے، کیونکہ اس قدر سرد لہجہ انھوں نے کبھی کا نہیں سنا تھا۔ نظریں اُٹھائیں تو سامنے ایک عجیب سا آدمی کھڑا نظر آیا، وہ کانپ اُٹھے۔ اتنا عجیب آدمی بھی انھوں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بالکل سُرخ تھیں۔ یوں جیسے دہکتے انگارے ہوں۔ باقی جسم کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ قد اور قامت کے لحاظ سے وہ کسی دیو سے کم نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عجیب سا ہتھیار تھا۔ پستول نما ہتھیار۔ لیکن وہ اُسے پستول کسی طرح بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ البتہ اس نے اسے پکڑ پستول کی طرح رکھا تھا۔ اور اس کی ننھی سی نالی کا رُخ ان کی طرف تھا۔

وہ ساکت رہ گئے۔ چند لمحے تک وہ ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ وہ سُرخ سُرخ آنکھیں انھیں دل و دماغ میں اُترتی محسوس

ہوئیں۔ اچانک اس کی آواز اُبھری:

" تم بھی ان لاشوں جیسی لاشوں میں تبدیل ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

" ٹھٹھ ۔ ٹھہرو بھائی ۔ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے ۔ ذرا دکھانا تو ۔ ایسا کھلونا میں نے تو آج تک دیکھا نہیں ۔" فاروق بول اٹھا۔

" تم ۔ تم اسے کھلونا کہہ رہے ہو ۔ ہاں ٹھیک تو ہے ۔ یہ کھلونا ہی تو ہے ۔ لیکن ۔ ہے ذرا موت کا کھلونا ۔"

" ارے باپ رے ۔ موت کا کھلونا ۔ یہ ۔ یہ تو ۔ یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے ۔"

" کیا کہا ۔ ناول کا نام ۔ یہاں ناول کا ذکر کہاں سے نکل آیا ۔" اس نے بُرا سا منہ بنایا۔

" چھوڑیے اس کی باتوں کو ۔ آپ پہلے اپنا تعارف تو کرائیے، آخر آپ ہیں کون ؟"

" اوہ سمجھا ۔" وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا: " تم مجھے باتوں میں لگانا چاہتے ہو ۔ باتوں میں لگا کر چکر دینا چاہتے ہو ، لیکن یہ ناممکن ہے ۔ تم مجھے چکر نہیں دے سکو گے ۔ ہاں ۔ میں ضرور تمہیں چکر دے جاؤں گا ، کیونکہ ۔ تم نہیں جانتے ۔ میں کون ہوں ۔ میں ٹومبو ہوں ٹومبو ۔"

" اگر تم ٹومبو بھی ہو تو بھی ہم کیا کر سکتے ہیں ، لیکن یہ کیا

تعارف ہوا ، میں ٹومبو ہوں ۔" فاروق بولا۔

" اپنے باس کا غلام ۔ زندگی میں پہلی مرتبہ تو اس نے مجھے کھلی فضا میں نکلنے کی اجازت دی ہے ۔ ورنہ جب سے پیدا ہوا ہوں ۔ اس نے مجھے تہہ خانے میں ہی رکھا ہے ۔"

" اور تمہارا باس کون ہے ؟"

" اے ۔ خبردار ۔ یہ بات ہرگز نہ پوچھنا ۔ نہ تمہیں بتا سکتا ہوں ۔ یہ ایسی بات نہیں جو بتائی جا سکے ۔ اور پھر تم تو یوں بھی ۔ دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہونے والے ہو ۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں نے ان تینوں کو سفر پر روانہ کیا ہے ۔ جس طرح اس انچارج کے بچے کے گھر والوں کو سفر پر روانہ کیا ہے اور جس طرح انچارج اور نگران کو سفر پر روانہ کیا ہے ۔" وہ شیخی کے انداز میں کہتا چلا گیا۔

" کیا مطلب ۔ انچارج اور نگران کو تم نے موت کے سفر پر روانہ کیا ہے ۔" محمود حیران ہو کر بولا۔

" ہاں ! اس میں کیا شک ہے ۔"

" لیکن انھوں نے تو کیپسول کھائے تھے ۔ زہر کے ۔" فرزانہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔

" تم لوگ غلط سمجھے ۔ اور تم ہی کیا ۔ سبھی غلط سمجھیں گے ۔ وہ کیپسول تو میرے باس نے ان لوگوں کو یہ کہہ کر دیے تھے

کہ جب کسی مصیبت میں پھنس جاؤ ۔ انھیں دانتوں تلے دبا لینا ، مجھے اطلاع ہو جائے گی ۔ ان کیپسولوں میں دراصل کچھ ایسی ریڈیائی لہریں بند ہیں جو کیپسولوں سے آزاد ہوتے ہی باس کے کمرے میں موجود آلات سے ٹکراتی ہیں اور عجیب قسم کی جھنجناہٹ سنائی دیتی ہے ۔ باس فوراً میری خدمات حاصل کرتا ہے ۔ بس میں وہاں اڑتا ہوا گیا اور انھیں اس ہتھیار کا نشانہ بنا کر چلا آیا ۔ وہ لوگ یہ سمجھے کہ وہ ان کیپسولوں کا شکار ہوئے ہیں؛ حالانکہ ان میں موت نہیں تھی ۔ اطلاع ضرور تھی ۔"

"اوہ !" وہ دھک سے رہ گئے ۔ یہ انھیں ایک نئی بات معلوم ہوئی تھی ۔

"اور تمھارا باس کون ہے ۔ وہ کیا چاہتا ہے ؟"

"باس کا نام ۔ مجھے نہیں معلوم ۔ میں تو اپنے کام سے کام رکھتا ہوں ، جو حکم ملا ، کر ڈالا ۔"

"ابھی تم نے کہا تھا ۔ اڑتے ہوئے وہاں گئے ، اس جملے کا کیا مطلب تھا ۔ کیا تم اس قدر تیز دوڑتے ہو ۔"

"نہیں ۔ میں کار میں گیا تھا ۔"

"گویا تمھارے پاس ایک عدد کار بھی ہے اور وہ یقیناً باس نے دی ہو گی ۔" محمود نے خیال ظاہر کیا ۔

"تم ایک بار پھر غلط سمجھے ۔ شاید تمھیں غلط سمجھنے کی عادت

ہے ۔ بہر حال میں بتاتا ہوں ۔ فوری طور پر اگر کوئی ٹیکسی نہ ملے تو میں سڑک پر کھڑی کوئی بھی کار لے اڑتا ہوں ۔ کار لے اڑنا میرے لیے اتنا ہی آسان ہے جتنا کسی بچّے کے لیے پتنگ اُڑانا ۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا ۔

"مطلب یہ کہ تم نے پہلے ایک کار چوری کی ۔ اس میں محکمہ سراغرسانی کی عمارت تک پہنچے ۔ کھڑکی کے ذریعے انچارج اور نگران کو نشانہ بنایا ، کیونکہ کمرے میں ان کے سروں پر پہرہ موجود تھا ۔ اور تم نشانہ بنا کر واپس آ گئے ، لیکن نہیں تو تمھارا یہ بیان بالکل غلط محسوس ہوتا ہے ۔" فرزانہ نے سوچ میں گم لہجے میں کہا ۔

"کیوں ۔ کیسے ؟" اس نے منہ بنایا ۔

"پہرے داروں کا کہنا ہے کہ انھوں نے کیپسول کھائے ، ذرا دیر کے لیے تڑپے اور مر گئے ۔ ادھر تم کہتے ہو کہ کیپسول اطلاع دینے کا ایک ذریعہ تھے ۔ اگر انھوں نے کیپسولوں کو چبا کر تمھیں اطلاع دی تھی تو پھر تو انھیں کافی دیر بعد مرنا چاہیے تھا ۔"

"ہاں ! تم لوگ بھی کم عقل نہیں ہو ۔ بات ٹھیک ہے ، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ انچارج اور نگران کو گرفتار کیے جانے کی اطلاع باس کو پہلے ہی مل چکی تھی اور انھوں نے مجھے پہلے ہی ہدایات دے دی تھیں ۔ لہٰذا میں وقت سے بہت پہلے اس کمرے کی کھڑکی تک پہنچ گیا تھا ۔ ادھر انھوں نے کیپسول منہ میں رکھے ،

اودھر میں نے اس ہتھیار سے وار کیا۔"

" ضرور ایسا ہی ہوا ہو گا، لیکن یہ ہتھیار کیا بلا ہے؟"

" زہریلی سوئیاں پھینکنے کا بہترین آلہ۔ اس کے ذریعے سوئیاں بہت دور تک پھینکی جا سکتی ہیں، اس کا فائدہ یہ ہے کہ دھماکا نہیں ہوتا۔ اور شکار چپ چپاتے دوسری دُنیا کو سدھار جاتا ہے۔"

" یہاں تک بات بالکل سمجھ میں آ گئی۔ سوال یہ ہے کہ بے چارے انچارج اور نگران کے گھر والوں نے کیا قصور کیا تھا کہ انھیں ختم کیا گیا۔" فرزانہ بولی۔

" باس نے ان سے بہت کام لیا۔ اس سلسلے میں انھیں باس کے پاس بار بار آنا جانا پڑا۔ ہو سکتا ہے، انھوں نے اپنے گھر والوں سے بھی ذکر کیا ہو۔ لہذا باس نے ان سب کو ختم کرنے کا حکم دے ڈالا۔ تاکہ کسی قسم کا خطرہ نہ رہ جائے۔ رہا میں۔ تو میرے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں کہ باس کون ہے۔"

" تب تو ہمارا یہاں آنا بے کار گیا۔ کاش ہم کچھ پہلے آ جاتے۔ اس طرح شاید ان لوگوں کو بچا لیتے۔"

" تم۔ اور انھیں بچا لیتے۔ ابھی بچے ہو۔"

" ہاں! ویسے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی موت

آ چکی تھی۔ بچائے کیسے جا سکتے تھے۔ خیر۔ اب ہمارا ایک مشورہ ہے۔" محمود نے کچھ سوچ کر کہا۔

" مشورہ۔ کیسا مشورہ۔ تم مجھے مشورہ دینے والے کون ہو؟"

" ہمارے نام محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں۔ شاید تم نے سُنے ہوں گے۔"

" ہاں! یہ نام جانے پہچانے ہیں۔ باس نے بھی خبردار کیا تھا کہ تم لوگوں سے ذرا دُور رہا جائے۔ گویا تم انسپکٹر جمشید کی اولاد ہو۔ اب میں تمھارا مشورہ ضرور سنوں گا۔" اس نے کسی قدر فکر مند ہو کر کہا۔

" مشورہ۔ بلکہ نیک مشورہ یہ ہے کہ اپنا یہ ہتھیار ہمارے حوالے کر دو اور ہمارے ساتھ نہایت شرافت سے پولیس اسٹیشن چلو۔ دراصل ہم شریف آدمیوں سے شریفانہ سلوک کرنے کے عادی ہیں۔" محمود بولا۔

" ارے جاؤ۔ تم اور مجھے پولیس اسٹیشن لے جاؤ گے۔ مانا کہ مجھے باس نے ہدایت دے رکھی ہے کہ تم لوگوں سے ذرا دُور دُور رہوں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمھارے کہنے میں آ کر خود کو پولیس کے حوالے کر دوں۔ میرا ابھی پھانسی پانے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔ جب ارادہ بن جائے، ہمیں بتا دینا۔ آؤ بھئی چلیں۔" فاروق نے دروازے کی طرف مُڑتے ہو کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو فاروق۔ دماغ تو نہیں چل گیا۔" فرزانہ نے بھنّا کر کہا۔

"ایک تو ہر وقت تمھیں میرا دماغ چلتا نظر آنے لگا ہے۔ تم اپنی نظر ٹسٹ کیوں نہیں کرا لیتیں۔" فاروق نے بُرا مان کر کہا۔

"اچھا چُپ رہو۔ دماغ نہ چاٹو۔ اس وقت مسٹر ٹومبو سے بہت اہم بات ہو رہی ہے۔ بہتر ہو گا کہ ان سے ہمیں بات کر لینے دو۔"

"بہت اچھا۔ جب تم دونوں ان سے بات چیت کر کے فارغ ہو جاؤ۔ تو مجھے اطلاع دے دینا، میں چلا، مسٹر ٹومبو، ایک عدد اطلاعی کیپسول انھیں دے دینا۔"

"کیا مطلب؟"

"اسے دانتوں میں چبا کر یہ مجھے اطلاع دے سکیں گے۔" فاروق بولا۔

"تم غلط سمجھے۔ اطلاع صرف باس تک جا سکتی ہے۔"

"اُف توبہ۔ بات کہاں سے کہاں لے گئے۔ یار تم خاموش

نہیں رہ سکتے۔" محمود نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

"ضرور کیوں نہیں۔ یہ کیا مشکل ہے۔ میرے تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" فاروق خوش ہو کر بولا۔

"دھت تیرے کی۔" محمود نے جھلّا کر ران پر ہاتھ مارا۔

"یہ تم لوگ کس بحث میں اُلجھ گئے اور یہ کیا پٹاپٹی ہو رہی ہے۔"

"پٹاپٹی نہیں۔ یہ ران پر ہاتھ مارا جا رہا ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"ہم یہ کہہ رہے تھے کہ اپنا ہتھیار ہمارے حوالے کر دو، تاکہ ہم تمھیں پولیس اسٹیشن لے جا سکیں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے تو یہ کہیں آسان ہے کہ میں تم لوگوں کی طرف بھی تین سوئیاں داغ دوں ۔۔ اور یہاں سے چلتا بنوں۔"

"مسٹر ٹومبو۔ یہ اس قدر آسان نہیں ہو گا۔ تم شاید باس کی ہدایت بھول گئے۔" فرزانہ غرّائی۔

"اچھی طرح یاد ہے، لیکن میں خود کو پولیس کے حوالے کس طرح کر دوں۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ تم لوگ میرا راستہ چھوڑ دو اور میں تمھیں ہلاک کیے بغیر یہاں سے نکل جاؤں۔ اس طرح تمھاری جانیں بچ جائیں گی اور میں باس کی ہدایت پر عمل بھی

کر سکوں گا۔"

"افسوس! یہ صورت ہمیں منظور نہیں، کیونکہ ایک خوفناک قاتل، ایک دو آدمیوں کا نہیں، کئی آدمیوں کا، ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہو اور ہم اسے فرار ہونے کی اجازت بھی دے دیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔" محمود نے سینہ تان کر کہا۔

"تو پھر آؤ۔ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کی اُنگلی نے حرکت کی۔ نالی کی بالکل سیدھ میں اس وقت محمود تھا۔ اس نے بلا کی رفتار سے ایک اونچی چھلانگ لگائی، ساتھ ہی فاروق اور فرزانہ دائیں بائیں لوٹ لگا گئے، اتنی دیر میں ہی ٹومبو آلے کی نالی کا رُخ فاروق کی طرف کر چکا تھا۔ فاروق نے خطرے کو بروقت بھانپا اور لڑھکنے کی رفتار یک دم تیز کر دی۔ پھر اٹھا، اسی وقت ٹومبو نے ٹریگر دبایا۔ فاروق غوطہ لگا گیا، وار پھر خالی گیا۔

"فرش پر گرنے والی سوئیوں سے بھی خود کو بچانا ہے۔" فرزانہ چلائی۔

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی نالی کا رُخ اس کی طرف ہو گیا۔ وہ اس وقت تک فرش سے اُٹھ چکی تھی۔ جونہی ٹریگر دبا۔ وہ بلا کی رفتار سے جھکی۔ منہ ٹومبو کی طرف تھا، جھکتے ہی ٹومبو کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اور سیدھی اس کی ٹانگوں سے ٹکرائی۔ ٹومبو اس دھکے کے لیے پہلے سے تیار نہیں تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان میں سے کوئی اس کی طرف بڑھ آنے کی ہمت بھی کر سکتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ دھکا لگتے ہی آگے کی طرف جھکا۔ ادھر فاروق اس وقت تک اس کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ موقع پا کر اس نے ایک دو ہتھڑ اس کی کمر پر دیا۔ وہ پہلے ہی جھکا ہوا تھا۔ منہ کے بل گرا۔ فرزانہ کے عین اوپر گرتا، لیکن اس سے پہلے ہی فرزانہ دائیں طرف سرک چکی تھی۔ بس پھر کیا تھا۔ محمود نے اس کی طرف چھلانگ لگا دی اور آلے والے ہاتھ پر دائیں پیر کی ایک زور دار ٹھوکر رسید کر دی۔ آلہ ٹومبو کے ہاتھ سے نکل گیا۔ فاروق آلے کی طرف لڑھکتا چلا گیا، اسے اٹھاتے ہوئے سیدھا کھڑا ہو گیا اور چہکتی آواز میں بولا:

"تمہارے باس نے ٹھیک ہی کہا تھا مسٹر ٹومبو، لیکن افسوس! تم نے باس کی ہدایت پر عمل نہ کیا اور ہمارے نزدیک آ گئے۔ نہ صرف نزدیک آ گئے۔ بلکہ ہم سے ٹکرا بھی گئے۔ اب دیکھو نا۔ تم ہماری زد پر ہو۔ اور تمہارا انجام بھی بالکل وہی ہو سکتا ہے، جو اس وقت تک تم چھ سات لوگوں کا کر چکے ہو۔"

"یہ صرف تمہارا خیال ہے۔" ٹومبو ہنسا۔

"کیا مطلب ۔ ہمارا خیال ہے ۔ تو تمہارا خیال کیا ہے؟" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"میں نے باس کی ہدایت کی خلاف ورزی ہر گز نہیں کی۔ تم لوگ اچانک میرے سامنے آ گئے تھے۔ میں نے تو کہا تھا کہ مجھے نکل جانے دیا جائے، لیکن تم نے نہیں مانا ۔ ان حالات میں مَیں کیا کر سکتا تھا؟"

"خیر۔ اب کیا خیال ہے۔ پولیس اسٹیشن چلنے کے بارے میں؟"

"میرا ایسا کوئی پروگرام ۔ یہ آلہ تمھیں مبارک ۔ جب تمھارے پاس سوئیاں ہی نہیں، تو آلہ کس کام آئے گا ۔ یہ لو، میں چلا۔"

یہ کہہ کر ٹومبو نے قدم اٹھا دیے۔

"ارے ارے ۔ یہ کیا مسٹر ٹومبو ۔ کیا تم بھول گئے۔ کہ میرے ہاتھ میں خود تمھارا ہتھیار موجود ہے۔"

"اسی لیے تو بے فکر ہو کر جا رہا ہوں، اگر تمھارے ہاتھ میں تمھارا ہتھیار ہوتا تو ضرور میں رک جاتا۔" یہ کہتے وقت وہ کھڑکی تک پہنچ گیا۔

"تو پھر یہ لو۔" یہ کہتے ہوئے فاروق نے ٹریگر دبا دیا۔

نالی میں سے ایک سوئی نکلتے انھوں نے صاف دیکھی — سوئی تیر کی طرح ٹومبو کی کمر کی طرف گئی اور آنکھوں سے اوجھل ہو گئی —

"ارے باپ رے ۔ چیونٹی سی کاٹ گئی کمر میں۔" ٹومبو نے کہا اور کھڑکی کھولتے ہی باہر کی طرف چھلانگ لگا دی۔

"ارے ارے ۔ مسٹر ٹومبو ۔ اطلاعاً عرض ہے کہ تمھاری کمر میں زہریلی سوئی لگ چکی ہے۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"کیا یہ بے تکی ہانک رہے ہو۔" محمود یہ کہتے ہوئے باہر کی طرف دوڑا، لیکن جب تک وہ کھڑکی سے باہر نکلتا۔ ٹومبو کہیں کا کہیں پہنچ چکا تھا ۔ وہ سرپٹ دوڑا جا رہا تھا ۔

اب کیا ہو گا

"خیر تو ہے جمشید — کیا کوئی بُری خبر سُنی ہے؟" خان رحمان نے پریشان ہو کر کہا۔

"ہیلو — ہیلو — اپنا نام بتائیے — جلدی — کوشش کریں — آپ کون ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں۔

دُوسری طرف سے پھر خرخر کی آواز سنائی دی اور پھر انھیں یوں محسوس ہوا جیسے ریسیور پٹخ کر رکھ دیا گیا ہو — انھوں نے بھی تھکے تھکے انداز میں ریسیور رکھ دیا:

"کسی شخص کو قتل کر دیا گیا ہے خان رحمان — اپنے قتل سے پہلے وُہ بے چارہ مجھے فون کر رہا تھا — ابھی اس نے ہیلو ہی کہا تھا کہ اس پر وار ہو گیا — اور وُہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔"

"اُف خدا — نہ جانے شہر میں یہ واردات کہاں ہوئی ہو گی۔" پروفیسر داؤد کانپ کر بولے۔

"جی ہاں! خیر — میں کوشش کرتا ہوں — شاید کچھ معلوم ہو جائے۔"

یہ کہہ کر اُنھوں نے ٹیلیفون ایکسچینج کے دفتر سے رابطہ قائم کیا اور تعارف کرانے کے بعد بولے:

"ابھی ابھی — اس نمبر پر مجھ سے کسی نے بات کرنے کی کوشش کی ہے — میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کس نمبر سے بات کی گئی ہے۔"

"چند منٹ انتظار کیجیے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

انسپکٹر جمشید ریسیور کان سے لگائے بیٹھے رہے — خان رحمان، پروفیسر داؤد اور سب انسپکٹر اکرام ٹکر ٹکر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"نہ جانے بیٹھے بٹھائے یہ کیا شروع ہو گیا؟"

"اتنی بڑی واردات ہمارے مُلک میں پہلے کبھی نہیں ہوئی، اگر سونے کے جہاز کی گم شُدگی والی خبر بھی درست ثابت ہو گئی تو پھر شاید یہ اس سال کی سب سے بڑی واردات ہو گی۔"

انسپکٹر جمشید بڑبڑائے — اسی وقت دوسری طرف سے کہا گیا:

"ہیلو انسپکٹر صاحب — ہمیں افسوس ہے — کچھ معلوم نہیں ہو سکا —"

"خیر — کوئی بات نہیں۔" انھوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"سمندر میں پائے جانے والے ایک زہریلے سانپ کا زہر ان لوگوں کے پاس کہاں سے آ گیا — یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"دوسرے یہ کہ انچارج اور نگران دونوں غدار تو خیر ہو گئے

تھے۔ اتنا بڑا کام کیسے کر گزرے۔"

" کام انھوں نے اکیلے نہیں کیا۔ ضرور کچھ دوسرے لوگوں نے ان کا ساتھ دیا ہوگا اور وہ وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے ان دونوں کو غداری پر آمادہ کیا۔" انسپکٹر جمشید بولے، پھر یکایک اُچھلے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ چہرہ تمتما اُٹھا:

" اُف خدا۔ اس پہلو پر تو میں نے غور کیا ہی نہیں۔" وہ بڑبڑائے۔

" کس پہلو پر جمشید۔ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ۔" پروفیسر داؤد اُلجھ کر بولے۔

" یہ کمرہ اس دفتر کا ایک عام کمرہ ہے۔ کسی کا خاص کمرہ نہیں ہے۔ یہاں ہر شخص آ کر بیٹھ سکتا ہے، دفتر کا کوئی ایسا کام کاج کر سکتا ہے جو دوسروں کے سامنے کرنا پسند نہ کرتا ہو۔ مثلاً ملاقاتیوں کے سامنے۔ دفتر کے لوگوں کی سہولت کے لیے یہاں فون بھی موجود ہے۔ اس فون کا دوسرے ٹیلیفون سیٹوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا نمبر بھی بالکل الگ ہے۔ اس فون سے یہاں بیٹھنے والے عام طور پر فون تو ضرور کرتے رہتے ہیں، لیکن اس نمبر پر کسی کا فون کرنا ایک بہت ہی عجیب سی بات ہے۔ آخر فون کرنے والے کو کس طرح معلوم تھا کہ اس وقت میں اس نمبر پر موجود ہوں۔"

" اوہ۔ اوہ۔ واقعی جمشید۔ یہ تو تم نے ایک بہت ہی عجیب بات کہی۔" خان رحمان چونک کر بولے۔

" ہاں! میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی یہاں آیا ہوں۔ اس سے پہلے چند سیکنڈ کے لیے اپنے کمرے میں گیا تھا۔ اور اس سے پہلے میٹنگ روم میں تھا۔ تب۔ کیا جس شخص نے مجھے فون کیا، وہ دفتر میں ہی کسی کمرے میں موجود ہے۔ اور وہ مجھے اس کمرے میں داخل ہوتے دیکھ چکا تھا۔"

" کیا۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کا مطلب ہے۔ دفتر کی عمارت میں ایک اور شخص کو قتل کیا جا چکا ہے۔"

" ہاں! اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔"

" تب تو ہمیں مقتول کی تلاش شروع کر دینی چاہیئے۔" اکرام نے بوکھلا کر اُٹھتے ہوئے کہا۔

" ٹھیک ہے۔ تم جاؤ اور سب ماتحتوں کو تلاش پر لگا دو۔" انھوں نے کہا اور کچھ سوچ کر پھر فون کا ریسیور اٹھایا۔ شیخ صاحب کے نمبر ڈائل کیے اور بولے:

" ہیلو سر! جمشید عرض کر رہا ہوں۔ سونے کے جہاز کے بارے میں کوئی اطلاع ملی یا نہیں؟"

" ابھی تک نہیں۔ اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، لیکن کامیابی نہیں ہو رہی۔ آخری اطلاعات کے مطابق

سونے کا جہاز اپنے مُلک کی سمندری حدود سے ابھی تقریباً ایک ہزار
کلو میٹر دُور ہے ؛ بہر حال جو کچھ کیا جا سکتا ہے ، کیا جا رہا ہے،
دوست مُلک چمپان کو بھی خبردار کر دیا گیا ہے ۔ کہ سونے کا
جہاز لاپتا ہونے کی اِطلاع مِلی ہے ۔ وُہ اپنی طرف سے سراغ
لگانے کی کوشش کریں گے ۔ صرف دو گھنٹے تک جہاز کے بارے
میں حقیقت معلوم کر لی جائے گی ۔"

" دو گھنٹے تک ۔ اُف خُدا ۔ دو گھنٹے تو بہت ہوتے ہیں سر!
ایک گھنٹے میں تو نہ جانے کیا کچھ ہو جائے ۔"

" اس سے پہلے کچھ معلوم ہونے کے امکانات بہت کم ہیں۔"

" ہُوں ۔ خیر ۔ میں اِطلاع ملنے کا انتظار کروں گا ۔"

" اور ۔ دفتر کے ریکارڈ کے بارے میں کیا ہو رہا ہے ؟"

" معاملات حیرت انگیز ہیں ۔ ان لوگوں کو ایک ایسے زہر
سے ہلاک کیا گیا ہے جو سمندر کے ایک خاص سانپ میں پایا جاتا
ہے ۔ زہروں کے ماہر تنویر نیازی نے یہ بات بتائی ہے ۔
اس سلسلے میں ابھی مزید تفتیش کی ضرورت ہے ۔ میں تھوڑی دیر
بعد تنویر نیازی صاحب کے ہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں ۔
کیونکہ مجرم وہ لوگ ہیں جنھوں نے انچارج اور نگران کو زہر کے
کیپسول دیئے تھے ۔"

" لیکن جمشید ۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ریکارڈ کی گم شدگی کا

تعلق ان لوگوں سے ہو ۔ سونے کے جہاز کی گم شدگی میں تو ان
کا ہاتھ نہیں ہو سکتا ۔" آئی جی بولے ۔

" یس سر ۔ ہم ایسی کوئی وجہ بھی تو نہیں پاتے جس کی
روشنی میں یہ خیال کیا جائے کہ دونوں وارداتیں ایک ہی سلسلے
کی کڑی ہیں ۔"

" اچھا خیر ۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تھوڑی دیر پہلے
ہی صدر صاحب کا فون مِلا ہے ۔ وُہ بہت پریشان ہیں ۔
ریکارڈ کی گم شدگی ایک بہت بھیانک معاملہ ہے ۔ اور سونے
کے جہاز کی گم شدگی بھی کوئی چھوٹی بات نہیں ہے ۔ دوست مُلک
چمپان نے یہ سونا خفیہ طور پر ہمیں دیا تھا ۔ تاکہ ہم اپنے وسائل
پر قابو پا سکیں ، لیکن اب ایسا ہوتا نظر نہیں آتا ۔ چمپان کی حکومت
کو جب معلوم ہوگا کہ جہاز راستے میں سے ہی گم ہو گیا ہے تو
وُہ کیا خیال کرے گی ۔"

" لیکن سر ۔ اس میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں ۔"

" ٹھیک ہے ، لیکن بہر حال نقصان دونوں مُلکوں کا ہوا ہے ۔"

" تو کیا آپ کو بھی یقین آ چلا ہے کہ جہاز واقعی گم ہو چکا
ہے ۔"

" سمندری طوفانوں کا کیا پتا ۔ ہو سکتا ہے ۔ سمندر میں کوئی
بڑا طوفان آیا ہو ۔ اور اس طوفان نے اس جہاز کو نگل لیا

ہوئے۔

"اللہ اپنا رحم فرمائے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ دوسری طرف سے ریسیور رکھے جانے کے بعد وہ خان رحمان کی طرف مڑے:

"خان رحمان — میں بہت بے چینی محسوس کر رہا ہوں — اس کمرے میں بیٹھے رہ کر یہ بے چینی دور نہیں ہو سکے گی — لہذا میں نے سوچا ہے — ذرا تنویر نیازی سے مل آؤں — تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو گے یا یہیں ٹھہرنا — پروفیسر صاحب کو تو میں تکلیف دینا پسند نہیں کروں گا — ایجاد کے فارمولے کی گمشدگی نے انہیں پہلے ہی پریشان کر رکھا ہے۔"

"ہاں جمشید — یہ تو ٹھیک ہے۔" پروفیسر بولے۔

"میں تمہارا ساتھ دوں گا جمشید — چلو۔" خان رحمان اٹھتے ہوئے بولے۔

"تو پھر میں تمہارے دفتر میں چلتا ہوں — وہیں بیٹھوں گا۔"

"آپ پسند کریں تو تجربہ گاہ چلے جائیں۔"

"نہیں — جب تک ریکارڈ اور جہاز کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو جاتا، میرا گھر جانے کو دل نہیں چاہے گا۔" وہ بولے۔

"اچھا خیر — جیسے آپ کی مرضی۔" وہ بولے۔

دونوں باہر نکل کر جیپ میں بیٹھے اور ڈاکٹر تنویر نیازی کی لیبارٹری پہنچے — ڈاکٹر نیازی نے ان کا استقبال بہت گرم جوشی

سے کیا اور بولا:

"معاف کیجیے گا — میں اس کمرے میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرا — دراصل یہ زہر سانس کے ذریعے بھی انسانی خون میں شامل ہو جاتا ہے۔"

"اوہو — پھر تو یہ بات آپ کو ہمیں بھی بتا دینی چاہیے تھی۔" انسپکٹر جمشید چونک اٹھے۔

"بس گھبراہٹ میں نہیں بتا سکا۔"

"اس سانپ کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں آپ؟" انسپکٹر جمشید بولے — ڈاکٹر تنویر نیازی انہیں ڈرائنگ روم کی طرز پر سجے ایک کمرے میں لے آیا تھا اور اب وہ صوفے پر بیٹھے تھے — تنویر نیازی ان کے بالکل سامنے تھا۔

"ضرور کیوں نہیں — سمندر سے باہر یہ سانپ کہیں بھی نہیں ملتا — عام طور پر پانی کے اندر ہی رہتا ہے، کبھی کبھی سطح پر بھی آ جاتا ہے، اس سانپ کی رفتار انتہائی تیز ہوتی ہے — اسے پکڑنا حد درجے مشکل اور انتہائی خطرناک ہے — یوں بھی یہ گروہوں کی صورت میں رہتے ہیں — سمندر میں جہاں کہیں ایک سانپ نظر آ جائے — وہاں صرف ایک نہیں سیکڑوں سانپ موجود ہوں گے — عام طور پر غوطہ خوروں کی ان سے ملاقات ہو جاتی ہے، لیکن چونکہ غوطہ خور غوطہ خوری کے لباس میں ہوتا ہے، اس

لیے ڈنک سے محفوظ رہتا ہے۔"

"ہوں! سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس اس سانپ کا زہر کہاں سے آگیا؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بھلا اس سلسلے میں مَیں کیا بتا سکتا ہوں۔ احسان بھٹہ شاید کچھ بتا سکے۔ اس نے اس زہر پر کافی کام کیا ہے اور ذاتی طور پر بھی دلچسپی لیتا رہا ہے۔"

"ویری گڈ۔ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔" اُنھوں نے خوش ہو کر کہا۔

"میں اسے یہیں بلاتا ہوں۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر نیازی نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ فوراً ہی ایک مُلازم اندر داخل ہُوا:

"نومان۔ ڈاکٹر بھٹہ کو بُلا لاؤ۔"

"او کے سر!" اس نے کہا اور ایڑیوں پر گھوم گیا۔

وُہ انتظار کرنے لگے۔ ایک منٹ بعد ہی نومان اندر داخل ہُوا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار ظاہر تھے:

"سر۔ ڈاکٹر بھٹہ صاحب تو اپنی سیٹ پر نہیں ہیں۔"

"ارے۔ وُہ کہاں چلے گئے؟"

"جی۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"تم نے انھیں کب سے نہیں دیکھا؟"

"محکمہ سراغرسانی کے دفتر جاتے وقت تو میں نے انھیں

دیکھا تھا۔ اس کے بعد نہیں دیکھا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ وہاں سے تو اسے میں نے فوراً ہی واپس بھیج دیا تھا۔ گویا اسے تو مجھ سے پہلے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا، پھر وُہ اب تک کیوں نہیں پہنچا؟"

"میرا تو یہی خیال تھا کہ وُہ واپس آکر اپنے کمرے میں کام میں مصروف ہو گئے ہوں گے۔" نومان نے پریشان آواز میں کہا۔

"آئیے۔ ذرا ان کے کمرے کا جائزہ لے لیں۔ ہو سکتا ہے۔ وہ پھر کوئی چٹ رکھ گئے ہوں۔"

"چلیے۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ میں کچھ گھبراہٹ سی محسوس کر رہا ہوں۔" ڈاکٹر نیازی نے کہا۔

"فکر نہ کریں۔ ہم انھیں تلاش کریں گے۔"

وُہ ایک دُوسرے کمرے میں آئے۔ الماریوں میں زہروں کی شیشیاں قرینے سے رکھی تھیں اور دو الماریاں کتابوں سے بھری پڑی تھیں۔ یہی کچھ وہ ڈاکٹر نیازی کے کمرے میں دیکھ چکے تھے۔ انھوں نے پورے کمرے پر ایک نظر ڈالی، کمرے کی ہر چیز ترتیب سے رکھی تھی۔ کہیں کوئی بے ترتیبی نہیں تھی۔ اب انھوں نے ایک ایک چیز کو غور سے دیکھا، لیکن کوئی خاص بات نظر نہ آ سکی۔ انسپکٹر جمشید کو نہ جانے

کیا سوجھی کہ ڈاکٹر احسان بھٹہ کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور سوچ
میں گم ہو گئے۔ پھر ان کا ہاتھ میز پر رکھے فون کی
طرف بڑھ گیا۔
"ڈاکٹر صاحب۔ کیا میں ایک فون کر سکتا ہوں؟"
"دس فون کیجیے۔ یہ بھی کوئی اجازت لینے کی بات ہے۔"
"اجازت لینے کی بات تو خیر ہے۔ دوسرے کی چیز کو اس
کی اجازت کے بغیر استعمال کرنے کی اسلام ہمیں اجازت نہیں
دیتا۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے کسی کے نمبر ڈائل کیے۔ اور
سلسلہ ملنے پر بولے:
"ہیلو۔ انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔ دفتر سے کوئی اور مقتول
ملا یا نہیں؟"
"جی نہیں۔" دوسری طرف سے اکرام نے کہا۔
"کیا پوری عمارت کو اچھی طرح دیکھ لیا گیا؟"
"جی ہاں۔ پوری طرح دیکھا جا چکا ہے۔ کہیں بھی کسی
گڑبڑ کے آثار نظر نہیں آئے۔"
"اچھا خیر۔ ڈاکٹر تنویر نیازی کے اسسٹنٹ ڈاکٹر احسان بھٹہ
بھی غائب ہیں۔ ان کی تلاش بھی شروع کرا دو۔ تم انھیں دفتر
کے کمرے میں دیکھ ہی چکے ہو۔"
"جی۔ جی ہاں۔ لیکن وہ کہاں غائب ہو گئے؟" اکرام کے

لہجے میں حیرت تھی۔
"اگر یہ بات معلوم ہوتی تو انھیں تلاش کرانے کی ضرورت
ہی کیا تھی۔"
"اوہ ہاں۔ سوری سر۔ میں ابھی تلاش شروع کراتا ہوں۔"
اکرام نے کہا اور انھوں نے ریسیور رکھ دیا، پھر جیب سے نوٹ
بک نکال کر اس میں کچھ لکھا۔ نوٹ بک کو جیب میں رکھا
اور اٹھتے ہوئے بولے:
"حالات اور واقعات انتہائی عجیب و غریب ہیں۔ کچھ سمجھ
میں نہیں آرہا کہ ہو کیا رہا ہے۔ آپ کو بھی تکلیف دی۔ امید
ہے، معاف فرمائیں گے۔"
"کوئی بات نہیں جناب، قانون کی مدد کرنا تو ہر شہری کا
فرض ہے۔"
دونوں باہر نکل کر جیپ میں بیٹھے۔ ابھی چند منٹ ہی
چلے ہوں گے کہ ایک پبلک فون بوتھ کے سامنے انسپکٹر جمشید
نے جیپ روک لی:
"اب کیا ہوا؟" خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔
"ایک فون کروں گا۔"
"تو وہیں کیوں نہ کر لیا۔ میرا مطلب ہے۔ ڈاکٹر بھٹہ کے
کمرے میں۔" وہ بولے۔

" ہاں - تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔ دراصل حالات ہی ایسے ہیں، عقل کام نہیں کر رہی -" وہ بولے اور جیپ سے اُتر کر فون بوتھ کی طرف چلے گئے - پانچ منٹ بعد ان کی واپسی ہوئی :

" بڑا لمبا فون کیا " خان رحمان کے لہجے میں حیرت تھی۔

" ہاں ! واقعی فون لمبا ہو گیا "

" یار تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو " خان رحمان بولے۔

" میں یہ نہیں کہوں گا خان رحمان کہ تمہارا اندازہ غلط ہے " وہ مسکرائے۔

" تو پھر بتاؤ - کیا چھپایا جا رہا ہے ؟"

" ابھی ٹھہرو - ذرا محمود ، فاروق اور فرزانہ سے ملاقات ہو لینے دو " انھوں نے کہا اور جیپ آگے بڑھا دی۔ دفتر پہنچے، پروفیسر داؤد اونگھ رہے تھے ، آہٹ سُن کر چونک اُٹھے — انھوں نے آئی جی صاحب کے نمبر گھمائے۔۔ دوسری طرف سے فوراً ہی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا گیا :

" جمشید ! تصدیق ہو گئی "

" جی - کس بات کی تصدیق ہو گئی ؟"

" سونے کے جہاز کی گم شدگی کی - جہاز واقعی اپنے راستے پر نہیں ہے "

" نہیں !!! " وہ دھک سے رہ گئے —

" عملہ پوری طرح اطمینان کر چکا ہے "

" اف — بحری جہاز کا اغوا — ہوائی جہازوں کا اغوا تو خیر اب آئے دن کی بات ہے - لیکن میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بحری جہاز کو اغوا بھی کیا جا سکتا ہے "

" اب - جمشید - اب کیا ہو گا ؟"

" ہمیں ایک سفر پر روانہ ہونا پڑے گا سر - حالات اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں "

" لیکن تم کس سفر پر روانہ ہو گے — جہاز کا سراغ لگانے کے لیے یا ریکارڈ کا — "

" میرے ذہن میں ایک بات آ رہی ہے سر - میں ریکارڈ والے معاملے کو سنبھال لیتا ہوں - انسپکٹر کامران مرزا کی ڈیوٹی جہاز والے معاملے پر لگا دی جائے "

" یہ - ٹھیک رہے گا - اس سے بہتر کوئی تجویز نہیں ہو سکتی " آئی جی بولے۔

" آپ ان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کریں - خدا کرے وہ دارالحکومت میں ہی ہوں "

" آمین ! " انھوں نے کہا - اور دوسری طرف سے ریسیور رکھے جانے پر خود بھی رکھ دیا :

" لو بھئی — سونے کا جہاز واقعی غائب ہے "

"یا اللہ رحم۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"اور میں حیران ہوں۔ محمود، فاروق اور فرزانہ اب تک لوٹ کر کیوں نہیں آئے۔ وہ کہاں ہیں؟"

"کیا اب ہم ان کی تلاش میں نکلیں؟" خان رحمان بوکھلا کر بولے۔

"[illegible] کر سکے ہیں اور بہت کام ہیں۔"

[illegible] انھوں نے جملہ مکمل کیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ انھوں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے کسی نے کہا:

"ہیلو سر۔ ڈاکٹر احسان بھٹہ کے گھر والوں کا کہنا ہے کہ وہ صبح دفتر جانے کے بعد ذرا دیر کے لیے بھی گھر نہیں آئے۔"

"ہوں۔ تلاش جاری رکھی جائے۔ اب یہ تلاش بہت ہی باریک بینی سے کی جانی چاہیے۔"

"جی بہت بہتر۔" دوسری طرف سے کہا گیا اور انھوں نے ریسیور رکھ دیا۔

"ڈاکٹر احسان بھٹہ کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ آخر یہ شخص کہاں غائب ہو گیا۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"کک۔ کون؟" پروفیسر داؤد چونک کر بولے۔

"ڈاکٹر احسان بھٹہ۔ ڈاکٹر تنویر نیازی کے نائب۔"

"اسے کیا ہوا؟"

"وہ غائب ہے۔ نہ جانے کہاں؟"

"تمھیں یہ جان کر خوشی ہو گی کہ میں اس کے ایک ٹھکانے سے واقف ہوں۔ میں نے شام کے وقت اکثر اسے وہاں دیکھا ہے۔"

"ارے۔ تو بتائیے نا۔" انسپکٹر جمشید بے چین ہو کر بولے۔

"گولڈن کلب میں، یہ ڈوگر روڈ پر واقع ہے۔ ایک بار مجھے ایک زہر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ضرورت پڑی تھی۔ میں نے احسان بھٹہ سے رابطہ قائم کیا تو وہ اس کلب میں ملے تھے۔"

"لیکن آپ نے تنویر نیازی سے رابطہ قائم کیوں نہیں کیا تھا؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"وہ ان دنوں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔"

"ویری گڈ۔ کیا آپ اس کلب کا فون نمبر بھی بتا سکتے ہیں؟"

"ضرور۔ کیوں نہیں۔" انھوں نے کہا اور نمبر بتا دیے۔ انسپکٹر جمشید نے فوراً گولڈن کلب کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسرے ہی لمحے ایک بھرائی ہوئی آواز سنائی دی:

"کیا یہ گولڈن کلب ہے جناب؟" وہ بولے۔

"ہاں۔ بالکل۔"

"ذرا احسان بھٹہ سے بات کروا دیجیے۔"

"وہ آج یہاں نہیں آئے۔" دوسری طرف سے فوراً کہا گیا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں۔ وہ اس وقت کہاں ہوں گے؟"

"جی نہیں۔ بھلا یہ بات ہم کس طرح بتا سکتے ہیں؟"

"اس طرح سے کہ شاید انھوں نے کسی کے لیے کوئی پیغام چھوڑا ہو؟"

"اوہ ہاں۔ یہ ممکن ہے، لیکن پیغام ایک اور صاحب نوٹ کرتے ہیں، ٹھہریے میں ان سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔" دوسری طرف سے چونک کر کہا گیا، پھر ایک منٹ بعد آواز آئی:

"جی ہاں۔ کچھ دیر پہلے انھوں نے پیغام لکھوایا تھا — ذاکر شاہ کے نام۔ یہ کہ آج وہ ان سے ملاقات کے لیے نہیں آ سکیں گے۔"

"تو کیا ذاکر شاہ بھی آپ کے کلب کے ممبر ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے۔ وہ فون کے ذریعے احسان بھٹّہ کا پیغام معلوم کریں گے۔"

"جی ہاں ضرور۔"

"تو پھر مہربانی فرما کر ان سے کہہ دیجیے گا۔ ذرا مجھے فون کریں۔"

"آپ کا نام اور نمبر؟"

انھوں نے جونہی اپنا نام اور فون نمبر لکھوائے۔ دوسری طرف سے چونک کر کہا گیا:

"اوہو۔ یہ آپ ہیں۔ ذرا ٹھہریے۔ دوسرے فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ میں ذرا اس پر بات کر لوں۔"

"ضرور۔" انھوں نے کہا۔ تیس سیکنڈ بعد ہی آواز سنائی دی:

"جناب۔ فون ذاکر شاہ کا تھا۔ میں نے انھیں آپ کا نام اور نمبر بتا دیا ہے۔ وہ اسی وقت آپ کو فون کر رہے ہیں۔"

"بہت خوب۔ شکریہ!"

جونہی انھوں نے سلسلہ بند کیا، فون کی گھنٹی بجنے لگی:

"ہیلو۔ انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔"

"آپ مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو آپ ذاکر شاہ ہیں؟"

"جی ہاں۔ فرمائیے۔ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"اپنا پتا لکھوا دیں۔ میں آپ کے دوست کے بارے میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا آپ کی مُراد احسان بھٹّہ سے ہے؟"

"جی ہاں۔"

"وہ ٹھیک تو ہے؟" ذاکر شاہ پریشان ہو گیا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ ان کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ ہم ان

کے گھر سے بھی معلوم کر چکے ہیں۔"

"یہ تو آپ بہت ہی عجیب بات بتا رہے ہیں۔"

"جی ہاں ۔ ہے تو عجیب ہی ۔ کیا آپ احسان بھٹہ صاحب کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ معلومات رکھتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کچھ سوچ کر کہا۔

"کیوں نہیں ۔ اس کا تو کوئی راز بھی مجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے، آپ تشریف لے آئیے ۔ میں آپ کو بہت کچھ ۔ غغ ۔ غغ ۔ ار ۔"

"ڈاکٹر شاہ صاحب ۔ آپ کو کیا ہوا؟" انسپکٹر جمشید چلائے۔

لیکن دوسری طرف سے کچھ بھی نہ کہا گیا ۔ ہلکی سی خرخراہٹ گونجتی رہی ۔ ریسیور بھی کریڈل پر نہیں رکھا گیا تھا۔

تعاقب کا طریقہ

فاروق نے بھی محمود کے پیچھے دوڑ لگا دی ۔ محمود اس وقت تک موٹر سائیکل سٹارٹ کر چکا تھا، اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ۔ اس کے پیچھے بیٹھ گیا ۔ اسی وقت موٹر سائیکل ایک دھچکے سے آگے بڑھی، ساتھ ہی محمود نے اسے بیٹھتے دیکھ لیا:

"یہ کیا کر رہے ہو ۔ اپنی موٹر سائیکل پر آؤ، ورنہ فرزانہ یہیں رہ جائے گی۔"

"کوئی بات نہیں، وہ ڈرپوک نہیں ہے کہ ہماری عدم موجودگی میں ڈرنا شروع کر دے گی ۔ ہم چند منٹ میں تو ان تک پہنچ جائیں گے ۔ وہ پیدل اور ہم موٹر سائیکل پر ۔" فاروق جلدی جلدی بولا۔

محمود بُرا سا منہ بنا کر رہ گیا ۔ بولا کچھ نہیں ۔ اچانک انہوں نے ٹومبو کو بائیں طرف مڑتے دیکھا ۔ جب ان کی موٹر سائیکل اس جگہ پہنچی ۔ جہاں ٹومبو مڑا تھا تو انہوں نے

دیکھا۔ وہ ایک تنگ سی گلی تھی اور اس گلی میں موٹر سائیکل پر سوار ہو کر گزرنا اتنا آسان نہیں تھا۔

"لو۔ میں اُتر جاتا ہوں۔ تم چکر لگا کر دُوسری طرف والی سڑک پر آؤ۔" فاروق نے کہا اور چھلانگ لگا دی، پھر تیر کی طرح دوڑا۔ سڑک پر پہنچ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن ٹومبو کا کہیں کوئی سراغ نہ ملا۔ اتنے میں محمود بھی آ گیا:

"کیوں۔ کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا۔ بس وُہ نکل گیا۔"

"اس کی ایسی کی تیسی۔ نکل کیسے سکتا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔" محمود بھنّا کر بولا۔

فارُوق پھر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ موٹر سائیکل ایک بار پھر سڑک پر دوڑنے لگی۔

"ہمیں کیا پتا۔ وُہ کس سمت میں گیا ہے۔" فاروق بڑبڑایا۔

"کوئی بات نہیں۔ پہلے ہم دائیں طرف کا جائزہ لیں گے، پھر بائیں طرف کا۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس دوران اسے کوئی ٹیکسی مِل گئی ہو۔ یا وُہ کوئی کار لے بھاگا ہو۔"

"اوہ۔ اس بات کا تو خیال ہی نہیں رہا کہ وُہ کار چرا

لے جانے میں بہت ماہر ہے۔ تب تو اس نے پہلا کام یہی کیا ہو گا۔ سڑک کی طرف توجہ رکھو۔ اگر اس نے کوئی کار چرائی ہے تو اُس جگہ ضرور کچھ لوگ جمع ہوں گے۔" محمود نے جلدی جلدی کہا۔

یہ خیال ٹھیک ہی نکلا۔ ایک جگہ انھیں لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ موٹر سائیکل روکنے کی صورت میں وقت ضائع ہونا یقینی تھا، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ ورنہ وُہ غلط سمت میں جا سکتے تھے۔ محمود نے ہجوم کے پاس موٹر سائیکل روکتے ہوئے ایک صاحب سے پُوچھا:

"کیوں جناب۔ کیا معاملہ ہے۔ کیا کوئی کار تو چوری نہیں ہو گئی؟"

"بالکل یہی بات ہے۔"

"چور کس طرف گیا ہے؟"

"اس طرف جاتے دیکھا گیا ہے اسے۔"

"کار کا رنگ اور نمبر وغیرہ بتا سکتے ہیں آپ؟"

"نیلے رنگ کی کار تھی۔ نمبر تو کار کا مالک ہی بتا سکتا ہے۔ اور وُہ رپورٹ درج کرانے گیا ہوا ہے۔"

"اوہ! شکریہ۔ ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وُہ نیلے رنگ کی کار ہے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا اور محمود نے موٹر سائیکل

پوری رفتار پر چھوڑ دی —

"آج تمھاری مہارت کا امتحان ہے۔" فاروق بولا۔

"ٹھیک ہے ، اگر وہ جلد ہی کسی عمارت میں نہ گھس گیا تو میں اسے پکڑ کر دکھاؤں گا — اس لیے کہ بھری پری سڑک پر کار اتنی رفتار سے نہیں چل سکتی ، جتنی رفتار سے موٹر سائیکل۔" محمود بولا —

بلا کی رفتار سے چلتے آخر وہ ایک نیلی کار تک پہنچ گئے۔ اُس کے قریب سے ہو کر گزرے تو دل بلیوں اُچھلنے لگا — کیونکہ کار وہی مسٹر ٹومبو چلا رہا تھا۔ انھوں نے خاموش رہنا مناسب خیال کیا اُسے ہوشیار کرنے میں خطرہ ہی تھا — وہ کار کے ذریعے انھیں کچلنے کی کوشش کر سکتا تھا —

اب وہ نیلی کار کے آگے چلے جا رہے تھے :

"میرے خیال میں تعاقب کا یہ طریقہ بہترین ہے — جس کا تعاقب کرنا ہو ، اس کے آگے آگے چلا جائے —" فاروق مسکرا کر بولا —

"ہوں — تم ٹھیک کہتے ہو ، لیکن یہ اسی صورت میں بہترین ہے ، جب دوسرے کو پتا نہ ہو کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے —"

یہ تعاقب پندرہ منٹ تک جاری رہا ، پھر نیلی کار سڑک کے

کنارے رکتی نظر آئی — ٹومبو اس میں سے نکلا اور اسے سڑک پر ہی چھوڑ کر ایک گلی میں مڑ گیا —

اب انھیں پلٹنا پڑا — یہ گلی بہت کشادہ تھی — انھوں نے ٹومبو کو ایک عمارت میں داخل ہوتے دیکھا :

"اللہ کا شکر ہے ، میں امتحان میں کامیاب ہو گیا۔" محمود بولا —

"ہاں ، اور اب اصل کام شروع ہوتا ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"تو کیا تعاقب کرنا نقلی کام تھا؟" محمود نے جل کر کہا۔

"یہ میں نے کب کہا — موٹر سائیکل سڑک سے اُتار کر کھڑی کر دو — اُس کھمبے کے ساتھ ٹھیک رہے گی۔" فاروق بولا۔

موٹر سائیکل کھڑی کرنے کے بعد دونوں گلی میں داخل ہوئے اور اس عمارت کے سامنے پہنچے جس میں ٹومبو گیا تھا — دروازے پر کسی کے نام کی تختی نہیں تھی — محمود نے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر دیکھا — دروازہ اندر سے بند تھا —

"اب کیا کیا جائے ؟"

"دو ہی صورتیں ہیں — یا تو باہر رہ کر اس کے نکلنے کا انتظار کیا جائے یا پھر کسی طرح اندر داخل ہوا جائے۔" فاروق بولا۔

"باہر رہ کر مزا نہیں آئے گا — مارے بے چینی کے میرا بُرا حال ہے — آخر یہ لوگ چاہتے کیا ہیں —" محمود بولا۔

" میں پہلے ہی جانتا تھا کہ تم یہی کہو گے۔ یہ تمھاری پُرانی عادت ہے۔ بس کود پڑتے ہو۔ چاہے کتنا ہی خطرہ ہو۔ خیر۔ آؤ ذرا دوسری طرف سے عمارت کا جائزہ لیں۔"

عمارت کے دائیں طرف ایک پتلی سی گلی تھی۔ وہ اس میں گھس گئے۔ آگے جا کر گلی پھر دائیں ہاتھ مڑ گئی۔ اور انھوں نے خود کو عمارت کی پشت پر پایا۔ آس پاس کوئی شخص نہیں تھا:

" موقع اچھا ہے۔ تم اس پائپ کے ذریعے اوپر پہنچ سکتے ہو۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

" تمھارے لیے ضرور موقع اچھا ہے، میرے لیے نہیں۔" فارُوق نے بُرا سا منہ بنایا۔ پائپ کے ساتھ بھی ایک دروازہ تھا۔ فاروق پائپ پر چڑھنے کی تیاری کر رہا تھا کہ محمود نے بے خیالی میں دروازے پر ہاتھ رکھ دیا۔ دُوسرے ہی لمحے وُہ لڑکھڑا گیا:

" ارے۔ یہ کیا؟" اس نے مُنہ سے نکلا۔

"کیا ہوا؟" فارُوق جلدی سے بولا۔

" یہ۔ یہ دروازہ تو کھلا ہُوا ہے۔"

" او ہو اچھا، پھر تو میرے خیال میں پائپ کے ذریعے اوپر چڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

" اگر تمھیں شوق ہے تو چڑھتے رہو، میں تو اندر چلا۔" محمود

نے منہ بنایا۔

" مجھے پاگل کتّے نے نہیں کاٹا۔" فارُوق بھنا کر بولا۔

دونوں دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ اب وُہ ایک طویل برآمدے میں کھڑے تھے۔ برآمدے کے دونوں طرف کمرے تھے اور ان کمروں پر تالے لگے ہوئے تھے۔ شاید یہ کوئی تجارتی عمارت تھی۔ جس میں مختلف لوگوں نے کمرے کرائے پر لے رکھے تھے، لیکن اس صورت میں کمروں کے دروازوں پر سائن بورڈ ہونے چاہییں تھے، دوسرے یہ کہ عمارت کا بیرونی دروازہ بند نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جب کہ ٹومبو نے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

" یہ عمارت میری سمجھ میں نہیں آئی۔" محمود دبی آواز میں بولا۔

" جب کہ ہم عمارت کو نہیں، مسٹر ٹومبو کو سمجھنے آئے ہیں۔" فارُوق بھنا کر بولا۔

" فرزانہ بے چاری وہیں رہ گئی۔ اور بور ہو رہی ہو گی۔" محمود بڑبڑایا۔

" کیوں۔ بور ہونے کی اسے کیا ضرورت۔ وُہ کوئی ٹیکسی پکڑ کر گھر جا سکتی ہے۔"

" گھر کیسے جائے گی۔ اس مکان میں تو تین لاشیں پڑی ہیں۔"

"ہم یہاں فرزانہ کے بارے میں بات چیت کرنے تو ہرگز نہیں آئے تھے۔ اگر یہی کام کرنا تھا تو گھر بیٹھ کر بھی کر سکتے تھے۔" فاروق تلملا کر بولا۔

"ہاں! بات تو یہ بھی ٹھیک ہے۔ تو پھر آؤ۔ آگے چلیں، عمارت سمجھ میں نہیں آتی تو نہ سہی۔" محمود نے خوش دلی سے کہا۔

دونوں آگے بڑھے اور پھر ان کے اُٹھتے قدم رُک گئے۔ آگے ایک کمرے کا دروازہ کھُلا تھا اور اس میں سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ محمود نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر فاروق کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، شاید اسے خطرہ تھا کہ کہیں وُہ ایسے میں بھی نہ بول پڑے۔ اسی وقت اُنھوں نے کسی کو کہتے سُنا:

"ٹھیک ہے ٹومبو۔ اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں۔ تم جان بوجھ کر ان سے نہیں اُلجھے۔ وہی تمھارے راستے میں آ گئے تھے، بھلا باس کیوں تم پر بگڑنے لگے۔"

"لیکن اب وُہ لوگ ہمارے پیچھے تو پڑ ہی جائیں گے۔ اور یہی باس نہیں چاہتا۔" ٹومبو کی آواز سنائی دی۔

"پھر وہی بات۔ ایسا تمھاری کسی غلطی سے نہیں ہوا۔ تم تو باس کے احکامات کی تعمیل کر رہے تھے۔"

"اور میرا بلو پائپ بھی ان کے پاس رہ گیا۔ انھوں نے تو مجھ پر سوئی بھی پھینک دی تھی۔" یہ کہتے وقت ٹومبو ہنسا۔

"اب ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ یہ سوئیاں ہمارے لیے زہریلی نہیں ہیں۔"

"لیکن یار۔ یہ کس قدر عجیب بات ہے۔ پہلی مرتبہ باس نے ہمیں وہ سفید گولیاں صرف اس لیے دی تھیں کہ ان سوئیوں کے زہر سے ہم محفوظ رہیں، لیکن اب ہم ان گولیوں کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ جب تک دن میں ایک گولی نہ کھا لیں، اس وقت تک چین نہیں آتا۔ گویا ہم گولیوں کے عادی بن گئے ہیں، لیکن آخر یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ اگر کسی دن باس نے ہمیں گولیاں نہ دیں تو کیا ہوگا۔ یا باس کے پاس گولیاں ختم ہو گئیں تو کیا ہوگا؟"

"ایسی باتیں نہ سوچو۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگتا ہے۔" ایک تیسری آواز اُبھری۔

"فکر نہ کرو۔ باس کے پاس سفید گولیوں کا ایک بہت بڑا سٹاک موجود ہے۔" ٹومبو کی آواز آئی۔

"ہم تو آج تک یہ نہیں جان سکے کہ روزمرہ کی گولیاں اور باس کی ہدایات اس عمارت کے اس کمرے میں کس طرح پہنچ جاتی ہیں۔"

"کوئی ایک تو ہم میں ایسا ہوگا جس کے سامنے وہ آتا جاتا ہوگا۔ بس اس کے ذریعے گولیاں اور ہدایات یہاں تک پہنچتی ہوں گی۔"

"ہوں! ضرور یہی بات ہے۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"یہ ضرور باس کا فون ہوگا۔ چلو ٹومبو بات کرو۔"

اس وقت تک ٹومبو ریسیور اٹھا کر ہیلو کہہ چکا تھا۔

"یس سر۔ میں آپ کا خادم ٹومبو ہوں۔ جی۔ جی ہاں۔ سب کام ٹھیک ٹھاک ہوگیا، نگران اور انچارج نہ تو خود آپ کی پریشانی کا سبب بن سکتے ہیں اور نہ ان کے گھر والے۔ آپ ہر فکر سے آزاد ہیں۔" یہاں تک کہہ کر ٹومبو رکا اور پھر دوسری طرف کی بات سننے لگا۔ جلد ہی اس نے کہا:

"یس سر۔ میں بات بتانا بھول گیا۔ نگران کے گھر میں میں اپنے کام سے ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ انسپکٹر جمشید کے بچے وہاں پہنچ گئے۔ ان سے میری جھڑپ ہوئی، لیکن پھر میں وہاں سے نکل بھاگا۔" یہاں تک کہہ کر وہ رک گیا، پھر بولا:

"جی۔ جی ہاں۔ مجھے یقین ہے۔ وہ میرا تعاقب نہیں کر سکے۔ میں دراصل پہلے گلیوں میں گھس گیا تھا اور پھر سڑک پر نکلا، وہاں سے ایک کار چرائی اور اس طرح یہاں پہنچا۔

جی کیا فرمایا۔ آپ کا مطلب ہے۔ انھوں نے تعاقب ضرور کیا ہو گا۔ میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔ جی۔ جی بہتر۔"

انھوں نے ریسیور رکھے جانے کی آواز سنی:

"باس کا خیال ہے، انھوں نے میرا تعاقب ضرور کیا ہوگا۔ تعاقب کیے بغیر وہ رہ ہی نہیں سکتے، لیکن میں نے کسی کو بھی اپنے تعاقب میں محسوس نہیں کیا۔"

"باس ہم سے بہت زیادہ عقل مند ہیں۔ خیر۔ انھوں نے کیا کہا ہے؟"

"ان کا خیال ہے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ اس عمارت کے آس پاس منڈلا رہے ہوں گے۔ اس لیے فوری طور پر ان سے پیچھا چھڑا لیا جائے۔ مطلب یہ کہ خفیہ طور پر اس عمارت کو خالی کر دیا جائے، تاکہ جب وہ اندر داخل ہوں تو یہاں ہم انھیں نظر نہ آئیں۔"

"ہوں۔ باس ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ اب ہمیں یہاں سے کھسک ہی لینا چاہیے۔" دوسری آواز سنائی دی۔

محمود اور فاروق نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں۔ اب کیا کیا جائے۔

"باہر نکل چلیں۔" فاروق نے اشارہ کیا۔

"نہیں۔ ان کے سامنے کیوں نہ آ جائیں۔" محمود نے بھی

اشارے میں جواب دیا۔

فاروق نے اسے گھورا جیسے کہہ رہا ہو۔ یہ تو وہی بات ہوئی۔ آ بیل مجھے مار۔ محمود نے جیسے اس کا اشارہ سمجھا ہی نہیں، یک دم دروازے کے سامنے آگیا اور چہکتی آواز میں بولا:

"تم لوگوں کو فرار ہونے کا خیال ذرا دیر سے آیا دوستو۔ ہمیں افسوس ہے۔"

وہ اچھل پڑے۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، پھر اپنے سامنے صرف محمود اور فاروق کو دیکھ کر سنبھلے:

"دو ہی ہو یا اور لوگ بھی ساتھ ہیں؟" ٹومبو بولا۔

"تمھارے لیے ہم دو ہی کافی ہیں۔" محمود بولا۔

"ٹومبو۔ موقع اچھا ہے۔ اپنا حساب ان سے چکا لو۔"

"لیکن بھئی۔ باس کا حکم ہے۔ ان سے دُور ہی رہو۔"

"یہ حکم انھوں نے صرف تمھیں دیا تھا۔ ہم تو ان کی بنا دیں گے چٹنی۔" وہ یک دم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ تعداد میں کل پانچ تھے۔ پانچوں ہٹے کٹے تھے۔ صرف ٹومبو ان میں سیاہ فام تھا۔ باقی سُرخ و سفید رنگ کے تھے۔

"لو بھئی۔ بنواؤ ان سے اپنی چٹنی۔ بہت شوق تھا، تمھیں چٹنی بنوانے کا۔" فاروق جل بُھن کر بولا۔

"یہ لوگ قاتل ہیں۔ ہم انھیں فرار کس طرح ہو جانے دیں۔"

محمود نے بھی تلملا کر کہا۔

"بھئی تم تو آپس میں لڑنے لگے۔ ہمارے ساتھ کیا لڑو گے۔"

"ہم ذرا لڑنے کی ریہرسل کر رہے ہیں۔" فارُوق نے جل بھُن کر کہا۔

"کیا محکمہ سراغرسانی کے خاص کمرے کا سارا ریکارڈ تمھارے باس نے چرایا ہے؟" محمود نے پوچھا۔

"اتنا شاندار کام بھلا ہمارے باس کے سوا کون کر سکتا ہے۔" ٹومبو خوش ہو کر بولا۔

"لیکن کیسے۔ یہ کیسے ہوگیا؟"

"یہ ایک راز ہے۔ جسے معلوم کرنا تمھارے بس کا روگ نہیں۔ اب اندر آ جاؤ۔ تمھاری موت تمھیں کھینچ کھانچ کر یہاں لے آئی ہے۔ اس کمرے کے فرش میں ایک مین ہول تھا۔ جس کے نیچے گٹر کا پانی بہہ رہا ہے۔ ہمیں کرنا صرف یہ ہو گا کہ تم لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اس مین ہول میں سے نیچے پھینک دیں گے۔ اور اس طرح پولیس تمھارا سُراغ کبھی نہیں لگا سکے گی۔ کیوں کیسی ترکیب ہے۔"

"بہت گھسی پٹی۔ ایسی بے شمار ترکیبیں مجرم لوگ ہم پر آزماتے ہی رہتے ہیں۔ کوئی نئی بات کرو۔" فارُوق نے جل

کر کہا ۔

"اس پرانی ترکیب میں نیا پن نہ ہے کہ ہم تمہیں ان سوئیوں کے ذریعے موت کے گھاٹ اتاریں گے ۔ کیوں کیا خیال ہے؟"

"تمہارے خیال میں کوئی نیا پن ہو سکتا ہے، ہمارے خیال میں نہیں۔" محمود بڑبڑایا۔

"خیر کوئی بات نہیں ۔ ہمیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ترکیب نئی ہے یا پرانی ۔ پکڑ لو بھئی انہیں ۔ اور ایک ایک سوئی ان کے جسموں میں داخل کر دو۔" ڈومبو نے کہا۔

چاروں غنڈے ان کی طرف بڑھے ۔

"فاروق ۔ برآمدہ ٹھیک رہے گا۔" محمود چلایا۔

"اچھا ۔" اس نے کہا اور دونوں تیزی سے پیچھے ہٹے ۔ اب وہ برآمدے میں تھے ۔ برآمدہ کافی لمبا چوڑا تھا، ادھر اُدھر ہونا آسان تھا:

"اوہو ۔ یہ تو باقاعدہ مقابلہ کرنے کے چکر میں ہیں ۔ بھلا ہمیں کیا ضرورت اپنے آپ کو تھکانے کی ۔ ڈامو ۔ اپنا بلو پائپ نکال کر ان پر سوئیاں پھینک دو ۔ بس ہمارا کام ختم ہو جائے گا۔" ڈومبو بولا۔

"ہاں، ٹھیک تو ہے ۔ ان کے ساتھ ہم بھی بلا وجہ بیوقوف

بن گئے۔" دوسرے نے کہا اور جیب میں ہاتھ ڈال دیا ۔

یہ لمحات ہولناک تھے ۔ یہ لوگ تو واقعی انہیں موت کے گھاٹ اتارنے پر تل گئے تھے ۔ محمود نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ۔ اپنی جگہ سے دوڑ لگا دی اور اس کے سینے سے جا ٹکرایا جو بلو پائپ نکال رہا تھا ۔ وہ لڑکھڑا گیا ۔ ادھر فاروق بھی اپنی جگہ سے حرکت کر چکا تھا ۔ وہ دوسرے سے ٹکرایا ۔ اور اس طرح لڑکھڑا جانے والے دونوں غنڈے آپس میں زور سے ٹکرائے ۔ محمود نے ان کی بوکھلاہٹ سے فائدہ اٹھایا اور یک دم کمرے میں گھس گیا ۔ کمرے میں تیزی سے ایک نظر ڈالی ۔ آتش دان میں راکھ کریدنے والی سلاخ موجود تھی ۔ بس پھر کیا تھا ۔ اس نے سلاخ اٹھا لی ۔ دروازے کی طرف مڑا تو ڈومبو کا ایک ساتھی کمرے میں داخل ہو چکا تھا ۔ اور وہ جیب میں سے پائپ بھی نکال چکا تھا ۔ جونہی اس نے ٹریگر دبایا ۔ محمود لوٹ لگا گیا ۔ اور لوٹ کی حالت میں ہی اس نے سلاخ گھما ڈالی، سلاخ کا اگلا سرا اس کی ایک پنڈلی پر لگا ۔ وہ ہائے کرکے بیٹھتا چلا گیا، پائپ اس کے ہاتھ سے نکل گیا ۔ محمود بلا کی رفتار سے اٹھا اور پائپ اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے سلاخ ایک بار پھر گھمائی، اس بار سلاخ اس کے سر پر

پڑی ۔ محمود یہ دیکھنے کے لیے رُکا نہیں کہ ابھی اس میں دم خم باقی ہیں یا نہیں ۔ بس باہر نکل آیا ، کیونکہ باہر فاروق تنہا رہ گیا تھا ، لیکن یہ دیکھ کر اسے ہنسی آ گئی کہ فاروق انہیں تگنی کا ناچ نچائے دے رہا تھا ...۔ وُہ چاروں اس پر جھپٹ رہے تھے اور وُہ انہیں ٹھینگے پہ رکھ دے رہا تھا ۔ ایک بار ٹومبو نے جو ہاتھ چلایا تو فاروق کے کندھے پر لگا ۔ فاروق اُچھل کر دوسرے کی طرف گرنے لگا ۔ اس نے بھی ایک مُکا اس کی کنپٹی پر دے مارا ۔ فاروق چکرا کر رہ گیا ۔ محمود اب مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا ۔ اس نے تلوار کے انداز میں سلاخ کو گھمانا شروع کر دیا اور بلند آواز میں چلّا اُٹھا :

" بزدلو ۔ اب میں تمہیں ہرگز نہیں چھوڑوں گا ۔"

وُہ اس کی طرف مڑے ۔ اور پھر بجلی کی طرح گھومتی سلاخ نے انہیں بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا ۔ فاروق نے موقع پا کر ان میں سے ایک کی ٹانگ گھسیٹ لی :

" ارے ارے ۔ بھئی یہ کیا ۔ گرے کیوں جا رہے ہو — ذرا سنبھل کر لڑو ۔" ساتھ ہی اس نے چہکتی آواز میں کہا ۔ ایسے میں اس کی نظر دروازے پر پڑی اور وُہ دھک سے رہ گیا ۔ خون آلود چہرے والا ایک غنڈہ ہاتھ میں وزنی کرسی اُٹھائے

عین محمود کے پیچھے پہنچ چکا تھا ۔ محمود کا رُخ بقیہ چار غنڈوں کی طرف تھا ۔ اس نے دیکھا ۔ چھلانگ لگائی اور اس کے راستے میں آ گیا ۔ وہ کرسی کو سر سے بلند کر چکا تھا ۔ کرسی تیزی سے فاروق کے سر کی طرف بڑھی ۔ وہ درمیان میں نہ آ جاتا تو کرسی محمود کی کمر پر لگنے والی تھی ۔ اسے اور تو کچھ نہ سوجھا ، دونوں ہاتھ اوپر کر دیے ۔ کرسی پوری طاقت سے اس کے ہاتھوں پر آ کر لگی ۔ اور اسے اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی ، لیکن اس سے اتنا ضرور ہوا کہ اس کا سر اور محمود کی کمر زخمی ہونے سے بچ گئے — اب کرسی پر اس کے ہاتھ جمے ہوئے تھے اور ادھر وہ کرسی کو کھینچ لینے کی کوشش میں تھا ۔ تاکہ پھر کرسی سر سے بلند کر کے اس پر دے مارے ۔ فاروق کے ہاتھ بے تحاشہ درد کر رہے تھے ۔ اس حالت میں بھی اسے کرسی کو پکڑنا پکڑ رہا تھا ۔ دوسری طرف محمود کی سلاخ بجلی کی طرح حرکت کر رہی تھی ۔ اور اب تک ٹومبو کے دو ساتھیوں کی بُری طرح خبر لے چکی تھی ۔ اچانک فاروق نے کرسی کے ذریعے اسے پیچھے کی طرف دھکا دیا ۔ وہ چند قدم لڑکھڑا گیا ، ساتھ ہی فاروق نے کرسی پر سے ہاتھ ہٹا لیے اور جھکائی دیتا ہوا اس کی کمر پر پہنچ گیا ، لیکن وُہ کمر پر ٹکر رسید نہیں کر سکتا

تھا۔ اس طرح وہ محمود سے جا ٹکراتا ۔ لہٰذا اس نے اس
کی گردن میں بازو ڈال دیے اور انھیں دبانے لگا ۔
حملہ آور کرسی کو بھول گیا۔ اس کے ہاتھوں سے کرسی فرش
پر گری اور ہاتھ فاروق کے بازوؤں کی طرف بڑھے ۔ دونوں
میں زور آزمائی ہونے لگی ۔ اور پھر اس کی آنکھیں باہر کو
اُبل آئیں ۔ ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے ۔ فاروق نے اسے دھکا
دیا اور لپک کر کُرسی اٹھا لی ۔ وہ بُری طرح گردن مسل
رہا تھا ۔ فارُوق نے کُرسی اس پر دے ماری ۔ اور محمود
کی طرف مُڑا ۔ محمود کے مُقابلے میں اب صرف ٹومبو اور اس
کا ایک ساتھی رہ گیا تھا۔ فاروق ٹومبو کے ساتھی کی طرف
لپکا اور کرُسی دے ماری ۔ ٹومبو نے جب دیکھا کہ محمود اور
فارُوق کے مُقابلے میں وُہ تنہا رہ گیا ہے تو چہرے پر
گھبراہٹ کے آثار طاری ہو گئے۔ یک دم اس نے ہاتھ سَر سے
اُوپر اُٹھا دیے اور بولا :

" رُک جاؤ۔ میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔"

محمود نے سُلاخ روک لی۔ فارُوق نے کُرسی نیچے رکھ
دی اور اس پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا ، محمود یہ
دیکھ کر مسکرایا ۔

" بھئی واہ ۔ اسے کہتے ہیں ، ایک پنتھ دو کاج ۔ کرُسی کی

کرُسی اور ہتھیار کا ہتھیار۔"

" باس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ تم لوگوں سے دُور ہی رہنا چاہیے
تھا۔" ٹومبو کے لہجے میں حسرت تھی ۔

عین اُسی وقت کمرے میں رکھے فون کی گھنٹی بجنے لگی ۔

وُہ چونک اُٹھے ۔

اندر چلیں

فرزانہ اُن کے پیچھے دوڑتی ہوئی کھڑکی سے باہر آئی تو دونوں دُور جا چکے تھے ۔ چند لمحے تک وُہ وہیں کھڑی کچھ سوچتی رہی، پھر سڑک پر آئی اور ایک پبلک فون بوتھ سے دفتر فون کیا — لیکن سلسلہ قائم نہ ہو سکا — آخر اس نے اس علاقے کے پولیس اسٹیشن کو فون کیا ۔ مکان کا پتا بتایا ، اس میں تین لاشوں کی موجودگی کی اطلاع دی اور پھر مکان تک پہنچی — اندر داخل ہو کر اس نے بیرونی دروازہ اندر سے بند کر لیا ، لاشوں کے پاس سے گزرتی اندرونی کمرے میں داخل ہوئی اور ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگی — اچانک کسی نے دروازے پر دستک دی ۔ اسے حیرت ہوئی — پولیس اس قدر جلد نہیں آ سکتی تھی — اس کا مطلب تھا ، دروازے پر کوئی اور ہے — دبے پاؤں دروازے تک آئی — جھری میں سے باہر دیکھا ، لیکن دستک دینے والا دوسری طرف کھڑا تھا ، آخر اس نے دبی آواز میں کہا :

" کون ہے ؟ "

" ثمینہ — یہ تمھاری آواز کو کیا ہوا ۔ "

" ثمینہ — " فرزانہ کے منہ سے نکلا ۔ یک دم اسے خیال آیا ، صحن میں پڑی تین لاشوں میں ایک لڑکی کی لاش بھی ہے — گویا باہر جو کوئی بھی تھا ۔ گھر کا یا گھر سے تعلق رکھنے والا آدمی تھا —

" او ہو — تم — تم ثمینہ نہیں ہو سکتیں — تب پھر تم ضرور کوئی چور ہو — میں نے تالا کھول دیا ہے ، دروازہ کھولو ۔ "

" نہیں ، میں چور نہیں ہوں ۔ " فرزانہ نے پُر سکون آواز میں کہا ۔

" تب پھر ۔ کون ہو — میں کہتا ہوں — دروازہ کھولو ۔ "

" افسوس ! میں ابھی دروازہ نہیں کھول سکتی — ویسے آپ کون ہیں ؟ "

" میں — یہ میرا گھر ہے ۔ "

" تو کیا ثمینہ آپ کی بہن ہے ؟ "

" ہاں لیکن تم کون ہو کیا ثمینہ کی کوئی سہیلی ہو ۔ "

" نہیں ! میں ثمینہ کی سہیلی بھی نہیں ہوں ۔ " فرزانہ پریشان ہو گئی — اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا ۔ کیا کرے — کیا نہ کرے — دروازہ کھولنے کی صورت میں ثمینہ کا بھائی اپنے گھر کے افراد کی لاشوں کو دیکھ کر غصے میں پاگل ہو سکتا تھا اور جو

پکھ کر گزرتا کم تھا۔

"تب پھر۔ تم ضرور چور ہو۔ میں باہر سے دروازہ بند کرکے پولیس کو فون کرنے جا رہا ہوں۔" اس نے گویا دھمکی دی۔

"آپ یہ کوشش نہ کریں۔ میں پہلے ہی پولیس کو فون کر چکی ہوں۔"

"کیسے۔ اندر فون کہاں؟" آواز آئی۔

"باہر نکل کر پبلک فون بوتھ سے کیا تھا۔"

"کیا اندر کوئی گڑبڑ ہے۔" اس کی آواز میں کپکپی تھی۔

"ہاں۔ بہت۔ اسی لیے تو میں دروازہ نہیں کھول رہی، پولیس کے آنے پر کھولوں گی۔"

"دیکھو۔ مجھے بتا دو۔ اندر کیا ہو گیا ہے؟" اس کی آواز رو دی۔

"آپ کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"کیا بات ہے ناظر۔ دروازے پر کھڑے کس سے باتیں کر رہے ہو؟" ایک بوڑھی آواز سنائی دی۔

"پتا نہیں انکل۔ کیا بات ہے۔ دروازہ اندر سے بند ہے۔ ایک لڑکی دروازے کے دوسری طرف کھڑی ہے اور دروازہ نہیں کھول رہی۔"

"گویا اندر ایک چور موجود ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ وہ بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی۔ میں ابھی سارے محلے کو جمع کیے لیتا ہوں۔"

"ضرور انکل۔ یہ تو کرنا ہی ہو گا۔"

گلی میں شور بڑھنے لگا۔ اندر چور ہے۔ اندر چور ہے۔ دیکھو۔ بھاگ نہ جائے۔ اے۔ تم ادھر جاؤ۔ اور ادھر تم۔ خبردار ہوشیار رہنا۔ کہیں اس کے پاس کوئی پستول نہ ہو۔ اس قسم کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ آخر پولیس کی سیٹیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ دو منٹ بعد دروازے پر دستک دی گئی:

"دروازہ کھولو۔ باہر پولیس موجود ہے۔ ہاتھ سر سے اوپر کیے رکھنا۔"

"جی بہتر۔ میں دروازہ کھول رہی ہوں۔ واضح رہے۔ فون میں نے ہی کیا تھا۔"

"اوہو۔ اچھا۔ ہاں۔ آواز تو یہی تھی۔"

فرزانہ نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے دیکھا، ایک پولیس انسپکٹر کے پیچھے چھ سات کانسٹیبل اور ان کے پیچھے بے شمار لوگ کھڑے تھے۔ سب نے فرزانہ کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا:

"فون تم نے کیا تھا؟" سب انسپکٹر اکھڑ لہجے میں بولا۔

"ہاں!" فرزانہ بولی۔

"وہ تین لاشیں کہاں ہیں؟"

"اندر—صحن میں۔" فرزانہ نے اشارہ کیا۔

"تین لاشیں — کیا مطلب؟" ایک نوجوان آگے بڑھ کر پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔ وہ فرزانہ کو بُری طرح گھور رہا تھا۔ یہی نوجوان اب تک اس سے باتیں کرتا رہا تھا۔

"آپ کون ہیں مسٹر؟" پولیس انسپکٹر بولا۔

"اس گھر کا ایک فرد۔ تھوڑی دیر پہلے دوسرے شہر سے یہاں پہنچا ہوں — گھر کا دروازہ کھلوانا چاہا، لیکن اس لڑکی نے کھولا ہی نہیں۔"

"اگر اندر تین لاشیں موجود ہیں، تب تو اس نے دروازہ نہ کھول کر عقل مندی کا ثبوت دیا ہے — آئیے اندر چلیں — باقی لوگ باہر ہی رہیں — کوئی اندر داخل ہونے کی کوشش نہ کرے، یہ معاملہ شاید قتل کا ہے۔"

"جی ہاں! اس میں کوئی شک نہیں۔" فرزانہ بولی۔

جونہی لاشوں کے پاس پہنچے — نوجوان نے ایک دھاڑ ماری اور لاشوں پر گرنے لگا، لیکن فرزانہ فوری طور پر اس کے راستے میں آ گئی اور اسے گرنے سے بچا لیا، پھر دھکیل کر دُور کر دیا —

"ہٹ جاؤ میرے راستے سے — یہ میرے بھائی۔ بہن اور ماں کی لاشیں ہیں۔"

"ان لاشوں سے لپٹنے کا مطلب یہ ہو گا کہ آپ کی لاش بھی ان کے ساتھ پڑی ہو گی۔" فرزانہ سرد لہجے میں بولی۔

"کیا مطلب؟" سب انسپکٹر نے چونک کر کہا۔

"انھیں ایک سمندری سانپ کے زہر کے ذریعے ہلاک کیا گیا ہے — ان کے جسموں سے وہ زہر دوسروں کے جسموں میں بھی داخل ہو سکتا ہے — آپ کو ان لاشوں کو اٹھوانے میں بہت جلدی کرنی چاہیے، ورنہ یہ پانی بن کر بہنے لگیں گی — اس قسم کی چند لاشیں پہلے ہی جل چکی ہیں۔"

"اوہ — اوہ — آپ کون ہیں؟" سب انسپکٹر نے کانپتی آواز میں کہا۔

"میں فرزانہ ہوں — آپ فوری انتظامات کریں۔"

"مم — میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔"

"ابھی ایک اور گھر میں بھی ایسی ہی چند لاشیں ملیں گی — وہاں بھی جانا ہو گا۔" یہ کہہ کر فرزانہ نے انچارج کے بارے میں بتایا۔

نوجوان اس وقت تک بے ہوش ہو چکا تھا — ابھی تو اس نے اپنے باپ کی موت کی خبر بھی نہیں سُنی تھی — محکمہ سراغرسانی کی عمارت میں ہلاک کیا جانے والا نگران ضرور اس نوجوان کا باپ تھا — سب انسپکٹر انتظامات میں لگ گیا — فرزانہ اور کانسٹیبل گھر کی چیزوں کا جائزہ لینے لگے — جلد ہی سب انسپکٹر بھی وہاں آ گیا — اس نے بھی چیزوں کا جائزہ لینا شروع کیا — ایک الماری

کا تالا توڑا گیا تو اس میں کچھ کتابیں نظر آئیں۔ ایک شیشی میں ایک سفید گولی موجود تھی۔ انسپکٹر نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ جب کہ فرزانہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ سوچنے لگی۔ کتابوں کی الماری میں دوا کی شیشی کا کیا کام۔ کچھ سوچ کر اس نے شیشی اٹھا لی۔

پندرہ منٹ بعد لاشیں اٹھوا دی گئیں۔ ایک ڈاکٹر صاحب بھی آ چکے تھے، انھوں نے نوجوان کا معائنہ کیا۔ اسے انجکشن دیا۔ جلد ہی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ گم سم لیٹا رہا، آخر فرزانہ اس کی طرف بڑھی اور ہمدردانہ لہجے میں بولی:

"کیا آپ کے والد بیمار تھے؟"

"تھے۔ کیا مطلب۔" نوجوان چونک کر بولا۔

"میرا مطلب ہے۔ کیا انھیں ان دنوں کوئی مرض تو لاحق نہیں تھا؟"

"نہیں۔ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔"

"اور وہ کسی قسم کی دوا استعمال نہیں کر رہے تھے؟"

"آپ بار بار لفظ تھے کیوں استعمال کر رہی ہیں؟"

"اوہ سوری۔ میری بات کا جواب دیں۔" فرزانہ بولی۔

"نہیں۔ وہ کوئی دوا وغیرہ نہیں کھاتے۔"

"گولیوں کی اس شیشی کو پہچانتے ہیں آپ؟" فرزانہ نے شیشی

اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ نوجوان نے اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا:

"آخر اس شیشی میں کیا خاص بات ہے۔ کیا یہ کوئی خاص دوا ہے؟"

"جی نہیں۔ یہ شیشی کتابوں کی الماری میں ملی ہے۔ اس لیے مجھے ذرا حیرت ہوئی تھی۔"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" سب انسپکٹر نے منہ بنایا۔

"بات ہے۔ میں اس گھر کے ایک دوسرے کمرے میں دواؤں کی ایک باقاعدہ الماری دیکھ چکی ہوں، اس الماری میں سوائے دواؤں کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس صورت میں صرف یہ شیشی اس کمرے کی الماری میں کیوں رکھی گئی۔ کیا یہ عجیب بات نہیں۔ دواؤں کی اس الماری کے دروازے پر تالا بھی نہیں لگا ہوا۔ جب کہ اس الماری کے دروازے پر تالا لگا ہوا ملا ہے۔"

"ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ کوئی خاص دوا ہو۔"

"ہاں! میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا، پھر کسی خیال کے تحت بولی:

"میں ابھی آئی۔"

وہ اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ باہر نکل کر وہ سڑک پر آئی

اور دواؤں کی ایک دکان میں گھس گئی ۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ایک شخص کو اس نے وہ شیشی دیتے ہوئے کہا :

" کیا آپ بتا سکتے ہیں ۔ یہ کون سی دوا ہے ؟ "

دکاندار نے منہ بنایا ۔ شیشی کو دیکھا اور بولا :

" پتا نہیں ۔ یہ کس چیز کی گولی ہے ۔ ویسے شیشی جن گولیوں کی ہے ۔ وہ گولی اس میں نہیں ہے "

" شکریہ ۔ " اس نے کہا اور باہر نکل کر گھر کی طرف مڑی ہی تھی کہ ٹھٹک کر رُک گئی ۔

○

" اُف خدا ۔ ذاکر شاہ کو بھی ہلاک کر دیا گیا ۔ یہ ہو کیا رہا ہے ۔ ریسیور ابھی تک کریڈل میں نہیں رکھا گیا ۔ اکرام فوراً ڈائریکٹری میں ذاکر شاہ کی تلاش شروع کر دو "

" جی ۔ ذاکر شاہ کی تلاش ۔ " اکرام حیران رہ گیا ۔

" میرا مطلب ہے ۔ اس نام کی ۔ تاکہ پتا معلوم کیا جا سکے " وہ بولے ۔

" لیکن سر ۔ ڈائریکٹری میں تو نہ جانے کتنے ذاکر شاہ ہوں گے ۔ "

" ہاں ٹھیک ہے ۔ اس میں ذرا محنت تو ہو گی ، لیکن ناکامی نہیں ہو سکتی ، کیونکہ فون کا ریسیور لٹکتا چھوڑ دیا گیا ہے ۔ ہم فون کرنے کا سلسلہ شروع کریں گے ۔ اور اس طرح ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ جس ذاکر شاہ کی ہمیں تلاش ہے ۔ وہ کہاں رہتا ہے "

" بہت خوب ۔ ترکیب ٹھیک ہے " خان رحمان بولے ۔

" تب پھر تم بھی ایک ڈائریکٹری سنبھال لو "

" تو میں ہی بے کار بیٹھا کیا کر رہا ہوں ۔ ایک ڈائریکٹری مجھے بھی دے دو " پروفیسر صاحب نے کہا ۔

" اور جتنے بھی ذاکر شاہ ملتے چلے جائیں ۔ ان کے نمبر مجھے بتاتے چلے جائیں " انسپکٹر جمشید بولے ۔

" اچھی بات ہے "

یہ مہم شروع ہوئی ۔ اور پھر ذاکر شاہ نام کی لائن لگ گئی ، انسپکٹر جمشید نے تیزی سے فون کرنا شروع کیے ۔ جونہی دوسری طرف سے کہا جاتا ۔ جی ہاں ۔ ذاکر شاہ بول رہا ہوں ۔ وہ رانگ نمبر کہہ کر سلسلہ کاٹ دیتے اور دوسرا نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیتے ۔ آخر ایک ذاکر شاہ کے نمبر ڈائل کیے گئے اور دوسری طرف سے لائن خاموش رہی تو وہ پتا نوٹ کر لیا گیا ۔ یہ ڈوگر روڈ کا پتا تھا ۔

" اکرام ۔ ابھی ہم سب کا اس پتے پر جانا درست نہیں ۔

ہو سکتا ہے اس ذاکر شاہ کا فون خراب ہو، لہذا پہلے اپنا آدمی بھیج دو تاکہ صورتِ حال معلوم ہو جائے۔"

"اوکے سر۔ یہ ٹھیک رہے گا۔"

"اور اس دوران ہم دوسرے ذاکر شاہ نامی افراد کو فون کرنے کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔"

"جی بہتر۔" اکرام نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ جلد ہی اس کی واپسی ہوئی:

"آدمی جا چکا ہے سر۔ جلد ہی پیغام مل جائے۔"

آدھ گھنٹے بعد فون موصول ہوا، اکرام کا ماتحت کہہ رہا تھا:

"جس ذاکر شاہ کی تلاش تھی۔ وہ مل گیا ہے سر۔ اس کی لاش اپنے گھر کے کمرے میں پڑی ہے۔ اس کی گردن میں ایک خنجر دستے تک پیوست ہے۔"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گیا اور پھر یہ اطلاع انسپکٹر جمشید کو دی۔

"آؤ پھر چلیں۔ پروفیسر صاحب۔ آپ کا کیا پروگرام ہے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"مجھے لاشیں دیکھنے کا کوئی شوق نہیں۔ کیا میں گھر چلا جاؤں۔"

"جی ہاں۔ یہی ٹھیک رہے گا۔"

"اگر میری ضرورت پڑے تو فون کر دینا۔ حاضر ہو جاؤں گا۔"

"شکریہ۔" انھوں نے فوراً کہا۔

وہ باہر نکلے اور اپنے اپنے راستے پر روانہ ہو گئے۔

ذاکر شاہ کو چونکہ خنجر کے ذریعے ہلاک کیا گیا تھا۔ اس لیے یہاں زہر کے کوئی آثار نہیں تھے۔ عملے نے اپنے کام شروع کر دیا۔ انسپکٹر جمشید گھر کی چیزوں کا جائزہ لینے لگے۔ گھر میں ذاکر شاہ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ نہ جانے وہ لوگ کہاں گئے ہوئے تھے۔ آس پاس کے افراد سے پوچھ گچھ کی گئی تو انھوں نے بتایا۔ کسی عزیز کی شادی میں گئے ہوئے ہیں۔ انسپکٹر جمشید ایک الماری کا جائزہ لے رہے تھے۔ اچانک ایک ڈائری پر نظر پڑی۔ اُٹھا کر دیکھا تو ذاکر شاہ کی تھی۔ اور انھوں نے محسوس کیا۔ انہیں اسی چیز کی ضرورت تھی۔

وہ وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور ڈائری کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اسی وقت خان رحمان اندر داخل ہوئے اور بولے:

"بھئی جمشید۔ یہاں کیا کر رہے ہو۔ کارروائی تو مکمل ہو گئی۔"

"ذاکر شاہ کی ڈائری ملی ہے ۔ اسے پڑھ کر دیکھنا پڑے گا ۔"

"تو چلو ۔ دفتر میں چل کر پڑھ لیتے ہیں ۔"

"نہیں ۔ اس ڈائری کو پڑھنے کے بعد شاید کسی اور چیز کے معائنے کی ضرورت پڑے ۔"

"تو پھر یہ لو ۔ میں بھی یہیں بیٹھ جاتا ہوں ۔"

دونوں ڈائری پڑھنے لگے ۔ ایک صفحے پر وہ ٹھٹک کر رہ گئے ۔ لکھا تھا :

"ان دنوں احسان بھٹہ کا رویّہ بہت عجیب ہو گیا ہے ۔ اس کی عادت بھی پہلے جیسی نہیں رہی ۔ نہ جانے کیا بات ہے ، میں اس میں زبردست تبدیلی محسوس کرنے لگا ہوں ۔ کبھی کبھی تو وہ اس حد تک گم نظر آتا ہے ۔ جیسے اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو ۔ اب وہ خوف زدہ سا رہنے لگا ہے ۔ میں اس سے ضرور پوچھوں گا ۔ آخر اسے ہو کیا گیا ہے ۔"

اس کے بعد چند صفحے پلٹنے پر یہ تحریر نظر آئی :

"میں نے احسان بھٹہ کو بہت کریدا ۔ آخر وہ مجھے سب کچھ بتانے پر آمادہ ہو گیا ۔ اس نے مجھے

حیران کن باتیں بتائیں ۔ وہ واقعی ایک شخص سے خوف زدہ ہے ۔ بے حد خوف زدہ ۔ وہ شخص کوئی بھیانک جرم کر رہا ہے ، لیکن ڈاکٹر احسان بھٹہ کے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ۔ لہذا وہ اس کے خلاف کوئی قدم بھی تو نہیں اٹھا سکتا ۔ قانون اس کی سُنی سنائی باتوں پر کوئی اقدام نہیں کر سکتا ، پھر بھی اس نے مجھے جو باتیں بتائی ہیں ۔ وہ حد درجے بھیانک ہیں ۔ اور اب میں بھی بہت خوف زدہ ہو گیا ہوں ۔"

ان دو صفحات کے علاوہ کسی صفحے پر احسان بھٹہ کا ذکر نہیں تھا ۔

"یہ ذکر تو نا مکمّل رہ گیا ۔" انسپکٹر جمشید ڈائری سے نظریں ہٹاتے ہوئے بڑبڑائے ۔

"شاید اس نے گھر والوں میں سے کسی سے ذکر کیا ہو ؟" خان رحمان بولے ۔

"ارے ۔" انسپکٹر جمشید اچھل پڑے ان کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں ۔

اگلے ہی لمحے وہ باہر کی طرف دوڑ پڑے ۔

خان رحمان کی حیرت کا کیا پوچھنا۔ وہ بھی یہ کہتے ہوئے ان کے پیچھے دوڑے:

" ارے ارے۔ کیا ہوا بھئی۔"

موت کو آواز

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر ان کی نظریں ڈومبو پر جم گئیں:

" تمھارے خیال میں کس کا فون ہو سکتا ہے؟"

" یہ عمارت ہمیں باس کی طرف سے ملی ہوئی ہے۔ باس کے علاوہ یہاں ہمیں کوئی فون نہیں کرتا۔" ڈومبو بولا۔

" تب یہ باس ہی ہو سکتا ہے ۔ خیر میں خود بات کر دوں گا ۔ فاروق یہ سلاخ پکڑ لو ۔ تم جانتے ہی ہو اگر یہ کوئی حرکت کرنے کی کوشش کرے تو تمھیں کیا کرنا ہو گا۔"

" ہاں! اچھی طرح جانتا ہوں ۔ زیادہ سمجھانے کی کوشش نہ کرو۔" اس نے سلاخ کو ہاتھوں میں تولتے ہوئے کہا۔

" شکریہ ۔ تم میں بس یہی اچھی بات ہے کہ زیادہ سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔" محمود نے بُرا سا منہ بنایا اور فون کی طرف بڑھ گیا۔ ریسیور اٹھاتے ہی اس نے کہا:

"ہیلو۔"

"کون ہو تم؟" ایک جانی پہچانی سی آواز سنائی دی۔

"وہی جن کے سائے سے دور رہنے کی ہدایت تم نے ٹومبو کو کی تھی۔"

"تو تم یہاں پہنچ چکے ہو۔ اور تمہارا یہاں پہنچنا بے کار گیا ہو گا، کیونکہ میں ٹومبو کو پہلے ہی خبردار کر چکا ہوں۔" وہی آواز سنائی دی۔

"نہیں ۔ تمہارا خیال مات کھا گیا۔ ہم اس وقت دروازے کے باہر موجود تھے جب تم ٹومبو سے بات کر رہے تھے ۔ تمہارے پانچوں غنڈے چت ہو چکے ہیں ۔ ان میں اب اتنا دم خم نہیں رہا کہ اور مقابلہ کر سکیں ۔ ہاں ، ان کی مدد کے لیے تم خود آنا پسند کرو تو ہم تمہارے استقبال کے لیے یہاں موجود ہیں ۔ ساتھ ہی ہم پولیس کو فون کر رہے ہیں ، اگر پولیس سے پہلے آ سکتے ہو تو ہمیں خوشی ہو گی ۔ پولیس کو فون کرنا اس لیے ضروری ہے کہ ان پانچ غنڈوں کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست تو کرنا ہو گا ۔ ان بے چاروں کو بے یار و مددگار تو چھوڑا نہیں جا سکتا ۔ یہاں بھوکے پیاسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے اور میرا خیال ہے ۔ تم یہ ہرگز پسند نہیں کرو گے ۔ ٹھیک ہے نا ۔ تو تم آ رہے ہو یا ہم ریت کے

ان بوروں کو اٹھوا کر اپنا راستہ لیں۔" محمود روانی کے عالم میں کہتا چلا گیا ۔

"ہائیں ہائیں ۔ محمود ۔ یہ ساری تقریر تم نے جھاڑی ہے، کہیں رات سوتے میں تم نے میری زبان چرا کر تو اپنے منہ میں فٹ نہیں کر لی ۔ ارے باپ رے ۔ اب میں سمجھا ۔ آج میں چپ چاپ کیوں ہوں ۔ میری زبان حرکت میں کیوں نہیں آتی ۔"

"ادھر ادھر کی نہ ہانکو ۔ مجھے بات کر لینے دو۔" محمود نے جھلا کر کہا اور یہ کہتے وقت ریسیور پر ہاتھ رکھنا بھول گیا۔

"کیا مطلب ۔ تمہارے خیال میں میں ادھر ادھر کی ہانک رہا ہوں۔" دوسری طرف سے غرا کر کہا گیا۔

"یہ میں نے تم سے نہیں کہا ۔ ہاں تو تم نے جواب نہیں دیا۔"

"سنو ۔ تم لوگ اپنی موت کو آواز دے چکے ہو ۔ بلکہ تم لوگ کیا اپنی موت کو آواز دے چکے ہو ۔ میں تمہاری موت کو آواز دے چکا ہوں۔"

"یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم بھی ہماری موت کو آواز دے سکتے ہو۔" محمود چہکتی آواز میں بولا۔

"عنقریب میں تم لوگوں کا نام و نشان مٹا دوں گا۔" وہ

بولا —

" لیکن اپنے آدمیوں کو تو تم ہم سے دُور رہنے کی ہدایات دیتے ہو۔"

" ہاں ! میں اپنے کام سے کام رکھنے کا عادی ہوں۔ بلاوجہ الجھنیں مول نہیں لیتا۔ اس لیے ٹومبو کو یہ ہدایت دی تھی، لیکن اب جب کہ تم راستے میں آ چکے ہو تو ہم تم سے دُور نہیں رہیں گے۔ بلکہ ہر آن نزدیک ہونے کی کوشش کرتے رہیں گے۔"

" تو محکمۂ سراغرسانی کے خاص کمرے سے ریکارڈ تم نے اڑایا ہے ؟"

" میں نے نہیں — میرے کارندوں نے — ایسے کام میں اپنے ہاتھ سے نہیں کرتا — میرا تو بس حکم چلتا ہے۔"

" ایک ہی بات ہے — اب یہ بھی بتا دو کہ وُہ سارا ریکارڈ کہاں ہے ؟"

" یہ کیا بات ہوئی — کیوں بتا دوں۔"

" اچھا یہ بتا دو — تم اس کا کیا کرو گے ؟"

" یہ بھی نہیں بتا سکتا۔"

" سونے کا جہاز کہاں ہے ؟"

" سونے کا جہاز — کیا مطلب ؟" دوسری طرف سے چونک کر

کہا گیا — محمود نے محسوس کیا — اس کا چونکنا مصنوعی ہرگز نہیں ہو سکتا —

" ہمارے مُلک کی طرف حکومت چمپان نے سونے کا ایک جہاز روانہ کیا تھا — اس میں کئی ٹن سونا تھا، لیکن وُہ جہاز اپنے راستے سے غائب ہو گیا ہے۔"

" دلچسپ ترین اِطلاع ہے — کاش یہ شاندار کام میں کر سکتا — جس نے بھی یہ کام کیا ہے — وُہ یقیناً بہت شاندار آدمی ہو گا —" اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

" گویا یہ کام تمھارا نہیں — ہاں، تمھارا ہو بھی کیسے سکتا ہے، تم تو ادھر ریکارڈ چوری کرنے میں لگے تھے — کیا تم کوئی غیر مُلکی ایجنٹ ہو — کوئی بین الاقوامی جاسوس ہو ؟"

" میرے بارے میں تم کچھ بھی سوچتے رہو — تمھیں کھُلی چھٹی ہے۔" دوسری طرف سے ہنس کر کہا گیا۔

" کیا تم اپنے ان غنڈوں کے لیے کچھ نہیں کرو گے ؟"

" میرے لیے ایسے نہ جانے کتنے آدمی کام کرتے ہیں۔" وُہ بولا اور ساتھ ہی ریسیور رکھ دیا۔

" جانتے ہو — میری اس بات کا اس نے کیا جواب دیا ہے، کہتا ہے — میرے لیے ایسے نہ جانے کتنے آدمی کام کرتے ہیں۔"

" ہاں — باس نے ٹھیک ہی کہا ہے — ان کے لیے واقعی بہت

سے لوگ کام کرتے ہیں ۔ بلکہ ان کے اشاروں پر کام کرتے ہیں ، لہذا انھیں ہماری کیا ضرورت ۔" ٹومبو نے حسرت زدہ آواز میں کہا ۔

" اب جب کہ تمھارے باس نے تمھیں بچانے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا اور تمھیں موت کے منہ میں دھکیل دیا ۔ تو کیا تم اب بھی اس کا نام نہیں بتاؤ گے ۔ آخر وہ کون ہے ؟"

" میں نہیں جانتا ۔ وہ کون ہیں ۔ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی ۔ ایسی کسی کوشش کا مطلب ایک بھیانک موت ہی ہو سکتا تھا ۔"

" لیکن باس کے احکامات اور گولیاں وغیرہ تو تم ہی لاتے رہے ہو ۔" محمود بولا ۔

" یہ ۔ یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو ۔" اس نے حیران ہو کر کہا ۔

" عقل سے کام لے کر ۔ تمھارے ساتھیوں کے پاس شاید عقل نام کی کوئی چیز نہیں ہے ۔ ابھی ابھی ان سے گفتگو کے دوران تم نے کہا تھا کہ فکر نہ کرو ، باس کے پاس ایسی گولیوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے ۔ آخر تمھیں یہ بات کس طرح معلوم ہے ۔ دوسرے یہ کہ فون پر بات بھی تم نے ہی کی ، گویا تم ہی وہ آدمی ہو ۔ جو گولیاں اور احکامات یہاں

تک لاتے ہو ۔ ان حالات میں ہم یہ کیوں نہ سمجھیں کہ تم باس سے واقف ہو ۔"

" نہیں ۔ یہ غلط ہے ۔" وہ بولا ۔

" محمود ۔ ہم نے پولیس کو فون نہیں کیا ۔ ابا جان اور انکل اکرام کو پریشان کرنا مناسب نہیں ۔ وہ ریکارڈ کے سلسلے میں نہ جانے کہاں مصروف ہوں گے ۔" فاروق نے خیال دلایا ۔

" اوہ ہاں ! یہ کام تو سب سے پہلے کرنا چاہیے ۔" محمود نے کہا اور پولیس کو فون کرنے لگا ، پھر ریسیور رکھ کر ٹومبو کی طرف مڑا :

" ہاں تو ٹومبو ۔ کیا کہتے ہو ؟"

" اس میں کوئی شک نہیں کہ گولیاں اور احکامات میں ہی لاتا رہا ہوں ، لیکن یہ بھی درست ہے کہ میں باس کو نہیں جانتا ۔ گولیاں اور احکامات مجھے صبح سویرے ۔ منہ اندھیرے ایک پبلک فون بوتھ کے پاس رکھے کوڑے کے ڈرم سے نکالنا ہوتے ہیں ۔"

" یہ فون بوتھ اور ڈرم کہاں ہے ؟"

" کریم کالونی کی تیسری سڑک پر ۔"

" کریم کالونی ۔" ان کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا ، پھر فاروق بولا :

"خیر۔ ہم اس ڈرم کو بھی چیک کر لیں گے۔"

"لیکن اب وہاں کیا ملے گا ۔ میری گرفتاری کے بعد بھلا وُہ اس ڈرم میں کیوں کچھ رکھنے لگا۔" ٹومبو بولا۔

"ہاں ۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ ویسے کیا تم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ باس کون ہے ۔"

"میں نے بہت سوچا ۔ اندازے لگائے ، لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا ۔ صاف ظاہر ہے ۔ ڈرم میں گولیاں اور احکامات وُہ رات کے کسی حصّے میں ڈالتا ہو گا ۔ گویا ساری رات ڈرم پر نظریں جمائے رکھتا ، تب کہیں جاکر باس کو دیکھ پاتا ، لیکن اس میں بھی یہ خطرہ تھا کہ باس کو یہ بات معلوم ہو جاتی ۔ اس صورت میں وُہ بھلا مجھے زندہ چھوڑ سکتا تھا ۔ ہرگز نہیں ۔ بس موت کے خوف سے میں نے یہ کوشش کبھی نہیں کی ۔"

"کیا اس ڈرم سے صرف تم ہی احکامات نکالتے ہو ۔ کیا خبر تمھارے علاوہ بھی اس کا کوئی آدمی نکالتا ہو۔" فاروق نے خیال ظاہر کیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ اس طرح تو دوسرا لفافہ میرے ہاتھ اور میرا لفافہ اس کے ہاتھ لگ سکتا تھا ۔ نہیں ۔ شہر میں کوڑے کے ڈرم جگہ جگہ نصب ہیں ۔ ان حالات میں وُہ ایک ہی ڈرم

سے کام کیوں کر لے سکتے ہیں۔"

"تمھارے باس نے تمھیں موت کے منہ میں دھکیل دیا ہے ۔ کیا اب بھی تمھیں اس سے نفرت محسوس نہیں ہو رہی۔"

"نہیں ، کیونکہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ۔ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں تمھارے راستے میں نہ آؤں ۔ نہ اس میں میرا کوئی قصور ہے ۔ میں تمھارے راستے میں نہیں آیا ۔ تم ہی میرے راستے میں آ گئے تھے ۔"

"لیکن اس میں قصور ہمارا بھی تو نہیں ۔ ہم تو بہت کوشش کرتے ہیں ۔ کوئی جاسوسی چکر نہ چلے ۔ ہم کسی کے راستے میں نہ آئیں ۔ کوئی ہمارے راستے میں نہ آئے ، لیکن ایسا ہوتا نہیں ۔ چکر چل کر رہتے ہیں ۔ ہم لوگوں کے راستے میں آ کر رہتے ہیں ۔ لوگ ہمارے راستے میں آئے بغیر نہیں رہتے ۔" فاروق جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔

"یار بات مختصر کیا کرو۔" محمود نے تلملا کر کہا۔

"اوہ سوری ۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"خیر بھئی ۔ ہمیں کیا ۔ تم اپنے باس سے نفرت کرو یا نہ کرو ۔ تمھاری مرضی ۔ نفرت بھی کرنے لگ گئے تو ہمیں کیا فائدہ ہو جائے گا ۔"

"ارے ۔ میں مرا ۔"

اچانک ڈوبو دوہرا ہو گیا — اس کے چہرے پر شدید تکلیف
کے آثار ظاہر ہو گئے —

" کیا ہوا — خیر تو ہے — تمھارے پیٹ میں درد تو نہیں؟"
فاروق بولا۔

" ہاں — بہت شدید درد ہے — دراصل آج میں سفید گولی
کھانا بھول گیا — اب یہ بات یاد آئی ہے۔"

" تو پھر اب کھا لو۔"

اس نے جلدی جلدی جیبیں ٹٹولیں اور پھر شیشی نکال کر
اس میں سے گولی نکال کر نگل گیا — تھوڑی دیر تک تکلیف
کے آثار اس کے چہرے پر جوں کے توں رہے، پھر آہستہ
آہستہ ختم ہوتے چلے گئے۔

" شیشی میں تو آخری گولی تھی — اب تم کیا کرو گے؟"
محمود نے پوچھا۔

" باس گولیاں حساب سے دیتا ہے — کسی شخص کو ایک دن
میں ایک گولی سے زیادہ نہیں مل سکتی — ہر ایک کو روزانہ
ایک گولی دی جاتی ہے۔"

" اوہ، پھر اب کیا ہو گا — تم لوگ تو مر جاؤ گے بے موت۔"
فاروق حیران ہو کر بولا۔

" یہ سوچنا آپ لوگوں کا کام ہے کہ اب کیا ہو گا، کیونکہ

اب ہم قانون کے مہمان ہیں۔" اس نے کہا اور سر جھکا لیا۔
شاید اسے آنے والی تکلیف کا خیال ستانے لگا تھا۔

اسی وقت بھاری قدموں کی آواز سنائی دی — فاروق
دروازہ پہلے ہی کھول چکا تھا — ایک پولیس انسپکٹر اپنے
ماتحتوں کے ساتھ اندر داخل ہوا اور پانچوں مجرموں کو گرفتار
کر لیا گیا — محمود نے مختصر طور پر حالات انھیں سنائے اور
ان کی حفاظت کی خاص تاکید کی، پھر وہ وہاں سے نکلے اور اپنی
موٹر سائیکل کی طرف بڑھے:

" اب کہاں چلیں؟"

" فرزانہ ابھی تک نگران کے گھر میں ہمارا انتظار کر رہی ہو
گی — وہاں موٹر سائیکل بھی موجود ہے — اس لیے وہیں جانا پڑے
گا۔" محمود بولا۔

" خیر — آج ہم نے فرزانہ کے مقابلے میں کافی کامیابی
حاصل کر لی ہے — وہ تو وہاں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہو گی۔"
فاروق نے خیال ظاہر کیا۔

" خیر — یہ تو نہ کہو — فرزانہ نے لاشوں کو اٹھوانے کا بندوبست
تو کیا ہی ہو گا — اس کے علاوہ بھی وہ نچلی بیٹھنے والی نہیں۔"
محمود نے نفی میں سر ہلایا۔

" تمھیں اس کی طرف داری کرنے کی کچھ عادت سی پڑتی

جا رہی ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"یہ صرف تمھارا خیال ہے۔"

موٹر سائیکل پر سوار ہو کر وہ نگران کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ نزدیک پہنچے ہی تھے کہ فرزانہ پر نظر پڑی۔ فرزانہ بھی انہی کو دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی طرف بڑھے:

"معلوم ہوتا ہے۔ کوئی بڑا تیر مار آئے ہو۔" فرزانہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"تو کیا تم نے کوئی چھوٹا سا تیر مارا ہے۔" فاروق نے منہ بنایا اور محمود مسکرا دیا۔

"میں بے چاری یہاں کر ہی کیا سکتی تھی۔ پولیس کو بلا کر لاشیں اٹھوانے کا انتظام ضرور کرایا ہے۔"

"دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا۔ آج فرزانہ کچھ نہیں کر سکی ہو گی۔" فاروق بولا۔

"آخر تم ایسا کون سا کارنامہ انجام دے آئے ہو؟" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"کارنامہ تو خیر نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اصل آدمی ابھی تک اندھیرے میں ہے۔ ہم اس کے بارے میں، کچھ معلوم نہیں کر سکے۔"

"پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ ساری بات تفصیل سے بتاؤ۔" فرزانہ جھلا کر بولی۔

"جلنے بھننے کی ضرورت نہیں۔ اس کام کے لیے تمھاری جوتی ہی کافی ہے۔ چلو محمود۔ سنا دو۔ یہ بھی کیا یاد رکھے گی۔"

"آخر میں دو دو مرتبہ محنت کیوں کروں۔" محمود نے بھی جل کر کہا۔

"دو دو مرتبہ۔ کیا مطلب؟"

"ابھی جب ہم دفتر جائیں گے تو ابا جان کو بھی ساری کہانی سنانا پڑے گی۔" محمود نے جواب دیا۔

"ہاں! بات ٹھیک ہے۔ خیر دفتر میں ہی سن لیں گے، اب یہاں ہمارا کام بھی تو کوئی نہیں۔ آؤ چلیں۔" فرزانہ نے کہا۔

دوسری موٹر سائیکل اٹھا کر وہ دفتر کی طرف روانہ ہوئے، اس بھاگ دوڑ نے انھیں قدرے تھکا دیا تھا۔ دفتر پہنچے تو بابا فضل دین اونگھتا نظر آیا:

"اس کا مطلب ہے۔ ابا جان دفتر میں نہیں ہیں۔"

فضل دین اس کی آواز سن کر چونک اٹھا اور ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔

"خیر تو ہے۔ آپ اونگھ کس خوشی میں رہے ہیں۔" فاروق

بولا —

" لو محمود — اب اونگھنا بھی کسی خوشی میں شامل ہو گیا۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

" مم — میں — میں حیران ہوں — مجھے اونگھ کیوں آ گئی — آج تک ایسا نہیں ہوا۔" بابا فضل دین نے بوکھلا کر کہا۔

" تب آپ اپنا ڈاکٹری معائنہ کرائیں۔" محمود نے مشورہ دیا —

" جج — جی بہتر۔" وہ بولا۔

" ابا جان وغیرہ کہاں ہیں ؟"

" جی۔ پتا نہیں — بھلا میں کیا بتا سکتا ہوں۔"

" ابا جان کے آنے تک کیوں نہ شیخ صاحب سے سونے کے جہاز کے بارے میں معلوم کر لیں ، شاید اس وقت تک کچھ معلوم ہو چکا ہو۔"

" ہاں ٹھیک ہے — آؤ چلتے ہیں۔"

وہ شیخ صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے —

" کہاں سے آ رہے ہو ؟" وہ سنجیدہ لہجے میں بولے۔

" نگران اور انچارج کو قتل کیا گیا ہے انکل — انھوں نے خودکشی نہیں کی — ان کے قاتلوں کے تعاقب میں گئے تھے — ان کی گرفتاری تک تو کامیابی حاصل کر چکے ہیں ، لیکن اصل آدمی کا

سراغ ابھی تک نہیں لگ سکا ہے — وہ لوگ نگران اور انچارج کے گھر والوں کو بھی ہلاک کر چکے ہیں۔"

" اُف !" ان کے منہ سے نکلا۔

" جہاز کے بارے میں کیا اطلاع ہے سر ؟"

" اس کا کوئی پتا نہیں چل رہا ، کوشش جاری ہے۔"

" ہوں — اور ادھر ریکارڈ واپس حاصل کرنے کے سلسلے میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔" فرزانہ بڑبڑائی ، پھر محمود نے کہا :

" اچھا انکل بہت بہت شکریہ — ہم جہاز کے بارے میں معلوم کرنے آ گئے تھے۔"

" کوئی بات نہیں۔"

" ویسے جہاز پر کتنا سونا آ رہا تھا ؟"

" ٹنوں کے حساب سے — درست وزن نہیں بتایا جا سکتا۔"

" اوہ — اچھا۔"

وہ باہر نکلے ہی تھے کہ محمود چونک اٹھا :

" ارے — اسے تو ہم بھول ہی گئے۔"

" کسے — ویسے یہ کوئی خاص بات نہیں — کسی نہ کسی کو تو ہم بھول ہی جاتے ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا ، فرزانہ مسکرا دی۔

" ڈرم کو — کوڑے کے ڈرم کو — کریم کالونی کی تیسری سڑک پر — پبلک فون بوتھ کے نزدیک۔"

"اوہ ہاں۔ابا جان کا انتظار کرنے سے یہ بہتر ہے کہ لگے ہاتھوں اس ڈرم کا بھی جائزہ لے آئیں اور وہاں ایک سادہ لباس والے کی ڈیوٹی بھی تو لگانی ہے۔چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی۔"

"ہاں! اگرچہ اس کا فائدہ نہیں ہوگا۔"

وہ کریم کالونی کی طرف روانہ ہوئے۔اچانک ایک جیپ آندھی اور طوفان کی طرح مخالف سمت سے آئی اور ان کے پاس سے گزر گئی—

سفید لفافہ

"آخر کیا ہوا جمشید۔کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔"

"میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔" انھوں نے جیپ میں بیٹھتے ہوئے کہا۔خان رحمان بھی جلدی سے اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

"خطرہ۔کیسا خطرہ۔اور کس سے محسوس کر رہے ہو؟"

"سنو خان رحمان۔ریکارڈ کی گم شدگی سے متعلق لوگوں کو مجرم بہت تیزی سے ہلاک کرتا چلا جا رہا ہے۔اس نے سب سے پہلے نگران اور انچارج کو ہلاک کیا، پھر احسان بھٹہ کو۔شاید احسان بھٹہ مجرم کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا تھا۔اس نے اسی پر بس نہیں کی۔احسان بھٹہ کے دوست ذاکر شاہ کو بھی نہیں چھوڑا۔اور اب میں سوچ رہا ہوں۔کہیں وہ ذاکر شاہ کے گھر کے افراد پر بھی حملہ نہ کر دے۔یہ سوچ کر کر ذاکر شاہ نے احسان بھٹہ کے بارے میں اپنے گھر کے افراد کو بھی بتایا ہو گا۔"

"اوہ۔ بہت دُور کی سُوجھی جمشید، لیکن میرا خیال ہے۔ مجرم اتنی دُور تک نہیں سوچے گا۔"

"خیر۔ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔"

تیز رفتاری سے چلتے وُہ پھر ذاکر شاہ کے گھر کے پاس پہنچے، اسی پڑوسی کو بلایا گیا۔ وُہ حیران پریشان سا آ کھڑا ہوا:

"کیا آپ بتا سکتے ہیں۔ ذاکر شاہ کے گھر کے افراد شادی میں شرکت کے لیے کہاں گئے ہیں؟"

"جی ہاں! میں اس گھر سے واقف ہوں۔ یہاں سے قریباً دو کلو میٹر دُور ہے۔ دراصل ذاکر شاہ کو کہیں کام جانا تھا، لہذا ان کے گھر والوں کو میں ہی شادی والے گھر تک چھوڑ کر آیا تھا۔"

"تو پھر مہربانی فرما کر ہمیں اس گھر تک لے چلیے۔"

"ضرور۔ کیوں نہیں۔"

وُہ شادی والے گھر پہنچے۔ یہ گھر لڑکے والوں کا تھا۔ لڑکے کے باپ کو بلایا گیا۔ وُہ حیران پریشان سا لپکتا آیا۔

"ہمیں فوری طور پر ذاکر شاہ کے گھر والوں کے پاس لے چلیے۔ ان کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔"

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"وقت ضائع نہ کیجیے۔"

"تب پھر وہ یہاں نہیں ہیں۔ ابھی ابھی ایک صاحب آئے تھے۔ انھوں نے بتایا تھا۔ ذاکر شاہ کو کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ وُہ کار میں آیا تھا۔ اسی میں ذاکر شاہ کے گھر والوں کو لے گیا۔"

"اوہ۔ یہ کیا ہوا۔" انسپکٹر جمشید چلائے، پھر جلدی سے بولے:

"کار کس طرف گئی تھی؟"

"جنوبی سڑک پر۔"

انھوں نے کچھ کہے بغیر جیپ جنوبی سڑک پر چھوڑ دی۔ رفتار اس قدر تیز تھی کہ جیپ سڑک پر اچھل اچھل جا رہی تھی۔ اور پھر جنگل میں ایک طرف انھیں ایک سفید کار کھڑی نظر آئی۔ انھوں نے بھی کار کا رُخ اسی طرف کر دیا۔

"خان رحمان ہوشیار ہو جاؤ۔ پستول ہاتھ میں لے لو۔"

"اچھا۔ فکر نہ کرو۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنا پستول نکال لیا، انسپکٹر جمشید نے جیپ سفید کار کے عین پیچھے روکی اور نیچے اُتر آئے، اب ان کے ہاتھوں میں بھی پستول تھا۔

"آؤ خان رحمان۔ جلدی کرو۔ موت اور زندگی میں بہت کم فاصلہ رہ گیا ہے۔ اور شاید ہمیں دیر ہو بھی چکی ہو۔"

دونوں دوڑ پڑے۔ یہاں تک کہ انھیں ایک شخص کھڑا

نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول نما ایک آلہ تھا اور اس آلے کا رُخ اس کے سامنے کھڑے چند بچّوں اور عورتوں کی طرف تھا۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اس پر فائر کر دیا۔ وُہ اچھل کر گرا۔ اور تڑپنے لگا۔ سامنے کھڑے بچّوں اور عورتوں نے ان کی طرف دیکھا۔

نزدیک پہنچے تو وُہ سب تھر تھر کانپ رہے تھے:

" گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اب آپ لوگ خطرے سے باہر ہیں۔"

" اُف۔ خدا۔ یہ۔ یہ سب کیا تھا۔"

" آپ ذاکر شاہ کے گھرانے کے افراد ہیں نا ؟"

" ہاں۔" ایک عورت بولی۔

" کیا آپ لوگوں کو ذاکر صاحب نے احسان بھٹّہ کے بارے میں کچھ باتیں بتائی تھیں ؟"

" کئی باتیں۔ عجیب سی باتیں۔ یہ کہ وُہ کسی سے خوف زدہ ہے۔ اور بھی اس قسم کی باتیں تھیں۔"

" بس اسی لیے یہ شخص آپ لوگوں کو ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ مہربانی فرما کر وُہ سب باتیں تفصیل سے بتا دیں۔"

" انھوں نے بتایا تھا۔ کہ وُہ اس شخص کے بارے میں پوری تفصیل سے ہر بات لکھ کر ایک جگہ رکھ چکے ہیں، اگر انھیں کچھ ہو جائے تو وہ اس جگہ کے بارے میں پولیس کو بتا دیں،

ہمارے ابّو نے ہمیں یہ بات یہی سوچ کر بتائی تھی کہ اگر انھیں کچھ ہو جائے تو ہم اس جگہ کے بارے میں پولیس کو بتا دیں۔"

" کیا۔ تو آپ لوگوں کو اس جگہ کے بارے میں معلوم ہے۔" انسپکٹر جمشید پُر جوش لہجے میں بولے۔

" جی ہاں۔ انھوں نے وُہ لفافہ اپنے بنک کے لاکر میں رکھا ہوا ہے۔"

" اوہ۔ آئیے۔ جلدی کریں۔ اب ہم ایک منٹ بھی ضائع نہیں کر سکتے۔" انھوں نے گھبرا کر کہا۔

جلد ہی وُہ اڑے جا رہے تھے۔ ذاکر شاہ کے گھر والوں کو بھی انھوں نے جیپ کے پچھلے حصّے میں بٹھا لیا تھا:

" کون سا بنک ہے ان کا ؟"

" جی نیشنل بنک۔"

آندھی اور طوفان کی طرح چلتے وہ بنک پہنچے۔ انسپکٹر جمشید نے فوراً ہی مینجر کو جا پکڑا۔ جونہی انھوں نے اپنا تعارف کرایا، وُہ کھڑا ہو گیا:

" مہربانی فرما کر فوری طور پر احسان بھٹّہ کے لاکر کی طرف چلیے۔"

" خیر تو ہے جناب۔"

"خیر ہوتی تو اس قدر جلدی کی کیا ضرورت تھی۔" وہ بولے۔
"آئیے میرے ساتھ۔"

وہ لاکرز والے حصے میں آئے۔ دوسرے ہی لمحے مینجر اچھل پڑا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ یہ دیکھتے ہی انسپکٹر جمشید سرد آواز میں بولے:

"خبردار۔ اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ ورنہ چھلنی کر دوں گا۔"

لاکر پر جھکا ہوا شخص بوکھلا کر مڑا۔ انھوں نے دیکھا، اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا سفید لفافہ تھا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کی طرف قدم بڑھاتے۔ ایک زبردست دھماکا ہوا۔ اور بنک کی پوری عمارت لرز اٹھی۔ لاکرز والے حصے میں گہرا دھواں پھیل گیا۔

انھوں نے آنکھوں میں شدید جلن محسوس کی۔ شاید دھوئیں کا بم مارا گیا تھا۔ وہ زیادہ دیر اپنے پیروں پر کھڑے نہ رہ سکے۔ گرتے چلے گئے۔

○

"میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جیپ ابا جان کی تھی،

اگرچہ ہم نمبر نہیں پڑھ سکے۔" محمود بولا۔

"میں بھی یہی کہتا ہوں۔" فاروق نے کہا۔

"میں تو یہاں تک کہہ سکتی ہوں کہ اس میں ساتھ والی سیٹ پر انکل خان رحمان بیٹھے تھے۔" فرزانہ بولی۔

"تو پھر۔ ڈرم پر فی الحال بھیجو لعنت۔ آؤ ہم بھی ان کے پیچھے چلیں۔" محمود نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ یہی کرنا چاہیے۔"

انھوں نے موٹر سائیکلیں موڑیں۔ اس وقت تک جیپ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

"آگے جا کر وہ نہ جانے کس طرف مڑ جائیں۔ رفتار میں ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔" محمود بڑبڑایا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم اس سڑک پر سیدھے تو چل ہی سکتے ہیں۔" فاروق بولا۔

انتہائی تیز رفتاری سے چلنے کے باوجود بھی وہ جیپ کو نہ دیکھ سکے۔ اور پھر جیپ انھیں ایک بنک کے سامنے کھڑی نظر آئی۔ ابھی وہ اترنے کی تیاری میں مصروف تھے کہ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ ساتھ ہی دھوئیں کا ایک بادل اٹھتا نظر آیا۔

"دھماکا ہو گیا۔ اب ہم اندر نہیں جا سکتے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

" اندر والے باہر نکلنے کی فکر میں ہوں گے۔ ہم اندر جا کر کیا تیر ماریں گے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

" یہ تم پر ہر وقت منہ بنانے کا بھوت کیوں سوار رہتا ہے؟"

" بھوت سے پوچھو۔"

" لعنت تیرے کی۔ اُدھر دُھوئیں کا بم پھٹا ہے۔ بنک سے دُھواں نکل رہا ہے۔ اور اِدھر تمھیں ایک دُوسرے سے جھگڑنے کی پڑی ہے۔ ہے کوئی تُک۔" محمود نے جھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

عین اسی وقت انھوں نے ایک آدمی کو بنک سے نکلتے دیکھا۔ دھماکا ہونے کے بعد اندر سے نکلنے والا یہ پہلا آدمی تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفید لفافہ تھا۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وُہ ایک کار میں بیٹھ گیا۔

" جلدی کرو۔ ہمیں اس کا تعاقب کرنا ہے۔ اگر اس کا تعلق بنک کے حملے سے ہوتا تو یہ اس طرح بھاگ نکلنے کی فکر میں نہ ہوتا۔ کہیں ابا جان اس کے تعاقب میں تو یہاں تک نہیں آئے تھے اور جب وُہ اس تک پہنچ گئے تو یہ دُھوئیں کا بم مار کر بھاگ رہا ہے۔"

" نظر تو یہی آ رہا ہے۔ خیر اس کا تعاقب کرنے میں کوئی

حرج نہیں۔"

انھوں نے موٹر سائیکلوں کو اس کار کے پیچھے لگا دیا۔ اور رفتار بڑھاتے چلے گئے۔ اچانک کار ایک سڑک پر مڑتی نظر آئی۔ چند سیکنڈ کے لیے وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

" جلدی کرو۔" فرزانہ بے چین ہو گئی۔

جونہی وہ موڑ مڑے کار پھر نظر آنے لگی۔ پھر رفتہ رفتہ درمیانی فاصلہ کم ہونے لگا، آخر وہ کار سے آگے نکل گئے، انھیں بہت حیرت ہوئی کہ کار کی رفتار کم کیوں ہو گئی۔ اس وقت تک وُہ شہری حدود سے باہر نکل چکے تھے۔ آگے نکلتے ہی محمود نے کار والے کو رُکنے کا اشارہ کر دیا۔ ساتھ ہی محمود نے جوتے کی ایڑی میں سے چاقو نکال لیا۔ کار والے نے کار روک لی اور پھر کھڑکی میں سے منہ باہر نکال کر چلایا:

" کیا بات ہے۔ کیا یہ سڑک تمھارے باپ کی ہے؟"

" جی نہیں۔" فاروق نے فوراً کہا۔

" تو پھر۔ تم نے میرا راستہ کیوں روکا ہے؟"

" بس یونہی۔ ذرا شوق ہے ہمیں دوسروں کا راستہ روکنے کا۔ اس میں بہت فائدے ہیں۔" فارُوق گنگنایا۔

" یہ کیا بکواس ہے۔" وہ جھلا کر بولا۔

"ہاں۔ آپ اسے بکواس بھی کہہ سکتے ہیں۔ اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔ کچھ لوگوں کی سمجھ ناقص بھی ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کی بات کو بالکل بکواس خیال کرتے ہیں۔"

"تمھاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔"

"اچھا تو ہم براہِ راست بات کرتے ہیں۔ وہ سفید لفافہ ہمارے حوالے کر دو۔"

"کون سا سفید لفافہ۔" اس نے چونک کر کہا۔

"وہی۔ جو تم نیشنل بنک سے اڑا کر لائے ہو۔"

"تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ بے پر کی اڑائے جا رہے ہو۔" اس نے چیخ کر کہا۔

"یہی تو کمال ہے جناب۔ آج کل تو لوگ پر کی نہیں اڑا پاتے۔ ہم بے پر کی اڑائے چلے جا رہے ہیں۔ اسے کمال نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

"میں۔ میں شاید پاگل ہو جاؤں گا۔"

"اگر اللہ کو یہی منظور ہے تو آپ کو پاگل ہونے سے کون روک سکتا ہے۔" فارُوق بھلا کب چُپ رہنے والا تھا۔

"دیکھیے جناب۔ اب آپ اِدھر اُدھر کی ہانک رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ پہلے ہمارے ساتھی نے بھی اِدھر اُدھر

کی ہانکی تھی۔ مہربانی فرما کر وہ سفید لفافہ نکالیے۔ ورنہ۔"

"ورنہ کیا؟" اس نے گرج دار آواز میں کہا۔

"اس چاقو کو دیکھ رہے ہیں جناب۔"

"ہاں! یہ اس قدر چھوٹا ہے کہ مشکل سے ہی دیکھ پا رہا ہوں۔" اس کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

"تو پھر سُن لیجیے۔ یہ دُنیا کا بہترین چاقو ہے۔ لوہے کو اس طرح کاٹ دیتا ہے جیسے موم کو۔ یہ آپ کے جسم کی ہڈیوں کو نہایت آسانی سے تراش سکتا ہے۔ اب آپ کیا کہتے ہیں۔"

"ٹھہرو۔ میں تمھیں لفافہ دیتا ہوں۔" اس نے یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ جب ہاتھ باہر آیا تو وہی پستول نما بلو پائپ تھا۔ جس سے ان کی پہلے بھی شناسائی ہو چکی تھی۔

"ارے باپ رے۔ پھر وہی۔" محمود نے بوکھلا کر کہا اور ساتھ ہی لوٹ لگا گیا۔ فاروق اور فرزانہ نے بھی دیر نہ لگائی۔ ادھر کار چل پڑی۔ اور تیزی سے ان کی طرف بڑھی، انھوں نے بجلی کی سی تیزی سے اِدھر اُدھر لڑھک کر خود کو بچایا۔ کار آگے جا کر رُکی اور پھر ان کی طرف مُڑی۔ اب وہ پھر ان کی طرف آئی اور پوری رفتار سے آئی۔

"ہائیں۔ یہ تو ہمیں کچل دینا چاہتا ہے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"اللہ اپنا رحم فرمائے۔ اِس طرح کام نہیں چلے گا۔" محمود نے کہا۔

"تو جس طرح کام چلے گا۔ اس طرح کیوں نہیں چلاتے۔" فاروق تلملا کر بولا۔

"ہاں۔ اب یہی کرنا ہو گا۔" محمود نے کہا اور واپس آتی کار کے اگلے ٹائر پر چاقو کھینچ مارا۔ چاقو نشانے پر لگا اور ٹائر ایک دھماکے سے پھٹا۔ کار والے نے بریک لگائے اور کار سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

"درختوں کے پیچھے۔" محمود نے نعرہ لگایا۔

اب ان کے پاس کو ہتھیار نہیں تھا۔ جب کہ دشمن کے پاس بلو پائپ جیسا خطرناک ہتھیار موجود تھا۔ وُہ اس ہتھیار کی تباہ کاری دیکھ چکے تھے۔ لہٰذا درختوں کے پیچھے دَم سادھ کر کھڑے ہو گئے۔

"تم تو مجھ سے سفید لفافہ وُصول کرنے چلے تھے۔ اب بھاگے کیوں پھر رہے ہو؟" کار والے نے بلند آواز میں کہا۔

اب وُہ اتنے بے وقوف بھی نہیں تھے کہ طیش دلا دینے والے اس جُملے کا جواب دے بیٹھتے۔ اس طرح دشمن کو ان کے چھپنے کی جگہ معلوم ہو جاتی اور وُہ تیر کی طرح ان کی طرف آتا، کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ ان کے پاس لے دے کے

ایک چاقو تھا۔ اور وُہ چاقو بھی ٹائر پھاڑنے میں استعمال ہو چکا تھا۔

"ارے۔ بس نکل گئی ساری بہادری۔ خیر۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔ میں بھی تمہیں تلاش کر کے چھوڑوں گا۔" یہ کہہ کر وُہ درختوں کی طرف دوڑا اور ایک ایک درخت کے دُوسری طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اچانک اس کے سینے پر دو پیر پورے زور سے لگے اور وُہ منہ کے بل گرا۔ بلو پائپ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ فرزانہ نے درخت کے پیچھے سے نکل کر بلو پائپ اٹھا لیا۔ کار والے کے سینے پر یہ وار محمود نے کیا تھا۔ جونہی وہ اس درخت کے نزدیک پہنچا جس کے پیچھے محمود چھپا ہوا تھا۔ اس نے ایک شاخ کو پکڑ کر دونوں پیر اس کے سینے پر دے مارے۔

اب بلو پائپ فرزانہ کے ہاتھ میں تھا اور محمود اس کے سینے پر چڑھا تابڑ توڑ مُکّے برسا رہا تھا۔ مُکّے برسانے میں فاروق نے بھی اس کی مدد شروع کر دی۔ جلد ہی وُہ بے سُدھ ہو گیا۔

"فرزانہ۔ اسے ہم سنبھال لیں گے۔ تم کار میں سے وُہ سفید لفافہ نکال لاؤ۔ ذرا دیکھیں تو سہی۔ وُہ ہے کیا۔" محمود نے کہا۔

"اچھا!" فرزانہ نے کار کی طرف دوڑ لگا دی۔ ادھر دونوں اپنے رُومالوں کے ذریعے دشمن کو باندھ رہے تھے۔ باندھنے کے لیے یہاں اور تھا ہی کیا؛ تاہم وُہ اس حد تک اس کی پٹائی کر چکے تھے کہ اب وُہ بھاگنے کے قابل نہیں رہا تھا۔
ایسے میں انھوں نے فرزانہ کی آواز سُنی:
"سفید لفافہ کار میں نہیں ہے۔"

باس کا نام

"کیا مطلب۔ سفید لفافہ کار میں نہیں ہے۔ تو پھر ہمیں اس کی جیبوں کی تلاشی لینی چاہیے۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔ دونوں نے جلدی جلدی اس کی تلاشی لی، لیکن لفافہ نہ ملا:
"فرزانہ، تم نے کار کی اچھی طرح تلاشی نہیں لی۔"
"کیا کہتے ہو، اگر تم نے لفافہ کار میں سے نکال دیا تو میں تمھاری شاگردی اختیار کر لوں گی۔" فرزانہ غصّیلے لہجے میں بولی۔
"کوئی اور بات کہو۔ شاگرد تو تم ہماری پہلے ہی ہو۔" فارُوق مسکرایا۔
"اس خیال میں نہ رہنا۔ میں تو تمھارے کان کاٹ لیتی ہوں۔" فرزانہ نے بھنّا کر کہا۔
"اب زیادہ اپنے مُنہ میاں مٹھو نہ بنو۔ ٹھہرو۔ ہم ابھی کار میں سے لفافہ نکال دیتے ہیں، تم ذرا اس کے پاس آ کر کھڑی ہو جاؤ۔ کوئی شاخ ہاتھ میں لے لو۔"

"اچھی بات ہے۔"

انھوں نے جگہ تبدیل کی اور کار کی تلاشی میں مصروف ہو گئے، لیکن دس منٹ کی مسلسل کوشش کے بعد بھی لفافہ نہ ملا۔

"کیوں۔ مل گیا لفافہ؟" فرزانہ نے ہنس کر کہا۔

"نہیں، لیکن حیرت تو اس بات پر ہے کہ لفافہ کہاں گیا۔"

"کار ایک جگہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوئی تھی۔ شاید اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ ہم اسے نہیں دیکھ سکے۔ وہ لیٹا ہوا ہوگا۔ ہماری توجہ یوں بھی اس کی طرف تھی۔ جونہی کار نے موڑ مڑا۔ دوسرا آدمی لفافہ لے کر نیچے اتر گیا، کیونکہ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ کار کا تعاقب شروع ہو چکا ہے۔"

"اوہ۔ یہ تو بہت بُرا ہوا۔ نہ جانے اس لفافے میں کیا تھا جس کی خاطر ابّا جان آندھی اور طوفان کی رفتار سے جیپ چلا رہے تھے۔" محمود مایوسانہ لہجے میں بولا۔

"ہوں، لیکن اس میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں۔ آؤ اب چلیں۔"

"اور اس کا کیا کریں؟" فاروق نے کار والے کی طرف اشارہ

کیا۔

"تو۔ اسے ہم یہیں چھوڑ جانے کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔ ساتھ لے جانے کی کوئی صورت بھی تو نہیں۔ ہاں شہری حدود میں داخل ہوتے ہی فون کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ آؤ چلیں۔"

ابھی وہ سڑک تک پہنچے ہی تھے کہ دوسری طرف سے ایک جیپ آتی نظر آئی۔ ان کے چہرے کھل اُٹھے، کیونکہ جیپ انسپکٹر جمشید کے علاوہ اور کسی کی نہیں تھی۔ جیپ ان کے نزدیک آ کر رُک گئی اور پھر اس میں سے انسپکٹر جمشید، خان رحمان اور اکرام اُترے۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"سفید لفافہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے، افسوس کامیابی نہیں ہوئی۔" محمود بولا۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونک کر بولے۔

"نیشنل بنک میں مجرم دھماکا کر کے باہر نکل آیا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک سفید لفافہ بھی تھا، ہم نے آپ کی جیپ کو دیکھ کر آپ کا تعاقب شروع کیا تھا، بنک کے باہر آپ کی جیپ بھی نظر آئی تو سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا، لہذا ہم اس کے پیچھے نکل کھڑے ہوئے۔"

"اس صورت میں تمھیں کامیابی کیوں نہ ہوئی؟" انھوں نے چونک کر کہا۔

"اس لیے کہ اس شخص کا ایک ساتھی بھی کار میں موجود تھا، ہم اسے نہیں دیکھ سکے۔ راستے میں ایک موڑ پر کار ہماری نظروں سے اوجھل ہوئی تھی۔ بس وہیں دُوسرا آدمی لفافے سمیت اتر گیا اور ہم اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آ پہنچے۔ ہم اس پر قابو پا چکے ہیں، لیکن چونکہ لفافہ حاصل نہیں کر سکے، اس لیے خود کو ناکام ہی سمجھ سکتے ہیں۔"

"ہوں۔ آؤ۔ ذرا میں بھی اسے دیکھ لوں۔"

وُہ کار والے کے پاس آئے۔ وُہ ہوش میں تھا:

"ہیلو جونی۔ کیا حال ہے؟" انسپکٹر جمشید مُسکرا کر بولے۔

"جونی۔ آپ نے اسے جونی کیوں کہا؟" فارُوق حیران ہو کر بولا۔

"اس لیے کہ اس کا نام جونی ہے۔"

"تو آپ اسے جانتے ہیں؟"

"اچھی طرح۔ یہ ایک پُرانا جرائم پیشہ ہے۔ کئی بار سزا کاٹ چکا ہے۔ ہاں تو جونی۔ یہ کیا چکر ہے۔ تم نیشنل بنک کے لاکرز تک کس طرح پہنچ گئے تھے؟"

"احسان بھٹہ کے لاکر کی چابی میں نے اس کے گھر سے

حاصل کی تھی اور اس کے اندازِ تحریر میں ایک اجازت نامہ بھی گھسیٹ لیا تھا۔ نائب مینجر کو وُہ اجازت نامہ اور چابی دکھا کر ہی میں لاکر تک پہنچا تھا۔ دوسری چابی نائب مینجر لگا کر اپنی سیٹ پر چلا گیا تھا۔"

"چلو۔ یہ تو ہوا۔ یہ بتاؤ۔ تم کس کے لیے کام کر رہے ہو۔"

"میں ان کا نام نہیں جانتا، لیکن ان کے لیے کام ضرور کرتا ہوں۔"

"اور بدلے میں وُہ تمھیں کیا دیتا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ مُجھے اور مُجھ جیسے بہُت سے لوگوں کو ان کے لیے بالکل مُفت کام کرنا پڑتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اس کا جواب ہم دے سکتے ہیں ابّا جان۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"اوہو اچھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ بہت زیادہ معلومات حاصل کر چکے ہو۔" وہ مسکرائے۔

"جی ہاں۔ آپ کی دُعا سے۔"

"خیر۔ فی الحال مجھے اس سے بات کرنے دو۔ ہاں تو جونی۔ کیا کہتے ہو؟"

"باس نے ایک قسم کی گولیوں کے ذریعے بے شمار لوگوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ ہر آدمی کو روزانہ صرف ایک گولی ملتی ہے، اگر ہم وہ گولی نہ کھائیں تو جان لبوں پر آ جاتی ہے۔" جونی نے بتایا۔

"لیکن سوال تو یہ ہے کہ آدمی پہلی مرتبہ گولی کیوں کھاتا ہے؟"

"پہلی مرتبہ اسے پتا ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا چیز کھا رہا ہے، مثال کے طور پر اس نے میرے پاس میرے ایک دوست کو بھیجا، ایک ایسے دوست کو جسے وہ پہلے ہی گولیوں کا عادی بنا چکا تھا۔ اس نے مجھے باتوں باتوں میں گولی کھلا دی۔ جیسے کوئی بچہ دوسرے کو ٹافی کھلا دے۔ یہ گولیاں میٹھی ہیں اور بہت ذائقے دار ہیں۔ پہلی مرتبہ کھاتے وقت کوئی ایک لمحے کے لیے بھی دل میں خیال نہیں لاتا کہ دراصل یہ کیا ہیں۔"

"خیر اس کی بھی وضاحت ہو گئی۔ سوال یہ ہے کہ تمہارا یہ باس چاہتا کیا ہے؟"

"کسی کو نہیں معلوم۔ نہ کسی نے اسے کبھی دیکھا ہے۔ اس کے احکامات مختلف طریقوں سے ہم لوگوں کو ملتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"مختلف طریقوں سے، کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"میں اپنی بات کرتا ہوں۔ مجھے حکم ہے کہ ہر صبح اپنے گھر سے نکل کر سو قدم چلوں۔ سو قدم چلنے کے بعد دائیں ہاتھ ایک درخت نظر آتا ہے۔ اس درخت کے تنے میں ایک کھوہ ہے۔ اس کھوہ میں سے ہدایات اور گولی حاصل کروں، اور خبردار۔ مجھے دیکھنے کی کوئی کوشش نہ کروں، ورنہ گولی سے محروم کر دیا جاؤں گا۔ گولی کا خوف ایسا ہے کہ اس کا کوئی آدمی اس کا راز جاننے کا خیال تک دل میں نہیں لاتا۔"

"ہوں۔ اب تم قانون کے مہمان بن رہے ہو، اب گولی کہاں سے حاصل کرو گے۔" انسپکٹر جمشید طنزیہ لہجے میں بولے۔

"میں اسی خیال سے تو لرز رہا ہوں۔"

"خیر۔ اب چلنا چاہیے۔ محمود۔ تم لوگوں کی کہانی ہم گھر چل کر سنیں گے۔ اپنی بھی سنائیں گے اور پھر فیصلہ کریں گے کہ کیا کیا جائے۔"

"ادھر ابھی تک سونے کے جہاز کا بھی کوئی پتا نہیں چلا۔" فرزانہ نے کہا۔

"ہاں۔ اس سے زیادہ حیران کن بات بھلا کیا ہو گی۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"شہر پہنچ کر شیخ صاحب سے بھی فون پر بات کروں گا۔

شاید جہاز کے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے۔"

"س - سونے - سونے کا جہاز۔" جونی کے منہ سے نکلا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

○

انھوں نے بھی حیران ہو کر جونی کی طرف دیکھا:

"خیر تو ہے جونی - سونے کے جہاز کا ذکر سن کر تم چونک کیوں اٹھے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کہیں تم یہ تو نہیں سمجھ بیٹھے کہ وہ جہاز سونے کا بنا ہوا تھا۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"نن - نہیں - کیا یہ کسی ایسے جہاز کا ذکر ہے جو سونا لے کر آرہا تھا؟"

"ہاں - کیا تم اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو جونی۔" انسپکٹر جمشید بے چین ہو گئے۔

"ہاں انسپکٹر صاحب - جانتا ہوں۔" وہ بولا۔

"تو پھر بتاؤ جونی - جلدی بتاؤ۔"

"لل - لیکن۔" لیکن سے آگے اس نے کچھ بھی نہ کہا تو وہ بے چین ہو گئے۔

"جونی - معموں میں باتیں نہ کرو۔" اکرام غرایا۔

"لیکن سوال یہ ہے جناب کہ مجھے بتانے کا کیا فائدہ ہو گا۔ آپ مجھ سے کیا رعایت کریں گے۔"

"جونی - ہوش میں تو ہو۔" اکرام کو غصہ آگیا۔

"ٹھہرو اکرام - تاؤ کھانے کی ضرورت نہیں - ہاں جونی - تم کیا چاہتے ہو - جس قسم کی رعایت چاہو، ہم دینے کے لیے تیار ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"آپ لوگ میرے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے - کل جب گولی نہیں ملے گی تو میرا جو حال ہو گا - وہ میں ہی جانتا ہوں - اس وقت سرکاری ڈاکٹروں کی پوری ٹیم بھی میرے لیے کچھ نہیں کر سکے گی - لہذا میری ایک تجویز ہے - اگر آپ میری تجویز مان لیں تو میں آپ کو سونے کے جہاز کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔"

"یہ چال چلنے کی کوشش میں ہے سر۔" اکرام بول اٹھا: "میں اس سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔"

"اکرام - خاموش رہو - اس سے مجھے بات کرنے دو - کیا تم نہیں جانتے - سونے کے جہاز کی کتنی اہمیت ہے۔"

"جی ہاں - یہ تو خیر ہے۔"

"اور اگر سونے کے جہاز کے بارے میں کسی بھی شخص کو کچھ

معلوم نہیں ۔ سوائے خاص خاص لوگوں کے ۔"

"جی ہاں ۔ یہ بھی جانتا ہوں ۔" اکرام نے کہا ۔

"لیکن جونی نے ہمیں یہ بات بتائی ہے کہ سونے کا ایک جہاز ہمارے ملک کی طرف آ رہا تھا ۔ اس کا مطلب ہے ۔ اسے ضرور جہاز کے بارے میں کچھ معلوم ہے ۔ میں ہر قیمت پر وہ بات معلوم کرنا پسند کروں گا ۔"

"تو پھر میری تجویز مان لیں ۔"

"تمہاری تجویز کیا ہے جونی ؟"

"مجھے یہاں سے جانے دیں ۔ سفید لفافہ تو اب تک باس کے پاس پہنچ بھی چکا ہوگا ۔ میں بھی جا کر انہیں رپورٹ پیش کروں گا کہ میرے ساتھ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا ۔ اس طرح میں بدستور اس کا ایک کارکن رہوں گا ۔ مجھے سفید گولی ملتی رہے گی ۔ میں اس کے لیے کام کرتا رہوں گا ، لیکن دراصل آپ کو اطلاعات دیتا رہوں گا ۔ اس کے پروگراموں کی ۔ اس کے کاموں کی ۔ یا ان کاموں کی ، جو وہ ہم سے لیتا رہے گا ۔ گویا میں آپ کے لیے جاسوسی کروں گا ۔ اس دوران آپ لوگ میڈیکل ریسرچ سنٹر سے اس گولی کا معائنہ کرائیں اور اس کا علاج دریافت کریں ۔ جب علاج دریافت ہو جائے گا ، پھر مجھے اور مجھ جیسے دوسروں کو باس کی ذرا

بھی پروا نہیں رہ جائے گی ، پھر ہم اس کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کر سکیں گے ۔"

وہ سب تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں گم ہو گئے ، آخر انسپکٹر جمشید بولے :

"ٹھیک جونی ۔ مجھے تمہاری شرط منظور ہے ۔ تم یہاں سے اپنی کار میں واپس جا سکو گے ہاں ، تمہیں ٹائر ضرور بدلنا ہوگا ۔ اب بتاؤ ۔ سونے کے جہاز کے بارے میں کیا بات جانتے ہو ؟"

"ایک روز مجھے باس کی ہدایت موصول ہوئی تھی کہ درخت کی کھوہ میں جو لفافہ ہے ، وہ فلاں جگہ پہنچا دیا جائے ۔ میں نے لفافہ دیکھا ۔ ایک طرف سے تھوڑا کھلا رہ گیا تھا ، میں نے اس میں رکھا ہوا کاغذ نکال لیا اور اسے پڑھ لیا ۔ لفافہ ایک شخص ساجد باری کے لیے تھا ۔ اس کا نام پتا تو خیر لفافے کے اوپر لکھا ہوا تھا ۔ اندر والے کاغذ پر یہ پیغام لکھا تھا ۔ ساجد صاحب ۔ سونے کے جہاز کا تمام انتظام کر لیا گیا ہے ۔ بس یہی الفاظ تھے ۔ میں نے کاغذ پھر لفافے میں رکھا اور اسے ساجد باری کے ہاں پہنچا دیا ۔"

"اُف خدا ۔ کیا تم محکمہ خارجہ کے نائب سیکرٹری ساجد باری کی بات کر رہے ہو ۔" انسپکٹر جمشید کانپ اُٹھے ۔

"جی ۔ جی ہاں ۔ بالکل ۔" اس نے کہا ۔

"ٹھیک ہے جونی۔ تم کار کا ٹائر بدل کر جا سکتے ہو، یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد تم مجھے فون کرنا اور بتانا کہ تمھیں کوئی اور ہدایت تو نہیں ملی۔ ٹھیک ہے۔ تم مجھے ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد فون کرو گے نا۔"

"جی ہاں۔ بالکل کروں گا۔"

"شکریہ جونی۔ تمھاری تجویز واقعی بہت اچھی ہے۔ اس طرح تمھارے ساتھ اور بھی بہتوں کا بھلا ہو گا۔ دوسرے یہ کہ تم قانون کی سزا سے بھی بچ جاؤ گے۔"

"بہت بہت شکریہ جناب۔"

"آؤ بھئی۔ ہم چلیں۔ ہمیں پہلے ساجد باری سے بات کرنا ہو گی۔"

وہ ساجد باری کے دفتر پہنچے۔ یہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھے۔ انھوں نے انسپکٹر جمشید کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا:

"باس کی طرف سے آپ کو سونے کے جہاز کے بارے میں جو پیغام ملا تھا۔ اس کا کیا مطلب تھا؟"

"کیا!" ساجد باری اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

"اس کا مطلب ہے۔ جونی نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ جلدی کیجیے۔۔ اکرام، شیخ صاحب کو رپورٹ دو۔۔ بار کا صاحب کو

ہی فون استعمال کرو۔"

"اوکے سر۔"

ابھی اکرام نے ریسیور اٹھایا ہی تھا کہ کمرے میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور ساجد باری کی لاش کرسی سے گر کر قالین پر تڑپنے لگی۔ انھوں نے جیب سے پستول نکال کر گولی اچانک اپنی کن پٹی میں اتار لی تھی۔ انسپکٹر جمشید وغیرہ کچھ بھی نہ کر سکے۔

جلد ہی وہاں تمام بڑے بڑے آفیسر پہنچ گئے۔ انسپکٹر جمشید کو گھیر لیا گیا، کیونکہ ساجد باری کی خودکشی کی وجہ صرف انہی لوگوں کو معلوم تھی۔ انسپکٹر جمشید نے انھیں حالات اور واقعات بتائے اور پھر وزیرِ خارجہ کی طرف مڑے:

"سر۔ کیا باری صاحب کو سونے کے جہاز کی آمد کے بارے میں معلوم تھا؟"

"ہاں۔ اس سلسلے میں حکومتِ چمپان سے بات بھی انھوں نے ہی وہاں جا کر کی تھی۔"

"اوہ۔ تب۔ تب تو ساجد باری غدار تھے۔"

"ہاں! ان کا خودکشی کرنا اس بات کا بہت بڑا ثبوت ہے۔" وزیرِ خارجہ بڑبڑائے۔

"اس کا مطلب ہے انھوں نے ہی اس نامعلوم باس کو

جہاز کے بارے میں اطلاع دی تھی ، نہ صرف اطلاع دی تھی ، بلکہ پوری تفصیلات بتائی تھیں ، لیکن میں حیران ہوں کہ یہ باس کیا بلا ہے۔ اس نے سمندر سے جہاز کس طرح غائب کر دیا۔"

"جب تک ہم باس تک نہیں پہنچیں گے۔ الجھنیں جوں کی توں رہیں گی۔" آئی جی بولے۔

"اب ہم اس پہلو کی طرف توجہ دیں گے۔"

کارروائی مکمل ہونے کے بعد وہ گھر پہنچے۔

"آج تو آپ دفتر کا وقت ختم ہونے سے پہلے ہی آگئے۔" بیگم جمشید حیران ہو کر بولیں۔

"آج دفتر میں ٹک ہی کون سکا ہے۔" وہ بولے۔ اور پھر سب صحن میں ہی بیٹھ گئے۔ محمود ، فاروق اور فرزانہ کا مارے بے قراری کے برا حال تھا۔ ان کے چہروں پر نظر ڈالتے ہوئے انسپکٹر جمشید مسکرائے اور بولے :

"میں جانتا ہوں۔ تم تمام حالات اور واقعات سنانے اور سننے کے لیے بہت بے چین ہو ، لیکن اس سے پہلے میں ایک کام کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی۔ کیسا کام؟" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"میں ایک کاغذ پر باس کا نام لکھ کر جیب میں رکھ لیتا

ہوں۔ اس کے بعد میں تمھاری باتیں سنوں گا ، پھر تم میری باتیں سننا۔ میری باتیں سننے کے بعد تم مجرم کا نام لکھ کر اپنی جیبوں میں رکھ لینا۔"

"ل۔ لیکن جمشید۔" خان رحمان ہکلائے۔

"ہاں۔ کیا بات ہے خان رحمان؟" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"میں۔ میں کیا کروں گا۔"

"بھئی۔ تم بھی ہم سب کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات سن کر مجرم کا نام لکھ کر جیب میں رکھ لینا۔"

"لیکن میں سراغرساں نہیں ہوں۔ ایک فوجی ہوں۔ وہ بھی ریٹائرڈ فوجی۔"

"ہاں۔ یہ تو خیر ٹھیک ہے ، لیکن انکل۔ آخر آپ بھی اکثر مہمات میں ہمارے ساتھ ہوتے ہیں۔"

"ہاں! صرف مہمات میں شریک ہوتا ہوں۔ جاسوسی میں نہیں۔" انھوں نے کہا اور وہ مسکرا دیے۔

"خیر۔ جو بھی نام آپ کے ذہن میں آئے ، لکھ دیجیے گا۔ اور ہاں انکل اکرام۔ کیا آپ بھی مقابلے میں حصہ لیں گے؟"

"ضرور ، کیوں نہیں۔" اس نے کہا۔

"یہ کیسے مقابلے کی بات ہو رہی ہے۔ کیا میں اس میں

حصہ نہیں لے سکتی۔" باورچی خانے سے بیگم جمشید کی آواز سنائی
دی اور وہ سب ہنس پڑے۔

"امّی جان۔ یہ مقابلہ ذرا جاسوسی قسم کا مقابلہ ہے۔"
فاروق بولا۔

"ذرا جاسوسی قسم کا یا خالص جاسوسی۔" انھوں نے پوچھا اور
وہ پھر مسکرا اٹھے۔

"جی خالص جاسوسی۔" فرزانہ نے کہا۔

"تب تو یہ مقابلہ آپ کو ہی مبارک۔" وہ منہ بنا کر بولیں۔

"لیکن امّی جان۔ آپ باورچی خانے میں کیا کر رہی ہیں؟"

"سب کے لیے کھانا تیار کر رہی ہوں اور کیا؟"

"ویری گڈ۔ جاؤ فرزانہ۔ تم بھی امّی جان کا ہاتھ بٹاؤ۔" فاروق
نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"اور میری جگہ مجرم کا نام تم بتاؤ گے؟" فرزانہ نے جل
بھن کر بولی۔

"ختم کرو۔ اور ذرا جلدی سے حالات سناؤ، کیونکہ یہ معاملہ
بہت بھیانک معاملہ ہے۔ دفتر کے خاص ریکارڈ روم سے
سارا ریکارڈ غائب ہونا، پھر سمندر سے سونے کا پورا ایک جہاز
غائب ہو جانا۔ اور دھڑا دھڑ لوگوں کا مارا جانا۔ بہت ہی
خوفناک حالات کی نشاندہی کر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے،

ہم کسی بڑی الجھن میں پھنس چکے ہیں۔" انسپکٹر جمشید جلدی جلدی
بولے۔

"بہت بہتر ابّا جان! میں شروع کرتا ہوں۔ آپ دفتر
پہنچ چکے تھے۔ چھٹیاں ہونے کی وجہ سے ہم انکل خان رحمان کے گھر
تھے کہ آپ کا فون ملا۔ دفتر پہنچے تو آپ میٹنگ روم میں تھے،
لہٰذا ہم نگران اور انچارج کی لاشوں کا معائنہ کرنے نکل گئے،
لاشوں کی ناکوں کی نوکیں سرخ نظر آئیں۔ باقی جسم نیلا تھا۔
صاف ظاہر تھا۔ وہ کسی زہر سے ہلاک ہوئے تھے۔ ایسے میں
ہمیں ان کے گھر والوں سے ملنے کا خیال آیا۔ ہم نگران کے
گھر پہنچے، لیکن قاتل وہاں پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ ٹومبو نام کے
ایک آدمی نے نگران کے گھر کے افراد کو زہریلی سوئیوں سے
موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، لیکن ابھی فرار نہیں ہو پایا تھا کہ
ہم پہنچ گئے۔ ہماری اس سے جھڑپ ہوئی اور پھر وہ بھاگ
نکلا۔ اس کا رنگ سیاہ اور آنکھیں بالکل سرخ تھیں۔ میں نے
اور فاروق نے اس کا تعاقب کیا، فرزانہ وہیں رہ گئی۔ ٹومبو
نے ہمیں بتایا کہ نگران اور انچارج نے خودکشی نہیں کی۔
انھوں نے تو منہ میں اطلاعی کیپسول رکھے تھے۔ اور باس نے
ٹومبو کو انھیں ہلاک کرنے کے لیے پہلے ہی بھیج دیا تھا۔ اس
نے زہریلی سوئیاں پھینک کر انھیں ختم کیا اور پھر انچارج کے

گھر گیا، وہاں کے افراد کو ختم کیا اور اس کے بعد نگران کے گھر
پہنچا۔ یہاں ہماری اس سے جھڑپ ہوئی۔ ہم دونوں اس کا
تعاقب کرتے ایک عمارت میں پہنچے۔ اس عمارت میں ٹومبو کے
علاوہ چار آدمی اور موجود تھے۔ یہاں باس کا فون انہیں موصول
ہوا۔ ٹومبو نے حالات کہہ سنائے۔ باس نے خیال ظاہر کیا کہ
ہم نے ٹومبو کا تعاقب ضرور کیا ہوگا اور آس پاس ہی موجود
ہوں گے۔ ہم ان پانچوں کے سامنے آ گئے۔ یہاں ہماری ان
سے باقاعدہ جنگ ہوئی اور آخر ہم ان پانچوں کو ڈھیر کرنے میں
کامیاب ہو گئے۔ اس دوران باس نے پھر فون کیا اور میں نے
اس سے بات کی۔ اس کی آواز بھاری سی تھی۔ ٹومبو سے معلوم
ہوا کہ ان کا یہ باس لوگوں کو خاص قسم کی گولیوں کے ذریعے غلام
بناتا ہے۔ ان لوگوں کو پولیس کے حوالے کرنے کے بعد ہم واپس
فرزانہ کے پاس پہنچے، وہاں سے روانہ ہوئے تو آپ کی جیپ
دیکھ کر بنک پہنچے۔ وہاں سے جونی کا تعاقب کیا، لیکن سفید لفافہ
حاصل نہ کر سکے۔ یہ ہے ہماری کل کہانی۔" محمود نے تمام تفصیلات
بتانے کے بعد کہا۔

"لیکن فرزانہ کی کہانی رہ گئی۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"جی کیا مطلب۔ فرزانہ کی کہانی۔ فرزانہ تو نگران کے گھر
میں رہ گئی تھی۔"

"آخر۔ اس نے گھر میں کچھ نہ کچھ تو کیا ہوگا؟"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے ابا جان۔ نگران کے گھر سے نکل کر
میں نے پولیس کو فون کیا۔ پولیس انسپکٹر نے دوا کی ایک شیشی
کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ جب کہ مجھے وہ شیشی عجیب سی
نظر آئی، کیونکہ اس گھر میں دواؤں کی ایک باقاعدہ الماری
موجود تھی، لیکن اس پر تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ جب کہ وہ شیشی
کتابوں کی الماری میں رکھی تھی اور اس پر تالا لگا ہوا تھا۔ اس
شیشی میں صرف ایک گولی تھی۔ ایک سفید گولی۔"

"کیا!!!" محمود اور فاروق اچھل پڑے۔ انسپکٹر جمشید مسکرانے
لگے۔ فرزانہ نے شیشی جیب سے نکال کر میز پر رکھ دی۔ ان کی
نظریں اس میں موجود گولی پر جم گئیں۔

ناکام مہم

"تو یہ ہے وہ گولی۔ جس کے بل پر اس باس نامی آدمی نے لوگوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے اور انھیں اپنی انگلیوں پر نچا رہا ہے۔ اس طریقہ سے اس نے ہمارے محکمے کا ریکارڈ چُرا لیا اور سمندر سے سونے کا جہاز اِدھر اُدھر کر دیا۔ ریکارڈ والی بات تو خیر حلق سے اُتر جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جہاز کا کیا ہوا۔ خیر اس پہلو کو بعد میں لیں گے۔ اب میں اپنی کہانی سناؤں گا، تاکہ ہم اندازہ لگا سکیں کہ وہ شخص کون ہے — جو خود کو باس کہلاتا ہے۔" یہ کہہ کر وُہ ایک لمحے کے لیے رُکے اور پھر کہنے لگے:

"میٹنگ سے فارغ ہو کر میں لاشوں والے کمرے میں داخل ہوا، زہر کے ماہر تنویر نیازی کو فون کیا گیا، وُہ دفتر میں نہیں تھے۔ ان کی بجائے ان کے نائب احسان بھٹہ وہاں پہنچ گئے، لیکن اسی وقت تنویر نیازی آ گئے۔ انھوں نے احسان بھٹہ کو

واپس بھیج دیا۔ اور خود لاشوں کا معائنہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی موت سمندر میں پائے جانے والے ایک سانپ کے زہر سے ہوئی ہے۔ اس کے بعد وُہ بھی چلے گئے۔ دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ فون کی گھنٹی بجی، لیکن فون کرنے والا بات نہ کر سکا۔ اسے کسی نے قتل کر دیا، پھر ہم ڈاکٹر تنویر نیازی کی لیبارٹری گئے، وہاں معلوم ہوا، ان کے نائب احسان بھٹہ سراغرسانی کی عمارت سے واپس دفتر نہیں پہنچے چنانچہ ان کی تلاش بھی شروع کرائی گئی۔ ان کے گھر سے بھی معلوم کیا۔ پھر پروفیسر صاحب کے ذریعے گولڈن کلب کا نام معلوم ہوا۔ انھیں فون کیا گیا، وہاں سے احسان بھٹہ کے دوست ذاکر شاہ کے بارے میں معلوم ہوا، ان سے فون پر بات ہو رہی تھی کہ کسی نے انھیں بھی قتل کر دیا۔ ڈائریکٹری کے ذریعے ذاکر شاہ کے گھر کا پتا چلایا اور وہاں پہنچے، ان کے گھر میں ان کی لاش ملی۔ گھر کے افراد شادی پر گئے ہوئے تھے — گھر سے ایک ڈائری ضرور ملی۔ ڈائری میں احسان بھٹہ کا ذکر تھا کہ وُہ کسی شخص سے بہت خوف زدہ ہے۔ اور یہ کہ وُہ شخص کوئی بھیانک جرم کر رہا ہے۔ اس دوران خیال آیا کہ کہیں قاتل ذاکر شاہ کے گھر والوں کو بھی قتل نہ کر دے — چنانچہ شادی والے گھر پہنچے۔ مجرم وہاں سے انھیں لے کر جا چکا

تھا۔ آخر ہم نے اسے جنگل میں جا پکڑا ۔ مجرم ہلاک ہوگیا ۔
گھر کے افراد بچا لیے گئے ۔ ان سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ڈاکٹر
احسان بخشہ نے ایک لفافہ اپنے بنک کے لاکر میں رکھا تھا ۔ ہم وہ
لفافہ حاصل کرنے گئے ۔ مجرم ہم سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا ۔
یعنی جونی ۔ اب ہم جونی سے نبٹ کر آ رہے ہیں ، لیکن ابھی
تک اصل مجرم سامنے نہیں آیا ۔ لہذا سوال یہ ہے کہ اصل
مجرم کون ہے ۔ یہ ہے میری مفصل کہانی ۔" انسپکٹر جمشید خاموش ہو
گئے ۔ تھوڑی دیر کے لیے سب سوچ میں گم ہوگئے ۔

" ہم اندازہ لگا چکے ہیں ابا جان ۔" محمود بولا ۔

" ہم ۔ کیا مطلب ۔ تم فاروق اور فرزانہ کے بارے میں
کس طرح کہہ سکتے ہو ۔"

" اوہ ہاں ۔ اچھا تو میں قاتل کے بارے میں اندازہ لگا
چکا ہوں ۔"

" میں بھی ابا جان ۔" فاروق نے فوراً کہا ۔

" اور میں بھی ۔" فرزانہ بولی ۔ انسپکٹر جمشید نے خان رحمان
کی طرف دیکھا :

" میں ابھی الجھن میں ہوں جمشید ۔ لیکن غور کر رہا ہوں ۔" خان
رحمان بولے ۔

" خیر ۔ ضرور غور کرو ۔ اچھا بھئی ۔ اپنے اپنے کاغذ پر مجرم

نام لکھ کر مجھے دے دو ۔"

" جی بہتر !" محمود نے کہا اور تینوں نے نام لکھ کر دے دیے ،
اسی وقت خان رحمان بولے ۔

" بھئی ۔ ذرا ایک کاغذ کا پرزہ مجھے بھی دینا ۔" خان رحمان
بول اٹھے ۔

" گویا آپ بھی اندازہ لگانے میں کامیاب ہوگئے ہیں ۔"

" ہاں ۔ کوشش تو کرنی ہی چاہیے ۔" خان رحمان نے کہا ۔

محمود نے ایک کاغذ انھیں بھی دے دیا اور انھوں نے
اس پر مجرم کا نام لکھ کر انسپکٹر جمشید کی طرف بڑھا دیا ۔ اسی
وقت باورچی خانے کی طرف سے آواز آئی :

" محمود ۔ میری چٹ بھی لے جاؤ ۔"

" ارے !" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا ۔

" ہاں ! میں نے بھی تمام حالات اور واقعات غور سے سنے
ہیں ۔"

" بھئی ۔ تب تو یہ مقابلہ بہت دلچسپ ہوگیا ۔ جاؤ محمود ۔
اپنی امی جان سے بھی چٹ لے آؤ ۔"

بیگم جمشید نے بھی مجرم کا نام لکھ کر دے دیا ۔

" میں اپنے خیال کے مطابق مجرم کا نام لکھ کر پہلے ہی
جیب میں رکھ چکا ہوں ۔ اب سب سے پہلے محمود کی چٹ پر لکھا

نام پڑھتا ہوں۔ اس نے لکھا ہے۔ مجرم تنویر نیازی ہے۔"

"ارے!" ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"اور فاروق نے بھی یہی نام لکھا ہے۔ فرزانہ نے بھی ۔۔۔ یہاں تک کہ خان رحمان نے بھی ۔۔۔ اور حد تو یہ ہے کہ بیگم نے بھی تنویر نیازی کو ہی مجرم قرار دیا ہے۔۔ اب میں کروں تو کیا کروں۔" انسپکٹر جمشید نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

⊙

انھوں نے عجیب سی نظروں سے ان کی طرف دیکھا:

"جی ۔ کیا فرمایا ۔ آپ کریں تو کیا کریں۔"

"ہاں ۔ میں کروں تو کیا کروں۔" انھوں نے پھر وہی الفاظ کہے ۔۔۔

"آپ یہ کریں چٹ پر لکھا مجرم کا نام پڑھ کر سنا دیں۔۔" فاروق نے کہا۔

"ہاں! یہ تو خیر کرنا ہی ہوگا۔" انھوں نے کہا۔

"صاف ظاہر ہے ۔ آپ نے بھی نیازی کا ہی نام لکھا ہوگا۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔ اگر میں نیازی کا نام لکھتا تو پھر تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔" انھوں نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"کک ۔ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ۔ میرے خیال میں مجرم تنویر نیازی نہیں ہے۔" وہ بولے۔

"یہ ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" محمود دھک سے رہ گیا۔

"ہاں! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ جب میں نے ڈاکٹر تنویر نیازی کو فون کیا تھا تو اس کے صرف دس منٹ بعد احسان بھٹہ لاشوں والے کمرے میں پہنچ گئے تھے، پھر فوراً بعد ڈاکٹر نیازی پہنچے ۔ انھوں نے احسان بھٹہ کو واپس بھیج دیا ۔ پھر خود لاشوں کا معائنہ کرنے کے بعد واپس روانہ ہوئے ۔ دوسری طرف احسان بھٹہ ایک شخص سے پہلے ہی خوف زدہ چلے آ رہے تھے ۔ وہ لاشوں کا معائنہ کرنے کے بعد دفتر نہیں گئے، اپنے گھر چلے گئے ۔ شاید وہ خود کو غیر محفوظ خیال کر رہے تھے ۔ وہ اس شخص کا نام بتانا چاہتے تھے، جو یہ سب کچھ کر رہا تھا، لیکن اس سے پہلے ہی انھیں بھی ختم کر دیا گیا ۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجرم تنویر نیازی کیوں نہیں ہے ۔ وہ اس طرح کہ ہمیں احسان بھٹہ کے ایک ٹھکانے کا پتا چلا ۔ وہ گولڈن کلب میں بیٹھتے تھے ۔ وہاں فون کیا ۔ تو ان کے ایک دوست ذاکر شاہ کا نام معلوم ہوا ۔ ڈاکٹر تنویر نیازی کو اس کارروائی کا قطعاً علم نہیں ہو سکتا، نہ احسان بھٹہ نے ذاکر شاہ کا نام اسے بتا رکھا تھا ۔ لہذا وہ کس طرح اپنے کسی آدمی کو

ذاکر شاہ کے قتل کے لیے بھیج سکتے تھے۔ ذاکر شاہ کی طرف سے
فوری طور پر اگر خطرے کا احساس ہو سکتا تھا تو گولڈن کلب
والوں کو، کیونکہ ہم نے خود ہی تو ان سے ان کے بارے میں
پوچھا تھا۔ بس اسی وقت ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ ایک اور
شخص بھی ایسا ہے جسے ختم کرنا ضروری ہے۔ ورنہ ان کے خلاف
سراغ لگا لیا جائے گا۔ لہٰذا فوری طور پر ذاکر شاہ کو بھی ختم
کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور ذاکر شاہ کا گھر بھی کلب کے بالکل
نزدیک ہی نکلا۔ ذاکر شاہ نے پیغام دیتے وقت اپنا پتا بھی
لکھوایا ہو گا، لیکن انھوں نے ہمیں پتا نہیں بتایا، بلکہ ذاکر شاہ
سے ہماری بات کرا دی اور ادھر قاتل کو بھیج دیا۔ وہ فوراً ہی
وہاں پہنچ گیا اور اپنا کام کر کے واپس آ گیا۔ ان حالات میں میں
کیوں نہ یہ کہوں کہ یہ سارے چکر گولڈن کلب سے چلائے جا
رہے ہیں اور اب ہمیں گولڈن کلب پہنچ جانا چاہیے۔ ہم پہلے ہی
بہت دیر کر چکے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے انسپکٹر جمشید اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ بھی حیرت زدہ
سے ان کے پیچھے ہو لیے۔ جیپ میں بیٹھے ہی تھے کہ اکرام
بولا:

"سر۔ کیا پورے گولڈن کلب کے لیے بس ہم ہی کافی ہیں۔
کیا خبر۔ انھوں نے کلب کے اندر کیا کچھ تیاریاں نہیں کر رکھی ہوں

گی۔ اندر نہ جانے کتنے آدمی ہوں۔"

"فکر نہ کرو اکرام۔ یہ بات میرے ذہن میں ہے۔ بلکہ پہلے
سے ہے، کیونکہ جونہی ذاکر شاہ کو ختم کیا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس
سارے چکر کے پیچھے گولڈن کلب کا ہاتھ ہے۔"

"گویا آپ انتظام کر چکے ہیں۔ اور کلب ہمارے آدمیوں کے
گھیرے میں ہو گا۔"

"ہاں۔ یہی سمجھ لو۔"

"تب تو وہ مارا۔ اب ہماری کامیابی کے امکانات سو فیصد
ہیں۔" اکرام نے خوش ہو کر کہا۔

"ایسا نہ کہو اکرام۔" انسپکٹر جمشید کا لہجہ حد درجے سنجیدہ تھا۔

"جی کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ مجرم کچھ کم ہوشیار نہیں ہے۔ اسے پہلے سے
تمام حالات کا اندازہ تھا۔ بلکہ یوں کہہ لو کہ انھوں نے پہلے سے
پوری طرح منصوبہ بندی کی تھی۔ انھیں معلوم تھا، محکمۂ سراغ رسانی
کی عمارت سے ریکارڈ چرائے جانے کے بعد کیا کیا جائے گا۔
کیا کیا قدم اٹھائے جائیں گے۔ یہ منصوبہ بندی بھی کر لی گئی تھی
کہ انھیں کس کس آدمی کو موت کے گھاٹ اتارنا ہو گا۔ یعنی
پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا۔ اس لیے ہر آدمی کی پہلے سے
نگرانی ہو رہی تھی۔ جہاں جہاں بھی کوئی تھا۔ وہیں گولڈن کلب

کے آدمی موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وُہ کامیاب ہوتے چلے گئے، ہم حیران ہی ہوتے رہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اس قدر جلد قاتل مقتول کے پاس کس طرح پہنچ جاتے ہیں، لیکن اب یہ بات مجھے بالکل واضح نظر آ رہی ہے۔ اور مجھے گولڈن کلب میں اپنی کامیابی کی ایک فیصد بھی اُمید نہیں۔"

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابا جان۔ ایک فیصد بھی اُمید نہیں، اِدھر انکل اکرام کو کامیابی کی سو فیصد اُمید ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"میرے اس خیال کی ایک بہت مضبوط وجہ ہے۔"

"حیرت ہے۔ اب وجہیں بھی مضبوط ہونے لگیں۔" فارُوق بڑبڑایا۔

"مضبوط وجہ۔ کیا مطلب؟" فرزانہ چونک اٹھی۔

"ایک منٹ ٹھہرو۔ میں ذرا ایک فون کروں گا۔"

وُہ واپس مڑے اور گھر میں داخل ہوئے۔ انسپکٹر جمشید نے شیخ صاحب کے نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا:

"انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں سر۔"

"کہو جمشید۔ کوئی کامیابی ہوئی؟"

"شاید میں ایک گھنٹے کے بعد آپ کو مکمل رپورٹ دے سکوں گا۔"

"ویری گڈ۔" وہ بولے۔

"سر۔ کیا انسپکٹر کامران مرزا سے رابطہ قائم کیا جا چکا ہے؟"

"نہیں، ان سے رابطہ قائم نہیں ہو سکا، ان کے آئی جی صاحب سے ضرور بات ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جونہی انسپکٹر کامران مرزا سے ملاقات ہوئی، وہ انھیں اس کیس پر لگا دیں گے۔ یہ انھیں بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔"

"اوہ! خیر۔ میں آپ سے یہ پُوچھنا چاہتا ہوں کہ ریکارڈ روم کس سلسلے میں کھولا گیا تھا؟"

"ساجد باری کی وجہ سے۔" انھوں نے بتایا۔

"جی کیا مطلب؟" وُہ بولے۔

"انھوں نے بتایا تھا کہ کسی نے انھیں گمنام فون کیا ہے اور بتایا ہے کہ محکمہ سراغرسانی کے خاص ریکارڈ روم کا صفایا کر دیا گیا ہے، اگر یقین نہیں تو کھلوا کر دیکھ لیں۔ یہ فون ملنے کے بعد انھوں نے ہمیں فون کیا۔ ہم نے ریکارڈ روم کھلوایا تو وہاں واقعی کچھ نہیں چھوڑا گیا تھا۔ فوری طور پر ریکارڈ روم کے انچارج اور نگران کو حراست میں لے لیا گیا، کیونکہ ان کی غداری کے بغیر ریکارڈ روم کھولا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے بعد تو جو کچھ ہُوا، تمھیں معلوم ہی ہے۔"

"جی ہاں۔ شکریہ۔ امید ہے، میں ایک گھنٹے کے بعد آپ

کی خدمت میں حاضر ہو سکوں گا۔" ریسیور رکھ کر وہ ان کی طرف مُڑے اور بولے:

"اب مجھے پوری طرح یقین ہو چکا ہے۔ ریکارڈ روم کھلوا کر دیکھنے کے لیے ساجد باری نے آئی جی صاحب کو فون کیا تھا، اس نے بتایا تھا کہ اسے ایک گمنام فون مُوصول ہوا ہے۔ خیر۔ ساجد باری تو غدار تھا۔ گولڈن کلب کا ساتھی تھا، اسے گمنام فون تو نہیں ملا تھا۔ اسے تو ہدایت دی گئی تھی کہ اس قسم کا فون کر دیا جائے۔ ادھر مجھے سونے کے جہاز کے بارے میں گمنام فون کیا گیا، پھر جس طرح لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا، کیا ان سب باتوں سے یہ ظاہر نہیں کہ ایک ایک چیز کی منصوبہ بندی کر لی گئی تھی۔"

"ہوں۔ نظر تو یہی آتا ہے، لیکن وہ مضبوط وجہ کیا ہے سر۔" اکرام نے کہا۔

"بتا تو چکا ہوں کہ سونے کے جہاز کے بارے میں مجھے گمنام فون کیا گیا۔ اب ذہن میں سوال اُبھرتا ہے، آخر کیوں۔ اس کی کیا ضرورت تھی۔ ساجد باری کے ذریعے یہ اطلاع کیوں دی گئی کہ ریکارڈ روم کا صفایا کرایا گیا ہے۔ اس کی بھی کیا ضرورت تھی، اگر انھوں نے ریکارڈ چرا لیا تھا۔ سونے کا جہاز غائب کر دیا تھا۔ تو چپ چاپ رہتے۔ اس کا چرچا کرنے کی کیا

پڑی تھی۔ ان تمام باتوں پر جب میں غور کرتا ہوں تو اسی نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ گولڈن کلب کی مہم ناکام مہم ثابت ہو گی۔"

"یا اللہ رحم۔ اگر یہ مہم ناکام مہم ثابت ہوئی تو ہم کیا کریں گے۔ اصل مجرموں کو گرفتار کس طرح کریں گے۔ اس باس کی صورت کس طرح دیکھ سکیں گے، جسے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔ جو اب تک کسی صورت سامنے ہی نہیں آیا۔" فاروق نے مُنہ بنا کر کہا اور وہ مسکرانے لگے۔

گولڈن کلب شہر کے ایک سرے پر واقع تھا، شہر کے اس طرف پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس سے پہلے انھوں نے گولڈن کلب کا نام بھی نہیں سنا تھا، انھیں کلب تک پہنچنے میں قریباً تیس منٹ لگے۔ عمارت دور سے ہی نظر آنے لگی۔ کلب کی عمارت سنہری رنگ کی تھی۔ دُھوپ میں اس طرح چمک رہی تھی جیسے واقعی سونے کی بنی ہوئی ہو۔

"کہیں سونے کے جہاز سے انھوں نے یہ کلب تو نہیں بنا لیا۔" فاروق حیران ہو کر بولا۔

"عقل تو ٹھکانے ہے۔ جہاز تو ابھی ایک دو دن پہلے ہی اپنے راستے سے غائب ہوا ہے۔"

"بھئی اس نے تو یونہی ایک بات کہہ دی۔ پیچھے جھاڑ کر

تو اس کے پیچھے نہ پڑا کرو۔" خان رحمان بولے۔

"شکریہ انکل۔ انکل ہو تو بس آپ جیسا۔"

"ایسے میں مجھے ایک بات یاد آ رہی ہے۔" انسپکٹر جمشید سوچ میں گم بولے۔

"جی۔ کیا بات یاد آ رہی ہے؟"

"میں نے جونی سے کہا تھا کہ ٹھیک ایک گھنٹے بعد مجھے فون کرے۔ ہم ایک گھنٹے سے زیادہ عرصہ گھر میں موجود رہے، لیکن اس نے فون نہیں کیا۔"

"کیا مطلب۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" محمود چونک کر بولا۔

"یہ کہ۔ اس نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ وہ پھر اپنے باس سے جا ملا ہے۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ یہ بات اس کے لیے تو نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ ہمارے لیے نہیں۔"

اب وہ کلب کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ انسپکٹر جمشید نے سیٹی کی آواز منہ سے نکالی۔

فوراً ہی دو آدمی دو تناور درختوں کے پیچھے سے نکل کر ان کے نزدیک آ گئے۔ یہ سادہ لباس والے تھے۔ چہروں سے تھکن ظاہر تھی:

"کیوں۔ کیا رہا۔"

"کوئی باہر نہیں نکلا۔ نہ کسی نے فرار ہونے کی کوشش کی۔"

"یہ۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"یہ بالکل درست ہے سر۔ ہم نے کلب کے چاروں طرف متواتر نظر رکھی ہے۔ کسی طرف سے بھی کوئی آدمی نکلتا نظر نہیں آیا۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ سب لوگ اندر ہی موجود ہیں؟"

"جی ہاں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔"

"لیکن جمشید۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ لوگ کلب چھوڑ کر جا چکے ہوں۔"

"جی نہیں۔" سادہ لباس والے نے کہا: "جب ہم یہاں آئے تھے تو اندر موجود لوگ صاف دیکھے تھے، لیکن اس کے ایک گھنٹے کے بعد۔ وہ نظر آنا بند ہو گئے۔"

"تب تو۔ تب تو۔" اکرام پُرجوش لہجے میں بولا۔

"ہاں ہاں۔ میں مانتا ہوں۔ تمہارا خیال درست نکلا۔ میرے تمام اندازے غلط ثابت ہو گئے۔ اور اس کا مطلب ہے۔ یہ مہم ناکام مہم ثابت نہیں ہو گی۔ ان حالات میں ہمیں چوکس ہو جانا چاہیے۔ کیا پورے کلب کے گرد ہمارے آدمی کافی تعداد میں موجود ہیں؟"

"جی ہاں۔ آپ فکر نہ کریں۔ اگر کلب والوں نے مقابلہ کیا

تو ہم انھیں پوری طرح جواب دیں گے اور انشاء اللہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیں گے۔"

"ویری گڈ۔ آؤ بھئی۔ کلب کا دروازہ دیکھیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور وہ ان کے پیچھے چلنے لگے۔ دروازے پر پہنچ کر انسپکٹر جمشید نے ہاتھ کا دباؤ ڈالا۔ اور دوسرے ہی لمحے وہ حیران رہ گئے۔

دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔

۲۰

ڈراڑ میں سفر

"دروازہ تو کھلا ہے۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"جی۔ دروازہ کھلا ہے۔" انھوں نے ایک ساتھ کہا۔

"ہاں۔ دروازہ کھلا ہے۔ اچھا اکرام۔ صرف میں اندر جا رہا ہوں، اگر تین منٹ تک میری طرف سے کوئی اطلاع نہ ملے تو پھر تم لوگ بھی اندر داخل ہو جانا۔ اور جو مناسب سمجھو کرنا۔"

"بہت بہتر، لیکن سر۔ آپ کو اندر داخل نہیں ہونا چاہیے، نہ جانے انھوں نے کس قسم کا جال بچھا رکھا ہو۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ جال تو ضرور بچھا ملے گا، لیکن میں کیا کروں۔ رہ نہیں سکتا۔ عام طریقۂ کار میں وقت بہت لگے گا۔" یہ کہتے ہی انھوں نے اندر قدم رکھ دیا۔ وہ دھک سے رہ گئے۔ ہدایت کی خلاف ورزی بھی نہیں کر سکتے تھے۔

"جمشید۔ کم از کم مجھے تو ساتھ لے لو۔" خان رحمان نے پیچھے سے ہانک لگائی، لیکن انھوں نے جیسے سنا ہی نہیں۔

عمارت کے چاروں طرف ایک چار دیواری تھی۔ اس چار دیواری میں ایک گیٹ لگا ہوا تھا۔ انسپکٹر جمشید اس گیٹ میں داخل ہوئے تھے۔ اصل عمارت تو ابھی اندر تھی؛ تاہم حالات جو تھے۔ ان کی روشنی میں بیرونی گیٹ بھی کھلا نہیں ملنا چاہیے تھا۔

ان کی بے چینی بڑھتی چلی گئی۔ تین منٹ تین سال سے بھی طویل محسوس ہوئے۔ آخر انسپکٹر جمشید کا چہرہ نظر آیا۔ وہ عجیب انداز سے مسکرا رہے تھے:

"کیا رہا جمشید؟"

"آؤ۔ اندر آ جاؤ۔ باقی لوگ اپنی جگہوں پر موجود رہیں۔" انھوں نے کہا۔

وہ پانچوں اندر داخل ہوگئے۔ اور پھر اندرونی دروازے پر پہنچے۔ انسپکٹر جمشید اس دروازے سے گزر کر کلب کے ہال میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے انھوں نے بھی ہال میں قدم رکھے۔

یہ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ کرسیاں اور میزیں ایک خاص ترتیب سے رکھی گئی تھیں۔ کاؤنٹر پر چیزیں قرینے سے سجی نہیں لیکن پورے ہال میں ایک آدمی بھی نہیں تھا۔

"حیرت ہے۔ سب لوگ کہاں چلے گئے؟" محمود بڑبڑایا۔

"کہیں وہ عمارت میں کسی جگہ چھپے ہوئے نہ ہوں۔" فرزانہ نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں۔ اس کا امکان ہے، لیکن پہلے ہال کے درمیان والی بڑی میز کی طرف دیکھ لو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

انھوں نے دیکھا، اس میز پر ایک ٹیپ ریکارڈر رکھا تھا۔ انھوں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا:

"یہ تو ایک ٹیپ ریکارڈر ہے۔"

"ہاں۔ اس کے نیچے کاغذ کا ایک پرزہ بھی دبا ہوا ہے۔ اس پرزے پر لکھا ہے۔ انسپکٹر جمشید۔ ٹیپ ریکارڈر چلا دو۔ تمھارے سوالات کے جواب مل جائیں گے۔"

"اوہ۔ کیا آپ ٹیپ ریکارڈر چلا کر سن چکے ہیں؟" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"نہیں۔ میں نے سوچا تھا۔ ساتھ ہی سن لیں گے۔"

"تو پھر کیجیے نا اسے آن۔"

"بھئی اسے تو ہم بعد میں بھی سن لیں گے۔ میں سوچ رہا ہوں۔ ہمیں اس میں الجھا کر کہیں مجرم فرار ہونے کی فکر میں نہ ہوں۔ ہم ٹیپ ریکارڈر میں گم ہو جائیں اور وہ ادھر ادھر نکل جائیں۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔" خان رحمان بولے۔

"ہمیں پوری عمارت کی پوری احتیاط سے تلاشی لینی ہے — اور یہ دیکھنا ہے کہ وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں۔" انھوں نے کہا۔

تلاشی شروع ہوئی۔ ایک ایک کمرہ دیکھا گیا۔ چھت کا بھی جائزہ لیا گیا، غسل خانوں کو دیکھا بھالا گیا، لیکن کہیں بھی کسی مجرم کے آثار نظر نہ آئے۔ آخر تھک ہار کر وہ سب ہال میں جمع ہوئے:

"حیرت کی بات ہے۔ سادہ لباس والوں نے کسی کو بھی باہر نکلتے نہیں دیکھا، لیکن وہ اندر موجود بھی نہیں ہیں۔" فاروق بڑبڑایا —

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ ہو سکتا ہے، اس عمارت کے نیچے کوئی تہہ خانہ ہو۔" فرزانہ نے منہ بنا کر کہا۔

"تو یہ کہنے کے لیے منہ بنانے کی کیا ضرورت تھی؟" فاروق نے اس سے بھی برا منہ بنایا۔

"کہیں تم دونوں کا، برا سا منہ بنانے کا مقابلہ کرنے کا پروگرام تو نہیں۔" محمود گھبرا گیا۔

"چلو پہلے تہہ خانہ تلاش کرو، پھر منہ بنانا۔" انسپکٹر جمشید بولے —

"گویا تہہ خانہ تلاش کرنے کے بعد منہ بنانے کی کھلی چھٹی ہو گی۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"تم کہیں منہ بنانے پر ادھار تو نہیں کھائے بیٹھے۔" محمود نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

"اچھا بس۔ باتوں میں کہیں ہم وقت نہ ضائع کر دیں۔"

اب انھوں نے تہہ خانے کی تلاش شروع کی۔ اس قسم کے کاموں میں وہ پہلے ہی بہت مہارت رکھتے تھے، لہٰذا فرزانہ نے جلد ہی ایک کمرے کے فرش میں تہہ خانے کا راستہ تلاش کر ہی لیا۔ فرش پر ایک بہت وزنی قالین بچھا تھا۔ قالین کے ایک سرے پر ایک رسی بھی نظر آئی تھی۔ اس رسی کو دیکھ کر ہی فرزانہ کو شک گزرا۔ ورنہ تہہ خانے کا راستہ فرش کے رنگ کے عین مطابق تھا اور بغور دیکھنے پر بھی مشکل سے نظر آتا تھا —

"لیکن قالین کے سرے پر یہ رسی کیوں باندھی گئی۔" خان رحمان حیران ہو کر بولے۔

"بھئی۔ ان سب کو تہہ خانے میں اترنا تھا۔ آخری آدمی کو اس بھاری قالین کو پھر فرش پر بچھانا تھا، سیڑھیوں پر ہوتے ہوئے وہ یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا قالین کے ایک سرے پر رسی باندھی گئی۔ اور آخری آدمی نے نیچے اتر کر رسی کا سرا کھینچ لیا۔ اس طرح الٹا ہوا قالین پھر بچھ گیا، لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم قالین کے سرے پر بندھی رسی کو بھی نظر انداز نہیں

کریں گے۔"

"چلو خیر — یہ تو ہوا — اب کیا کریں؟" خان رحمان بولے۔

"وہی پرانا طریقہ — پہلے صرف میں اُتروں گا — تم لوگ میرے بعد آنا۔"

"لیکن کتنی دیر بعد۔" محمود بے چین ہو گیا۔

"بس ایک منٹ بعد آ جانا — کیونکہ اگر نیچے کوئی خطرہ ہے تو پھر تم لوگوں کا زیادہ دیر تک اُوپر رہنا مناسب نہیں ہو گا۔" وہ بولے۔

"میں باقی لوگوں کو بھی یہاں کیوں نہ لے آؤں سر۔" اکرام بول اُٹھا۔

"نہیں اکرام — اس طرح کام خراب ہو سکتا ہے۔"

آخر انسپکٹر جمشید دروازہ اُٹھا کر سیڑھیاں اُترتے چلے گئے، چند سیکنڈ بعد ہی انھوں نے نیچے سے ایک حیرت بھری آواز سُنی:

"ارے — یہ کیا۔"

"اس ارے یہ کیا کے بعد ہم نہیں ٹھہر سکتے۔" محمود نے کہا۔

وُہ جلدی جلدی نیچے اُترے — اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وُہ کسی تہہ خانے میں نہیں — بلکہ ایک سُرنگ میں کھڑے تھے — سُرنگ کافی کشادہ تھی —

"گویا وُہ لوگ اس سُرنگ سے فرار ہوئے ہیں — آؤ جلدی کرو۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

وُہ سُرنگ میں آگے بڑھنے لگے —

"ہو سکتا ہے — وُہ لوگ سُرنگ کے دُوسرے سِرے پر موجود ہوں، اس صورت میں ادھر سے فائرنگ بھی کی جا سکتی ہے۔"

"میرے خیال میں تو وُہ دُوسرے سِرے پر بھی موجود نہیں ہوں گے — حالات یہی کہہ رہے ہیں۔" انھوں نے جواب دیا۔

وُہ آگے بڑھتے چلے گئے — فاروق کی جیب سے نکلنے والی پنسل ٹارچ نے اس وقت بہت کام دیا — وہ تقریباً پندرہ منٹ تک سفر کرتے رہے — آخر انھیں دن کی روشنی نظر آئی — گویا سُرنگ ختم ہو گئی تھی — وُہ باہر نکلے — انھوں نے دیکھا، وُہ ایک چٹان کے دامن میں تھے اور اس جگہ سے گولڈن کلب نظر نہیں آ رہا تھا، لیکن جب انھوں نے چٹان سے ذرا ہٹ کر دیکھا تو گولڈن کلب کی عمارت صاف نظر آنے لگی —

"تو وہ اس چٹان کی اوٹ لے کر فرار ہوئے ہیں — سادہ لباس والوں نے اتنی دُور تو دیکھا بھی نہیں ہو گا — وُہ تو بس عمارت کے چاروں طرف سے اس پر نظریں جمائے رہے ہوں گے۔"

" ابّا جان — یہ دیکھیے —" فرزانہ کی چلاتی ہوئی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی —

وُہ سب تیزی سے اس کی طرف مُڑے — وُہ چٹان کی اوٹ میں ہی کھڑی تھی اور قدرے فاصلے پر دیکھ رہی تھی — بظاہر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا —

" کہیں تمہیں کوئی سانپ تو نظر نہیں آ گیا ۔" فارُوق نے کانپ کر کہا ۔

" لیکن تم کانپ کیوں رہے ہو ؟" محمود حیران ہو کر بولا ۔

" پہاڑی سانپ بہت زہریلے ہوتے ہیں نا ۔"

" بھئی — لی کاف سے زیادہ زہریلے تو نہیں ہوتے ہوں گے ۔" فارُوق بول اُٹھا ۔

" لی کاف !" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا ۔

" لی کاف — یہ اس موقعے پر لی کاف کہاں سے ٹپک پڑا ۔" خان رحمان گھبرا کر بولے ۔

" معاف کیجیے گا انکل — لی کاف نہیں — لی کاف کا نام —" فارُوق مُسکرایا ۔

" چھوڑو لی کاف کے ذکر کو — اس کے نام سے بھی خوف محسوس ہوتا ہے — اُف خدا — مجھے وُہ لڑائی اب تک یاد ہے ۔" خان رحمان نے جلدی جلدی کہا ۔

" چلیے چھوڑ دیا ۔"

وُہ فرزانہ کے نزدیک پہنچے اور یہ دیکھ کر دھک سے رہ گئے کہ چٹان کے بالکل ساتھ ہی ایک دڑاڑ تھی — یہ اس قدر چوڑی تھی کہ ایک آدمی اس میں اُتر سکتا تھا — اور کہیں جھک کر تو کہیں لیٹ کر آگے جا سکتا تھا ، لیکن اس دڑاڑ میں کیا تھا — یا آگے جا کر کیا خطرات پیش آ سکتے تھے — یہ بات انھیں معلوم نہیں تھی —

" اب کیا کیا جائے ؟" انسپکٹر جمشید بولے ۔

" کرنا کیا ہے — داخل ہو جائیے اس دڑاڑ میں ۔" محمود بولا ۔

" خطرات میں اندھا دھند کود پڑنا تو تمھاری پُرانی عادت ہے ۔" فارُوق نے جھنّا کر کہا ۔

" تو کیا تم ان حالات میں پیچھے ہٹنا پسند کرو گے ۔" محمود اس کی طرف پلٹا —

" ہرگز نہیں — پیچھے ہٹنا تو ہم جانتے ہی نہیں — حالات خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہوں ۔"

" بھئی میرا بھی خیال یہی ہے کہ دڑاڑ میں اُترنا ہو گا —" انسپکٹر جمشید مسکرائے ۔

" لیکن سر — پہلے یہ سوچ لیجیے — ابھی ہم نے ٹیپ ریکارڈر پر مجرموں کا پیغام نہیں سُنا ۔"

"پھر کیا ہُوا ۔ سُن لیں گے ۔"

"میرے لیے دڑاڑ میں اُترنا بہت آسان ہو گا ، کیونکہ مَیں سب سے زیادہ پتلی دبلی ہوں۔"

"خیر ۔ موٹے تو ہم بھی نہیں ہیں ۔ بس انکل خان رحمان ذرا سڈول ہیں ۔"

"تم میری فکر نہ کرو ۔ میں کام نکال لوں گا۔" خان رحمان مُسکرائے ۔

سب سے پہلے انسپکٹر جمشید دڑاڑ میں اُترے ۔ ان کے پیچھے وُہ سب چلے ۔ شاید دڑاڑ کسی بڑے زلزلے کے نتیجے میں بنی تھی ۔

"نہ جانے آگے جا کر دڑاڑ میں کیا ہو گا۔" اکرام بڑبڑایا۔

"وہی ہو گا جو منظورِ خدا ہو گا۔"

انھیں کبھی تو جُھک کر چلنا پڑا ۔ کبھی سینے کے بل لیٹ کر اور کہیں بالکل سیدھا ہو کر ؛ تاہم یہ کام آسان نہیں تھا ۔ جب انھیں سینے کے بل لیٹ کر آگے بڑھنا پڑتا تو ابھرے ہوئے پتھر سینے میں سُوراخ کرتے محسوس ہوتے ، لیکن وُہ بھی نہ جانے کس ہڈی کے بنے ہوئے تھے ۔ ایک بار بھی واپس مُڑ جانے کا خیال دل میں نہ لائے اور آگے ہی بڑھتے چلے گئے ۔ دڑاڑ بھی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی ۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید پکار اُٹھے :

"لو بھئی ۔ ایک ثبوت مِل گیا۔"

"جی ۔ کیا فرمایا ۔ ثبوت مِل گیا ۔ آپ کا مطلب ہے ۔ دڑاڑ میں ثبوت ۔" فارُوق حیران ہو کر بولا ۔

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے دڑاڑ میں کوئی ثبوت کبھی مِل ہی نہیں سکتا۔" فرزانہ جل بُھن کر بولی ۔

"اور تم بالکل اس طرح کہہ رہی ہو جیسے ثبوت اگر مِل سکتا ہے تو صرف دڑاڑ میں۔" محمود مسکرایا۔

"توبہ تم سے ۔ یہ تو پوچھا نہیں ۔ کیا ثبوت مِل گیا ہے ۔ اور بحث میں پڑ گئے۔" خان رحمان بھنّا اُٹھے ۔

"انکل ۔ آپ اور ہماری باتوں پر توبہ کر رہے ہیں ۔ آپ تو وُہ ہیں جو ہماری باتیں سُن کر بچّوں کی طرح کِھل اُٹھتے ہیں اور پروفیسر انکل بھی۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا ۔

"اوہ ۔ پروفیسر انکل کو تو ہم بُھول ہی گئے ۔ خیر یہ اچھا ہی ہوا ، وُہ ہمارے ساتھ نہیں آئے ۔ ورنہ اس دڑاڑ میں سفر کرنا ان کے بس کی بات تو تھی نہیں۔"

"جمشید ۔ تم بھی بس چُپ ہو گئے ۔ آخر کیا ثبوت مِلا ہے ؟"

"بتاؤں تو اس وقت نا ۔ جب یہ لوگ بولنے کا کوئی موقع دیں۔" انسپکٹر جمشید غرّائے ۔

"لیجیے ۔ اگر یہ بات ہے تو ہم خاموش ہو جاتے ہیں۔" فارُوق

نے گھبرا کر کہا۔

"مجھے دڑاڑ میں سے سگریٹ کا ایک ٹکڑا ملا ہے۔ ٹکڑا بالکل نیا ہے۔ یعنی ایک دو دن پہلے کا بھی نہیں ہے۔ آج کا ہی ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ وہ لوگ بھی دڑاڑ کے ذریعے ہی فرار ہوئے ہیں۔"

"حیرت ہے۔ یہ دڑاڑ انھیں بھلا کہاں لے گئی ہوگی؟" فرزانہ بولی۔

"جہاں یہ ہمیں لے جائے گی۔" فارُوق نے فوراً کہا اور وُہ مُسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

عین اسی وقت انھوں نے ایک آواز سُنی۔ ایک عجیب سی آواز۔

تنے پر سفر

"خان رحمان۔ تم نے سُنی یہ آواز۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں۔ یہ۔ یہ تو سمندر کی آواز ہے۔" خان رحمانؔ نے کہا۔

"سمندر کی آواز۔ لیجیے۔ اب سمندر صاحب بھی آوازیں نکالنے لگے۔ ایک دن وُہ بھی آئے گا جب یہ حضرت آوازے بھی کسنے لگیں گے۔" فاروق نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"لیکن۔ سمندر۔ سمندر تو یہاں سے بہت دُور ہے۔ پہاڑوں کے اُس طرف اور ہم پہاڑوں کے اس طرف ہیں۔"

"تب پھر۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دڑاڑ سمندر تک چلی گئی ہے۔ زلزلہ تو بڑے سے بڑے پہاڑوں کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ یہ دڑاڑ پڑ جانا تو کوئی بات ہی نہیں۔ اور یہ بھی ناممکن نہیں کہ دڑاڑ کا سلسلہ سمندر تک چلا گیا ہو۔ گویا ہم اس دڑاڑ میں سفر کرتے ہوئے سمندر تک جا پہنچیں گے

پہاڑوں کے اُوپر جانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بھئی یہ تو بہت پُر لطف بات ہو گئی۔" انسپکٹر جمشید جلدی جلدی کہتے چلے گئے۔

"خُدا جانے یہ بات پُر لطف ہو گئی یا پُر ہول۔ ویسے ہے کسی نہ کسی چیز سے پُر ہی۔"

"کیوں نہ اب ہم واپس چلیں۔" اکرام بولا۔

"معلوم ہوتا ہے۔ تم خوف زدہ ہو۔" انسپکٹر جمشید نے مُنہ بنایا۔

"جی نہیں۔ میں ہرگز خوف زدہ نہیں۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں، آگے جانا بے فائدہ ہو گا۔ ہم سمندر میں چھلانگیں تو لگا نہیں سکیں گے، پھر آگے بڑھنے کا فائدہ۔"

"بھئی۔ جب تک ہم اس دراڑ کے دُوسرے سِرے پر نہیں پہنچ جاتے۔ اس وقت تک یہ سفر جاری رہے گا۔" انسپکٹر جمشید فیصلہ کُن لہجے میں بولے۔ اب اکرام کے بولنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔

ایک گھنٹے کے بعد کہیں جا کر ان کے چہروں سے نم دار ہُوا ٹکرائی۔

"لیجیے۔ آ گئے سمندر صاحب۔ اب جی بھر کر ملاقات کر لیجیے ان سے۔" فارُوق منمنایا۔

انھوں نے دیکھا۔ دراڑ اب کسی غار کے دہانے کی طرح

کُشادہ ہو گئی تھی۔ سمندر کے پانی کی چھالیں دُور سے ہی نظر آنے لگی تھیں اور ان چھالوں کی وجہ سے بہت سا پانی دراڑ میں بھی آ رہا تھا، لیکن ساتھ ساتھ غائب بھی ہو رہا تھا۔ شاید دراڑ اندر ہی اندر سمندر سے جا ملی تھی۔

"حیرت ہے، اگر وُہ لوگ اس دراڑ کے ذریعے یہاں تک آئے تھے۔ یہاں سے کہاں گئے اور گئے تو کیسے؟"

"ہو سکتا ہے۔ ان کے لیے یہاں کوئی لانچ بالکل تیار کھڑی ہو، کیونکہ آپ نے ہی تو کہا تھا کہ ان لوگوں نے ہر بات کی پوری طرح منصوبہ بندی کی تھی۔" فارُوق نے جواب دیا۔

"ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔ اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ان کا سراغ کھو چکے۔ اب ہمیں وُہ ٹیپ سُننا ہی ہو گی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔ ہمیں واپس ہی جانا پڑے گا۔"

عین اسی وقت ان پر کوئی چیز گری۔ وُہ بوکھلا اُٹھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وُہ سنبھل سکتے۔ اس چیز نے انھیں جکڑ لیا، انھوں نے دیکھا۔ وُہ ایک جال تھا۔ جال دراڑ کے اوپر کسی جگہ سے پھینکا گیا تھا۔

اسی وقت کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی، پھر ہنسنے والے نے کہا:

" دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا۔ سگریٹ کا ایک ٹکڑا انھیں ہمارے جال میں لے آئے گا۔ چلو اب جلدی کرو۔ ہمیں مُلک کے مشرقی حِصّے میں بھی جانا ہے۔ باس کب کا وہاں پہنچ چکا ہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی جال اوپر کھینچا جانے لگا۔ انھوں نے پریشان نظروں سے اوپر دیکھا۔ جال کا رسہ سمندر پر جھکی ہوئی ایک چٹان کے سرے تک چلا گیا تھا۔ اور یہ کافی اونچائی پر تھا۔ جونہی جال چٹان اور سمندر کے عین درمیان پہنچا، وہی آواز اُبھری:

" بس کرو۔ ان لوگوں کے لیے یہی جگہ مناسب ہے۔ اب نہ یہ زمین پر ہیں نہ سمندر پر۔ ہوا میں لٹک رہے ہیں۔ جال میں جھولے لے رہے ہیں۔ بہت لُطف آ رہا ہو گا۔ انسپکٹر جمشید اب مانگو اپنے بیٹے محمود سے چاقو اور کر دو اس جال کو تار تار ہم تو چلے۔"

اسی وقت ایک آبدوز سطحِ سمندر پر اُبھری اور جال میں سے انھوں نے دیکھا۔ ڈراڑ کے دونوں طرف سے کچھ لوگ اس پر سوار ہو گئے۔ دُوسرے ہی لمحے آبدوز سمندر میں اُترتی چلی گئی۔

" تم نے سُنا خان رحمان۔ وُہ کیا کہہ گیا ہے؟"

" ہاں جمشید۔ میں نے اس کی آواز صاف پہچانی ہے۔ وُہ جونی تھا۔"

" ہاں۔ جونی۔ کیا خیال ہے۔ ہم جال کاٹ کر سمندر میں کود پڑیں یا اس ابھری ہوئی چٹان تک پہنچنے کی کوشش کریں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

" اوپر چڑھنا بہت خطرناک ہو گا۔ کیوں نہ ہم پانی میں چھلانگیں لگا دیں اور پھر اس ڈراڑ کے ذریعے گولڈن کلب تک پہنچ جائیں۔"

" یہ ٹھیک رہے گا۔ پانی میں چھلانگ لگانا ہی مناسب رہے گا۔" خان رحمان بولے۔

" تو پھر لاؤ چاقو۔ جونی کے کہنے پر ہی عمل کر لیں۔" انسپکٹر جمشید بے چارگی کے عالم میں مسکرائے۔ وُہ سب جال میں گڈ مڈ ہو رہے تھے۔ محمود نے جوتے کی ایڑی سے چاقو نکالا اور انھیں دے دیا۔ انھوں نے جال کے نچلے حِصّے کو کاٹنا شروع کیا۔ جلد ہی جال کٹ گیا اور انھوں نے نیچے چھلانگیں لگا دیں۔ اپنے رُخ ڈراڑ کی طرف تیرنے لگے۔ اچانک انھوں نے بے شمار پھنکاروں کی آوازیں سُنیں۔ انھیں اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے، آوازیں ڈراڑ کی طرف سے آئی تھیں۔ ڈراڑ میں سفر کر کے وُہ یہاں تک آئے تھے۔ اس وقت تو کسی سانپ کی پھنکار سنائی نہیں دی تھی۔ اب اتنی بہت سی پھنکاریں۔ انھیں حیران کرنے کے لیے

کافی تھیں ۔ آخر وُہ دڑاڑ تک پہنچ گئے۔ جونہی اس کے اندر نظر
پڑی ۔ سُرخ رنگ کے بے شمار سانپ دُور تک لہراتے نظر آئے ۔
وُہ کانپ اٹھے ۔ یک دم دڑاڑ سے دُور ہونے لگے ۔
" یہ ۔ یہ وہی سانپ ہیں ۔ جن کے زہر سے اس گروہ کے باس
نے لوگوں کو ہلاک کروایا ہے ۔ حیرت ہے ۔ اچانک اتنے بہت سے
سانپ یہاں کہاں سے آگئے ۔"
" لیکن ۔ لیکن ابّا جان ۔ اب ہم کیا کریں ۔ آپ ۔ آپ دیکھ رہے
ہیں ۔ پہاڑوں کا یہ سلسلہ سمندر کی طرف سے بالکل عمودی ہے ۔ ادھر
ہم کسی جگہ سے بھی تو چڑھنے کی کوشش نہیں کر سکتے ۔" فرزانہ نے
بوکھلا کر کہا۔
" ایسے لمحات میں بوکھلاہٹ موت سے دو چار کر دیا کرتی
ہے ۔ یہ ٹھیک ہے ۔ ہم بُری طرح پھنس گئے ہیں ۔ آخر کب تک
تیر سکیں گے ، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہمت ہار دیں
اور سمندر کی تہہ میں چلے جائیں ۔ آؤ ۔ کیا خبر آس پاس کوئی
جزیرہ موجود ہو ۔ اللہ تعالیٰ کوئی بھولی بھٹکی لانچ یا کشتی ہماری طرف
بھیج دیں ۔ کم از کم اب ہم دڑاڑ میں داخل نہیں ہو سکتے ۔"
ان الفاظ کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے رُخ سمندر کی طرف
کر لیے ۔ اور تیزی سے آگے کی طرف تیرنے لگے ۔ ستم ظریف دشمن
نے انھیں اپنی طرف سے ایک یقینی موت کے حوالے کر دیا تھا۔

اچانک ان کی نظر ایک درخت کے بہت بڑے تنے پر پڑی ۔ تنا
پانی پر تیر رہا تھا ، اوپر نیچے ہو رہا تھا ۔
" کیا خیال ہے خان رحمان ۔ ہم اس تنے پر سوار ہو جائیں ۔"
" ہم اس کے ساتھ چمٹ ضرور سکتے ہیں ۔" خان رحمان بڑبڑائے۔
" چلو یہی سہی ۔ تیرنے سے تو نجات مل جائے گی ۔"
" تو پھر آؤ ۔ بسم اللہ کرو ۔"
سب نے بسم اللہ پڑھی اور تنے تک پہنچنے کی کوشش شروع
کر دی ۔ آخر کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی گئے ۔ ہاتھوں اور پیروں کی
مدد سے وہ تنے کے ساتھ لپٹ گئے ۔ تنا کبھی انھیں نیچے لے
جاتا تو کبھی اُوپر ۔ گویا اب وُہ سمندر کی اچھالوں کے ساتھ ساتھ
تھے ۔ تنا سمندر کی طرف ہی بڑھ رہا تھا ۔ لمحہ بہ لمحہ وُہ عمودی
پہاڑوں اور اس ہولناک دڑاڑ سے دُور ہوتے جا رہے تھے ۔ ایسے
میں انھوں نے فارُوق کی آواز سُنی :
" انکل اکرام ۔ اس مرتبہ تو ہمارے ساتھ آپ بھی پھنس گئے ۔"
" کوئی بات نہیں ۔" اکرام مُسکرایا۔
" آپ نے تو ہمیں واپس لے جانے کی پوری کوشش کی تھی ،
لیکن وُہ ہم ہی کیا جو واپس مُڑ جائیں ۔ دیکھ لیں ۔ ان حالات
میں بھی آگے ہی بڑھ رہے ہیں ۔"
وُہ مسکرا دیے ۔ تنے پر یہ سفر نہ جانے کتنے گھنٹے تک

جاری رہا ۔ ان کے چاروں طرف سمندر ہی سمندر تھا ۔ اور سر پر آسمان ۔ کئی بار تو ان کے دل دہل گئے ۔ انجام نظر آنے لگا ۔

اور پھر انسپکٹر جمشید پکار اُٹھے :

" اوہو ۔ وہ کیا چیز آرہی ہے ۔"

سب نے چونک کر اُدھر دیکھا ۔۔۔

یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوبِ فطرت ہے
(اقبالؒ)

ایک اُلجھن

اس لمبے قد کے خوبصورت آدمی کو دیکھ کر انھوں نے پلکیں جھپکائیں اور آخر شوکی نے کہا:

"کیوں جناب۔ کیا آپ ہمارے دفتر کے دروازے پر ہی کھڑے ہونے کے لیے آئے ہیں؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کندھے پر لٹکا ہوا تھیلا ہاتھ میں لیا اور اندر آ گیا۔ تھیلا فرش پر رکھا اور خالی کرسی پر بیٹھ گیا:

"میں نے سُنا ہے۔ آپ لوگ جاسوس ہیں۔ آپ کے ادارے کا نام شوکی اینڈ کو ہے اور آپ شوکی برادرز کہلاتے ہیں۔"

"ان سب باتوں میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں۔"

"بہت خُوب۔ یہ اچھا ہوا، میں درست جگہ آ گیا۔ میں ایک مہم پر روانہ ہو رہا ہوں۔ مُلک کے اس حصے میں بالکل اجنبی ہوں۔ مَیں چاہتا ہوں، اس مہم میں آپ لوگ میرا ساتھ

دیں۔"

"ہم لوگ اس مہم میں آپ کا ساتھ دیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟" شوکی نے حیران ہو کر کہا۔

"یعنی۔ یہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ عجیب بات ہے۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"جی ہاں۔ ہمارے نزدیک یہ واقعی کوئی بات نہیں ہوئی، دراصل ہمارے نزدیک کسی بات کا ہونا ذرا مشکل سا ہے۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"آپ لوگوں کی باتیں میرے پلے نہیں پڑ رہیں۔ میں نے سنا ہے۔ آپ معاوضہ لے کر لوگوں کے لیے سراغرسانی کرتے ہیں۔ تو ہم اس بات کو اس طرح لے لیتے ہیں۔ میں آپ کو معاوضہ ادا کروں گا۔ آپ میرا کام کر دیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپ کے ساتھ میں بھی ہوں گا۔ میں آپ لوگوں کو مہم پر تنہا روانہ نہیں کر سکتا۔"

"کیوں۔ کیا آپ کو ہم پر اعتبار نہیں۔" اخلاق نے تلملا کر کہا۔

"اعتبار یا بے اعتباری کی بات نہیں۔ بات مہم کی اہمیت کی ہے۔"

"تو آپ کے خیال میں مہم بہت اہم ہے؟"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں۔"

"دیکھیے جناب۔ پہلے تو آپ اپنا تعارف کرائیں، پھر مہم کی تفصیل سنائیے۔ اس کے بعد یہ بتائیے۔ ہمیں معاوضہ کتنا دیں گے۔ تب کہیں ہم اس معاملے پر غور کر سکتے ہیں۔ اور یہ فیصلہ کریں گے کہ آپ کی پیش کش منظور کی جائے یا نہ۔" شوکی نے جلدی جلدی کہا۔

"بات سلیقے کی ہے۔ تو سنیے۔ میرا نام منور علی خان ہے۔ میں ایک شکاری ہوں۔ ساری زندگی شکار میں گزری ہے۔ پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور شکار کھیلتا ہوں۔ کئی بار درندوں کے درمیان گھرے ہونے کے باوجود نماز ادا کی۔ ہر قسم کے جانوروں کی فطرت اور عادات کا مجھے تجربہ ہے۔ ملک کے اس حصے کے جنگل کا بہت چرچا سنا تھا۔ سوچا، کیوں نہ اس بار اس جنگل کی خاک چھانی جائے؛ چنانچہ گزشتہ چھے ماہ سے میں شکار کھیل رہا ہوں۔ شہر کے چڑیا گھر کو کئی قیمتی جانور فروخت کر چکا ہوں اور انھوں نے وہ جانور شکریے کے ساتھ قبول کیے ہیں، کیونکہ آج تک اتنے عجیب اور انوکھے جانور خود چڑیا گھر کے لوگوں نے نہیں دیکھے تھے۔ دوسروں کا تو ذکر کیا۔ کہنے کا مطلب یہ کہ جس طرح کچھ لوگ کتابوں کے کیڑے ہوتے ہیں، میں جنگل کا کیڑا ہوں۔ جنگل ہی میری زندگی ہیں۔ جنگل کے بغیر میرے دن

نہیں گزرتے۔ اسی لیے۔ سال میں صرف چند دن اپنے گھر میں گزارتا ہوں۔ میرا گھر ملک کے مغربی دارالحکومت میں ہے۔ یہ تو تھا میرا تعارف۔ اور اب ذرا آپ اپنا تعارف کرا دیں۔"

"ضرور کیوں نہیں۔ میں شوکی ہوں، یہ اشفاق، اخلاق اور آفتاب ہیں۔ ہم چاروں بھائی ہیں۔ ہمارے والد صاحب ایک ریٹائرڈ سراغرسان ہیں۔ اب بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اس قسم کے کاموں میں عملی طور پر حصّہ نہیں لے سکتے۔ ہاں۔ ہمیں مشورہ ضرور دیتے رہتے ہیں۔ آپ نے اپنی مہم کی تفصیلات نہیں بتائیں۔" شوکی نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا۔

"اب میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ جنگل کے دوسری طرف میں نے کچھ عجیب وغریب سے آثار دیکھے ہیں۔ یہ آثار میری سمجھ میں نہیں آئے، کیونکہ بنیادی طور پر میں شکاری ہوں۔ شکار سے متعلق تو ہر بات میری سمجھ میں آ جاتی ہے، لیکن شکار سے علاوہ باتوں کو سمجھنا میرے لیے ذرا مشکل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ ان آثار کو دیکھیں اور نتیجہ نکالنے کی کوشش کریں کہ وہ کیا ہیں۔ اس کے بعد ہم آگے بڑھنے کی کوشش بھی کریں گے۔"

"بات کچھ پلّے نہیں پڑی۔ آخر آپ نے کیا دیکھا ہے۔" اشفاق

حیران ہو کر بولا۔

"ہوں" ایک ایسی چیز۔ جو میرے لیے حیران کُن ہے۔ جس کا تعلق جنگل سے نہیں ہے۔ تعلق اگر جنگل سے ہوتا تو جنگل کے جانور اس سے دُور دُور نہ بھاگتے۔"

"آپ کی باتوں سے تو ہم خوف سا محسوس کرنے لگے ہیں۔"

"ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اس مہم میں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کم از کم میں یہی سمجھتا ہوں۔"

"دیکھیے جناب۔ معاف کیجیے۔ ہم شہر سے باہر جا کر کوئی کام نہیں کرتے۔ بس شہر کے اندر رہ کر ہی لوگوں کے کام کرتے ہیں۔" شوکی نے کہا۔

"میرے ساتھ چلے جائیں گے تو کیا نقصان ہو جائے گا۔ کچھ فائدہ ہی ہو گا۔"

"سوری! آپ یہ کام کسی اور سے لیں۔" اخلاق نے کہا۔

"آپ تو مجھے مایوس کیے دے رہے ہیں۔ میں تو بہت اُمید لے کر آیا تھا۔" وہ بولے۔

"ہم جا کر کیا کریں گے۔ ہماری سمجھ میں تو آیا ہی نہیں کہ آپ ہم سے کام کیا لینا چاہتے ہیں؟"

"جنگل میں جا کر ہی اس کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ یہاں نہیں۔ آپ کو معاوضہ معقول ملے گا۔"

"مثلاً کیا؟" آفتاب بول اُٹھا۔

"دس ہزار۔ بیس ہزار۔ جتنا آپ چاہیں۔"

"جب تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہو جاتا کہ کام کیا ہے۔ ہم معاوضے کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔" شوکی بولا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ میرے ساتھ چل کر دیکھ لیں دیکھ لینے کے بعد معاوضہ طے کر لیں اور اگر کام پسند نہ آئے تو واپس آ جانا۔ میں آپ لوگوں کو واپسی کا خرچ دے دوں گا۔"

عین اُسی وقت اندرونی دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ شوکی یہ کہتے ہوئے اُٹھا:

"معاف کیجیے گا۔ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

دروازے کی جھری میں سے شوکی کو اپنی والدہ نظر آئی:

"خیر تو ہے امّی جان؟" اس نے دبی آواز میں کہا۔

"آج۔ آج نہ جانے کیا بات ہے۔ میری دونوں آنکھیں۔" وہ کہتے کہتے رُک گئیں۔

"تو آپ کی دونوں آنکھیں پھڑک رہی ہیں۔" شوکی جلدی سے بولا۔

"یہ بات نہیں۔ آج میری دونوں آنکھیں بالکل پُرسکون ہیں۔ پھڑکن تو جانے کہاں غائب ہو گئی ہے۔ اس لیے۔ دفتر میں جو

صاحب بیٹھے ہیں۔ ان کا کیس ضرور لو۔" انھوں نے کہا۔

"لیکن امّی جان۔ یہ صاحب تو بہت ہی عجیب سا کیس لے کر آئے ہیں۔ جس کا نہ سر ہے نہ پیر۔"

"کوئی بات نہیں۔ سر پیر بعد میں بن جائیں گے۔ بس تم کیس لے لو۔"

"امّی جان۔ ہم پہلے غور کریں گے، پھر کیس لینے کی بات کریں گے۔ بعض لوگ ہمیں مصیبت میں بھی تو مبتلا کر دیتے ہیں۔ جیسے کہ پستول والے معاملے میں ہوا تھا۔"

"ہاں۔ ٹھیک ہے، لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ دفتر میں بیٹھا ہوا آدمی تم لوگوں سے کوئی دھوکا نہیں کرے گا۔"

"اچھا۔ آپ فکر نہ کریں۔ ابا جان کہیں گئے ہوئے ہیں کیا؟"

"ہاں۔ گئے ہوئے تو ہیں۔ ویسے اب تک انھیں واپس آ جانا چاہیے تھا۔ ارے لو وہ آ گئے۔"

"السلام علیکم۔ یہ کیا۔ حسبِ معمول تم لوگ دروازے کے اس طرف اور اس طرف موجود ہو۔" مشتاق احمد نے مُنہ بنا کر کہا، پھر جلدی سے بولے:

"اوہ سمجھا۔ شوکی۔ تمھاری امّی ضرور کوئی کیس لینے سے منع کر رہی ہوں گی اور دفتر میں اس وقت کوئی مؤکل موجود ہو گا۔ گویا ان کی بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔ خیر شوکی تم فکر

نہ کرو۔ جا کر کیس وصول کرو۔ میں انھیں سنبھالتا ہوں۔"

"میں گری جا رہی ہوں جو آپ مجھے سنبھالیں گے۔"

"میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔ آؤ اندر چلیں۔ ان لوگوں کو اپنے معاملات خود ہی نبٹا لینے دیں۔"

"شکریہ ابا جان۔" شوکی نے خوش ہو کر کہا۔

"شکریہ امی جان کہنا تو گویا تمہیں آتا ہی نہیں۔" اس کی امی تلملا کر بولیں۔

"اوہ۔ معاف کیجیے گا۔ آپ کا بھی شکریہ۔ ارے ہاں ۔۔ ابا جان ۔ میں آپ کو یہ تو بتانا بھول ہی گیا کہ آج امی جان کی دونوں آنکھوں میں سے کوئی سی بھی نہیں پھڑک رہی ۔۔ ان کا کہنا ہے کہ دفتر میں موجود آدمی کا کیس ہم ضرور لیں۔"

"ویری گڈ ۔۔ اور تمہیں کیا چاہیے۔" انھوں نے خوش ہو کر کہا۔

"لیکن ان حضرت کا کیس ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔" شوکی نے اُلجھ کر کہا۔

"خیر۔ یہ تم جانو۔ میں تمہاری امی کو ضرور دروازے پر سے لے جا رہا ہوں۔"

"اچھا شوکی ۔۔ اگر تم نے ان کا کیس نہ لیا تو میں یہ ضرور کہوں گی ۔۔ لڑکو، تم کسی کام کے بھی ہو یا بالکل نکمے

ہو۔" اس کی امی نے بھنائے ہوئے لہجے میں کہا اور اندر کی طرف مڑ گئیں ۔

شوکی مسکراتا ہوا واپس مڑا۔ اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا:

"معاف کیجیے گا۔ آپ کو زحمت ہوئی۔"

"زحمت کیوں ہوتی ۔ ہاں تو آپ کیا کہتے ہیں؟"

"مجھے افسوس ہے جناب ۔ ہم شہر سے باہر جانا پسند نہیں کرتے۔"

"اچھا۔ جیسے آپ کی مرضی۔" انھوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

انھوں نے اپنا تھیلا اٹھا کر کندھے پر لٹکایا اور باہر کی طرف چلے ۔ اس وقت شوکی کو نہ جانے کیا ہوا کہ پکار اُٹھا:

"ٹھہریے جناب ۔ میری ایک اُلجھن رفع کرتے جائیے۔"

"کیسی اُلجھن؟" انھوں نے مُڑتے ہوئے کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے میں نے آپ کو ۔ یا آپ سے ملتے جلتے کسی آدمی کو دیکھا ہے۔" شوکی نے ان کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے ۔ جب کہ آپ اس شہر سے باہر نہیں جاتے۔" منور علی خان بولے۔

"یہ میں نے کب کہا۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ ہم شہر سے باہر کے کیس نہیں کرتے۔"

"کیا آپ لوگ مغربی دارالحکومت گئے ہیں کبھی ؟"

"جی نہیں ۔ البتہ وہاں کے کچھ لوگوں سے ایک مہم کے دوران ملاقات ضرور ہوئی تھی ۔"

"کیا وہ مہم اس شہر میں سر کی گئی تھی ؟" منور علی خان حیران ہو کر بولے ۔

"جی نہیں ۔ وہ ایک اور ہی جگہ تھی ۔ ہمارے ملک سے باہر ۔"

"پھر آپ اس مہم میں شہر سے ۔ بلکہ ملک سے باہر کس طرح چلے گئے تھے ؟" منور علی خان نے برا مان کر کہا ۔

"اس میں ہماری کوشش کو دخل نہیں تھا ۔ یوں کہہ لیجیے کہ تقدیر لے گئی تھی ۔"

"ہو سکتا ہے ، اس مرتبہ بھی آپ کو تقدیر لے جانا چاہتی ہو ۔"

"نہ جانے کیوں ۔ آپ کی شکل صورت مجھے جانی پہچانی لگ رہی ہے ۔" شوکی بڑبڑایا ۔

"جس مہم کی آپ بات کر رہے ہیں ، اس میں اور کون لوگ شامل تھے ؟"

"بہت بڑے بڑے لوگ ۔" یہ کہتے ہوئے شوکی کا دل دھک دھک کرنے لگا ۔

"کتنے بڑے بڑے ؟" منور علی خان ہنسے ۔

"انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا جیسے ۔"

"کیا !" منور علی خان کرسی سے اچھل پڑے ۔ کرسی الٹتے الٹتے بچی ۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ، پھر وہ بولے :

"انسپکٹر کامران مرزا کی پارٹی کے ساتھ ایک فرحت نام کی لڑکی بھی تو ہو گی ۔"

"ج ۔ جی ہاں ۔ آپ کو کیسے معلوم ۔" اب حیران ہونے کی باری ان کی تھی ۔

"وہ ۔ وہ میری بیٹی ہے ۔ اور انسپکٹر کامران مرزا میرے گہرے دوست ہیں ۔ تو کسی مہم میں آپ لوگوں کا اور ان کا ساتھ ہو گیا تھا ۔ یہ جان کر حد درجے خوشی ہوئی ۔" منور علی خان جلدی جلدی بولے ۔

"اسی لیے میرا دل بار بار مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ان کی شکل جانی پہچانی لگ رہی ہے ۔ اور یہ بات غلط نہیں تھی ۔"

"ہاں واقعی ۔ تب تو آپ لوگوں سے مل کر اور بھی خوشی ہوئی ۔"

"آفتاب ۔ ابا جان کو بلا کر لاؤ ۔ وہ بھی ان سے مل لیں گے ۔" شوکی نے کہا ۔

ابھی آفتاب اٹھا ہی تھا کہ ایک آواز ابھری :

"خبردار ۔۔ جو جہاں ہے ، وہیں رہے ۔ حرکت کرنے کی کوشش

کا نام موت ہوگا ۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک شخص اندر داخل ہوگیا اور اندر داخل ہوتے ہی اس نے دفتر کا دروازہ بند کر دیا، پھر بائیں ہاتھ سے چٹخنی لگا دی، کیونکہ دائیں ہاتھ میں تو پستول تھا ۔

وہ ساکت رہ گئے ۔ منور علی خان کی تیوری پر بل پڑ گئے ۔

پھنس گئے نا

"میں نے تمہیں جنگل میں کہیں دیکھا ہے ۔" منور علی خان بڑبڑائے ۔

"ہاں! میری جھونپڑی کے پاس سے تم کئی مرتبہ گزرے ۔ اور میری طرف دیکھا بھی، لیکن اس وقت میں ایک فقیر کے حلیے میں تھا اس لیے اس وقت پہچاننے میں تمہیں دقت ہو رہی ہے ۔"

"اوہ ۔ ضرور یہی بات ہے ۔ خیر ۔ تم کیا چاہتے ہو ۔ اس نقلی پستول کو تم جیب میں رکھ لو ۔" منور علی خان بولے ۔

"نقلی پستول ۔" اُن کے منہ سے ایک ساتھ نکلا ۔

"ہاں! میں نقلی اور اصلی پستول میں تمیز کر سکتا ہوں ۔"

"کسی خوش فہمی میں نہ رہنا ۔ یہ تو خیر ٹھیک ہے کہ یہ پستول نہیں ہے، لیکن یہ پستول سے بھی زیادہ خطرناک آلہ ہے ۔ ابھی جب میں تم میں سے ایک کا نشانہ بناؤں گا ۔ تو اندازہ ہو ہی جائے گا ۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

"تم چاہتے کیا ہو؟"

"یہ کہ جنگل سے دُور رہو۔"

"کیوں ۔ جنگل کیا تمھارے باپ دادا کا ہے۔"

"ہاں! اس وقت جنگل ہمارے باپ دادا کا ہی ہے ۔ جو بھی جنگل کا رُخ کرے گا ، مارا جائے گا ۔ ہم نے تمھیں جنگل میں کئی بار ختم کرنے کی کوشش کی ، لیکن ہر بار تم بچ گئے ۔ نہ جانے ۔ کوئی غیبی طاقت تمھیں بچا لیتی ہے ۔ یا تم کوئی غیر انسانی مخلوق ہو۔"

"بکومت ۔ میں انسان ہوں ۔ تم لوگ جنگل میں کیا کام کر رہے ہو؟"

"اسی بات کو چھپانے کے لیے تو مجھے تمھارا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آنا پڑا ہے ۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم کیا ارادہ رکھتے ہو ۔ سو معلوم ہو گیا ۔ تم ان جاسوس کے بچّوں کو ساتھ لے کر جنگل میں جانا چاہتے ہو ۔ انھوں نے انکار تو کر دیا تھا ، لیکن پھر تم لوگ آپس میں واقف نکل آئے ۔ اور اب یہ لوگ تمھارے ساتھ جنگل میں ضرور جاتے ۔ اس لیے مجھے اندر آنا پڑا ۔ تاکہ اس قصّے کو یہیں ختم کر دیا جائے ۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم نہیں چاہتے ۔ جنگل میں لوگ آئیں جائیں۔"

"لیکن کیوں ۔ تم لوگ وہاں کیا کر رہے ہو؟" منور علی خان

نے کہا ۔

"کچھ نہ کچھ تو کر ہی رہے ہیں۔" وہ بولا۔

"اگر تم لوگ کوئی غیر قانونی کام نہیں کر رہے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ۔ اور اگر غیر قانونی کام کر رہے ہو تو پھر ہمیں دخل اندازی کرنا ہوگی۔"

"میں تم لوگوں کو اس قابل نہیں چھوڑوں گا ۔ یہ بات یہیں دفن ہو کر رہ جائے گی ۔ جنگل کی بات جنگل تک ہی رہ جائے گی ۔ اور اب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پستول نما آلے کا رُخ منور علی خان کی طرف کر دیا ۔ عین اسی لمحے منور علی خان نے کندھے پر رکھا تھیلا بجلی کی سی تیزی سے اس کی طرف اُچھال دیا ۔ اس سے پہلے کہ ٹریگر دبتا ۔ تھیلا پستول سے ٹکرا گیا ۔ تھیلا شاید کافی وزنی تھا ۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر گرا ۔ اس وقت تک منور علی خان اچھل کر کھڑے ہو چکے تھے ، انھوں نے دائیں لات گھمائی جو اس کی پسلیوں میں لگی ۔ وہ لڑکھڑا گیا ۔ اور بُری طرح گرا ۔ لیکن گرتے ہی اس نے پستول پر ہاتھ ڈال دیا ۔ منور علی خان نے اس پر چھلانگ لگائی اور کمر پر جم گئے ۔ پھر دونوں ہاتھ اس کے پستول والے ہاتھ پر جما دیے ۔ پستول چھین لینے میں انھیں چند سیکنڈ لگے ، پھر انھوں نے اس کی کمر پر سے اُٹھنے

یں دیر نہ لگائی :

" سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور ہاتھ اوپر اٹھا دو۔" منور علی خان بولے ۔

حملہ آور اُٹھا اور بے دھڑک ان کی طرف بڑھا ۔ یہ دیکھ کر منور علی خان گھبرا گئے ، کیونکہ ان کا تو خیال تھا کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کرے گا ۔ بوکھلاہٹ کے عالم میں انھوں نے ٹریگر دبا دیا ۔ انھوں نے ایک باریک سی سوئی پستول کی نالی سے نکلتے دیکھی ۔ سوئی حملہ آور کے سینے پر لگی ، لیکن کچھ بھی نہ ہُوا اور وہ ان پر آ پڑا ۔

" میں نے پہلے ہی کہا تھا ۔ یہ پستول بے کار ہے ۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے پستول پھینک دیا ۔ اور حملہ آور کا وار روکنے کے لیے جھکائی دے گئے ۔ ساتھ ہی بائیں ہاتھ کی ہڈی اس کی کن پٹی پر ماری ۔ اتنے میں وہ بھی ایک مُکّا ان کی طرف اُچھال چکا تھا ۔ یہ مُکّا ان کی ٹھوڑی پر لگا ۔ مُکّا کافی زور دار تھا انھیں مزا آ گیا ۔ بھنّا کر جوتے کی نوک اس کی پنڈلی پر ماری ۔ اس نے اُچھل کر وار بچایا اور گویا ہُوا میں اُڑتا ہُوا اُن کی طرف آیا ۔ منور علی خان حیرت زدہ رہ گئے ۔ یہ شخص لڑائی بھڑائی میں ان سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا ۔ وہ سنبھل گئے ۔ ابھی تک اسے اتنی اہمیت نہیں دی تھی ۔

" مسٹر شوکی ۔ کھڑے مُنہ کیا دیکھ رہے ہیں ۔ پولیس کو فون کر دیں ۔"

" ج ۔ جی بہتر !" شوکی نے کہا اور کانپتے ہاتھوں سے فون کا ریسیور اُٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا ۔ یہ دیکھ کر حملہ آور نے اس کی طرف چھلانگ لگائی اور ایک ہاتھ اس کے سر پر مارا :

" ارے ۔ یہ میرے سر پر کیا چیز لگی ۔" شوکی نے گھبرا کر کہا اور نیچے بیٹھتا چلا گیا ۔ ادھر منور علی خان نے حملہ آور کی بائیں کلائی پکڑی اور دروازے کی طرف ایک زور دار جھٹکا مارا ۔ اشفاق شوکی کو بیٹھتے دیکھ کر فون کی طرف بڑھا اور جلدی جلدی نمبر گھمانے لگا ۔

حملہ آور بند دروازے سے ٹکرایا ۔ اور بلا کی رفتار سے واپس مُڑا ۔ منور علی خان کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے اشفاق کی کمر پر حملہ کیا ، لیکن منور علی خان نے درمیان میں ہی ٹانگ اڑا دی ۔ اور وہ اشفاق سے چند انچ ادھر ہی دھڑام سے گرا ۔

" ویری گڈ انکل ۔" اشفاق نے خوش ہو کر کہا ۔

" کون انکل ۔ کیسا ویری گڈ ۔ کیا بکواس ہے ۔ کون ہو تم ۔" دُوسری طرف سے جلالی نور کی جھنّائی ہوئی آواز کانوں سے ٹکرائی ، دراصل اس دوران سلسلہ مل گیا تھا ۔

" ارے باپ رے ۔۔ س سوری ۔ غغ ۔ غلط ۔ نمبر ۔" اشفاق بوکھلاہٹ میں کہہ گیا ، پھر جلدی سے بولا :

" جی نہیں ۔ درست نمبر ملایا ہے ۔ آپ ہی سے بات کرنا ہے ، مم ۔ میں ۔"

اشفاق کی کمر پر حملہ آور کی دونوں لاتیں اس زور سے لگیں کہ وہ دیوار سے جا ٹکرایا ۔ ریسیور میز سے نیچے لٹکنے لگا ۔۔ اشفاق کے منہ سے نکلنے والی چیخ پورے کمرے میں گونج اٹھی ، اور ایسے میں حملہ آور کی گردن منور علی خان کے دونوں ہاتھوں میں آ گئی ۔ وہ اس وقت تک یوں بھی بہت غصے میں آ چکے تھے ، لہذا دباؤ ڈالتے چلے گئے ۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں باہر کو ابل آئیں ۔ یہ دیکھ کر شوکی گھبرا گیا :

" ارے ارے ۔ انکل ۔۔ چھوڑ دیجیے ۔ کہیں یہ مر ہی نہ جائے ۔ اور دوسری دنیا میں جا کر ہمارے خلاف محاذ نہ قائم کر لے ۔"

" کیا کہہ رہے ہیں مسٹر شوکی ؟" منور علی خان نے حیرت زدہ آواز میں کہا ۔

" جج ۔ جی ۔ پتا نہیں ۔ کیا کہہ گیا ہوں ۔ آپ کچھ خیال نہ فرمائیے گا ۔"

" اچھا ۔ نہیں فرماؤں گا ۔"

یہ کہتے ہوئے منور علی خان نے اسے ایک زوردار جھٹکا دیا اور وہ کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح گر گیا ۔

" نقلی پستول سے ڈرانے چلا تھا ۔" منور علی خان نے منہ بنایا ۔

" انکل ۔ اگر اجازت ہو تو یہ کھلونا ہم اپنے پاس رکھ لیں ۔ دل بہلانے کے کام آ جایا کرے گا ۔"

" ضرور ۔ کیوں نہیں ۔"

" اب پولیس کو فون کرو ۔"

" جی ۔ جی ہاں ۔ ضرور ۔" شوکی نے کہا اور جلالی نور کے نمبر گھمائے ۔ دوسری طرف سے ایک کانسٹیبل نے بتایا کہ جلالی نور صاحب ابھی ابھی کہیں گئے ہیں ۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے انسپکٹر کاشان کے نمبر گھمائے :

" ہیلو انکل ۔ یہاں آپ کی فوری ضرورت ہے ۔"

" خیر تو ہے ؟" وہ بولے ۔

" ہم نے ایک شکار پکڑا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں آپ اسے حملہ آور کہہ سکتے ہیں ۔"

" اوہ ۔ تو کسی نے تم لوگوں پر حملہ کیا تھا ۔ اور تم نے اسے پکڑ لیا ہے ۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں شوکی ؟" انسپکٹر کاشان کے لہجے میں حیرت تھی ۔

" کیوں انکل ۔ کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ۔" شوکی حیران

ہو کر بولا۔

"تم نے بھلا حملہ آور کو کیسے قابو کر لیا۔ تم میں یہ ہمت کہاں سے آ گئی۔"

"اُدھار مل گئی تھی انکل۔ بس آپ آ جائیں۔"

"لیکن تمھیں چاہیے تھا۔ انسپکٹر جلالی نور کو فون کرتے۔" وہ بولے۔

"کر چکا ہوں۔ وہ تھانے میں نہیں ہیں۔"

"اچھا۔ آ رہا ہوں۔"

یہ سُن کر شوکی نے ریسیور رکھ دیا اور حملہ آور کا پستول اشفاق کو دیتے ہوئے بولا:

"یہ اتی جان کے حوالے کر آؤ۔ اگر کہیں جلالی نور ادھر آ گئے اور اس پستول کو دیکھ لیا تو اپنے بچوں کا دِل بہلانے کے لیے لے جائیں گے۔ جب کہ اس مالِ غنیمت کے اصل حقدار ہم ہیں۔"

"اچھا۔" اشفاق نے کہا اور پستول لے کر اندر چلا گیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ شوکی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہاں جلالی نور چند ماتحتوں کے ساتھ کھڑا تھا:

"ارے انکل۔ آپ آ گئے۔ کمال ہے۔"

"اس میں کمال کی کیا بات ہے۔ میں نے اشفاق کی آواز پہچان

لی تھی۔ اشفاق ہے کہاں؟"

"اندر گیا ہے۔ آتا ہی ہو گا۔ ان سے ملیے۔ یہ ہیں منور علی خان مشہور و معروف شکاری۔"

"اوہ۔ ان کا تو بہت نام سُنا ہے۔"

"ضرور سُنا ہو گا۔ یہ حملہ آور انھیں اور ہم سب کو ہلاک کرنے آیا تھا۔ اُنھوں نے بڑی مُشکل سے اس پر قابو پایا۔ ورنہ یہ تو ہمیں جان سے مار ڈالنے پر تُلا ہوا تھا۔"

"اوہو اچھا۔" جلالی نور کے مُنہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

"یہ غلط ہے۔ یہ سب لوگ مل کر مجھے مارنے پر تُل گئے تھے۔ میرے پاس دس ہزار روپے ہیں۔ یہ مجھ سے میرے دس ہزار روپے چھین لینا چاہتے تھے۔"

"ارے۔ اچھا۔" جلالی نور کے لہجے میں حیرت دَر آئی۔

"بھئی واہ۔ خُوب پلٹا کھایا۔" منور علی خان مسکرائے۔

"یہ دیکھیے۔ میری جیب میں دس ہزار روپے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے جیب کی طرف ہاتھ لے جانا چاہا:

"اے۔ خبردار۔ اپنا ہاتھ جیب سے دُور رکھو۔ انکل جلالی نور یہ جیب سے کوئی ہتھیار نکالنا چاہتا ہے۔"

"مجھے سبق پڑھانے کی کوشش نہ کرو۔ ٹھہرو۔ مَیں خُود تمھاری جیب سے دس ہزار روپے نکالوں گا۔" جلالی نور نے پہلے شوکی سے

اور پھر حملہ آور سے کہا۔

"بڑے شوق سے۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" حملہ آور ہنسا۔

جلالی نُور نے حملہ آور کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ دُوسرے ہی لمحے اس کی ٹھوڑی پر حملہ آور کی کہنی اس زور سے لگی کہ وُہ لڑکھڑا گیا۔ دُوسرے ہی لمحے حملہ آور نے ایک لمبی چھلانگ لگائی۔ یہ چھلانگ دروازے کی طرف لگائی تھی۔ ایک دھماکہ سا ہوا، کیونکہ اسی وقت باہر سے انسپکٹر کاشان اندر داخل ہوئے تھے۔ انسپکٹر کاشان اور حملہ آور دونوں دھڑام سے گرے۔ منور علی خان نے حملہ آور کو پکڑنے کے لیے چھلانگ لگائی لیکن اس وقت تک وُہ اُٹھ کر دروازہ عبور کر چکا تھا۔ منور علی خان، انسپکٹر کاشان کی ٹانگوں میں اُلجھ کر مُنہ کے بل گرے۔ جب اُٹھے اور باہر نکل کر دیکھا تو حملہ آور غائب تھا۔

"اُف انکل۔" آفتاب نے کانپ کر کہا

"اُف انکل۔ کیا مطلب۔" انسپکٹر کاشان نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ہمارے دفتر میں اس وقت اکٹھے تین انکل جمع ہو چکے ہیں، اُف۔" وُہ بولا۔

"تو اس میں اس قدر اُف اُف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" جلالی نُور نے مُنہ بنایا۔

"ہاں، ٹھیک تو ہے۔ ویسے انکل۔ اب تو آپ کو ہماری باتوں پر اعتبار آ گیا ہوگا۔" اشفاق نے جلدی سے کہا۔

"خاموش رہو۔ آخر یہ سب کیا ہے؟"

"اس میں کوئی شک نہیں جناب کہ وُہ ہمیں واقعی جان سے مار دینا چاہتا تھا۔" منور علی خان بولے۔

"لیکن کیوں؟"

"یہ تو آپ اسی سے پُوچھیے۔" منور علی خان جلدی سے بولے۔

"کیا مطلب۔ کیا آپ کو بھی معلوم نہیں کہ حملہ آور آپ کو کیوں ہلاک کرنا چاہتا تھا؟"

"کیا کہہ سکتا ہوں۔" انھوں نے کندھے اچکائے۔

"معاملہ کیا ہے؟" انسپکٹر کاشان نے بے چین ہو کر کہا۔

"میں بتاتا ہوں انکل۔" آفتاب نے کہا، لیکن منور علی خان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور بولے:

"آپ نہیں۔ میں بتاؤں گا۔" یہ کہہ کر وُہ جلالی نُور اور کاشان کی طرف مُڑے۔ اسی وقت اندرونی دروازہ کھلا اور ابّا جان کی آواز سُنائی دی:

"بھئی یہ کیا دھما چوکڑی ہے۔"

"اب تو دھما چوکڑی ختم بھی ہو چکی ابّا جان۔" اخلاق بولا۔

"اوہو... یہاں تو انسپکٹر صاحبان بھی موجود ہیں۔"

"جی ہاں — اس میں تو کوئی شک نہیں۔" آفتاب بول اٹھا۔

"کیا مطلب؟" جلالی نور نے تلملا کر کہا۔

"لیجیے — کیا میں نے کوئی بُری بات کہہ دی؟" آفتاب نے منہ بنایا —

"مسٹر — آپ تفصیل سُنا رہے تھے۔" جلالی نور، منور علی خان کی طرف مڑے۔

"ان کا نام منور علی خان ہے — مشہور و معروف شکاری — اور انسپکٹر کامران مرزا کے گہرے دوست۔"

"کیا!!!" وہ ایک ساتھ بولے۔

"جی ہاں۔" شوکی نے پُرجوش انداز میں کہا: "کچھ عرصہ پہلے ایک مہم میں ہم انسپکٹر کامران مرزا کے ساتھ رہ چکے ہیں۔"

"یہ تو آپ سُن ہی چکے ہیں کہ میں ایک شکاری ہوں — ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ حملہ آور بھی کوئی شکاری تھا۔ شکاری عام طور پر دوسرے شکاریوں کا دشمن ہوتا ہے — شاید اسی لیے وہ مجھے ہلاک کرنا چاہتا تھا۔"

"اوہ، لیکن آپ کے ساتھ وہ شوکی برادرز کو کیوں مارنا چاہتا تھا؟" جلالی نور نے پوچھا۔

"تاکہ یہ لوگ اس کے خلاف گواہی نہ دے سکیں — پولیس کو اس کا حلیہ نہ لکھوا سکیں۔" منور علی خان بولے۔

"ہوں! بات تو ٹھیک ہے — کیا آپ اس کے خلاف رپورٹ نہیں لکھوائیں گے؟"

"جی ہاں — کیوں نہیں — آپ یہیں لکھیں گے یا مجھے تھانے چلنا ہو گا —"

"نہیں — یہیں لکھ لیتے ہیں۔"

جلالی نور نے رپورٹ تیار کرائی اور ان کے دستخط کرائے، پھر رُخصت ہوا:

"تو کیا میں بھی جا سکتا ہوں؟" انسپکٹر کاشان بولے۔

"جی ہاں، ضرور۔"

"تو کیا آپ لوگ اصل بات مجھ سے بھی چھپائیں گے؟"

"اوہو — تو آپ سمجھ گئے۔" شوکی چونک کر بولا۔

"ہاں — مسٹر منور علی خان نے تم لوگوں کو بات بتانے سے اس لیے روکا تھا کہ یہ اصل بات بتانا نہیں چاہتے تھے۔"

"ہوں — آپ سمجھ گئے — خیر بات کوئی اتنی خاص نہیں — مُلک کے اس حصے کے جنگل میں میں نے اس حملہ آور کو فقیر کے روپ میں دیکھا تھا — نقلی پیر اور فقیر کب یہ چاہتے ہیں کہ ان کا پول کھلے — یا تو یہ بات ہو سکتی ہے — یا پھر کوئی اور — اگر وہ پکڑا جاتا تو حقیقت معلوم ہو جاتی۔"

"ہوں، خیر — بہرحال آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی — آپ

کے دوستوں۔ یعنی انسپکٹر کامران مرزا اور انسپکٹر جمشید وغیرہ کو دیکھنے
کا بہت شوق ہے۔ کاش میرا یہ شوق پورا ہو جاتا۔" یہ کہتے ہوئے
انسپکٹر کاشان اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"اور اب انکل۔ آپ کیا کہتے ہیں؟" شوکی نے ان کے جانے
کے بعد کہا۔

"میں۔ میں اب کیا کہوں گا۔ جس مہم میں میں کوئی خطرہ
محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس میں تو اب ایسا معلوم ہوتا ہے،
جیسے اَن گنت خطرات بھرے پڑے ہیں۔ لہٰذا میں اب آپ
لوگوں سے یہ نہیں کہوں گا کہ میرے ساتھ جنگل میں چلیں۔ مجھے
بہر حال جانا ہو گا۔"

"آخر آپ نے جنگل میں کیا دیکھا تھا؟"

"جو کچھ میں نے دیکھا۔ وہ ذرا دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔"

"ہوں۔ تب پھر ہم آپ کے ساتھ ضرور چلیں گے۔" شوکی نے
فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

"میں بھی تم سے یہی کہنا چاہتا تھا کہ اپنے انکل کا ساتھ ہر
قیمت پر دو۔" مشتاق احمد خان بولے۔

"چاہے تمھاری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔" اندرونی دروازے
سے آواز آئی۔

"کیا مطلب امّی جان۔ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟" شوکی نے

گھبرا کر کہا۔

"یہ کہ ان کا ساتھ ضرور دینا چاہیے۔"

"بہت بہت شکریہ امّی جان۔"

"اور میں بھی آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہاں تو
میرے نئے ساتھیو۔ اب چلنے کی تیاری کریں، کیونکہ وقت ضائع
کرنا مناسب نہیں ہو گا۔ حملہ آور اگر گرفتار ہو جاتا تو اور
بات تھی۔"

"اس کے گرفتار ہونے کی صورت میں آپ جلالی نور کو کیا بیان
دیتے۔"

"یہ کہ حملہ آور سے ہی پوچھا جائے۔ اس نے حملہ کیوں کیا۔
مجھے یقین ہے۔ اصل بات وہ بھی ہرگز نہ بتاتا۔"

"ہمیں اجازت دیجیے۔ ہم لباس تبدیل کر لیں۔" شوکی بولا۔

"ہاں ضرور۔"

وہ اندر آئے۔ ان کی امّی بھی دروازے سے ہٹ کر
ان کے ساتھ اندر آ گئیں۔

"شوکی۔ یہ اپنا پستول اٹھا لو۔ مجھے ایسی چیزوں سے ڈر لگتا
ہے۔"

"لیکن امّی جان۔ یہ تو نقلی ہے۔" آفتاب نے کہا۔

"نقلی ہو یا اصلی۔ ہے تو پستول۔ کیا خبر کب یہ اصلی گولیاں

اُگلنے لگ جائے۔" ان کی امی گھبرا کر بولیں۔

انھیں ہنسی آ گئی۔ شوکی نے پستول لے لیا۔ لباس تبدیل کرکے وہ دفتر میں آئے، اور منور علی خان کے ساتھ باہر نکلے۔

"لیکن انکل۔ جائیں گے کیسے؟"

"فکر نہ کرو۔ میرے پاس میری جیپ ہے۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں۔ اپنی جیپ ساتھ لے جاتا ہوں۔"

منور علی خان نے کہا اور انھیں ساتھ لے کر کچھ فاصلے پر کھڑی سبز رنگ کی جیپ تک آئے۔ انھوں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے۔ اچانک ایک سرد آواز گونج اُٹھی:

"آخر پھنس گئے نا۔"

کھسرپھسر

جیپ کی پچھلی سیٹ سے اس آدمی نے سر اُبھارا جس نے دفتر میں منور علی خان سے جنگ کی تھی۔ اس مرتبہ بھی اس کے ہاتھ میں ایک پستول نظر آیا، لیکن یہ پستول پہلے سے مُختلف تھا۔ اس نے یہ الفاظ دبی آواز میں ادا کیے تھے۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ اگلی سیٹ پر بیٹھے منور علی خان کو اس کی جیپ میں موجودگی کا علم نہ ہو۔

"آ۔ آپ۔ یعنی کہ آپ۔" شوکی نے لرزتی آواز میں کہا۔

"ہاں بھئی۔ میں۔ کیا بات ہے؟" اگلے حِصّے سے منور علی خان بولے۔

"ج۔ جی۔ وُہ۔ وُہ۔ میں۔" شوکی نے کہنا چاہا، لیکن اسی وقت حملہ آور نے پستول کی نال اس کی پسلیوں میں چبھو دی۔

"وہ۔ میں۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں مسٹر شوکی۔"

"لگ۔ کچھ نہیں انکل۔ بس یونہی۔" شوکی بولا۔

"نہیں بھئی۔ کچھ نہ کچھ بات تو ضرور ہے۔"

"دراصل میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ۔ اگر آپ نے جنگل میں کوئی عجیب و غریب بات دیکھی تھی جو آپ کی سمجھ سے باہر ہے۔ تو اس صورت میں آپ نے اپنے دوست انکل انسپکٹر کامران مرزا کو کیوں فون کر کے نہ بلا لیا؟"

"اوہ ہاں! آپ نے اچھا سوال کیا۔ بات دراصل یہ ہے شوکی۔ کہ میں نے انھیں فون کیا تھا، مگر وہ دارالحکومت میں ملے ہی نہیں۔ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ کسی نامعلوم مقام کی طرف گئے ہیں۔"

"اوہ۔ تب تو ٹھیک ہے، لیکن اس صورت میں آپ کو انکل انسپکٹر جمشید کو بلا لینا چاہیے تھا۔" شوکی نے کہا۔

"ہاں! میں نے یہ کوشش کی تھی، لیکن ادھر بھی ناکامی ہوئی، وہ بھی نہیں ملے۔"

"اس لیے آپ ہمارے پاس آئے۔"

"اور کیا کرتا۔ یہاں رہتے ہوئے میں نے آپ لوگوں کا کچھ ذکر سنا تھا۔ میں نے سوچا، کیوں نہ آپ سے ہی مدد لی جائے۔ اس بات کا تو مجھے احساس بھی نہیں تھا کہ کوئی میرا تعاقب کرتا ہوا آپ کے دفتر تک پہنچ جائے گا۔ اور

آپ لوگ بھی پریشانی میں مبتلا ہو جائیں گے، اگر معلوم ہوتا تو کبھی اس طرح آپ کے دفتر کا رُخ نہ کرتا۔"

"تب آپ کس طرف رُخ کرتے؟" آفتاب بول اٹھا۔

"پپ۔ پتا نہیں۔" انھوں نے کہا اور خاموش ہو گئے۔

"اب چپ بھی رہو۔ چند باتیں مجھ سے بھی کر لو، لیکن آواز نہ اُبھرے۔" وُہ غرّایا۔

"بہت بہتر مسٹر حملہ آور۔ فرمائیے۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟" شوکی نے بھی سرگوشی کی۔

"میں یہ چاہتا ہوں۔ تم لوگ جنگل کا رُخ نہ کرو۔ اپنے ساتھی کو جنگل سے دُور ہی رہنے کا مشورہ دو۔"

"کیا وُہ ہمارا مشورہ مان لیں گے؟"

"اگر نہ مانیں تو تم لوگ اس کا ساتھ نہ دو۔"

"دیکھیے جناب۔ یہ دونوں باتیں ہی ہمارے لیے بہت مشکل ہیں۔ اوّل تو ہم انھیں یہ مشورہ نہیں دے سکتے، اور اگر کسی طرح مشورہ دے بھی دیں تو ان کے انکار کے باوجود ان کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ دراصل ہمارے تعلقات آپس میں کچھ اس قسم کے ہیں۔"

"اس صورت میں پتا ہے، کیا ہو گا؟" اس نے گویا دھمکی دی۔

"جی- پتا نہیں- کیا ہوگا- یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں۔" آفتاب نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

"ہاں! اس میں کیا شک ہے کہ میں بتا سکتا ہوں۔ تو سنو- اس صورت میں ہوگا یہ کہ یہ جیپ اُلٹ جائے گی اور تم لوگ یا تو دُوسری دُنیا کو سدھار جاؤ گے یا پھر شدید زخمی ہو جاؤ گے۔"

"ل- لیکن- جیپ کیوں الٹ جائے گی- اس کا دماغ تو نہیں چل گیا-" آفتاب کی آواز قدرے اونچی ہو گئی- آواز منور علی خان کے کانوں تک پہنچ گئی:

"یہ کس کا دماغ چل گیا ہے بھئی۔"

"ج- جی جیپ- میرا مطلب ہے- کسی کا نہیں- آپس کی بات ہے۔" آفتاب نے گڑبڑا کر کہا۔

"آپس کی بات- کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہم آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔"

"تو کرو- منع کس نے کیا ہے، لیکن کیا تم گونگی باتیں کر رہے ہو- آواز تو سنائی نہیں دے رہی۔"

"ہائیں- انکل- کیا باتیں بھی گونگی ہوتی ہیں؟"

"بھئی- میں یقین سے نہیں کہہ سکتا- ہوتی ہیں یا نہیں۔" وُہ بولے۔

"جو مَیں نے کہا ہے، اس پر عمل کرو۔" حملہ آور نے غرّانے کے انداز میں سرگوشی کی۔

"یہ کیا- تم ایک دوسرے سے کانا پھوسی کیوں کر رہے ہو۔" منور علی خان بولے۔

"اوہ، ایسی بات نہیں انکل- ویسے انکل ہم نہیں جانتے، آپ نے جنگل میں کیا دیکھا ہے- کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آپ خطرے میں نہ پڑیں اور شکار کھیلنے کے لیے کسی دُوسرے جنگل کی طرف نکل جائیں-" شوکی نے حملہ آور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا- اس نے پسندیدگی کے اظہار میں سر ہلایا- جیسے کہہ رہا ہو:

"ہاں! اب تم نے ٹھیک بات شروع کی۔"

"کیا بات کرتے ہیں مسٹر شوکی- میں نے جو کچھ دیکھا ہے، اسے نظر انداز کس طرح کیا جا سکتا ہے۔"

"لیکن انکل بات یہ ہے کہ ہم بہت خوف محسوس کر رہے ہیں۔"

"اوہ- تو یہ بات ہے- اس لیے آپ لوگ کھسر پسر کر رہے تھے- خیر بھئی- میں آپ کو زبردستی تو ساتھ دینے پر مجبور نہیں کر سکتا- آپ چاہیں تو واپس اپنے گھر جا سکتے ہیں- کیا میں جیپ روک دوں۔"

شوکی نے سوالیہ انداز میں حملہ آور کی طرف دیکھا۔ گویا اس نے اس سے پُوچھا:

"ہاں مسٹر۔ اب میں کیا جواب دوں۔"

"ٹھیک ہے۔ کہہ دو کہ ہمیں یہیں اُتار دیں۔" اس نے اشاروں میں کہا۔

شوکی نے اپنے تینوں بھائیوں کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی اُلجھن تھی، گویا سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔

"آپ نے جواب نہیں دیا شوکی۔"

"ہم۔ ہم آپ کا ساتھ دیں گے انکل۔ ہر حال میں۔"

"تب پھر ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ مالک ہے۔" وُہ بولے۔

حملہ آور نے قہر آلود نظروں سے انھیں دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو:

"فکر نہ کرو۔ تم لوگوں کو اگر میں نے کچّا نہ چبایا تو کچھ نہ کیا۔"

آدھ گھنٹے بعد جیپ جنگل میں داخل ہو گئی۔ اب وُہ درختوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ جیپ نے سڑک چھوڑ دی تھی:

"شوکی۔ بس ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔"

"لیکن کہاں انکل۔" آفتاب نے مُنہ بنایا۔

"بھئی۔ جنگل میں۔ جس جگہ مَیں آپ کو لے جا رہا ہوں۔"

"ہوں۔ کتنی دیر اور لگے گی؟" آفتاب بولا۔

"بس۔ دس منٹ اور۔"

شوکی نے حملہ آور کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اب گویا نیچے اُترنے کی تیاری میں مصروف تھا۔ انھیں حیرت اس بات پر تھی کہ اس کے پاس دوسرا پستول کہاں سے آ گیا۔ لڑائی کے وقت بھی اگر یہ پستول اس کے پاس تھا تو اس نے اس سے ان پر فائر کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی، پھر خود بخود وجہ ان کی سمجھ میں آ گئی۔ ان کا دفتر بہت آباد علاقے میں تھا۔ گولی چلانے کے بعد اس کے لیے فرار ہونا مشکل ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی جو اس نے نقلی پستول استعمال کیا تھا۔ اور اب اصلی پستول ان کی طرف تانے بیٹھا تھا۔

آخر جیپ رُک گئی۔ اور انھوں نے منور علی خان کی آواز سُنی:

"چلو بھئی۔ اُتر آؤ نیچے۔"

"یہیں بیٹھے رہو۔ صرف میں اُتروں گا۔ خبردار۔" حملہ آور نے گویا ان کے کانوں میں کہا اور جیپ سے اتر گیا۔ ساتھ ہی جیپ کا دروازہ بند کر دیا۔ انھوں نے سُنا۔ حملہ آور تیز آواز

یں کہہ رہا تھا:
"ہاتھ اُوپر اُٹھا دو مسٹر منور علی خان۔"
"ارے!" اُن کے مُنہ سے حیرت کی زیادتی سے نکلا، پھر وُہ
کانپتی آواز میں بولے:
"یہ ۔ یہ کیا ۔ شوکی برادرز تم میں کس طرح تبدیل ہو گئے؟"
خوف کے ان لمحات میں بھی ان چاروں کی ہنسی نکل گئی۔
ہنسی کی آواز نے منور علی خان کو چونکا دیا:
"اوہ ۔ تو وُہ اندر موجود ہیں ۔ آخر تم کیا چاہتے ہو؟"
"جنگل سے دُور رہو۔"
"تمھیں ہم لوگوں سے کیا خطرہ ہے؟" منور علی خان بولے۔
"میں نے کہا ہے ۔ جنگل سے دُور رہو، اگر نہ گئے تو یہاں
تم لوگوں کی صرف لاشیں ہی ملیں گی۔"
"کیسے ملیں گی ۔ جنگل کے جانوروں کو ۔ یہاں ہماری لاشیں
تلاش کرنے کون آئے گا؟"
"تو تم نہیں جاؤ گے؟"
"ہرگز نہیں ۔" منور علی خان بولے۔
"اچھا تو یہ لو۔"
ان الفاظ کے ساتھ ہی فائر کی آواز گونجی ۔ وُہ تھر تھر کانپنے
لگے ۔ دل دہل گئے ۔ اس خیال سے کہ کہیں گولی منور علی خان

کے لگ تو نہیں گئی ۔ اُسی وقت اُنھوں نے سُنا، منور علی خان کہہ
رہے تھے:
"بہت خوب ۔ نشانہ تو بہت پُختہ ہے تمھارا ۔ ایک بار پھر
فائر کرو۔" ان کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔
ایک بار پھر فائر ہوا ۔ وُہ پھر ہل گئے ۔
"بھئی واہ ۔ مزا آ گیا ۔ تم نے دیکھا میرے تھیلے کا کمال ۔
ڈرو اس وقت سے جب مَیں اس میں ہاتھ ڈال کر تم پر کوئی چیز
اچھالوں گا ۔ اس وقت تم کہیں کے نہیں رہو گے۔"
تیسرا فائر ہوا ۔ اور پھر تو گویا حملہ آور پر دیوانگی طاری ہو
گئی ۔ پے در پے فائر ہوئے اور خاموشی چھا گئی ۔ چند سیکنڈ
بعد آواز اُبھری:
"اب کیا کرو گے ۔ پستول تو خالی ہو چکا ہے۔"
ساتھ ہی کسی کے چھلانگ لگانے کی آواز آئی ۔ شاید حملہ آور
نے منور علی خان پر چھلانگ لگائی تھی:
"تم یوں نہیں مانو گے ۔ مجھے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالنا
ہی ہو گا۔"
ایک منٹ بعد ہی انھوں نے حملہ آور کے چیخنے اور چلّانے
کی آوازیں سنیں، پھر جیپ کا دروازہ کھلا اور منور علی خان کا
مسکراتا چہرہ نظر آیا:

"باہر آجاؤ بھئی۔ دیکھو۔ بے چارے حملہ آور کا انجام۔ دراصل
اس بے چارے کو کیا معلوم کہ ایک شکاری کے تھیلے میں کتنی
عجیب و غریب چیزیں ہوتی ہیں۔"

وہ چھلانگیں لگا کر باہر نکلے تو عجیب منظر دیکھا۔ حملہ آور
کے پیروں کو لوہے کے ایک آنکڑے نے گرفت میں لے رکھا تھا،
اور کچھ اس بُری طرح جکڑے ہوئے تھا کہ حملہ آور زمین پر پڑا
بُری طرح چیخ اور چلّا رہا تھا:

"دیکھا آپ نے۔ اب یہ اس جگہ سے آگے نہیں بڑھ سکے
گا۔ اس آنکڑے سے تو میں ہاتھی تک پکڑ لیتا ہوں۔ یہ خالص
میری ایجاد ہے۔" وہ بولے۔

"لیکن انکل۔ اب آپ ہاتھی کس طرح پکڑیں گے۔ آنکڑہ تو
اس کے پاس چھوڑے جا رہے ہیں۔" اشفاق بولا۔

"تو کیا ہُوا۔ یہ آنکڑہ لے کر بھاگ نہیں سکتا۔ ہم واپسی پہ
نکال لیں گے۔ اس وقت تک اس کی ٹانگیں جواب دے چکی
ہوں گی۔"

"جی کیا مطلب۔ جواب دے چکی ہوں گی۔"

"ہاں۔ جُوں جُوں یہ حرکت کرے گا۔ ٹخنوں کے پاس کی
جگہ چھلتی چلی جائے گی اور زخم گہرے ہوتے چلے جائیں گے۔
وہ زخم اسے اور حرکت کرنے پر مجبور کریں گے، اس طرح زخم

اور گہرے ہو جائیں گے۔"

"اوہ۔" وہ دھک سے رہ گئے۔ کس قدر خوفناک ہتھیار تھا یہ۔

"آؤ چلیں۔ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ میں آپ
لوگوں کو جلد ہی فارغ کر دوں گا اور پھر تنہا مہم پر نکلوں گا۔"

"کیا مطلب۔ فارغ کر دیں گے۔"

"ہاں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جنگل میں گڑبڑ کیا
ہے۔ گڑبڑ کو دُور کرنے کے لیے میں اکیلا جاؤں گا۔ آپ لوگوں کی
زندگیاں خطرے میں کیسے ڈال سکتا ہوں۔"

"اب جب کہ۔ ہم گھر سے نکل آئے ہیں۔ ہم آپ کا ساتھ
آخر تک دیں گے۔" شوکی بولا۔

"اوہو۔ یہ جذبہ۔ لیکن مجھے تو معلوم ہوا تھا۔ آپ لوگ ڈرپوک
ے واقع ہوئے ہیں۔"

"جی ہاں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہم واقعی واقع تو
ہوئے ہیں ڈرپوک، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے انکل کو
مصیبت میں چھوڑ کر خود واپس چلے جائیں۔"

"خیر۔ دیکھا جائے گا۔ میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔"

"اور ہم بھی آپ کو مجبور نہیں کریں گے۔" اخلاق نے کہا۔

"کیا مطلب۔" منور علی خان چونکے۔

"مطلب یہ کہ آپ کو پریشان نہیں کریں گے۔" اخلاق گڑبڑا

کر بولا۔

جنگل بہت گھنا تھا۔ اور سورج کی روشنی مشکل سے زمین تک آ رہی تھی۔ کہیں کہیں دھوپ نظر آ جاتی تھی۔ درخت بھی عجیب طرح کے تھے۔ بالکل ٹیڑھے میڑھے سے۔

"ابھی ہمیں پندرہ منٹ اور چلنا ہے۔ جیپ اس جگہ سے آگے نہیں آ سکتی تھی۔ اس لیے اسے وہاں روکنا پڑا تھا۔" منور علی خان نے بتایا۔

"پندرہ منٹ کیا۔ ہم تو آپ کے ساتھ ساری زندگی چلنے کے لیے تیار ہیں۔"

"نہ جانے۔ انسپکٹر کامران مرزا کہاں ہوں گے؟" منور علی خان حسرت بھرے انداز میں بڑبڑائے۔

"اور انکل انسپکٹر جمشید بھی تو۔" شوکی بول اُٹھا۔

"آپ لوگوں کی ان سے ملاقات کن حالات میں ہوئی تھی۔ کیا بتانا پسند کریں گے؟"

"ضرور کیوں نہیں۔ وہ تو ایک بہت ہی عجیب اور حیرت انگیز ملاقات تھی۔" شوکی نے کہا اور تفصیلات بتانے لگا۔ یہاں تک کر منور علی خان بول اُٹھے:

"بھئی بہت خوب۔ ان واقعات میں تو کسی شاندار ترین اور دلچسپ ترین فلم سے بھی زیادہ لطف آ رہا ہے۔"

"جی ہاں۔ آگے آگے دیکھیے۔ ہوتا ہے کیا۔" شوکی پُر جوش لہجے میں بولا اور پھر واقعات بیان کرنا شروع کر دیے، لیکن ابھی انجام تک نہیں پہنچا تھا کہ منور علی خان بول اُٹھے:

"لو بھئی۔ ہم پہنچ گئے۔ افسوس شوکی۔ ابھی آپ کی کہانی مکمل نہیں ہوئی۔ خیر۔ پھر کسی وقت سنوں گا۔ پہلے تو آپ یہ منظر دیکھ لیں۔ جو میں آپ کو دکھانے لایا ہوں۔"

انھوں نے سامنے دیکھا۔ چند لمحے تک خالی خالی نظروں سے دیکھتے رہے، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

مطالبہ

انسپکٹر کامران مرزا گھر کے دروازے پر پہنچے اور حیرت زدہ رہ گئے۔ دروازے پر ایک بڑا سا کاغذ چپاں تھا اور اس پر لکھا تھا۔ ہڑتال۔

چند سیکنڈ تک وہ کاغذ اور اس پر لکھے لفظ کی طرف دیکھتے رہے۔ آخر گھنٹی بجائی۔ چند سیکنڈ بعد شہناز بیگم نے دروازہ کھولا:

"بیگم۔ ہمارے گھر میں ہڑتال کس نے کر رکھی ہے؟"

"آپ کے سپوتوں نے۔"

"لیکن کیوں۔ انھیں کیا پریشانی ہے۔ جیب خرچ کم ہے۔ یا کوئی اور بات۔"

"جیب خرچ کی انھوں نے کبھی شکایت نہیں کی۔"

"تب پھر کیا بات ہے؟"

"میں نے تو پوچھا تھا۔ یہی جواب ملا۔ آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ شکایت ہے تو ابا جان سے۔"

"خیر۔ چلو۔ میں ان سے پوچھ لیتا ہوں۔"

وہ ان کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ آفتاب، آصف اور فرحت صحن میں بیٹھے نظر آئے۔ تینوں کے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں بندھی تھیں۔ سیاہ پٹیوں پر نظر پڑتے ہی وہ بولے:

"یا اللہ رحم۔ یہ تو کوئی باقاعدہ قسم کی ہڑتال نظر آتی ہے۔"

"تو کیا ابا جان۔ ہڑتالیں بے قاعدہ قسم کی بھی ہوتی ہیں؟"

"ہاں۔ بہت زیادہ بے قاعدہ بھی ہوتی ہیں۔ کچھ تو صرف گیدڑ بھبکیاں ہوتی ہیں، لیکن تم بتاؤ۔ تمھاری ہڑتال کس قسم کی ہے؟"

"ابا جان!" فرحت بولی۔

"ابا جان۔ ہائیں فرحت۔ یہاں تمھارے ابا جان کہاں ہیں؟"

"انکل منور علی خان۔" آفتاب اور آصف نے گویا نعرہ لگایا۔

"زندہ باد۔" انسپکٹر کامران مرزا بوکھلا اُٹھے۔

"آپ غلط سمجھے ابا جان۔ ہم نعرے بازی نہیں کر رہے۔"

"تت۔ تو پھر کیا کر رہے ہو؟" انھوں نے بوکھلا کر کہا۔

"مطالبہ۔ اور دراصل یہ مطالبہ فرحت کا ہے، لیکن ہم بھی اس کا پوری طرح ساتھ دے رہے ہیں، اس طرح یہ مطالبہ ہم تینوں کا ہی ہو گیا۔"

"اور مطالبہ کیا ہے؟" وہ بولے۔

" فرحت اپنے ابّا جان کے لیے بہت بے چین ہے ۔ یہ ان دنوں انھیں متواتر اپنے خوابوں میں دیکھ رہی ہے ۔ اس کا خیال ہے ۔ اس کے ابّا جان ضرور کسی مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں ، لہٰذا ان کی تلاش میں نکلنا چاہیے ۔"

" ان کی تلاش میں نکلنا چاہیے ، لیکن کیسے ۔ بھلا ہم انھیں کس طرح تلاش کر سکتے ہیں ۔"

" ڈھونڈے سے تو ابّا جان ، خدا بھی مل جاتا ہے ۔" آفتاب نے فوراً کہا ۔

" بھئی خدا کو تو تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں ۔ خدا تو ہماری شہ رگ سے بھی نزدیک ہے ۔ خدا تو ہر جگہ موجود ہے ، اس کی طرف تو بس لو لگانے کی دیر ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ۔ میرے بندے تو میری طرف ایک بالشت بڑھ ۔ میں تیری طرف ایک ہاتھ آگے بڑھوں گا ۔ تو میری طرف چل کر آ ، میں تیری طرف دوڑ کر آؤں گا ۔ تو میرا ذکر کر ، میں تیرا ذکر کروں گا ۔ تم یہ بتاؤ کہ ہم منور علی خان کو کس طرح تلاش کریں ۔"

" یہ زیادہ مشکل نہیں ۔ بس آپ کو کچھ چھٹیاں لینا ہوں گی اور ہمیں بھی ۔"

" چھٹیاں لینا کوئی مسئلہ نہیں ۔ آج کل میں بالکل فارغ ہوں ۔ تم تو بس یہ بتاؤ ۔ ہم انھیں تلاش کس طرح کریں گے ۔"

" دو ماہ پہلے فرحت کو ان کی طرف سے ایک خط ملا تھا ۔ یہ خط انھوں نے شہر لوسین سے لکھا تھا ۔ گویا وہ ان دنوں لوسین کے جنگل رینال بن میں شکار کھیل رہے ہیں ۔ کیا وہاں پہنچنا ہمارے لیے مشکل ہے ۔"

" مشکل کی بات چھوڑو ۔ بس ان کا سراغ ہمارے پاس ہونا چاہیے ۔"

" اور یہ سراغ بہت کافی ہے ۔"

" لیکن یقین سے نہیں کہا جا سکتا ۔ وہ اب تک اسی جنگل میں ہوں گے ۔ ہو سکتا ہے ۔ اب وہ کہیں اور جا چکے ہوں ، یہ تم لوگ بھی اچھی طرح جانتے ہو ۔ وہ زیادہ دن ایک جنگل میں نہیں گزارتے ۔"

" ہاں ، لیکن اس کے باوجود میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ وہیں ہیں اور کسی مصیبت میں پھنس چکے ہیں ۔" فرحت بولی ۔

" خیر ۔ تو ہم وہاں چلے چلتے ہیں ، لیکن اس کے لیے ہمیں کچھ بحری سفر کرنا ہو گا ۔ لوسین تک تو ہم ہوائی جہاز سے پہنچ جائیں گے ۔ اس سے آگے کا سفر لانچوں کا ہے ۔"

" تو کیا ہوا انکل ۔ کیا ہم پہلے لانچوں پر سفر نہیں کرتے رہتے ۔"

" ہاں ، کیوں نہیں ۔ خیر ۔ تم لوگ فکر نہ کرو ۔ ہڑتال ختم

کر دو ۔ میں اسی وقت سے **انتظامات میں لگ** جاتا ہوں ۔" انھوں نے کہا ۔

تینوں کے چہرے کھل اُٹھے ۔ وُہ ایک ساتھ بولے :

" ہماری ہڑتال کس قدر کامیاب رہی ۔"

انسپکٹر کامران مرزا اور شہناز بیگم مسکرانے لگے ۔ دُوسرے دن وُہ لوسین کے ایرپورٹ پر اُتر چکے تھے اور وہاں سے ایک لانچ میں بیٹھے رینال بن کا رُخ کر رہے تھے ۔ سمندر کی سطح بہت پُرسکون تھی ۔

" اب ہم صرف تین گھنٹے بعد رینال بن میں داخل ہو رہے ہوں گے ۔" فرحت نے خوش ہو کر کہا ۔

" ہاں ، لیکن اس کے بعد تمھارے ابّا جان کو تلاش کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا ، میں نے سُنا ہے ۔ رینال بن انتہائی خطرناک جنگل ہے ۔ اس میں شیر ، ہاتھی ، گینڈے ، اژدھے اور نہ جانے کون کون سے خطرناک جانور بھرے پڑے ہیں ۔"

" اللہ اپنا رحم فرمائے ۔ ہمیں تو شکار کا تجربہ بھی نہیں ۔ جنگل میں کس طرح سفر کریں گے ۔" آفتاب نے کانپ کر کہا ۔

" یہ تو روانہ ہونے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا ۔ اب کیا فائدہ ؟"

انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے ۔

" پہلے کیسے سوچ لیتے ابّا جان ۔ اس وقت تو فرحت کی رونی

صورت آنکھوں کے سامنے تھی ۔" آفتاب بولا ۔

" خیر کوئی بات نہیں ۔ فکر نہ کرو ۔ اس مرتبہ ہم بھی شکار کا تجربہ حاصل کر لیں گے ۔" وُہ بولے ۔

اسی وقت لانچ سے گھر گھرانے کی آواز اُبھری ۔ آواز ہلکی سی تھی ۔

" یہ کیسی آواز ہے بھئی ؟" انسپکٹر کامران مرزا نے ڈرائیور سے پُوچھا ۔

" یہ لانچ وہ کرائے پر لائے تھے ۔"

" سمجھ میں نہیں آئی ۔ دیکھ رہا ہوں سر ۔ آپ فکر نہ کریں ۔" اس نے انگریزی میں جواب دیا ۔ سوال بھی انگریزی میں کیا گیا تھا ۔

اب وُہ لانچ کے انجن سے بھر گیا ، گھر گھر کی آواز ابھی تک جاری تھی اور پھر آواز تیز ہو گئی ۔ اچانک انجن سے دُھواں اُٹھنے لگا ۔ وُہ گھبرا گئے :

" یہ ۔ یہ کیا ہُوا ؟"

" لانچ اب تباہ ہونے ہی والی ہے سر ۔ اب کچھ نہیں کیا جا سکتا ۔ موت نے ہمیں گھیر لیا ہے ۔ ہمیں لانچ سے چھلانگیں لگانا ہوں گی ، لیکن چھلانگیں لگا کر بھی ہم کچھ نہیں کر سکیں گے ۔ بچنا مشکل ہے ۔" ڈرائیور نے جلدی جلدی کہا ۔

" موت اور زندگی خدا کے ہاتھ ہے ، اگر موت آ چکی ہے تو

دُنیا کی کوئی طاقت ہمیں بچا نہیں سکتی اور اگر ابھی ہماری زندگی باقی ہے تو ہم نہیں مر سکتے ۔ آپ مشورہ دیں کہ کرنا کیا چاہیے۔"

"چھلانگیں لگا دینے میں ہی بہتری ہے ۔ نہ لگانے کی صورت میں بھی لانچ تباہ ہونے والی ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے ۔ ہم چھلانگیں لگا رہے ہیں۔"

"کیا آپ کے بچے بھی تیرنا جانتے ہیں؟" اس نے حیران ہو کر کہا ۔

"ہاں ۔ چھلانگیں لگانے سے پہلے مسٹر ڈرائیور ۔ آپ اپنا نام بتا دیں ۔ شاید اس کی ضرورت پیش آئے۔"

"مجھے جارج کہتے ہیں۔" یہ کہتے ہی اس نے چھلانگ لگا دی۔ وہ بھی اُٹھے اور پانی میں کود گئے ۔ ایک منٹ بعد ہی کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہُوا ۔ آگ کے شعلے سے پانی پر چند لمحوں کے لیے تیرتے نظر آئے اور پھر پانی کی سطح پر لانچ کا نام و نشان تک نہ تھا ۔ وہ پانی میں ہاتھ پاؤں مارنے لگے ۔

"میرے پیچھے آئیے ۔ شاید ہم کسی جزیرے پر پہنچ جائیں ۔" جارج کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی اور وُہ اس کے پیچھے تیرنے لگے ۔

انھیں دو گھنٹے تک تیرنا پڑا ۔ تب کہیں جا کر ایک جزیرے کے آثار نظر آئے ۔ جزیرے کے ساحل پر پہنچتے ہی وُہ لمبے لیٹ

گئے اور ہانپنے لگے ۔ آدھ گھنٹے بعد کہیں اُٹھنے کے قابل ہوئے :

"اف خدا ۔ اب کیا ہو گا ۔ کیا اس جزیرے کے آس پاس سے کسی لانچ یا جہاز کے گزرنے کا امکان ہے۔" آصف نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔

"اللہ چاہے تو سبھی کچھ ہو سکتا ہے۔" فرحت بولی ۔

"جی ہاں ۔ اس جزیرے کے پاس سے کوئی جہاز ضرور گزرے گا ، لیکن کب گزرے گا ۔ یہ نہیں کہا جا سکتا ۔ ہو سکتا ہے ۔ آج ہی آ جائے ۔ یا چند دن گزر جائیں ۔"

"تب تو ہمیں اس جزیرے کا جائزہ لے لینا چاہیے ۔"

وُہ خوف زدہ سے اُٹھے ۔ سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے جزیرے کی طرف مُڑے ہی تھے کہ فرحت چلّا اُٹھی :

"انکل ! میں نے ایک جہاز کے آثار دیکھے ہیں۔"

"کیا کہا ۔" وُہ سب پلٹ پڑے اور اس سمت میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے ۔ جس طرف فرحت نے اشارہ کیا تھا ۔

"نہیں بے بی ۔ تمھیں ضرور وہم ہوا ہے۔" جارج بولا ۔

"ہو سکتا ہے ، لیکن چند منٹ تک یہاں ٹھہر کر اس سمت میں دیکھتے رہنے میں کیا حرج ہے۔"

"کوئی حرج نہیں ۔ اب تو ہمیں کام ہی یہی کرنا ہے۔" جارج مایوسانہ لہجے میں بولا ۔

وُہ ٹکٹکی باندھ کر ادھر دیکھنے لگے اور پھر پانچ منٹ بعد انھوں نے جان لیا — فرحت کو دھوکا نہیں ہوا تھا — واقعی ایک جہاز ان کی طرف بڑھ رہا تھا — ان کی خوشی کا کیا پُوچھنا :

" اب ہم جزیرے کی طرف جا کر کیا کریں گے ۔"

" ہاں — کپڑے ہلانا شروع کر دیں — میں کچھ شاخیں جمع کرتا ہوں، آپ میں سے کسی کے پاس لائٹر ہو گا — میرا لائٹر تو لانچ میں ہی رہ گیا تھا ۔"

" ہمارے پاس لائٹر ہے ۔" آصف نے فوراً کہا ۔

انسپکٹر کامران مرزا ، آفتاب اور آصف نے قمیضیں اتاریں اور زور شور سے ہلانے لگے — فرحت ، جارج کے ساتھ لکڑیاں چننے کے لیے درختوں کی طرف بڑھ گئی — دس منٹ بعد وُہ بہت سی لکڑیاں جمع کر کے ساحل کی طرف لے آئے — اور لائٹر کی مدد سے آگ دکھا دی — لکڑیوں کے جلنے سے دھوئیں کا ایک بگولا سا اُوپر اُٹھنے لگا — ادھر ان کے ہاتھ تیزی سے ہل رہے تھے، جہاز کا رُخ بھی جزیرے کی طرف ہی تھا —

" میرا خیال ہے — جہاز والوں نے دھوئیں کو دیکھ لیا ہے اور اب وُہ جزیرے کی طرف آئے بغیر آگے نہیں جائیں گے ۔" جارج نے کہا ۔

" خُدا کرے ایسا ہی ہو ۔"

" آپ لوگ ہر بات میں خُدا کو لے آتے ہیں ۔" جارج نے منہ بنایا —

" تو اور کس کو لائیں — خدا کے سوا کون ہے — جو انسان کی مدد کر سکے ۔" فرحت جل کر بولی ۔

" ناراض ہونے کی ضرورت نہیں — میرا مطلب آپ کے مذہب کا مذاق اڑانا نہیں تھا ۔"

" شکریہ مسٹر جارج ۔" انسپکٹر کامران مرزا جلدی سے بولے ۔

جہاز آہستہ آہستہ جزیرے کے قریب آ گیا — یہاں تک کہ عرشے پر کھڑے لوگ انھیں حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے — ادھر انھوں نے جہاز کو جو دیکھا تو حیران رہ گئے :

" ارے — یہ جہاز تو ہمارے ہی مُلک کا ہے — یہ تو بہت شاندار بات ہو گئی ۔"

" اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے ۔" آصف بولا ۔

" کروڑ کروڑ کہنے میں کیا تمھاری زبان گھستی ہے ۔" آفتاب نے مُنہ بنایا ۔

" تم کہیں لڑنے کے موڈ میں تو نہیں ہو ، اگر ایسی بات ہے تو جہاز کے بالکل نزدیک آنے سے پہلے ہی لڑ بھڑ لو ، ورنہ جہاز پر سوار لوگ کیا کہیں گے ۔" آصف نے اسے گھورا ۔

" کہیں گے کیا — بس یہ سمجھ جائیں گے کہ تم دونوں پاگل ہو ۔"

فرحت بول اُٹھی۔

اتنے میں جہاز اور نزدیک آ گیا۔ عرشے پر کھڑے ایک لمبے قد کے باوردی آدمی نے پوچھا :

"تم لوگ کون ہو۔ اور جزیرے تک کیسے آئے ؟"

انسپکٹر کامران مرزا نے انھیں تفصیل سنائی۔ تو لمبا آدمی بولا :

"اوہ۔ تو تم ریناال بن جا رہے ہو، لیکن ہمارا جہاز تو اس طرف سے نہیں گزرے گا۔"

"تو کیا ہوا۔ آپ ہمیں کسی بھی ساحل پر اُتار دیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ تو یوں بھی ہم وطن ہو۔ یہ صاحب کون ہیں ؟" اس کا اشارہ جارج کی طرف تھا۔

"یہ بے چارے ہماری تباہ ہو جانے والی لانچ کے ڈرائیور ہیں۔"

"ہوں خیر۔ ہم کشتی بھیج رہے ہیں۔ آپ اس میں سوار ہو کر جہاز تک آئیں گے اور پھر رسی کی سیڑھی لٹکا دی جائے گی۔"

"بہت بہت شکریہ۔ کیا یہ جہاز ہمارے اپنے مُلک کی طرف جا رہا ہے ؟"

"ہاں ! اگرچہ ہمیں حکم تھا کہ ہم راستے میں کہیں بھی نہیں رُکیں گے اور رُکے بغیر اپنا سفر جاری رکھیں گے، لیکن پھر بھی مَیں نے رُکنے کا خطرہ مول لیا۔ خدا کا شکر ہے۔ ہم کسی گڑبڑ کا شکار نہیں ہوئے۔" اس نے کہا۔

"جو دُوسروں کی مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی مدد ضرور کرتے ہیں۔"

کشتی لٹکا دی گئی۔ جب وُہ ساحل سے آ لگی تو وہ اس میں سوار ہوئے۔ کشتی جہاز کی طرف چل پڑی۔

جونہی کشتی جہاز کے قریب پہنچی، رسی کی سیڑھی لٹکا دی گئی اور وُہ باری باری اوپر چڑھنے لگے۔ جب سب لوگ عرشے پر پہنچ گئے تو کشتی کھینچ لی گئی :

"میں اس جہاز کا نائب کپتان ہُوں۔ نام عبداللہ جانی ہے، کپتان صاحب عالم جاہ ہیں۔ ابھی آپ لوگوں کو ان کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ آپ لوگوں کو ان کے سوالات کے جواب دینا ہوں گے، اگر وہ مطمئن نہ ہو سکے تو آپ کو واپس جزیرے پر اُتار دیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم انھیں مطمئن کر دیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"آئیے۔ مَیں آپ کو ان کے پاس لے چلوں۔" عبداللہ جانی نے کہا۔

وُہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے انجن روم میں داخل ہوئے، یہاں ایک موٹے قد کا آدمی انجن سے بھڑا ہوا تھا۔ قدموں کی آواز سُن کر بھی اس نے اپنا رُخ تبدیل نہ کیا ؛ البتّہ اس کی

بھاری بھر کم آواز اُبھری:

"آپ لوگوں کے نام؟"

"میں کامران مرزا ہوں ۔ یہ مسٹر جارج ہیں اور یہ آفتاب، آصف اور فرحت ہیں۔"

"جزیرے تک کیسے پہنچے؟"

انسپکٹر کامران مرزا نے ایک بار پھر تفصیل کہہ سنائی:

"لیکن آپ نے اتنا لمبا سفر کیوں کیا ۔ آخر آپ کو رینال بن کس لیے آنا تھا؟"

"اس بچی کے لیے ۔ دراصل یہ میری نہیں ، میرے دوست کی بچی ہے ۔ اس کے والد کا ایک خط ملا تھا ۔ جس کی رو سے وہ رینال بن میں ہیں ۔ بس ہم ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ، لیکن لانچ کو آگ لگ گئی۔"

"ہوں ۔ ضرور یہی بات ہو گی اور بات ہو بھی کیا سکتی ہے، اب میری سنیئے ۔ یہ کوئی عام جہاز نہیں ۔ یعنی مسافروں کو لے کر نہیں جا رہا ۔ صرف مال بردار جہاز ہے ۔ اور ہم اپنے ملک مال لے کر جا رہے ہیں ۔ ہدایات یہ ہیں کہ کسی کے لیے بھی جہاز کو نہ روکا جائے ، کیونکہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کچھ ڈاکو قسم کے لوگ کوئی فرضی کہانی سنا کر جہاز پر سوار ہو جائیں۔"

"جی ہاں! یہ عین ممکن ہے ، لیکن آپ فکر نہ کریں ہم ڈاکو واکو

نہیں ہیں۔" آصف بولا۔

"میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا ۔ کہہ تو یہ رہا ہوں کہ آپ لوگوں کو جہاز میں سوار کر کے میں نے اپنے افسرانِ بالا کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے ۔ منزل پر پہنچنے کے بعد مجھے اپنے افسران کے سامنے پیش ہونا ہو گا اور انھیں یہ بھی بتانا ہو گا کہ میں ان کے حکم پر عمل نہ کر سکا۔"

"آپ فکر نہ کریں ۔ میں آپ کو سزا سے بچا لوں گا۔"

"ہاں! ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ مجھے سزا سے بچا لیں گے۔" اس نے مطمئن ہو کر کہا۔

"آپ لوگ کیا سامان لے کر جا رہے ہیں؟" آفتاب نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"اس سوال کا جواب نہ پوچھیں۔" کپتان نے مسکرا کر کہا۔

"بہت بہتر ۔ نہیں پوچھتے" آصف نے مسکرا کر کہا۔

"اُمید ہے ، آپ بُرا نہیں مانیں گے۔"

"آپ نے تو ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے ۔ اگر آپ ہمیں جہاز پر سوار نہ کرتے تو نہ جانے جزیرے پر ہمارے ساتھ کیا گزرتی؟"

"عبداللہ ۔ انھیں نچلی منزل میں ایک کمرہ دے دو۔"

"جی بہتر ۔ آئیے جناب۔" عبداللہ نے کہا۔

وہ عبداللہ کے ساتھ دروازے کی طرف مڑے ہی تھے کہ ایک آدمی گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا:

"خیر تو ہے نصیر بیگ۔"

"جی۔ جی نہیں۔ میں گڑبڑ محسوس کر رہا ہوں۔"

"گڑبڑ۔ کیسی گڑبڑ۔" یہ کہتے وقت کپتان کی نظریں انسپکٹر کامران مرزا پر جم گئیں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، پھر وہ پھنکار کر بولا:

"تو تم درست آدمی نہیں ہو۔"

"آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ جہاز پر اگر کسی قسم کی گڑبڑ ہے تو ہمارے چڑھنے کی وجہ سے نہیں۔ وہ گڑبڑ پہلے سے موجود ہو گی۔" انسپکٹر کامران مرزا فوراً بولے۔

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔ میں گڑبڑ بہت پہلے سے محسوس کر رہا ہوں، لیکن جب تک مجھے یقین نہیں ہو گیا۔ میں اس وقت تک آپ کے پاس نہیں آیا۔"

"اور یہی تمھاری غلطی ہے نصیر بیگ۔ تمھیں شک ہوتے ہی میرے پاس آنا چاہیے تھا۔" عالم جاہ نے منہ بنایا، پھر کہنے لگا:

"خیر۔ بتاؤ۔ گڑبڑ کیا ہے اور کہاں ہے، لیکن نہیں، ٹھہرو۔ عبداللہ۔ پہلے تو ان لوگوں کو کمرے تک چھوڑ آؤ۔ ان باتوں کا ان سے کوئی تعلق نہیں اور نہ انھیں یہ باتیں سننی چاہییں۔"

"ٹھیک ہے سر۔ آئیے جناب میرے ساتھ۔"

انسپکٹر کامران مرزا نے جیسے اس کا جملہ سنا ہی نہیں۔ آفتاب، آصف اور فرحت بھی جوں کے توں کھڑے رہے؛ البتہ جارج ضرور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا آپ لوگوں نے سنا نہیں۔ میں نے کیا کہا ہے۔" عبداللہ جانی نے قدرے تیز آواز میں کہا۔

"نہیں۔ ہم نے نہیں سنا۔ ہم ایسی باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"کیا مطلب؟" کپتان عالم جاہ نے زور سے چونک کر کہا اور پھر اس کے ہاتھ میں پستول نظر آیا۔

جنگل پر کیا بیتی

اُنھوں نے دیکھا۔ اس جگہ جنگل کی حالت بہُت عجیب و غریب تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں شاید اس قسم کا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آس پاس کے درخت بالکل سیاہ رنگ کے ہو گئے تھے۔ ان پر پتا نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی تھی۔ جھاڑیاں اور دُوسرے پودے بھی بالکل سیاہ رنگ کے نظر آرہے تھے۔ ان کے پتے بھی غائب تھے۔ جہاں تک نظر جاتی تھی۔ یہی منظر تھا۔

"یہ۔ یہ کیا انکل؟"

"یہی تو دکھانے کے لیے لایا ہوں۔"

"آخر ان درختوں اور جھاڑیوں کو ہُوا کیا؟" شوکی بولا۔

"اگر یہ بات میری سمجھ میں آجاتی تو آپ لوگوں کو یہاں کیوں لاتا۔" منور علی خان بولے۔

"آپ نے بتایا تھا۔ یہ جنگل بہُت خطرناک ہے۔ اس میں

شیر، چیتے، ہاتھی، گینڈے اور دُوسرے خطرناک جانور مُوجود ہیں۔ لیکن ہماری مُلاقات تو ان میں سے ایک جانور سے بھی نہیں ہوئی۔"

"میں آپ کو ایسے ہی راستے سے لایا ہوں۔ اور یہ محفوظ راستہ اسی وجہ سے بنا ہے۔" انھوں نے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا مطلب؟" وُہ چونکے۔

"مطلب یہ کہ جس چیز نے ان درختوں اور جھاڑیوں کو جُھلس دیا ہے، اسی چیز نے درندوں کو یہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا ہے۔" انھوں نے بتایا۔

"اوہ۔ تو کیا اس حصّے کو آگ لگ گئی تھی؟"

"جب کسی جنگل کو آگ لگتی ہے تو درخت صحیح سلامت کھڑے نہیں رہ جاتے۔ جھاڑیاں جوں کی توں مُوجود نہیں رہتیں۔ جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔ کیا سمجھے۔"

"تت۔ تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ کسی اور چیز سے جُھلسے ہیں۔"

"ہاں! اس کے علاوہ میں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"اور آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ کس چیز سے جھلسے ہیں اور کیوں؟" شوکی بولا۔

"ہاں بالکل۔"

"معاف کیجیے گا انکل۔ کیا آپ ہمیں نجومی سمجھ کر یہاں لائے

ہیں۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"نہیں۔ جاسوس سمجھ کر لایا ہوں۔"

"اگر جاسوس سمجھ کر لائے ہیں تو پھر جاسوسی کا کوئی کام کرائیے، جادو کا نہیں۔" اشفاق نے کہا۔

"کیا مطلب۔ کیا آپ لوگوں کے خیال میں یہ کام کسی جادوگر کا ہے۔"

اور کس کا ہو سکتا ہے۔ دیکھیے نا۔ درخت اور جھاڑیاں سب کی سب جھلس گئیں، لیکن راکھ نہ ہو سکیں۔ یہ کام تو کسی جادوگر کا ہی ہو سکتا ہے۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ ضرور کوئی اور چکر ہے۔ شاید آپ لوگ نہیں جانتے یا غور نہیں کیا۔ اس جنگل کے آخری سرے سے سمندر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ کام سمندر سے اُٹھنے والے بخارات کا بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ اگر بخارات درختوں کو اس طرح جھلس دینے کی خاصیت رکھتے تو پھر روئے زمین پر ایک درخت بھی نہ ہوتا۔ اس حصے کے علاوہ سارا کا سارا جنگل ہرا بھرا ہے۔ بس سمندر کے ساتھ ساتھ جنگل جھلسا ہوا ہے۔ آخر کیوں؟"

"تو پھر آئیے۔ سمندر سے پوچھ لیتے ہیں۔" آفتاب نے چند قدم آگے بڑھا دیے۔

"کیا کہا۔ سمندر سے پوچھ لیتے ہیں۔" منور علی خان آفتاب کی طرف مڑے۔

"جی ہاں! اس میں کیا حرج ہے۔" آفتاب فوراً بولا۔

"میرا خیال ہے۔ آفتاب ٹھیک کہتا ہے۔" شوکی بول اُٹھا۔

"کہیں۔ کہیں آپ لوگوں کے دماغ تو نہیں چل گئے؟"

"کیا مطلب۔ انکل۔ آپ نے یہ شاندار اندازہ کس طرح لگا لیا؟"

"کیا مطلب۔ تو کیا۔ آپ کے دماغ واقعی چل گئے ہیں؟" وہ حیران ہو کر بولے۔

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمارے دماغ تو عام طور پر چلتے ہی رہتے ہیں۔"

"نہ جانے۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ خیر۔ اگر سمندر تک جانے کا ارادہ ہے تو میں تیار ہوں۔"

"شکریہ انکل۔ ہم بالکل یہی چاہتے ہیں۔ ذرا دیکھیں تو سہی، آخر اس سمندر کے بچے کو کیا پڑی تھی، ہمارے جنگل کا ستیاناس مارنے کی۔ آخر کو سمندر بھی ہمارے اپنے ملک کا ہے۔ کسی دوسرے ملک کا تو نہیں۔ اسے اتنی تو ہمدردی ہونی چاہیے تھی۔" آفتاب نے جلدی جلدی کہا۔

منور علی خان نے اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر

دیکھتے ہی چلے گئے۔

"خیر تو ہے انکل۔ کہیں آپ کو اس کے سر پر دو سینگ تو نظر نہیں آ رہے؟" شوکی بوکھلا اُٹھا۔

"نہیں۔ ان کی باتیں سُن کر مجھے آفتاب یاد آ گیا۔ یُوں تو آصف بھی بہت شوخ ہے، لیکن آفتاب کی حاضر جوابی کا تو جواب ہی نہیں۔"

"اور انکل۔ فارُوق بھائی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ہاں۔ وُہ بھی کم نہیں۔ دونوں ایک دُوسرے کے کان کاٹ جاتے ہیں۔ ارے مَیں تو بھول ہی گیا۔ پچھلی مرتبہ تو خود آپ بھی ان کے ساتھ تھے۔"

"جی ہاں۔ خوب دنگل رہا تھا باتوں کا۔" آفتاب ہنس کر بولا۔

اب ان کے قدم سمندر کی طرف اُٹھ رہے تھے۔

"آخر آپ کا ان درختوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"کم از کم یہ آگ سے نہیں جُھلسے۔ اور اگر یہ آگ سے نہیں جُھلسے تو پھر کس چیز نے ان کی یہ حالت بنائی۔ بس مجھے یہ بات بہت عجیب سی نظر آئی تھی۔ اس لیے۔ میں نے انسپکٹر کامران مرزا سے رابطہ قائم کرنا چاہا۔ وہ نہیں ملے تو آپ لوگوں کے پاس پہنچ گیا۔"

"خیر کوئی بات نہیں انکل، اگر اس کی کوئی عجیب و غریب

وجہ ہے تو ہم آپ کا ساتھ ضرور دیں گے، لیکن بہتر ہوتا، اگر آپ جنگلات کے کسی ماہر سے بات کر لیتے۔" شوکی نے کہا۔

"کیا بات کرتے ہیں۔ جنگل کا کوئی ماہر سے ماہر آدمی بھی مجھ سے زیادہ جنگلات کے بارے میں نہیں جانتا۔ میں نے تو ساری زندگی جنگلوں میں گزاری ہے۔ جنگل کے بغیر میں رہ ہی نہیں سکتا، لیکن میں نے کسی جنگل میں ایسے درخت نہیں دیکھے۔"

"آخر آپ کا اندازہ کیا ہے؟"

"کچھ اندازہ نہیں لگا سکا۔"

"میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ ہمیں سمندر سے ہی پوچھنا پڑے گا۔ یہ ساری کارستانی سمندر صاحب کی ہے۔ دیکھیے نا۔ سمندر اور جنگل کے اس حصّے کے درمیان اور کوئی چیز نہیں ہے۔ ان حالات میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔" آفتاب جلدی جلدی بولا۔

"ہاں! سمندر سے پوچھنے والی بات ہی کہہ سکتے ہو۔" اخلاق جل کر بولا۔

"اور تم کیوں جلے جا رہے ہو۔ تم بھی پوچھ لینا سمندر سے۔ تمہیں کس نے روکا ہے۔"

"بھئی کچھ تو خیال کرو۔ ہمارے ساتھ انکل منور علی خان ہیں۔" اشفاق نے مُنہ بنایا۔

"میری بات چھوڑیں۔ میں تو عادی ہوں اس قسم کی باتیں

سننے کا۔" وہ مسکرائے۔

"جی کیا مطلب۔کیا درندے بھی اس قسم کی نوک جھوک کرتے ہیں" آفتاب بولا۔

"ارے نہیں بھئی۔ میرا اشارہ آفتاب وغیرہ کی طرف تھا۔" وہ ہنسے۔

"لیکن انکل۔آپ نے تو ساری زندگی جنگل میں گزاری ہے۔ آپ کو کیسے معلوم ان کی باتوں کے بارے میں۔"

"بھئی۔ میں سال میں چند دن تو ان کے ساتھ گزارتا ہی ہوں۔" انھوں نے جواب دیا۔

"اوہ ہاں۔ٹھیک تو ہے۔تو آپ کی طرف سے اجازت ہے۔ ہم بے تکلّفی سے گفتگو کر سکتے ہیں" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

"ضرور۔کیوں نہیں۔بلکہ مجھے بھی ساتھ میں شامل کر سکتے ہو۔"

"میرا ایک اندازہ ہے انکل" اخلاق نے سوچ میں گم لہجے میں کہا۔

"کیسا اندازہ؟"

"یہ کہ اگرچہ آپ درختوں کے جھلس جانے کی وجہ نہیں سمجھ سکے، لیکن کچھ نہ کچھ اندازہ آپ کو ضرور ہے۔اور اس اندازے نے آپ کو پریشان کر دیا ہے۔اسی لیے آپ نے انکل کامران مرزا سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی اور جب نہ ہو سکا تو ہمارے

پاس پہنچ گئے۔"

"لو۔اب اندازے بھی پریشان کرنے لگے۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"تم چُپ رہو۔ میں انکل سے بات کر رہا ہوں۔" اشفاق نے بھنا کر کہا۔

"تو میں کب کہتا ہوں۔کہ تم ان جُھلسے ہوئے درختوں سے بات کر رہے ہو۔ ویسے۔یہ درخت کس قدر عجیب لگ رہے ہیں۔یُوں لگتا ہے جیسے کسی نے انھیں کوئی خوفناک سزا دی ہے۔" آفتاب نے جلدی جلدی کہا۔

"خوفناک سزا۔" منور علی خان زور سے چونکے۔اُن کی آنکھوں میں چمک نمودار ہو گئی۔

"خیر تو ہے انکل۔کیا میں نے خوفناک حد تک کوئی غلط بات کہہ دی۔" آفتاب گھبرا گیا۔

"نہیں تو۔آپ نے تو بڑی حد تک دلچسپ بات کہی ہے۔"

"تو آپ نے یہی اندازہ لگایا ہے کہ ان درختوں کے جُھلسنے میں انسانی ہاتھ کو دخل ہے۔" شوکی پُر خیال لہجے میں بولا۔

"گویا آپ نے بھی یہ بات محسوس کر ہی لی۔" منور علی خان بڑبڑائے۔

"کیا کیا جائے۔مجبوری ہے۔محسوس نہ کرتے تو اور کیا کرتے، پھر آپ یہ نہ کہہ اُٹھتے۔ارے بھئی۔یہ تم جاسوس ہو یا گھسیارے۔"

آفتاب نے معصومی صورت بنائی۔

"خیر۔ گھسیارے تو میں آپ کو ہرگز نہیں کہہ سکتا۔" منور علی خان شگفتہ انداز میں مسکرائے۔

وہ ایک گھنٹے تک چلتے رہے۔ اس دوران سارا جنگل انھیں جھلسا ہوا ہی ملا۔ چونکہ جنگل میں اس طرف سوائے شکاریوں کے اور کوئی رُخ کرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا اور شاید ان دنوں سوائے منور علی خان کے اور کوئی نہیں آیا تھا۔ اس لیے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ جنگل پر کیا بیتی ہے۔ اور پھر انھیں سمندر نظر آنے لگا۔ ایسے میں شوکی کے اٹھتے قدم رُک گئے:

"ایک منٹ انکل۔ مجھے ابھی ابھی ایک خیال آیا ہے۔ کیا یہ کام آسمانی بجلی کا نہیں ہو سکتا۔"

"مجھے یہ خیال پہلے ہی آ چکا ہے۔ آسمانی بجلی سے جل جانے والے درخت بھی راکھ بن جاتے ہیں۔ صحیح سلامت کھڑے نہیں رہتے۔ ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آسمانی بجلی کی قسم کی کوئی چیز ان پر آ گری ہو۔" انھوں نے کہا۔

"آسمانی بجلی کی قسم کی کوئی چیز تو دُنیاوی بجلی ہی ہو سکتی ہے۔" اشفاق بولا۔

"تب یہ تابکاری اثرات بھی ہو سکتے ہیں۔" شوکی نے چونکے ہوئے انداز میں کہا۔

"ویری گڈ۔ دراصل میں آپ لوگوں کو اسی خیال کے تحت یہاں لایا تھا کہ کہیں یہ تابکاری اثرات تو نہیں ہیں، کیونکہ اگر یہ تابکاری اثرات ہیں تو پھر اس کے سوا کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ کسی دُشمن مُلک نے ہمارے مُلک کی سمندری حدود میں۔ یا اپنے مُلک کی سمندری حدود میں ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم کا یا اس قسم کا کوئی اور تجربہ کیا ہو۔ اس قسم کے تجربات سے بڑے پیمانے پر الفا شعاعوں، بیٹا شعاعوں وغیرہ کا اخراج ہوتا ہے۔ ان شعاعوں کے اثرات بہت مہلک ہوتے ہیں۔ اسی خوف کے پیشِ نظر میں دوسروں کی رائے جاننا چاہتا تھا۔ آپ نے بھی وہی خیال ظاہر کر دیا جو میرا تھا۔ اثرات تو جو ہو چکے۔ ہو چکے۔ میں تو پریشان اس لیے ہوں کہ اس حصّہ سمندر میں کس قسم کا تجربہ کیا گیا ہے۔" منور علی خان کہتے چلے گئے۔

"تو آپ یہ جاننا چاہتے ہیں، پھر تو آپ کو اپنے ساتھ کسی سائنس دان کو لانا چاہیے تھا۔"

"پہلے میں آپ کے ذریعے کوئی خیال تو قائم کر لوں۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم کسی سائنس دان کا بندوبست بھی کر لیں گے۔"

"مجھے تو ایسے میں پروفیسر داؤد انکل یاد آ رہے ہیں۔" آفتاب نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔

"تو کیا اس مہم میں وہ بھی ساتھ تھے؟"

"جی ہاں!"

"افسوس، میں شامل نہیں ہو سکا۔ دراصل میں ان دنوں ایمیزن کے جنگلات میں پھنسا ہوا تھا۔ ان کی طرف سے کوئی دعوت بھی نہیں ملی تھی۔"

"دعوت دینے کا انھیں وقت ہی کب ملا ہو گا۔"

آخر وہ ساحل پر پہنچ گئے۔ جنگل کی وجہ سے اس طرف کوئی بھی نہیں آتا تھا۔ عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ جنگل کے درندے سمندر میں نہانے کے لیے آ جاتے ہیں اور اگر کوئی انسان اس طرف نکل آئے تو اسے پھاڑ کھاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی بھولے سے بھی اس طرف کا رُخ نہیں کرتا تھا۔ ان حالات میں یہاں ہُو کا عالم طاری نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ ساحل پر کھڑے ہو کر انھوں نے چاروں طرف دیکھا۔ دُور دُور تک کوئی نہیں تھا۔ سمندر میں اس جگہ چند چٹانیں اُبھری ہوئی تھیں اور ایک دو چٹانیں تو ساحل پر بھی موجود تھیں۔

"ہمیں ان چٹانوں کے دوسری طرف کا بھی جائزہ لے لینا چاہیے، بظاہر تو یہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔" شوکی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آؤ چلیں۔ یہاں تک آئے ہیں تو پوری طرح جائزہ لے کر ہی جائیں گے۔" منور علی خان بولے۔

وہ ساحل کے ساتھ ساتھ چٹانوں کی طرف چل پڑے۔

"نہ جانے کیا بات ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے ـــ جیسے کوئی ہمیں چھپ کر دیکھ رہا ہے۔" آفتاب نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"ضرور تمھیں وہم ہو گیا ہے۔ ورنہ یہاں کون ہے۔" اشفاق نے جواب دیا۔

"اگر یہاں کوئی نہیں تو پھر درختوں کا یہ حال کیوں کر ہو گیا۔"

"خیر۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے ہی تو ہم یہاں آئے ہیں۔"

آخر وہ چٹان تک پہنچ گئے۔ دوسرا لمحہ چونکا دینے کے لیے کافی تھا۔ چٹان کے ساتھ ایک بہت بڑی لانچ موجود تھی، لیکن اس لانچ میں یا اس کے آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔

○

"کہیں ہم کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے۔" آفتاب نے کانپ کر کہا۔

"اس میں خواب دیکھنے کی کیا بات ہے۔ ساحل پر ایک لانچ کھڑی ہے۔ کوئی ہوائی جہاز تو نہیں بندھا ہوا۔" شوکی نے

بھنّا کر کہا۔

" لیکن بھلا لانچ لے کر اس طرف کون آ سکتا ہے ؟" اشفاق بولا ۔

" ہوگا کوئی سرپھرا ۔" آفتاب نے کہا۔

" اور وہ سرپھرا ہے کہاں ؟" اخلاق نے کہا۔

" میں نجومی نہیں ہوں ۔" آفتاب بولا ۔

" یہ اچھا ہی ہے کہ تم نجومی نہیں ہو۔ ورنہ ہر وقت اپنے نجوم پنے کا رُعب جھاڑا کرتے ۔" اخلاق نے جل کر کہا اور منور علی خان مسکرانے لگے۔

" انکل۔ کیوں نہ ہم اس لانچ میں بیٹھ کر ذرا سمندر کی سیر کر آئیں ۔" شوکی نے اچانک کہا۔

" اور جس کی لانچ ہے ۔ اسے کیا جواب دیں گے ۔"

" پتا نہیں ، کس کی ہے ۔ بہر حال ہم اس سے معافی مانگ لیں گے ۔ اس نے پسند کیا تو پٹرول کا خرچ ادا کر دیں گے ۔ اور اگر یہ کسی سمگلر وغیرہ کی لانچ ہوئی تو پھر تو اسے پولیس کے حوالے کریں گے ۔"

" اوہ ۔ سمگلر ۔ واقعی ۔ یہ خیال ہمیں ذرا دیر سے آیا ، اگر یہ کسی سمگلر کی ہے تب کوئی بات ہی نہیں ۔ آئیے ۔"

وہ چٹان کے دوسری طرف آئے ۔ لانچ کو ایک رسے کی

مدد سے باندھا گیا تھا ۔ اُنھوں نے رسہ کھولا اور اس پر سوار ہو گئے :

" ارے ، لیکن ۔ اسے چلائے گا کون ؟" اشفاق بولا ۔

" فکر نہ کرو ۔ مجھے لانچ چلانا آتا ہے ۔ سمندر میں بھی شکار کھیل لیتا ہوں ۔" منور علی خان بولے ۔

انھوں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور لانچ تیر کی طرح سمندر میں بڑھی ۔

" اگر آپ ساتھ نہ ہوتے انکل تو اس وقت ہمارے دل دھک دھک کر رہے ہوتے ۔" شوکی مسکرایا۔

" انکل اگر ساتھ نہ ہوتے تو ہم لانچ میں سفر کر ہی نہیں سکتے تھے ۔" اشفاق نے مُنہ بنایا۔

" ہاں ! یہ بھی ٹھیک ہے ۔"

" ہم سمندر کی سیر کے لیے چل تو پڑے ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ کریں گے کیا ؟"

" ہاں ! ہم تو یہاں جُھلسے ہوئے درختوں کا راز جاننے آئے تھے ۔"

" ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ سمندر کے کنارے ایک لانچ کھڑی تھی ۔ جب کہ یہاں دُور دُور تک کسی انسان کا نام و نشان تک موجود نہیں ۔"

" اوہو۔ یہ کیا۔" ایسے میں منور علی خان کے منہ سے پریشانی کے عالم میں نکلا۔

" کیا ہوا انکل۔" شوکی نے فوراً کہا۔

" بہت عجیب۔ بلکہ بہت ہی زیادہ عجیب۔" وہ بڑبڑائے۔ رنگ اڑتا جا رہا تھا۔

" آپ۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

" میں لانچ کو قدرے دائیں ہاتھ رکھ کر چلا رہا تھا۔ تاکہ ہم سمندر میں بہت دور نکل جائیں، لیکن اب اچانک۔" وہ پھر کہتے کہتے رک گئے۔

" اب اچانک کیا؟" شوکی چلا اٹھا۔

" اب اچانک۔ لانچ کا رخ بالکل سیدھ میں ہو گیا ہے۔ میں سٹیرنگ کو دائیں طرف موڑتا ہوں، لیکن یہ مڑتا نہیں۔" وہ بولے۔

" مڑتا نہیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل۔" آفتاب بوکھلا کر بولا۔

" یہی کہ لانچ اب میرے کنٹرول میں نہیں ہے۔ خود بخود سمندر میں آگے بڑھ رہی ہے۔" ان کی آواز میں کپکپی تھی۔

" اُف خدا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ کہیں یہ لانچ۔ یہ لانچ۔" اخلاق کہتے کہتے رک گیا۔

" کہیں یہ لانچ کیا۔ تم کہتے کہتے رک کیوں جاتے ہو۔" اشفاق کو

اس پر غصہ آ گیا۔

" میرا مطلب ہے۔ کہیں یہ لانچ جادو کی تو نہیں۔"

" لاحول ولا قوۃ۔ کیا بات کرتے ہو۔" شوکی نے برا سا منہ بنایا۔

" تو پھر بھائی جان۔ آپ ہی بتائیے۔ انکل اسے دائیں طرف لے جانا چاہتے ہیں، لیکن وہ دائیں طرف نہیں مڑتی۔ سیدھی ہی جا رہی ہے۔ آخر کیوں۔"

" ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی خرابی ہو گئی ہو۔"

" انکل۔ آپ ایسا کریں۔ اسے دائیں طرف کی بجائے بائیں طرف موڑیے۔" آفتاب نے تجویز پیش کی۔

" اچھا۔" انھوں نے کہا اور بائیں طرف سٹیرنگ گھمانے کی کوشش کی:

" ن۔ نہیں۔ یہ بائیں طرف بھی نہیں مڑ رہی۔"

" تب پھر اس میں ضرور کوئی خرابی ہو گئی ہے۔ انکل۔ آپ ایسا کریں۔ انجن بند کر دیں۔" شوکی نے چیخ کر کہا۔

" اوہ ہاں۔ یہ ترکیب ٹھیک رہے گی۔" منور علی خان جلدی سے بولے اور پھر لانچ کا انجن بند کر دیا۔ انجن چلنے کی آواز بند ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ لانچ کے آگے بڑھنے کی رفتار میں ذرا بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ بدستور سیدھ میں آگے بڑھ رہی تھی۔

"اُف خدا — یہ تو رُک ہی نہیں رہی — اب — اب کیا ہوگا؟"
منور علی خان نے بوکھلا کر کہا۔

ان کے یہ الفاظ سنتے ہی ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے — حلق سوکھنے لگے — جلد ہی یوں محسوس ہونے لگا جیسے ان میں کانٹے پڑ گئے ہوں —

یہ کون ہے؟

"تم کون ہو — سچ سچ بتا دو — ورنہ گولیوں سے چھلنی کر کے سمندر میں پھینک دیے جاؤ گے۔"

"ہم اپنے بارے میں پہلے ہی بالکل سچ بتا چکے ہیں، شک کی کوئی گنجائش نہیں — آپ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں — ہم آپ لوگوں کا حکم سُن کر اگر اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تو اس کی بھی ایک وجہ ہے — اور وہ وجہ یہ ہے کہ اگر جہاز میں کسی قسم کی کوئی گڑبڑ ہے تو پھر اس گڑبڑ کو دُور کرنے کے لیے آپ کو اس وقت ہم سے بہتر آدمی نہیں ملیں گے۔"

"کیا مطلب۔" عالم جاہ نے حیران ہو کر کہا۔

"میں آپ کو اپنا کارڈ دکھاتا ہوں — آپ سب کچھ سمجھ جائیں گے۔"

"سر — یہ حضرت دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں — ہو سکتا ہے — ان کی جیب میں پستول موجود ہو۔" نصیر بیگ بول

پڑا۔

"ہاں۔ بالکل۔ خبردار تم ہاتھ جیب میں نہیں لے جاؤ گے۔"

"تو پھر مہربانی فرما کر آپ خود میری جیب میں سے میرا کارڈ نکال لیں، لیجیے میں ہاتھ سر سے بلند کیے دیتا ہوں۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" عبداللہ جانی نے کہا اور آگے بڑھ کر ان کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اندر کارڈ موجود تھا۔ اسے نکال کر اس نے پڑھا۔ آنکھوں میں حیرت چھٹی اور پھر اس نے کارڈ عالم جاہ کی طرف بڑھا دیا۔ ساتھ ہی اس نے کہا:

"مم۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"کیا نہیں سوچ سکتے تھے؟" عالم جاہ حیران ہو کر بولا، پھر اس نے بھی کارڈ پر لکھا نام پڑھا:

"اف خدا۔ آپ۔ آپ انسپکٹر کامران مرزا ہیں۔"

"جی ہاں، اگر آپ یقین کر لیں۔"

"ان حالات میں تو واقعی آپ سے بہتر آدمی ہمیں کوئی نہیں ملے گا۔"

"تو پھر پہلے تو مجھے یہ بتائیے کہ اس جہاز پر کیا چیز لے جائی جا رہی ہے؟"

"افسوس! یہ تو ہم اب بھی نہیں بتا سکتے۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ اس جہاز

پر کیا جا رہا ہے۔ یہ جہاز ہمارے ملک کا ہے اور ہمارے ملک کی ہی کوئی چیز لے جائی جا رہی ہے، لہٰذا اسے بخیر و عافیت ساحل تک پہنچ جانا چاہیے۔ اور بس۔ اب مسٹر نصیر بیگ۔ آپ بتائیے۔ جہاز پر آپ نے کیا گڑ بڑ محسوس کی۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

"مجھے اجازت ہے جناب۔ میں ان کے سامنے بیان کر سکتا ہوں۔"

"ہاں، ضرور کیوں نہیں۔ انسپکٹر کامران مرزا صاحب۔ یہ ہمارے جہاز کے سراغرساں ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ اگر جہاز پر کوئی گڑ بڑ دیکھیں تو فوراً مجھے اطلاع دیں۔"

"بہت خوب۔ تب تو یہ گڑ بڑ محسوس کر چکے ہیں۔ جلدی بتائیے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے بے چین ہو کر کہا۔

"جی ہاں! میں یہی بتانے آیا تھا۔ جہاز کی حفاظت کے لیے ہمیں تربیت یافتہ عملہ دیا گیا تھا، لیکن اب وہ تربیت یافتہ عملہ ہر وقت سوتا یا اونگھتا رہتا ہے۔ جب کہ چند دن پہلے تک یہ بات دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔"

"بات پتے نہیں پڑی۔ سونا یا اونگھنا کوئی کام نہ ہونے کی وجہ سے بھی تو ہو سکتا ہے، سمندر میں جب چاروں طرف دُور دُور تک کسی خطرے کا نام و نشان تک نظر نہ آئے تو پھر محافظ

اونگھیں گے نہیں تو اور کیا کریں۔" کپتان عالم جاہ نے بُرا سا مُنہ بنایا۔

"ہاں! آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ اونگھتے ہوئے آدمی کو اگر ایک ہلکی سی چپت بھی مار دی جائے تو وہ اس طرح چونک اُٹھتا ہے جیسے پتا نہیں، کیا خطرہ پیش آگیا ہے، جب کہ ان محافظوں کے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں نے ان میں سے ایک کے تھوڑی دیر پہلے ایک سوئی چبھو دی۔ آپ یقین کریں۔ اس نے آنکھ کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا تک نہیں۔ بس اونگھتا ہی رہا، میں نے دوبارہ سوئی چبھوئی، لیکن اس نے پھر بھی کوئی توجہ نہیں دی یہاں تک کہ میں نے تیسری مرتبہ پوری سوئی اس کے جسم میں داخل کر دی۔ اور۔ اس نے اُف تک نہیں کی، حالانکہ وہ صرف اونگھ رہا تھا۔ سو نہیں رہا تھا۔ میں سوچ رہا ہوں۔ سوتے ہوئے آدمیوں کے جسموں میں اگر ہم چاقو بھی اُتار دیں تو کیا وہ جاگ سکیں گے۔ اور اگر ایسے میں جہاز پر حملہ ہو گیا تو کیا ہو گا۔"

کیپٹن کے کمرے میں موت کا سناٹا طاری ہو گیا۔ اُنھوں نے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس کیے۔

○

آخر چند سیکنڈ بعد انسپکٹر کامران مرزا نے نصیر بیگ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا:

"مسٹر نصیر بیگ۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان کا اونگھنا یا سونا قدرتی نہیں۔ غیر قدرتی ہے۔"

"جی ہاں۔ بالکل۔ میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔"

"تب تو معاملہ واقعی سنگین ہے۔ میں نہیں جانتا، اس جہاز پر کیا چیز لے جائی جا رہی ہے۔ بہر حال اگر جہاز پر خاص تربیت یافتہ محافظ مَوجود ہیں تو پھر ضرور کوئی قیمتی چیز ہی لے جائی جا رہی ہو گی۔ ان حالات میں ہمیں یہ معلوم کرنا ہو گا کہ محافظوں کے اونگھنے یا سونے کی کیا وجہ ہے۔ ہم جس قدر جلد یہ بات جان لیں، اتنا ہی اچھا ہے۔ کپتان صاحب۔ کیا مجھے اجازت ہے۔ میں اپنا کام شروع کر دوں۔"

"ہاں! میں تو یہ سوچ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری مدد کرنے کے لیے ہی آپ کو اس جزیرے پر پہنچایا تھا۔"

"لیکن یہ بھی سُن لیں۔ کہ میں ہر کام اپنی مرضی کے مُطابق کرنے کا عادی ہوں۔ آپ میرے کسی بھی اقدام کی مخالفت نہ کیجیے

گا۔ چاہے میں کچھ بھی کروں۔"

"اچھی بات ہے۔ فکر نہ کریں۔ میں اور میرے یہ دونوں ساتھی دخل اندازی نہیں کریں گے۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ آئیے مسٹر نصیر بیگ آپ ہمارے ساتھ چلیے۔ آپ دونوں یہیں ٹھہریں اور دروازے اندر سے بند رکھیں، جب تک میں نہ کہوں۔ دروازہ نہ کھولیں۔ ہاں یہ بھی بتا دیں۔ جہاز پر کُل کتنے آدمی ہیں؟"

"ہم تینوں کے علاوہ سو محافظ موجود ہیں۔ ان کا ایک انچارج ہے۔ یہ سب میرے احکامات کے پابند ہیں۔ میرے حکم کے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتے۔"

"گویا جہاز کے اصل انچارج آپ ہی ہیں۔"

"صرف اُوپر کی حد تک۔ جہاز پر جو چیز لے جائی جا رہی ہے اس چیز سے متعلق دس آدمی اور ہیں۔ وُہ جہاز کے گودام میں رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ہوا خوری، چہل قدمی کرنے یا کھانے اور پینے کے اوقات میں اوپر آتے ہیں۔"

"تو یہ دس آدمی آپ کے ماتحت نہیں ہیں۔"

"نہیں۔ ہماری حکومت کے خاص آدمی ہیں، گویا اعتماد کے آدمی۔ ان کی ذمے داری یہ ہے کہ اس چیز کے پاس کسی کو پھٹکنے تک نہ دیں۔ اور اگر کوئی مشکوک بات نظر آئے تو اس

کچھ بارے میں مجھے خطرے سے آگاہ کریں۔"

"تو محافظوں کے بارے میں انھوں نے کوئی اِطلاع نہیں دی؟" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"جی نہیں۔ ان بے چاروں کو تو معلوم ہی نہیں ہو گا۔ کیونکہ زیادہ تر تو وُہ نیچے ہی رہتے ہیں۔"

"ہوں۔ پورے جہاز کا ہی جائزہ لینا ہو گا۔" وُہ بولے۔

"لیکن ان دس آدمیوں کا انچارج آپ کو کم از کم اس کمرے میں نہیں جانے دے گا جس میں وُہ چیز رکھی ہے۔" نائب کپتان عبداللہ جانی نے کہا۔

"کوئی بات نہیں، مجھے اس کمرے میں جانے کی ضرورت بھی تو نہیں۔ آئیے مسٹر نصیر بیگ۔"

وُہ اس کے ساتھ باہر نکلے۔ عبداللہ جانی نے فوراً ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ تیز تیز چلتے عرشے پر آ گئے۔ عرشے کے ایک طرف ایک طیارہ شکن توپ لگی ہوئی تھی۔ باقی تین طرف مشین گنیں نصب تھیں، لیکن ان پر کوئی بھی محافظ موجود نہیں تھا۔ حالانکہ چند آدمی تو ضرور عرشے پر موجود ہونے چاہییں تھے۔ اور انھیں دُوربین کے ذریعے چاروں طرف کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے تھا۔

"محافظ کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں پڑے ہیں۔ عرشے پر ایک بھی نہیں۔"

"حیرت ہے۔ آخر انھیں کیا ہو گیا ہے۔" وُہ بڑبڑائے۔

"اُف اللہ۔" فرحت کے منہ سے خوف زدہ انداز میں نکلا۔

"کیا ہوا؟"

"مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے اس جہاز پر حملہ ہونے والا ہے۔"

وُہ تیزی سے اس کی طرف مڑے۔

"یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو؟" انسپکٹر کامران مرزا جھلّا کر بولے۔

"یہ صرف میرا احساس ہے۔ آخر جہاز کے سو کے سو محافظ کیوں غیر قدرتی نیند سو رہے ہیں؟"

"یہی بات ہم معلوم کرنے کے لیے آئے ہیں، اپنے محسوسات کو تھوڑی دیر کے لیے اپنے پاس رکھو۔" آفتاب نے جھلّا کر کہا۔

"اچھا۔" فرحت نے بھی اسے تیز نظروں سے گھورا۔

"سب سے پہلے انچارج کے کمرے میں چلیں۔ کیا ہر کمرے میں ایک محافظ ہے؟"

"جی نہیں۔ پانچ پانچ محافظوں کو ایک ایک کمرہ ملا ہوا ہے۔"

"گویا انچارج کے ساتھ بھی چار محافظ موجود ہیں۔" وُہ بولے۔

"جی نہیں۔ انھیں الگ ایک کمرہ دیا گیا ہے۔"

"کیا اس جہاز پر حفاظت کا انتظام ہمیشہ انہی محافظوں کے سُپرد ہوتا ہے؟"

"جی نہیں۔ عام طور پر تو چالیس کے قریب آدمی ہوتے ہیں، اس مرتبہ ان کی بجائے یہ سو آدمی دیے گئے ہیں۔ ان چالیس کو پندرہ دن کی چھٹی دے دی گئی تھی۔"

"ہوں۔ گویا آپ لوگ ان محافظوں سے واقف نہیں ہیں۔"

"جی نہیں۔ پہلی مرتبہ ہی ان کا ساتھ ہوا ہے۔"

"اچھا۔ چلیے۔ دیکھتے ہیں۔ ویسے آثار اچھے نہیں ہیں۔"

"یا اللہ رحم۔" نصیر بیگ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دو تین راہداریوں سے گزر کر آخر وُہ ایک کمرے کے دروازے پر رُک گیا۔ اور دستک دی۔ دروازہ دستک دیتے ہی کُھل گیا، لیکن اسے کھولا نہیں گیا تھا۔ چونکہ اندر سے بند نہیں تھا۔ اس لیے کُھل گیا۔ انھوں نے دیکھا۔ ایک لمبے چوڑے قد و قامت کا آدمی کمرے کے فرش پر چت لیٹا ہوا ہے اور اس کی آنکھیں بند ہیں، دروازہ کھلنے اور اُن کے اندر داخل ہونے پر بھی اس کے جسم میں حرکت نہ ہوئی۔

"کیا نام ہے ان کا؟"

"حنیف کورو۔"

"مسٹر حنیف کورو۔ اُٹھیے۔ ہم آپ سے مُلاقات کے لیے

آئے ہیں — خدا کے لیے آنکھیں تو کھولیے" انسپکٹر کامران مرزا نے
اس پر جھکتے ہوئے کہا، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اب انھوں
نے اسے شانے سے پکڑ کر ہلایا، لیکن اس کے کان پر جُوں
تک نہ رینگی۔ اب انھوں نے ایک طمانچہ اس کے منہ پر رسید
کیا۔ یہ طمانچہ زناٹے دار تھا، لیکن اس سے بھی اس کی آنکھیں
نہ کھل سکیں۔ انسپکٹر کامران مرزا نے پریشان ہو کر نصیر بیگ
کی طرف دیکھا:

"یہ تو بہت گہری نیند سو رہا ہے۔ یا یُوں کہہ لیں کہ
بے ہوش ہے۔"

"جی ہاں! میں نے بھی یہی محسوس کیا تھا۔"

"آپ نے ان حالات کی اطلاع کپتان صاحب کو پہلے کیوں
نہ دی۔"

"اس سے پہلے محافظوں پر یہ حالت طاری نہیں ہوئی تھی۔
یہ اونگھتے تو ضرور نظر آئے تھے، لیکن میں یہ سمجھا کہ چونکہ کوئی کام
نہیں ہے۔ اس لیے اونگھنے لگ گئے ہیں۔"

ہوں۔ آئیے۔ کسی ایسے محافظ کو چیک کریں۔ جو صرف
اونگھ رہا ہو۔"

"چلیے۔" وہ بولا۔

وہ ایک اور کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں پانچ محافظ

لیٹے ہوئے تھے۔ انھیں بھی ہلایا جلایا گیا، لیکن کسی میں
ہوش کے آثار نظر نہ آئے۔ اس طرح ایک ایک کرکے انھوں
نے بیس کے قریب کمرے دیکھ ڈالے۔ کوئی بھی اونگھتا ہوا
نہ ملا۔ انسپکٹر کامران مرزا ان چاروں کو لے کر راہداری میں آ
کھڑے ہوئے:

"اب کیا کیا جائے۔ یہ سب تو مکمل طور پر بے ہوش ہو
چکے ہیں۔"

"سب سے پہلے تو ہمیں ان حالات کی اطلاع ان دس
آدمیوں کو دینی چاہیے جو نیچے موجود ہیں، یعنی اس چیز کے گرد
موجود رہنے والوں کو۔ تاکہ کم از کم وہ تو ہوشیار ہو جائیں۔"

"آئیے۔ میں آپ کو ان کے پاس لے چلتا ہوں۔"

وہ نچلی منزل میں پہنچے۔ انھیں تقریباً تیس سیڑھیاں اُترنا پڑیں،
اب نصیر بیگ نے ایک کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

"کون؟" اندر سے فوراً ہی پُوچھا گیا۔

"یہ بھی شکر ہے۔ کہ یہ لوگ تو بے ہوش نہیں ہیں۔"

"میں ہوں نصیر بیگ۔ دروازہ کھولیے۔"

"کیا کوئی خاص بات ہے۔" دروازہ کھولے بغیر پُوچھا گیا۔

"جی ہاں۔ بہت زیادہ خاص۔ اور خطرناک بھی۔" اس نے
جواب دیا۔

" خطرناک بھی۔ ارے۔" اندر سے چونکے ہوئے انداز میں کہا گیا اور پھر دروازہ کھل گیا۔

" ارے۔ یہ کون لوگ ہیں آپ کے ساتھ ؟"

" یہ انسپکٹر کامران مرزا ہیں اور یہ ان کے بچے۔ کیا آپ اور آپ کے ساتھی۔ بالکل ٹھیک ہیں۔" نصیر بیگ نے جلدی جلدی کہا۔

" بالکل ٹھیک سے کیا مُراد ہے۔"

" مطلب یہ کہ سو کے سو محافظ اوپر بے ہوش پڑے ہیں۔"

" کیا کہا۔ بے ہوش پڑے ہیں۔" انچارج چلّا اُٹھا۔

" جی ہاں۔" اس نے کہا۔

" لیکن کیسے۔ انھیں کس نے بے ہوش کیا۔ کیا ان لوگوں نے۔" اس نے چیخ کر کہا۔

" یہ تو ہمارے مہربان ہیں۔ ایک جزیرے پر پھنس گئے تھے وہاں سے ہم نے انھیں اٹھایا ہے۔"

" اور یہ سازش بھی ہو سکتی ہے۔" انچارج نے پھنکار کر کہا۔

" مسٹر جالب نیاز۔ کیا آپ نے انسپکٹر کامران مرزا کا نام کبھی نہیں سُنا ؟ نصیر بیگ نے بُرا مان کر کہا۔

" بہت سُنا ہے، لیکن یہ نقلی انسپکٹر کامران مرزا بھی ہو سکتے ہیں۔"

" لیکن۔ ہم اپنا اطمینان کر چکے ہیں۔ کپتان صاحب بھی مطمئن

ہیں۔"

" لیکن میں مطمئن نہیں۔ اس امانت کو حفاظت سے اپنے ملک تک پہنچانا صرف اور صرف میری ذمے داری ہے، کپتان صاحب کی نہیں۔ ان کا کام تو بس یہ ہے کہ جہاز کو ملک کی طرف لے جائیں۔ محافظوں کا کام یہ ہے کہ اگر کوئی حملہ ہو تو اس کا منہ توڑ جواب دیں۔" اس نے بھنّائے ہوئے انداز میں کہا۔

" اسی لیے تو ہم آپ کے پاس آئے ہیں۔ سو کے سو محافظ بے ہوش ہیں۔ ایسے میں حملہ ہو گیا تو کیا ہوگا ؟"

" یہی میں کہتا ہوں۔ آخر وہ بے ہوش کس طرح ہو گئے ؟" جالب نیاز نے تلملا کر کہا۔

" مسٹر جالب۔ یہ تو ہمیں معلوم کرنا ہوگا کہ وہ بے ہوش کس طرح ہو گئے۔ ہم تو آپ کو صرف اطلاع دینے آئے تھے۔ آپ مجھ پر یقین کریں یا نہ کریں۔ آپ کا کام تو صرف اس امانت کی حفاظت ہے۔ اور آپ حفاظت کرتے رہیے، لیکن اتنا سوچ لیں۔ اگر جہاز پر حملہ ہو گیا تو آپ دس آدمی اس امانت کو نہیں بچا سکیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جلد از جلد محافظوں کو ہوش میں لایا جائے۔ ہم اب یہی کام کریں گے۔ اوہو۔ اس طرف تو میرا دھیان گیا ہی نہیں۔" آخری جملہ انھوں نے چونک کر کہا۔

"کس طرف —" نصیر بیگ نے گھبرا کر کہا۔
"مسٹر نصیر بیگ — سو محافظ — ایک ان کا انچارج — کپتان — نائب کپتان اور آپ — ان کے علاوہ گیارہ آدمی یہ — کیا ان کے علاوہ بھی جہاز پر کوئی اور سوار ہے ؟"
"آپ !" جالب نیاز نے فوراً کہا۔
"چلیے — ہمیں بھی شامل کر لیجیے — اب بتائیے — کیا ہم سب کے علاوہ بھی جہاز پر کوئی موجود ہے؟"
"ج — جی نہیں —" نصیر بیگ بولا۔
"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ؟" جالب نیاز نے اُلجھن کے عالم میں کہا —
"یہ کہ اگر کپتان ، نائب کپتان اور نصیر بیگ صاحبان — ان تینوں میں کوئی غلط آدمی نہیں ہے — اور آپ گیارہ آدمی بھی بالکل صحیح ہیں تب پھر —" وہ کہتے کہتے رک گئے ۔
"تب پھر کیا ابا جان ؟" آفتاب بے چین ہو گیا۔
"تب پھر یہ کہ ان ایک سو ایک آدمیوں میں سے کوئی ایک ضرور اس ساری گڑ بڑ کا ذمے دار ہے — اُف — ہم سے غلطی ہو گئی — آؤ — جلدی کرو —"
یہ کہتے ہی انسپکٹر کامران مرزا تیزی سے پلٹے اور سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے —

"یہ — یہ شخص ضرور کوئی چال چل رہا ہے اور نصیر بیگ — تم لوگ اس کی چالوں میں آ گئے ہو ، لیکن میں آنے والا نہیں — میرے ساتھیو — تیار ہو جاؤ — چوکس ہو جاؤ — یہیں موجود رہو — دروازے اندر سے بند کر لو — میں ابھی آتا ہوں —" جالب نیاز نے چیخنے کے انداز میں جلدی جلدی کہا اور ان کے پیچھے دوڑا —
آصف نے مڑ کر دیکھا تو اس کے ہاتھ میں پستول نظر آیا ؛
"انکل — کیا ہم اسے روکیں ؟" اس نے بھی بلند آواز میں کہا۔
"نہیں آصف — یہ حضرت غلط فہمی کا شکار ہیں — ایک ایک ساتھی — ہمیں اس وقت زیادہ سے زیادہ ساتھیوں کی ضرورت ہے — پہلے ہی ہمارے سو کے قریب ساتھی بے کار ہو چکے ہیں — ہم بہت کم رہ گئے ہیں — آصف — بہت کم —" ان کی جذبات سے لبریز آواز آہستہ ہوتی چلی گئی ۔
اسی وقت وہ عرشے پر آ گئے — انھوں نے چاروں طرف ایک نظر ڈالی اور یہ دیکھ کر دھک سے رہ گئے کہ ایک لمبے قد کا شخص آئینہ ہاتھ میں لیے کھڑا تھا اور آئینے کی مدد سے سورج کی شعاعیں ایک سمت میں پھینک رہا تھا — قدموں کی آواز سنتے ہی وہ تیزی سے پلٹا — اور ساتھ ہی اس نے ایک فائر جھونک مارا — انسپکٹر کامران مرزا منہ کے بل گرے — ان کے پیچھے آنے والے بھی فوری طور پر نیچے گر گئے — یکے بعد دیگرے پانچ فائر اور

ہوئے۔ جہاز کا عرشہ فائروں کی آواز سے گونج اُٹھا اور پھر خاموشی
چھا گئی۔ فائرنگ کرنے والے کا پستول خالی ہو چکا تھا۔ اور وُہ
پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے
جس تیزی سے اِدھر اُدھر لڑھک کر اس کے وار خالی دیے تھے،
شاید وُہ اس کے لیے بہت اچنبھے کی بات تھی۔ انسپکٹر کامران
مرزا اُٹھے اور ایک ایک قدم اس کی طرف بڑھنے لگے۔ ادھر
جالب نیاز بھی اس منظر کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

" تو وُہ تم ہو دوست۔"

" اوہو! تت۔ تم۔" حملہ آور کے منہ سے نکلا۔

" کیا مطلب؟" انسپکٹر کامران مرزا چونکے۔

عین اُسی وقت ایک فائر ہوا۔ اور عرشے کے کنارے کھڑا
ہُوا شخص اُچھل کر گرا، لیکن پھر لڑھکنی کھا گیا۔ کیونکہ ساتھ ہی
ایک اور فائر ہوا تھا۔ ایسے میں ایک مستول کے پیچھے سے کانپتی
آواز آئی:

" اُف خدا۔ یہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

یہ آواز عبداللہ جانی کی تھی۔ اس آواز کو سُن کر انسپکٹر کامران
مرزا کا چہرہ سُرخ ہو گیا، اُنھوں نے چیخ کر کہا:

" میں نے آپ دونوں سے کہا تھا کہ انجن روم سے باہر نہیں نکلنا
اور نہ دروازہ کھولنا ہے۔ واپس جائیے اور دروازہ بند کر لیجیے۔"

" اوہ۔ سس سوری۔" عبداللہ جانی کے مُنہ سے نکلا۔

ادھر فائرنگ کا سلسلہ بند ہو چکا تھا۔ اس مرتبہ فائرنگ جالب
نیاز نے کی تھی اور ہر بار حملہ آور کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی،
لیکن وُہ اس رفتار سے لڑھکا کہ خود انسپکٹر کامران مرزا بھی حیرت
زدہ رہ گئے:

" یہ۔ یہ کون ہے ابا جان؟" آفتاب ہکلایا۔

انسپکٹر کامران مرزا نے کوئی جواب نہ دیا۔ بھنّائے ہوئے
انداز میں جالب نیاز کی طرف مڑے:

" یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

" اس غدار کو جس قدر جلد ختم کر دیا جائے، بہتر ہے۔"

" جی نہیں۔ ہمیں ابھی یہ دیکھنا ہے کہ سارا چکر کیا ہے۔ یہ
کون ہے۔ اور عرشے پر کھڑا کیا کر رہا تھا، اس نے ہم پر گولیاں
کیوں برسائیں۔"

" اور مجھے آپ پر اور حملہ آور پر حد درجے حیرت ہے۔
آپ تو اس کی گولیوں سے بچ ہی گئے تھے۔ یہ بھی میری گولیوں
سے بچ گیا۔" جالب نیاز نے کہا۔

" کیا یہ شخص محافظوں میں شامل ہے؟"

" جی ہاں۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ اس کا نمبر سوواں ہے۔"

" ہوں۔ تب تو یہ بات ثابت ہو گئی کہ اپنے سو ساتھیوں

کو اسی نے ناکارہ بنایا ہے ۔ کوئی نشہ آور دوا کا عادی بنا کر۔"

"اوہ ۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"آئینے کے ذریعے سورج کی شعاعوں کا عکس یہ اس سمت میں ڈال رہا تھا ۔ آخر اس سے اس کا کیا مطلب تھا؟" فرحت بے چین ہو گئی۔

"مطلب صاف ہے ۔ جہاز کے آس پاس ضرور دشمنوں کا کوئی جہاز یا لانچ موجود ہے ۔ یہ اسے اشارے دے رہا تھا ۔۔ مسٹر جالب ۔ آپ مہربانی فرما کر اس پر اب فائرنگ کی کوشش نہ کیجیے گا ۔ مجھے ذرا اس سے دو دو باتیں کر لینے دیجیے۔"

"اچھی بات ہے ۔ اب تو ہمیں آپ پر اعتماد کرنا ہی پڑے گا، کیونکہ یہ دشمن آپ پر گولیاں برسا چکا ہے ۔ اور وہ ایکٹنگ نہیں تھی ۔ آپ لوگوں نے بڑی مشکل سے خود کو گولیوں سے بچایا ہے۔"

"شکریہ! مجھے آپ سے یہی امید ہے۔" انھوں نے کہا اور ایک بار پھر حملہ آور کی طرف بڑھے ۔ اس وقت تک وہ ایک مستول کے پیچھے ہو چکا تھا؛ تاہم اس کا سر انھیں نظر آ رہا تھا:

"آئیے ۔ انسپکٹر کامران مرزا آئیے ۔ مجھے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ آپ سے اس جہاز پر ملاقات ہو جائے گی ۔ آپ تو اس پر تھے ہی نہیں ۔ شاید اس جزیرے پر تھے ۔ جس کے

پاس جہاز کو روکا گیا تھا ۔ کاش میں اس وقت عرشے پر آ کر دیکھ لیتا ۔ اس وقت میں کپتان صاحب کو یہ مشورہ دے سکتا تھا کہ آپ حضرات بہت خطرناک لوگ ہیں، جہاز پر سوار نہ کریں ۔ اس وقت کپتان ضرور میری بات مان لیتا۔"

"چلو یہ اچھا ہی ہوا کہ تم اپنے کمرے میں رہے ۔ تو تم ان سو آدمیوں کو ۔ انچارج سمیت کوئی نشہ آور دوا دیتے رہے ہو؟"

"ہاں! اسی لیے تو ان میں شامل ہوا تھا۔" وہ ہنسا۔

"یہ کون ہے انکل ۔ آپ نے بتایا نہیں۔" آصف بے چین ہو کر بولا ۔

"میں نہیں جانتا، یہ کون ہے ۔ اتنی بات ضرور ہے کہ یہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے، کیوں بھئی ۔ کون ہو تم؟" انھوں نے کہا:

"میرا نام سام لٹ ہے۔" وہ بولا۔

غور کریں

انجن بند ہو جانے کے باوجود لانچ نہیں رُکی تھی ، یہ ان کی زندگی کا حیرت انگیز ترین واقعہ تو تھا ہی، خوفناک ترین بھی تھا ، کیونکہ وہ خود اس لانچ پر سوار تھے ۔ ان کے چاروں طرف سمندر تھا۔ دُور دُور تک کسی جزیرے کے آثار بھی نہیں تھے ۔ ہوتے تو بھی کیا فرق پڑتا تھا ۔ لانچ ان کے کنٹرول میں تو تھی نہیں کہ اسے جزیرے کی طرف موڑ دیتے ۔ ان حالات میں اگر شوکی اور اس کے بھائیوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ انھوں نے منور علی خان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ فکر مند وُہ بھی تھے ، لیکن انھوں نے اپنے ہوش و حواس بحال رکھے تھے :

" انکل ! کہیں ہم کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے ۔" آفتاب بول اُٹھا ۔

" ہاں ! یہ عین ممکن ہے ۔ میں راتوں کو عام طور پر خواب

دیکھتا رہتا ہوں ۔ بہت لمبے لمبے خواب ، بس یوں سمجھ لو کہ میری ساری رات خواب دیکھتے گزر جاتی ہے ، لیکن یہ خواب عام طور پر شیروں، ہاتھیوں اور گینڈوں وغیرہ کے ہوتے ہیں ، اگر یہ کوئی خواب ہے تو اس قسم کا خواب میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں ۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

" لانچ کا نہ رکنا ۔ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہیں ۔" شوکی نے بھی تائید کی ۔

" خدا کرے ۔ یہ ایک خواب ہی ہو۔ آنکھ کھلنے پر اس جادو کی لانچ سے تو نجات مل جائے گی ۔" منور علی خان بولے ۔

" انکل ! آپ اسے جادو کی لانچ کہہ رہے ہیں ۔" اشفاق حیران ہو کر بولا ۔

" اور کیا کہوں ۔"

" ٹھہریے انکل ۔ میں اپنی اُنگلی دانتوں تلے دبا کر دیکھتا ہوں ، پُرانے زمانے کی ، جنوں بھوتوں اور شہزادوں کی بے کار قسم کی کہانیوں میں لکھا ہوتا تھا کہ شہزادہ جب کوہ قاف میں پہنچا تو اس نے سمجھا شاید وُہ ایک خواب دیکھ رہا ہے ؛ چنانچہ اس نے یہ یقین کرنے کے لیے کہ یہ خواب ہے یا حقیقت ۔ اپنی اُنگلی چبا ڈالی اور تب اسے معلوم ہوا کہ وُہ خواب نہیں تھا۔ اسی طرح میں بھی یہ تجربہ کرتا ہوں ۔" اخلاق نے جلدی جلدی کہا۔

"جب وُہ بے کار کہانیاں تھیں تو ان کے طریقے پر کیوں عمل کر رہے ہو؟" شوکی نے کہا۔

"طریقے پر عمل کر کے دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔" اخلاق نے مُنہ بنایا۔

"لیکن ۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ خواب میں ہی تم یہ محسوس کرو جیسے انگلی کٹ گئی ہے۔"

"اللہ مالک ہے ۔ میں یہ تجربہ ضرور کروں گا۔" اخلاق نے کہا اور اپنے دائیں ہاتھ کی اُنگلی دانتوں تلے دبا ڈالی ۔ دُوسرے ہی لمحے اس کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی ۔

"کیا ہوا ۔ خیر تو ہے؟"

"انگلی ذرا زور سے چبا لی۔"

"تو کیا ہوا ۔ خواب ہی تو ہے ۔ جب جاگو گے تو اُنگلی بالکل ٹھیک ہو گی۔" شوکی نے مسکرا کر کہا۔

"بھائی جان ۔ کیا آپ میرا مذاق اُڑا رہے ہیں؟"

"نہیں تو ۔ تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"چھوڑو بھئی ۔ ہم کوئی خواب نہیں دیکھ رہے ، اگر یہ خواب ہے تو پہلے یہ بتاؤ ۔ یہ کہاں سے شروع ہوا ۔ میری اور آپ لوگوں کی ملاقات ہوئی بھی ہے یا نہیں ۔ جب کہ مجھے تو اچھی طرح معلوم ہے ۔ یاد ہے کہ میں آپ کے دفتر گیا تھا۔" منور علی خان

نے منہ بنا کر کہا۔

"چلیے ہم بھی مانے لیتے ہیں ، یہ خواب نہیں ہے ، پھر یہ لانچ آپ کے کنٹرول میں کیوں نہیں ہے ۔ انجن بند ہو جانے کے بعد بھی کیوں اسی رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے ۔ دائیں یا بائیں کیوں نہیں مڑتی ۔ ارے ہاں ۔ آپ نے اسے دائیں اور بائیں موڑ کر دیکھا ہے ۔ پیچھے کی طرف موڑنے کی کوشش نہیں کی ۔ ذرا یہ بھی کر کے دیکھ لیں۔" آفتاب نے جلدی جلدی کہا۔

"آفتاب تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا ۔ پیچھے موڑنے کے لیے بھی تو اسے دائیں یا بائیں موڑنا پڑے گا۔" اشفاق جل بھُن کر بولا ۔

"اب میرا اتنا بھی دماغ نہیں چل گیا ۔ پیچھے لے جانے کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح کار وغیرہ بیک ہو جاتی ہے ۔ کیا اس طرح لانچ نہیں ہو سکتی۔"

"نہیں ۔ اس میں گیر نہیں ہوتے۔" منور علی خان بولے۔

"اوہ ۔ مجھے افسوس ہے۔"

"گویا نہ ہم دائیں بائیں جا سکتے ہیں ، نہ پیچھے کی طرف ۔ جانے کا بس ایک ہی راستہ رہ گیا ہے اور وہ آگے کی طرف جاتا ہے ۔ آخر یہ سفر کہاں جا کر ختم ہو گا ۔ سمندر کوئی چھوٹی سی چیز تو ہوتا نہیں۔"

"نہیں میں سوچ رہا ہوں۔ اگر یہ پٹرول سے چل رہی ہوتی تو کہا جا سکتا تھا کہ پٹرول ختم ہونے کے بعد تو رُکے گی ہی۔"
اب منور علی خان کی آواز سے بھی پریشانی جھلک اُٹھی۔

"انکل۔ معلوم ہوتا ہے۔ آپ بھی خوف زدہ ہو گئے ہیں؟" شوکی نے ان کی طرف بغور دیکھا۔

"خوف زدہ تو خیر نہیں۔ پریشان ضرور ہو گیا ہوں۔"

"لیکن انکل۔ ہم نے کبھی انکل انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا صاحبان کو ذرا بھی پریشان ہوتے نہیں دیکھا۔" شوکی بولا۔

"ہاں بھئی۔ ان دونوں کے اعصاب حد درجے مضبوط ہیں۔ خطرات میں گھرنا ان کا مشغلہ ہے۔ ہے تو یہ میرا بھی مشغلہ، لیکن اگر میں اس وقت جنگل میں ہوتا تو ہرگز پریشان نظر نہ آتا۔"

"لیکن آپ سمندر میں بھی تو شکار کھیل لیتے ہیں؟"

"بہت کم۔ جب کبھی مچھلی کھانے کو جی چاہا اور سمندر نزدیک ہوا، شکار کھیل لیا۔"

"مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہم کسی آسیبی چکر میں پھنس گئے ہیں۔" اخلاق بڑبڑایا۔

"ارے باپ رے۔ کم از کم یہ بات تو نہ کہیں۔" آفتاب لرز گیا۔

"میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔" اشفاق نے منہ بنایا۔

"اور نہیں۔ یہ ضرور کوئی اور چکر ہے۔ اور اس کے بارے میں اندازہ لانچ رُکنے پر ہی ہو سکتا ہے۔" منور علی خان بولے۔

"تب تو ہمیں صبر شکر کر کے بیٹھ رہنا چاہیے اور اللہ کو یاد کرتے رہنا چاہیے۔" اشفاق نے کہا۔

"ہاں۔ بالکل ٹھیک۔" منور علی خان مسکرائے۔

"کم از کم میں ایک بات کہہ سکتا ہوں۔ کوئی طاقت اس لانچ کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ چاہے وہ مقناطیسی طاقت ہو یا کوئی اور طاقت۔ لہروں وغیرہ کی طاقت بھی ہو سکتی ہے۔" شوکی پُرخیال لہجے میں بولا۔

"لیکن ہم نے سمندر میں ایسا ہوتا پہلے کبھی نہیں سنا۔" اخلاق بولا۔

"ہاں۔ آج بھی نہیں سنا۔ آج تو ہم دیکھ رہے ہیں۔" آفتاب مسکرایا۔

"کمال ہے۔ یا تو آپ لوگوں کی جان ہی نکل گئی تھی یا۔ مسکرانے اور باتیں کرنے لگے۔"

"یہ آپ کی موجودگی کی وجہ سے ہے۔ آپ ذرا دیر کے لیے اِدھر اُدھر ہو جائیں، پھر دیکھیے گا۔ ہم کس بُری طرح ڈرتے ہیں۔" آفتاب بولا۔

"لیکن میں اِدھر اُدھر کس طرح ہو جاؤں۔" منور علی خان نے

بوکھلا کر کہا۔ اور وُہ مسکرانے لگے۔

لانچ یکساں رفتار سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ چاروں طرف سوائے سمندر کے اور کچھ نہیں تھا۔ اتنا ضرور ہے کہ سمندر پُرسکون تھا۔ اگر کہیں اس وقت سمندر میں طوفان ہوتا تو نہ جانے ان کا کیا حال ہوتا۔ جُوں جُوں وقت گزر رہا تھا، ان کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی، کیونکہ وُہ اس جنگل سے دُور ہی دُور ہوتے جا رہے تھے جس کے معائنے کے لیے منور علی خان انھیں لائے تھے۔

"جنگل کا معائنہ بھی درمیان میں رہ گیا۔" شوکی بڑبڑایا۔

"ہاں۔ کیا معلوم تھا۔ ایسے ہوگا۔ ورنہ ہم لانچ میں سوار ہی نہ ہوتے۔" اخلاق نے سرد آہ بھری۔

"اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ خدا کرے۔ لانچ کسی جزیرے کی سیدھ میں چلی جائے۔ اور جزیرے کے ساحل سے جا ٹکرائے۔ بس اس طرح ہم سمندر میں ڈوبنے سے بچ سکتے ہیں۔ ورنہ اس لانچ میں سفر کرتے رہنے کی صورت میں ہم ضرور ڈوب جائیں گے۔ اب تو دن کا وقت ہے۔ رات کو جب چاند نکلے گا تو سمندر میں جوار بھاٹا شروع ہو جائے گا۔ اس وقت یہ لانچ سمندر کی چھالوں کے مقابلے میں [illegible] ثابت ہوگی۔" منور علی خان کہتے چلے گئے۔

اور پھر اچانک وُہ چونک اُٹھے۔ ان کے چہرے [illegible]۔

ان کی نظروں کے سامنے ایک جزیرہ تھا۔ اور مزے کی بات یہ کہ اس جزیرے کے ساحل پر کچھ لوگ کھڑے تھے۔

"اللہ نے آپ کی سُن لی انکل۔" شوکی چلایا۔

"ہاں! ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، لیکن اس جزیرے پر لوگ کیوں کھڑے ہیں۔ کیا ان کا جہاز تباہ ہو گیا ہے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ بھی ہماری طرح کسی لانچ پر سوار رہے ہوں اور لانچ انھیں کھینچ کر یہاں لے آئی ہو۔ تب پھر ضرور اس جزیرے پر کوئی مقناطیسی طاقت مُوجود ہے۔"

"اب ہم جزیرے تک پہنچنے ہی والے ہیں۔ معلوم ہو جائے گا کہ کیا چکر ہے۔" اخلاق بڑبڑایا۔

اور پھر لانچ ساحل سے جا لگی۔ انھوں نے دیکھا۔ جزیرے کے ساحل پر کھڑے لوگوں کے چہروں پر شدید حیرت کے آثار تھے۔ لانچ ساحل پر پہنچتے ہی رُک گئی۔ وُہ چھلانگیں مار کر نیچے اُترے۔ ساتھ ہی ایک کڑک دار آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"کون ہو تم لوگ؟"

یہ الفاظ انگریزی میں کہے گئے تھے اور کہنے والا، ساحل پر کھڑے لوگوں میں سب سے آگے تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے ساتھ ساتھ شدید غُصّے کے آثار بھی تھے۔

" لانچ پر سے اترنے تو دیجیے ، پھر یہ بھی بتا دیں گے کہ ہم کون ہیں ۔" شوکی نے بھنا کر کہا۔

" یہ ۔ یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں ؟" اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ کر کہا۔

" آپ انسانوں کو دیکھ رہے ہیں ، حیوانوں کو نہیں ۔" آفتاب فوراً بولا ۔

" کیسے فرفر جواب دے رہے ہیں ۔ یہ کیا ہو گیا ۔" اس نے بوکھلا کر کہا ۔

" کیا آپ کے خیال میں کچھ اور ہونا چاہیے تھا ۔" منور علی خان نے ساحل پر چھلانگ لگاتے ہوئے کہا ۔ ان کے پیچھے شوکی، اشفاق اخلاق اور آفتاب بھی اترے ، اگرچہ وہ اتنی لمبی چھلانگیں نہ لگا سکے ۔ اور ساحل کی بجائے چھپاک چھپاک کر کے پانی میں گرے ۔ اس طرح چھینٹیں ساحل پر کھڑے لوگوں پر گریں ۔ سب سے اگلے آدمی پر تو زیادہ ہی گریں ۔

" یہ کیا کر رہے ہو ؟" وہ چلا اٹھا۔

" آپ دیکھ تو رہے ہیں ۔ ہم نے چھلانگیں لگائی ہیں ۔ اس کے بغیر آپ تک کس طرح پہنچ سکتے تھے ۔" آفتاب نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

" یہ چھلانگیں لگانے کا کون سا طریقہ ہے ؟" وہ غرایا۔

" ہمیں تو یہی طریقہ آتا ہے جناب ۔ یوں بھی ہم لانچوں پر سے ساحل پر ہر روز چھلانگیں نہیں لگاتے رہتے ۔ ویسے آپ سنائیے ۔ یہاں کیا کر رہے ہیں ۔" شوکی جلدی جلدی بولا — انگریزی ٹوٹی پھوٹی سی تھی ۔ منور علی خان بے ساختہ انداز میں مسکرا دیے ۔ البتہ ساحل پر موجود لوگوں کے منہ اور زیادہ بن گئے ۔

" تم لوگوں کو یہ لانچ کہاں سے ملی تھی ؟"

" ساحل پر ۔ اور کہاں ملتی ۔" منور علی خان نے جواب دیا۔

" تمہارا مطلب ہے ۔ جھلسے ہوئے جنگل کے ساحل پر ۔"

" ہاں ۔ بالکل ٹھیک کہا۔"

" اور جو شخص لانچ میں سوار تھا ۔ وہ کہاں ہے ؟"

" لانچ پر سوار تھا ۔ لانچ پر تو کوئی بھی نہیں تھا ، اگر کوئی ہوتا تو ہم اس پر کیوں سوار ہوتے ۔"

" کیا مطلب ؟" وہ چونک کر بولا۔

" مطلب یہ کہ اس لانچ پر کوئی بھی نہیں تھا ۔ یہ بالکل خالی کھڑی تھی ۔ ہم جنگل کی سیر کرتے ادھر نکل آئے تھے ۔ لانچ کو خالی دیکھ کر ہم نے سوچا ، کیوں نہ سمندر کی سیر کر لی جائے ۔ ہمارے یہ ساتھی لانچ چلانا جانتے ہیں ، بس ہم لانچ پر سوار ہو گئے ۔ اور ۔ اور ۔" شوکی کہتے کہتے رک گیا ۔

" اب اور اور کیا کر رہے ہو ؟" اس نے بھنا کر کہا ۔

" اور اور نہ کروں تو کیا کروں — سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آگے کیا کہوں — ہاں ٹھیک تو ہے — ہمارے انکل نے لانچ کو ساحل کے ساتھ ساتھ رکھنے کے لیے دائیں طرف موڑنا چاہا — لیکن یہ نہ مڑی — اس پر ہمیں بہت حیرت ہوئی — بائیں طرف موڑا تو یہ بھی نہ ہو سکا — بس آگے ہی آگے چلی جا رہی تھی — آخر تنگ آ کر اس کا انجن بند کر دیا — تاکہ اور کچھ نہیں ہوتا تو رُک تو جائے ، لیکن انجن بند کرنے کے بعد بھی یہ نہ رُکی — اور رُکی تو یہاں آ کر — اب آپ ہی بتائیے — اس میں ہمارا کیا قصور ہے "

" قصور تو بہت بڑا ہے — تم لوگ لانچ پر سوار ہوئے ہی کیوں تھے " اس نے غرا کر کہا ۔

" ہاں ! یہ واقعی ہمارا قصور ہے ، لیکن اب کیا کیا جا سکتا ہے — ویسے جناب — آپ یہ تو بتائیے — یہ لانچ اس جزیرے کے علاوہ کسی اور سمت میں کیوں نہ گئی "

" خاموش رہو — مجھے سوچنے دو — کیوں بھئی — اب ہم کیا کریں ؟ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا ۔

" میرا خیال ہے — ان لوگوں نے رولڈن کو ہلاک کر دیا ہے — اسے ہلاک کر کے سمندر میں پھینکنے کے بعد یہ لانچ لے کر فرار ہونا چاہتے تھے ، لیکن لانچ نے اِدھر اُدھر جانے سے انکار کر دیا — اور

سیدھی اِدھر آ گئی " ایک ساتھی نے کہا ۔

" آپ کی یہ بات تو بالکل درست ہے جناب کہ لانچ نے اِدھر اُدھر جانے سے انکار کر دیا ، لیکن یہ درست نہیں کہ ہم نے اس شخص کو ہلاک کر دیا — جس کا نام آپ نے رولڈن لیا ہے — ہم نے ساحل پر کسی کو نہیں دیکھا تھا "

" اس بات سے ہی ان کا جھوٹ ثابت ہو جاتا ہے " وہی شخص مسکرایا ۔

" جھوٹ ثابت ہو جاتا ہے — کیا مطلب ؟ "

" مطلب یہ کہ — رولڈن تو لانچ سے کہیں جا ہی نہیں سکتا تھا ۔ اسے تو صرف ساحل تک جا کر واپس پلٹ آنا تھا ، پھر بھلا وہ لانچ سے کیوں اُترتا ، اگر کسی فوری ضرورت کے تحت اُترا بھی تھا تو لانچ سے دُور نہیں جا سکتا تھا — اس لیے تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو — تم نے ہمارے ساتھی کو قتل کیا ہے — اور اس کی سزا تمھیں مل کر رہے گی "

" ہم نے آپ کے ساتھی کو ہرگز قتل نہیں کیا ، اگر آپ کا کوئی ساتھی اس لانچ پر تھا اور وہ ساحل تک گیا تھا تو پھر وہ وہیں کہیں ہوگا — ضرور اسے کسی اچانک ضرورت کے تحت اترنا پڑ گیا ہوگا — اور وہ ضرورت اسے لانچ سے کچھ دُور لے گئی ہوگی — ہم لانچ میں بیٹھے اور سمندر میں نکل آئے — ہمیں کیا

معلوم تھا کہ لانچ سیدھ میں جانے کے سوا اور کسی طرف مُڑ ہی نہیں سکے گی۔ اگر یہ بات معلوم ہوتی تو ہرگز اس منحوس لانچ پر سوار نہ ہوتے، اگر آپ کو ہماری باتوں پر یقین نہیں تو لانچ کو ساحل پر بھیج کر دیکھ لیں۔ آپ کے ساتھی مسٹر رولڈن وہیں کہیں ہوں گے۔ اور اس بات پر حیران ہو رہے ہوں گے کہ لانچ کہاں گئی۔" شوکی جلدی جلدی بولا۔

"خیر۔ یہ تو اب کر کے دیکھنا ہی ہوگا۔ اٹاری۔ تم لانچ لے کر جاؤ اور رولڈن کو تلاش کر لاؤ، اگر ساحل کے آس پاس اس کی لاش پڑی ہو تو لاش اٹھا کر لے آنا۔ تاکہ ان لوگوں کو بھی لاشوں میں تبدیل کر دیا جائے۔"

"ارے باپ رے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مسٹر رولڈن کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہوں۔ رفع حاجت کے لیے اُترے ہوں اور انھیں کسی سانپ نے کاٹ کھایا ہو۔ یا کوئی درندہ ادھر نکل آیا ہو۔" شوکی نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

"اِدھر اُدھر کی نہ ہانکو۔ ادھر کوئی درندہ نہیں پھٹک سکتا۔" اگلے آدمی نے کہا۔

"مسٹر شوبرا۔ یہ لوگ ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لانچ اڑا لے جانے کے چکر میں تھے۔ لیکن لانچ نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ اب جب کہ ہم معلومات

حاصل کر چکے ہیں، لانچ کو پھر سے ساحل کی طرف بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"کیوں۔ رولڈن کا پتا نہ کریں۔ کیا خبر۔ وہ ان کے بیان کے مطابق زندہ ہی ہو، اس صورت میں وہ لانچ کو ساحل پر نہ پا کر کس قدر پریشان ہو گا۔ دوسرے یہ کہ اگر رولڈن واقعی ان لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے تو انھیں بھی سزا دی جا سکے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔"

"تو پھر اٹاری تم لانچ لے کر چلے جاؤ۔ یہ لوگ تو انجن بند کر کے آئے ہیں، اس لیے انھیں ضرورت سے زیادہ دیر لگ گئی۔ تم جلد آ جاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ لانچ کو آزاد کر دیں۔" اٹاری نے کہا۔

"ضرور۔ راجر۔ تم جا کر لانچ کو آزاد کر دو۔" شوبرا نے ایک اور ساتھی سے کہا۔

"اوکے سر۔" راجر نے کہا اور جزیرے کی طرف دوڑنے لگا۔

"لانچ کو آزاد کرنے والی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی، کیا یہ لانچ آپ کی قیدی ہے؟"

"ہاں! یہی بات ہے۔" شوبرا مسکرایا۔

"آج تک تو جاندار چیزیں قیدی سننے میں آئی تھیں۔ آج ہم

نے لانچ کے قیدی ہونے کے بارے میں بھی سُن لیا۔ حد ہے ۔ کمال ہے ۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

" اگر ہم لانچ کو آزاد نہیں کریں گے تو یہ ساحل کی طرف کس طرح جا سکے گی ۔"

" آخر اسے قید کس طرح کیا گیا ہے ؟" شوکی نے پُوچھا۔

" یہ باتیں تمھارے سمجھنے اور سمجھانے کی نہیں ہیں ۔" اس نے کہا ۔

" تو اور کس کے سمجھنے سمجھانے کی ہیں ۔"

" آؤ جزیرے پر چلیں ۔ وہاں چل کر بیٹھیں گے ، کیونکہ ابھی لانچ کے واپس آنے میں کافی دیر لگے گی ۔" شوبرا بولا۔

" آئیے انکل ۔" شوکی نے کہا۔

وُہ سب چل پڑے :

" تم لوگ کون ہو اور اس بے آباد ساحل پر کس طرح پہنچ گئے تھے ؟"

" میں شکاری ہوں ۔ میرا کام ہی جنگلات کی خاک چھاننا ہے ۔" منور علی خان بولے۔

" تو کیا یہ بچّے بھی شکاری ہیں ؟"

" یہ ذرا اور قسم کے شکاری ہیں ۔" منور علی خان بولے۔

" یہ اور قسم کے شکاری کیسے ہوتے ہیں ؟"

" چھوڑیں اس بات کو ، یہ آپ کے سمجھنے سمجھانے کی باتیں نہیں ہیں مسٹر شوبرا ۔" شوکی نے اس کی نقل اُتاری ۔ وُہ بُرا سا مُنہ بنا کر رہ گیا۔

" یہ بتائیے ۔ آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں ۔ کیا چکر چلا رہے ہیں ؟" آفتاب بولا۔

" ہم اپنا کام کر رہے ہیں ۔ اب ذرا خاموش رہو ۔ تم لوگ بہت باتونی معلوم ہوتے ہو ۔"

" ہم میں سے صرف ایک ایسا ہے ۔ جسے باتونی کہا جا سکتا ہے ۔ سب کو نہیں ۔" اخلاق بھنّا کر بولا

" لانچ کے واپس آنے میں تو کئی گھنٹے لگیں گے ۔ ہم اس وقت تک خاموش کس طرح رہ سکتے ہیں ۔" اشفاق پریشان ہو کر بولا۔

" جزیرے پر ایک جگہ پہنچ کر تم لوگوں کو الگ بٹھا دیا جائے گا ۔ جتنی جی چاہے ، باتیں کرنا ۔"

" آخر اس جزیرے پر ہو کیا رہا ہے ۔ سمندر کے ساحل کے پاس کا جنگل جھلس کیوں گیا ہے ۔ وہاں کے درندے بھاگ کیوں گئے ہیں ؟"

" اسی طاقت نے ان درختوں کو جھلسایا ہے اور درندوں کو بھگایا ہے ۔ جو لانچ کو ساحل تک کھینچ لائی ہے ۔" شوبرا بولا۔

" کیا مطلب ۔ تم کس طاقت کی بات کر رہے ہو ۔ جہاں تک

ہمیں معلوم ہے۔ طاقت تو بس اللہ تعالیٰ کی ہے۔"

"ہم انسانی طاقت کی بات کر رہے ہیں۔ ایک تو تمہاری انگریزی اچھی نہیں ہے۔" شوبرا نے تلملا کر کہا۔

"اور تمہیں تو اُردو آتی ہی نہیں۔" آفتاب نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا —

پندرہ منٹ تک چلتے رہنے کے بعد وہ جزیرے کے درمیان میں پہنچ گئے۔ یہاں کسی دھات کے بنے ایک بہت بڑے قطر والے ستون کے اُوپر کوئی چیز تیزی سے گردش کر رہی تھی۔ وہ چیز دُھوپ کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ ستون کافی اونچا تھا — تاہم انھیں ساحل پر سے نظر نہیں آیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ درخت بہت بلند تھے۔ اور گھنے بھی تھے۔ اس قسم کے درخت انھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ان کی ڈاڑھیاں بھی لٹک رہی تھیں۔ جن کا رنگ نیلا تھا۔ درختوں کے پتوں کا رنگ بھی نیلگوں تھا —

"یہ۔ یہ کیا چیز ہے؟" آفتاب بڑبڑایا۔

"یہ تو ریڈار کی قسم کی کوئی چیز ہے۔" شوکی نے جواب دیا —

"تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ بس یہ سمجھ لو۔ یہی وہ چیز ہے، جس نے لانچ کو اِدھر اُدھر نہیں جانے دیا۔"

"اوہ!" وہ ایک ساتھ بولے۔

جزیرے کے اس حصے میں کرسیاں اور میزیں بچھی تھیں — شوبرا اور ان کے ساتھی ان پر بیٹھ گئے۔ ان لوگوں کے لیے کوئی کرسی نہ بچی —

"کیا ہم کھڑے رہیں گے؟" آفتاب نے جل بھن کر کہا۔

"ملزم کھڑے ہی رہا کرتے ہیں۔ کیا تمہارے ملک کی عدالتوں میں ملزموں کو کرسیوں پر بٹھایا جاتا ہے۔"

"گویا ہم ملزم ہیں۔"

"جب تک رولڈن کے بارے میں معلوم نہیں ہو جاتا، اس وقت تک تم ملزم ہو، اگر وہ زندہ لوٹ آیا تو تم پر کوئی الزام نہیں ہوگا اور اگر مُردہ ملا تو پھر ہم تم لوگوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"ہو سکتا ہے، اسے کوئی حادثہ پیش آگیا ہو۔"

"اس صورت میں بھی تم ہی مجرم ہو گے۔ ہم یہی خیال کریں گے کہ تم لوگوں نے ہی اسے حادثے سے دو چار کیا ہے۔" شوبرا نے کہا —

"مسٹر شوبرا — ایک تو آپ کا نام بہت عجیب ہے، دوسرے آپ کے کام بھی کم عجیب نہیں ہیں۔ آخر یہ سب کیا ہے؟" اشفاق نے ستون کے اُوپر گھومتی ہوئی چیز کی طرف اشارہ کیا۔

"تمھارے ننھے ساتھی برابر بولے جا رہے ہیں اور تم ہو کہ بالکل خاموش کھڑے ہو۔"

"میں سوچ رہا ہوں - اس ستون کے نیچے کیا ہے؟" منور علی خان بولے۔

"ستون کے نیچے... بہت کچھ ہے - تم کیوں فکر مند ہوئے جا رہے ہو۔"

"آؤ بھئی - ادھر چل کر بیٹھیں۔" منور علی خان نے تنگ آ کر کہا۔

"بس - کھڑے رہنے کی سکت نہیں رہی۔"

"بلا وجہ اپنی ٹانگیں کیوں توڑیں۔" آفتاب نے جھنجلا کر کہا اور ان کے پاس سے ہٹتے چلے گئے۔ شوبرا اور اس کے ساتھی ناخوش گوار انداز میں انھیں دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ منہ سے کچھ نہ بولے۔

"یہ ہم کہاں پہنچ گئے انکل - آپ تو ہمیں ساحل کے ساتھ جنگل دکھانے لائے تھے۔"

"ہاں! لایا تو تھا - میں خود حیران ہوں - آخر لانچ والا اس وقت کہاں تھا جب ہم ساحل پر پہنچے تھے اور لانچ خالی دیکھی تھی۔"

"یہ تو وہی بتا سکتا ہے - خدا کرے وہ مل جائے، ورنہ یہ لوگ

ہمارے ساتھ برا سلوک کریں گے۔" اشفاق نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"برا سلوک تو اس کے مل جانے کی صورت میں بھی کریں گے، صاف ظاہر ہے - یہ لوگ اپنا راز ظاہر نہیں ہونے دیں گے - اگر ہمیں واپس جانے دیا گیا تو ہم اس جزیرے کی تفصیلات پولیس تک پہنچا دیں گے۔"

"گویا ہمیں مرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔" شوکی نے کہا۔

"اللہ اپنا رحم فرمائے - تیار ہوں ہمارے دشمن - ان لوگوں کے پاس ہتھیار تو کوئی نظر آیا نہیں - یہ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔" اخلاق بولا۔

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو - جن لوگوں کے اشارے پر لانچ جزیرے تک کھنچی چلی آئی ہے - انھیں ہمارے مقابلے میں کسی ہتھیار کی کیا ضرورت ہے۔"

"کیوں نہ ہم یہاں سے بھاگ کھڑے ہوں۔" اشفاق بولا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا - بھاگ کیسے کھڑے ہوں - سمندر میں کب تک تیریں گے۔"

"انکل - بقول شوبرا - آپ تو واقعی بالکل خاموش ہو گئے - ایسا بھی کیا۔" شوکی بولا۔

"میں سوچ رہا ہوں - یہ مصیبت آپ لوگوں پر میری وجہ سے

نازل ہوئی ہے — آپ کے والدین مجھے بہت بد دُعائیں دینگے ۔ میں شیروں اور ہاتھیوں سے نہیں ڈرتا — ہاں بد دُعاؤں سے ضرور ڈرتا ہوں ۔"

" آپ کا مطلب ہے — شیر اور ہاتھی بد دُعاؤں کی نسبت کمزور ہوتے ہیں ؟" شوکی حیران ہو کر بولا ۔

" اس میں کیا شک ہے ؟"

" تب تو آپ شیروں کا مقابلہ بد دُعاؤں سے کرا دیا کریں — جب شیر شکست کھا جایا کریں ، آپ انھیں پکڑ لیا کریں ۔" آفتاب نے نئی ترکیب بتائی — منور علی خان مُسکرا کر رہ گئے اور بولے :

" آپ کی باتیں سُن سُن کر مجھے بے تحاشہ آفتاب یاد آجاتا ہے ، خُدا کے لیے باتیں نہ کریں ۔"

" باتیں نہ کریں تو کیا کریں ؟"

" غور — اس بات پر کہ یہاں سے نجات کس طرح مل سکے گی ۔"

" واقعی — یہ بات ہے تو غور کے قابل — خیر — ہم آپ کی غور کی دعوت قبول کر لیتے ہیں — آؤ بھئی غور کریں ۔" آفتاب نے پُرجوش انداز میں کہا ۔

اور وُہ واقعی سوچ میں ڈوب گئے — یہاں تک کہ انھوں نے راجر کو آتے دیکھا — نزدیک آ کر وُہ بولا :

" ساحل کی طرف جانے کا وقت ہو گیا ہے — تم لوگوں کو بھی

ہمارے ساتھ چلنا ہے — مسٹر شوبرا نے فیصلہ کیا ہے ، اگر لانچ پر رولڈن نہ ہوا تو تم لوگوں کو سمندر میں پھینک دیا جائے گا — اور اس کے لیے ترکیب یہ کی جائے گی کہ اسی لانچ میں بٹھا کر جزیرے سے بہت دُور پھینک آئیں گے — تاکہ تم لوگ تیر کر واپس جزیرے کی طرف نہ آسکو — کیا خیال ہے ؟"

" بھلا ہم اپنا کیا خیال بتا سکتے ہیں — اس وقت تو صرف تم لوگوں کا خیال چل رہا ہے ۔" آفتاب نے جلے کٹے انداز میں کہا ۔

" خیال چل رہا ہے — یہ کیا بات ہوئی ۔" منور علی خان حیران ہو کر بولے —

" پتا نہیں — کوئی بات ہوئی یا نہیں — میری تو بس یہ عادت ہے کہ بات کہہ دیتا ہوں — کوئی بات بنے یا نہ بنے ۔" آفتاب بولا ۔

" اچھا چلو — دماغ نہ خراب کرو ۔"

وُہ اس کے ساتھ چلتے جزیرے کے درمیان میں آئے — ابھی تک منور علی خان کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ کیا کرنا ہے — رولڈن کے مل جانے کی صورت میں شاید یہ لوگ انھیں بخیریت ساحل پر پہنچا دیں — اس بات کی انھیں ہلکی سی اُمید تھی —

" چلو — لانچ کا وقت ہو گیا ہے ۔" انھوں نے شوبرا کو کہتے سُنا —

وُہ سب کے ساتھ پھر ساحل پر آئے اور کھڑے ہو گئے —

بالکل اسی طرح ۔ جس طرح پہلے شوبرا اور اس کے ساتھی کھڑے تھے اور وہ لانچ پر آ رہے تھے ۔ اور پھر لانچ آتی نظر آئی ۔ جوں جوں لانچ نزدیک آ رہی تھی ۔ ان کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے ۔ حالانکہ یہ بات وہ پہلے ہی جانتے تھے کہ شوبرا اور اس کے ساتھی انھیں زندہ کسی صورت نہیں چھوڑیں گے ۔ صاف ظاہر تھا ۔ یہ لوگ کوئی غیر قانونی کام کر رہے تھے ۔ یہ سمندری حدود کس ملک کی تھیں ۔ یہ بات بھی انھیں معلوم نہیں تھی ۔

اور پھر لانچ نزدیک آگئی ۔ اس پر دو آدمی موجود تھے ۔ گویا رولڈن رہ گیا تھا ۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا :

"رولڈن ۔ تمھاری اس بے احتیاطی کو کیا کہا جائے ۔" شوبرا چلا اُٹھا ۔

"مجبوری سر ۔ ساحل پر پہنچا ہی تھا کہ پیٹ میں درد محسوس ہوا ، اس لیے رفع حاجت کے لیے چلا گیا ۔ واپس لوٹا تو لانچ غائب تھی ۔ میں نے اسے دور بہت دور سمندر میں جاتے دیکھا ۔ میں ان لوگوں کو آواز دے کر نہیں بلا سکتا تھا ، کیونکہ جانتا تھا ۔ لانچ نہیں مڑے گی ، اس لیے سر پکڑ کر بیٹھ گیا ۔ آپ ہی بتائیے ، مسٹر شوبرا ، اس میں میرا کیا قصور تھا ۔" رولڈن بلند آواز میں کہتا چلا گیا ۔

"ہوں ، بات تو ٹھیک ہے ۔ خیر ۔ ہم اپنا کام کر چکے ۔ اب ہمیں

[illegible]ر کرنا ہے ، لیکن اس سے پہلے ان لوگوں کا کچھ کرنا ہے ۔ ان کے بارے میں میرا فیصلہ ہے کہ سمندر میں پھینک دو ۔"

"اے مسٹر شوبرا ۔ کیا کہتے ہو ۔ تم نے کہا تھا ۔ اگر رولڈن زندہ سلامت مل گیا تو ہمیں واپس جانے دیا جائے گا ۔" منور علی خان تلملا اُٹھے ۔

"ہاں ، ضرور کہا تھا ، لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر ہم تم لوگوں کو واپس جانے دیں تو تم لانچ کے بارے میں سب کو بتاتے پھرو گے کہ کس طرح ایک لانچ سمندر کی لہروں پر ایک جزیرے کی طرف اپنے آپ کھنچی چلی جاتی ہے ۔ اور پھر یہ بھی بتاؤ گے کہ جزیرے پر کیا کچھ موجود ہے ، لیکن ہم یہ نہیں چاہتے ۔ اس جزیرے کو تو ہم نے پوری دنیا سے چھپا رکھا ہے ۔"

"چھپا رکھا ہے ۔ کیا مطلب ؟" آفتاب حیران ہو کر بولا ۔

"مطلب یہ کہ جزیرہ دور سے کسی کو نظر نہیں آتا ۔ اور کوئی لانچ یا جہاز اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا ۔" شوبرا نے بتایا ۔

"مسٹر شوبرا ۔ معاف کیجیے گا ۔ آپ کا دماغ تو نہیں چل گیا ۔" شوکی بوکھلا کر بولا ۔

"کیوں کیوں ۔ تم نے یہ اندازہ کس طرح لگا لیا ؟"

"اس طرح کہ لانچ تو اس جزیرے کی طرف کھنچی چلی آتی ہے ۔ اور تم کہہ رہے ہو کہ جہاز یا لانچیں اس کی طرف پھٹکتی

بھی نہیں۔ دوسرے یہ کہ جب ہم لانچ پر آ رہے تھے تو جزیرے
کو ہم نے دُور سے ہی دیکھ لیا تھا۔" شوکی نے کہا۔

" تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ سمجھ بھی کیسے سکو گے۔
ارے ہاں۔ ٹھیک تو ہے۔ ہمیں وقت تو گزارنا ہی ہے۔ خوب
لطف رہے گا۔" شوبرا نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

" خوب لطف رہے گا۔ کیا مطلب۔ ہمیں تو یہاں دُور دُور
تک کہیں لطف وطف نظر نہیں آ رہا۔ ہاں چاروں طرف پانی ہی
پانی ضرور ہے۔" آفتاب نے بوکھلا کر چاروں طرف دیکھا۔

" تم۔ تم احمق ہو۔ لطف واقعی رہے گا۔ رولڈن۔ لانچ
ان لوگوں کے حوالے کر دو۔"

" جی۔ کیا فرمایا۔ لانچ ان لوگوں کے حوالے کر دیں۔" رولڈن
حیران رہ گیا۔

" ہاں! میں نے یہی کہا ہے۔ تمہارے کانوں نے دھوکا
نہیں کھایا۔ چلو رولڈن۔"

" او کے سر۔ آؤ بھئی۔ لانچ تمہارے حوالے کر دوں۔"

" بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی مسٹر شوبرا۔" منور علی خان اُلجھے
ہوئے انداز میں بولے۔

" ہوں۔ آ جائے گی۔ تم لوگ لانچ پر سوار تو ہو جاؤ۔"

" اور اگر ہم سوار ہونے سے انکار کر دیں۔"

" تب پھر تمہیں اسی وقت مرنا ہوگا۔ دوسری صورت میں تمہاری
زندگی کی کچھ گھڑیاں زیادہ ہو جائیں گی۔"

" غلط کہتے ہو۔ ہمارا ایمان ہے۔ ہم ایک مقررہ زندگی لے
کر آئے ہیں۔ اس میں نہ کوئی اضافہ کر سکتا ہے نہ کمی۔ موت کا
ایک وقت معین ہے۔"

" چلو بھئی۔ انہیں زہریلی سوئیوں کا مزا چکھا دو۔ یہ یوں
نہیں مانیں گے۔" شوبرا نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ان
سب کے ہاتھ ایک ساتھ جیبوں میں رینگ گئے۔ ان کی تعداد
سات تھی، لیکن ابھی ہاتھ باہر نہیں آئے تھے کہ شوکی چلّا اٹھا:

" ارے ارے۔ مسٹر شوبرا۔ تم تو بُرا مان گئے۔ ہمارا کیا نقصان
ہے۔ لیجیے۔ ہم لانچ پر سوار ہو جاتے ہیں۔ آئیے انکل۔"
یہ کہہ کر اس نے منور علی خان کا ہاتھ پکڑا اور ساحل کی طرف
کھینچنے لگا۔

" یہ آپ کیا کر رہے ہیں شوکی۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔
اگر ہماری موت نہیں آئی تو یہ ہمیں کس طرح مار سکتے ہیں۔"
منور علی خان بھنا کر بولے۔

" آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن ہم یہ کیوں نہ دیکھ لیں کہ یہ ہمیں کیا
دکھانا چاہتے ہیں اور لطف کیسے اٹھاتے ہیں۔ آؤ بھئی۔" شوکی نے
ان تینوں سے کہا۔

پانچوں لانچ کی طرف بڑھے۔ رولڈان ان کے پیچھے چلا۔

"ہو گئے نا سیدھے۔" شوبرا مسکرایا۔ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا اور لانچ میں سوار ہو گئے۔ رولڈان نے لانچ کا رسہ کھول دیا:

"لو۔ اب تم آزاد ہو۔ لانچ سٹارٹ کرو اور ساحل پر چلے جاؤ۔ راجر۔ انھیں جانے دو۔"

"او کے سر۔" راجر نے کہا اور جزیرے کے درمیانی حصے کی طرف دوڑ پڑا۔

منور علی خان نے ان کی طرف دیکھا:

"دیکھ کیا رہے ہیں انکل۔ سٹارٹ کیجیے۔" شوکی نے کہا۔

انھوں نے انجن سٹارٹ کیا، لیکن لانچ اپنی جگہ سے ہل تک نہیں۔

"چند منٹ ٹھہرو۔ راجر کو پہنچنے دو۔"

دو منٹ بعد ہی لانچ کو ایک دھکا لگا اور وہ آگے بڑھ گئی۔

"ہاں۔ اب جاؤ۔ اور جس قدر تیز رفتاری سے جا سکتے ہو جاؤ۔"

منور علی خان نے پوری رفتار پر لانچ چھوڑ دی۔ پانچ منٹ تک وہ چلتی رہی، پھر جو انھوں نے مڑ کر جزیرے کی طرف دیکھا تو وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

"یہ۔ یہ کیا۔ انھوں نے تو ہمیں واقعی چھوڑ دیا۔" آفتاب

حیران ہو کر بولا۔

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔ اس لانچ کو جزیرے سے کنٹرول کیا جا رہا ہے۔ اس کی باگ ڈور دراصل ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ شوبرا جب چاہے گا۔ اس کی ڈوری کھینچ لے گا۔" شوکی جلدی جلدی بولا۔

"ضرور یہی بات ہے۔"

عین اسی وقت انھیں ایک جھٹکا لگا۔ لانچ رک گئی۔ اس کا انجن بدستور چل رہا تھا، لیکن لانچ آگے بڑھنا بند ہو گئی تھی۔ پھر اس نے خود بخود پانی میں ایک چکر لگایا اور جزیرے کی طرف چلی۔

"اُف خدا۔ یہ تو ایسا ہے۔ جیسے آج کل بہت سی چیزیں ریموٹ کنٹرول ہوتی ہیں۔" آفتاب چلایا۔

"ہوں۔ اب ہم پھر تیر کی طرح جزیرے کی طرف جائیں گے، ہم اسے اور کسی سمت میں نہیں لے جا سکتے۔" منور علی خان نے کانپتی آواز میں کہا۔

"گویا ہم پوری طرح ان کے کنٹرول میں ہیں۔" اشفاق بڑبڑایا۔

"ہاں۔ وہ ہمارے ساتھ بلی اور چوہے کا کھیل کھیل رہے ہیں۔"

"آخر یہ کون لوگ ہیں؟" اخلاق نے بھنا کر کہا۔

"کاش! میں نجومی ہوتا، پھر ضرور بتا دیتا۔" آفتاب نے

سرد آہ بھری۔

"تم سے کون پوچھ رہا ہے۔" اخلاق نے جل بھن کر کہا۔

اسی وقت لانچ کو ایک اور جھٹکا لگا۔ وہ رک گئی۔ شوکی نے فوراً اپنی گھڑی دیکھی۔ اور بول اٹھا:

"انکل۔ یہ وہی جگہ ہے۔ جہاں سے ہمیں جزیرہ نظر آنے لگ گیا تھا۔"

انھوں نے جلدی سے نظریں اُٹھائیں اور سامنے دیکھا۔ پانی کی سیکڑوں فٹ اونچی چھالیں اٹھ رہی تھیں۔ اور جزیرے کا کہیں پتا نہیں تھا۔ آفتاب مارے حیرت کے چلّا اُٹھا:

"ارے جزیرہ کہاں گیا۔"

جہاز اور کشتیاں

"مسٹر سام لٹ۔ آخر یہ سب کیا ہے۔ تم نے جہاز کے محافظوں کو کیوں بے کار کیا؟"

"تاکہ اس جہاز پر آسانی سے قبضہ کر سکوں۔ یہ میرے لیے بہت ضروری ہے۔"

"ایسی اس جہاز میں کیا بات ہے؟"

"اوہو۔ انسپکٹر کامران مرزا۔ ان لوگوں نے تمھیں بتایا نہیں۔ حیرت ہے۔ ارے انچارج صاحب۔ انسپکٹر کامران مرزا تو وہ شخص ہے۔ جس سے حکومت کا کوئی راز نہیں چھپایا جا سکتا۔"

"ہم احکامات پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔ حکام کو تو یہ معلوم نہیں تھا کہ انسپکٹر کامران مرزا کو بھی اس جہاز پر سوار ہونا پڑے گا۔"

"ہاں! بات تو ٹھیک ہے۔ خیر۔ اگر تم لوگ انھیں نہیں بتا سکتے تو میں بتائے دیتا ہوں۔ سنیے۔ انسپکٹر کامران مرزا۔ آپ کی

حکومت کو آپ کی دوست حکومت چمپان نے یہ سونے کا ایک جہاز بھیجا ہے۔ مطلب یہ کہ اس جہاز میں ٹنوں کے حساب سے سونا موجود ہے۔ اور ہم اس جہاز کو اڑا لینا چاہتے ہیں، کیونکہ اگر یہ سونا آپ کے ملک تک پہنچ گیا تو ملک بہت خوش حال ہو جائے گا۔ خوب ترقی کرے گا۔ پھلے پھولے گا۔ اس سونے سے آپ لوگ بڑی طاقتوں سے خوب اسلحہ خریدیں گے، لیکن ہم ایسا نہیں چاہتے۔ لہذا مجھے اس جہاز کو لوٹ لینے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ جہاز کے ایک محافظ کی جگہ لینے کے لیے مجھے بہت پاپڑ بیلنے پڑے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح میں اسے سمندر میں پھینکنے میں کامیاب ہو گیا اور اس کی جگہ خود لے لی۔ اس کے بعد محافظوں کو نشہ آور دوا دینا شروع کر دی۔ یہ کچھ مشکل نہیں تھا۔ وہ بے ذائقہ سفوف ہے۔ اور میں اسے ان کی چائے میں ملا دیتا ہوں۔ پانی کے ذخیرے میں اس لیے نہیں ملایا کہ اس طرح تو کپتان صاحبان بھی سو جائیں گے۔ اور جہاز اس جگہ تک نہیں پہنچ سکے گا جس جگہ تک میں اسے جوں کا توں لے جانا چاہتا ہوں، کیونکہ ایک بار جہاز اس جگہ پہنچ گیا، پھر کوئی مسئلہ نہیں رہ جائے گا۔ یہ ہے منصوبہ۔"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔ رنگ اڑ گئے، پھر انسپکٹر کامران مرزا نے کہا:

"لیکن خوش قسمتی سے جہاز پر اب ہم موجود ہیں اور تمھاری دال آسانی سے نہیں گلنے دیں گے۔"

"ہاں! اس بات کا مجھے احساس ہے۔ اسی لیے تو میں نے کہا تھا۔ ارے۔ تم کہاں سے آ گئے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ سو آدمی تو بے کار ہو چکے ہیں۔ باقی تم رہ گئے۔ میں تم لوگوں سے نمٹ لوں گا۔ دراصل میں چاہتا تھا۔ میرے آدمیوں میں اور جہاز کے عملے میں جنگ نہ ہو۔" وہ جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔

انھیں یوں لگا جیسے ان کی سٹی گم ہوتی جا رہی ہے، پھر انسپکٹر کامران مرزا سام لٹ کی طرف بڑھے:

"جہاز کے اس جگہ تک پہنچنے سے پہلے ہی میں تم سے نمٹ لینا چاہتا ہوں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

"آؤ آؤ۔ یوں ہی سہی۔" یہ کہہ کر سام لٹ بھی ان کی طرف بڑھا، پھر ایک مستول کے پاس رکا۔ تیزی سے اچک کر اس میں اڑسی ہوئی کوئی چیز کھینچ لی۔ انھوں نے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عجیب سا ہتھیار تھا۔ تلوار نما ایک ہتھیار، لیکن اس کے پھل کئی تھے۔ گویا ایک دستے میں کئی تلواریں جڑی ہوئی تھیں۔

"آپ کو اس سے جنگ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے انسپکٹر کامران مرزا۔ ابھی میرے آدمیوں کے پاس کئی پستول ہیں۔" جالب نیاز چلا اٹھا۔ شاید وہ یہ خوفناک ہتھیار دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

"اور اگر اس نے وُہ پستول بھی خالی کر دیے تو۔" انسپکٹر کامران مرزا نے اعتراض کیا۔

"اوہ۔گویا آپ کو اس سے دست بدست جنگ کرنا ہی ہو گی۔" جالب نیاز نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں، لیکن اس میں بوکھلانے کی کیا بات ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے مُنہ بنایا۔

"یہ کہ آپ خالی ہاتھ ہیں۔ اور اس کے پاس یہ عجیب و غریب تلوار ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ دیکھا جائے گا۔آپ عبد اللہ جانی سے جا کر کہیے۔ چاروں طرف نظر رکھیں۔ دُوربین سے نظریں نہ ہٹائیں۔ اور ہو سکے تو راستہ تھوڑا سا بدل دیں۔"

"میں۔میں اس جگہ سے نہیں ہٹ سکتا۔ یہ مقابلہ دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔" جالب نیاز نے ہکلا کر کہا۔

"اچھا۔تو نصیر بیگ کو بھیج دیں۔ مسٹر نصیر بیگ۔ کہیں آپ بھی تو یہ مقابلہ نہیں دیکھنا چاہتے۔"

"جی۔جی کیوں نہیں۔ بھلا کون ہے۔جو یہ مقابلہ نہ دیکھنا چاہے گا۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"اچھا تو بھاگ کر پیغام دے آئیں۔ یہ مقابلہ اتنا مختصر بھی ثابت نہیں ہو گا کہ آپ بھاگ کر انجن روم تک جائیں، بھاگ

کر یہاں تک آئیں۔اور مقابلہ ختم ہو چکا ہو۔" وُہ بولے۔

"تت۔تو کیا آپ اسے جان بوجھ کر لمبا کرنا چاہتے ہیں؟" آفتاب نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں خیر۔ میں یہ تو نہیں کروں گا، کیونکہ ابھی آنے والے خطرے سے بھی نبٹنا ہے۔"

نصیر بیگ نے دوڑ لگا دی۔ادھر سام لٹ ان کی طرف جھپٹا، اس نے تلوار والا ہاتھ سر سے بلند کیا اور ان کے سر پر دے مارا۔ انھوں نے پہلے تو اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہ کی۔ سب کو یوں محسوس ہوا جیسے تلوار بالکل ان کے سر پر پڑے گی، لیکن جونہی تلوار بلا کی رفتار سے نیچے گری۔ وُہ یک دم بیٹھ گئے اور دائیں طرف سرک گئے۔تلوار کھٹ کر کے عرشے پر لگی۔ اور اس میں دھنس کر رہ گئی۔ سام لٹ نے اسے کھینچ لینے کے لیے زور لگایا، لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔ اسی وقت ایک مُکا اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ وہ اس مکے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وُہ تو ہر حال میں تلوار کو کھینچ لینا چاہتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ دُوسری طرف اُلٹ گیا۔اس کے ساتھ ہی انسپکٹر کامران مرزا نے تلوار کے دستے پر ہاتھ جما کر زور جو لگایا تو وہ باہر نکل آئی۔ اب وُہ اسے تولتے ہوئے سام لٹ کی طرف بڑھے، انھوں نے دیکھا۔سام لٹ کے چہرے پر ذرا بھی پریشانی کے

آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ وہ اب بھی بے فکری سے مسکرا رہا تھا۔ انسپکٹر کامران مرزا نے چند قدم آگے بڑھائے۔ وہ پیچھے ہٹا اور عرشے کی ریلنگ سے اس کی کمر ٹکرا گئی۔ اس نے جلدی سے پیچھے دیکھا۔ ساتھ ہی تلوار والا ہاتھ اس کے کندھے کی طرف گرتا نظر آیا۔ اس نے بھی انتہائی پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اور ریلنگ کا سہارا لیے بائیں طرف سرک گیا۔ تلوار پورے زور سے ریلنگ پر لگی۔ ایک کھنک دار آواز ابھری اور ریلنگ اس جگہ سے کٹ گئی۔ سام لٹ کانپ گیا۔ اگر وہ اس وار کی زد میں آجاتا تو اس کا دھڑ دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ایک بار پھر انسپکٹر کامران مرزا اس کی طرف لپکے اور تلوار ترچھی گھمائی۔ یہ وار ایسا تھا کہ اگر درست پڑتا تو اس کا پیٹ چاک کرتا چلا جاتا، لیکن سام لٹ کمان کی طرح جھک گیا۔ تلوار اس کے کپڑوں کو پھاڑتی نکل گئی اور ٹھک کرکے ایک مستول میں جا دھنسی۔ انسپکٹر کامران مرزا نے اسے نکالنے کے لیے زور لگایا، لیکن اس مرتبہ وہ بہت بُری دھنسی تھی۔ نکل نہ سکی۔ فوراً ہی انھوں نے سام لٹ کو اپنے سر پر محسوس کیا۔ انھوں نے بچنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت تک مکا ان کی ٹھوڑی کا رُخ کر چکا تھا۔ تاہم۔ انھوں نے ٹھوڑی بچا لی اور مکا کندھے پر لگا۔ جھکتے ہوئے انھوں نے اپنا دایاں پاؤں اس کی پنڈلی کی ہڈی پر

دے مارا۔ یہ وار ایسا تھا کہ سام لٹ کھڑا نہ رہ سکا۔ عرشے پر گر گیا۔ پنڈلی کو اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ انسپکٹر کامران مرزا اس کی طرف بڑھے اور اسے کمر سے پکڑ کر ریلنگ کی طرف لے چلے۔ پنڈلی کی تکلیف نے اسے بالکل بے کار کرکے رکھ دیا تھا۔ انسپکٹر کامران مرزا نے اسے سر سے بلند کیا اور سمندر میں پھینک دیا۔ اسی وقت سام لٹ چلّا اُٹھا:

"انسپکٹر کامران مرزا۔ دیکھو۔ میں پھر بھی کامیاب ہو گیا!"

وہ ایک سمت میں اشارہ کر رہا تھا اور ساتھ میں تیر بھی رہا تھا۔ انھوں نے اس سمت میں دیکھا۔ سامنے سے دو بڑی کشتیاں چلی آ رہی تھیں۔ ان کے کناروں پر رائفلیں لگی صاف نظر آ رہی تھیں۔ انھوں نے جلدی سے دُوسری طرف دیکھا۔ دو ادھر سے آتی نظر آئیں۔ تیسری سمت میں دیکھا۔ ادھر بھی یہی منظر تھا۔ اور چوتھی سمت میں بھی۔ گویا آٹھ مسلح کشتیاں جہاز کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اور جہاز کے محافظ گہری نیند کے مزے لے رہے تھے:

"دیکھا۔ میں کامیاب ہو گیا نا۔"

"نہیں سام لٹ۔ ہم ان توپوں کو چلانا جانتے ہیں۔ ایک منٹ میں ان آٹھ کشتیوں کو بھون کر رکھ دیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا غرّائے۔

"ہا ہا ہا۔" سام لٹ نے دیوانہ وار ایک قہقہہ لگایا، پھر بولا:

"انسپکٹر کامران مرزا۔ شاید عقل گھر رکھ آئے ہو۔ میں جہاز پر موجود تھا، پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ ان توپوں اور گولہ بارود کو استعمال کے قابل رہنے دیتا۔ یہ سب ناکارہ ہو چکے ہیں۔"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔

ادھر سام لٹ نے اپنے سامنے والی کشتیوں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ وہ ساتھ میں ہاتھ بھی ہلا رہا تھا۔ گویا اشارہ دے رہا تھا۔ شاید کشتی والوں نے بھی اس کے اشارے کو سمجھ لیا۔ وہ اس کی طرف مڑ گئے۔ چند منٹ بعد انھوں نے سام لٹ کو کشتی پر سوار ہوتا دیکھا۔ اب اس نے چلا کر کہا:

"میں نے تم لوگوں کا راستہ صاف کر دیا ہے دوستو۔ جہاز پر قبضہ اب کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ عرشے پر کھڑے لوگوں کو بھون ڈالو۔" اس نے حکم دیا۔

"لیٹ جاؤ۔ نصیر بیگ۔ آپ لیٹے لیٹے انجن روم تک جائیں، کپتان صاحبان سے کہیں۔ وہ بھی لیٹ جائیں۔ اور جہاز کا رُخ بدستور اسی سمت میں رکھیں جس سمت میں جا رہا ہے۔ جہاز کو روکا ہرگز نہ جائے۔ ہاں، اگر ہو سکے تو رفتار اور بڑھا دیں۔"

"بہت بہتر جناب۔" اس نے کہا اور رینگنے لگا۔ وہ سب بھی عرشے پر گر چکے تھے۔ اسی وقت گولیوں کی تڑا تڑ جاری ہو گئی۔

"مسٹر جالب نیاز۔ ہماری توپیں تو ضرور سام لٹ نے بے کار کر دی ہوں گی۔ باقی اسلحہ بھی کیا کارآمد نہیں ہوگا۔ رائفلیں اور پستول وغیرہ۔"

"کم از کم میرے ساتھیوں کا اسلحہ ضرور محفوظ ہے۔" جالب نے فوراً کہا۔

"تو پھر مہربانی فرما کر اپنے آدمیوں کو اُوپر لے آئیں۔ اور تمام اسلحہ بھی۔"

"افسوس۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔ وہ اوپر نہیں آ سکتے۔ انھیں یہی حکم ہے کہ وہ ہر حالت میں نیچے رہیں گے۔"

"اب جب کہ اُوپر والے محافظ بے کار پڑے ہیں۔ تو ان لوگوں کو اوپر بلانے میں کیا حرج ہے، اگر جہاز پر ان دشمنوں کا قبضہ ہو گیا تو اس صورت میں وہ نیچے رہ کر بھی کیا کر لیں گے۔ میرا خیال ہے۔ آپ کو اس نئی صورتِ حال کا احساس کرنا چاہیے۔"

"ہوں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں انھیں لاتا ہوں۔"

"ذرا جلدی کریں۔ کشتیاں برابر نزدیک ہو رہی ہیں۔"

جالب نیاز نے جواب میں کچھ نہ کہا اور سیڑھیاں اُترتا چلا

گیا —

" ابا جان — آٹھوں کشتیوں پر تقریباً دو سو آدمی موجود ہیں — دو سو کے دو سو مسلح ہیں — ہم ان کا مقابلہ آخر کب تک کر سکیں گے — ہاں، اگر جہاز کی توپیں کام کر رہی ہوتیں تو ضرور ہم انھیں تباہ کر سکتے تھے۔"

" ہم ان کا مقابلہ کرنے کے سوا کر کیا سکتے ہیں — جیسے بھی ہو اور جو بھی ہو —" وہ بولے۔

" یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سام لٹ نے توپوں اور ان کے بارود کے بارے میں جھوٹ کہا ہو اور یہ بالکل صحیح حالت میں ہوں۔" فرحت بول اٹھی۔

" ہاں — یہ ٹھیک ہے — خیر — میں انھیں چیک کرنے کی کوشش کرتا ہوں — تم میں سے کوئی سر نہ ابھارے۔"

وہ ایک توپ کی طرف رینگ گئے — اتنے میں جالب نیاز اپنے ساتھیوں کو لے کر آ پہنچا — ایک ایک پستول انھیں بھی دے دیا گیا — اور جہاز کے چاروں حصوں میں تقسیم ہو کر انھوں نے بھی کشتیوں پر فائرنگ شروع کر دی — اسی وقت انسپکٹر کامران مرزا ان کے نزدیک آ گئے:

" نہیں بھئی — کم از کم سام لٹ نے اس بارے میں جھوٹ نہیں بولا تھا — توپیں بے کار ہو چکی ہیں۔"

" اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

" دوسری طرف ہم کشتیوں والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا پا رہے — وہ باقاعدہ مورچوں میں بیٹھے ہیں — ہماری گولیوں سے بالکل محفوظ — اور ایسا معلوم ہوتا ہے — جیسے ہمارا اسلحہ ختم کرنے کی فکر میں ہوں۔" آصف نے کہا۔

" ہوں، لیکن ہم کر ہی کیا سکتے ہیں، اگر فائرنگ نہ کریں گے تو یہ لوگ نزدیک آ جائیں گے۔" انھوں نے کہا

ایسے میں ان کی نظر لانچ ڈرائیور جارج پر پڑی — وہ ایک کونے میں سکڑا سمٹا کانپ رہا تھا — وہ مسکرا دیے اور پھر کشتیوں کی طرف متوجہ ہو گئے — کشتیاں بھی جہاز کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھیں — گویا وہ آگے بھی بڑھ رہے تھے اور جنگ بھی لڑ رہے تھے —

" اس جنگ کا انجام کیا ہو گا انکل۔" فرحت نے مایوسانہ لہجے میں کہا —

" انجام خدا جانے — ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا — دونوں طرف کا ایک آدمی بھی ابھی تک ضائع نہیں ہوا — جس فریق کا اسلحہ پہلے ختم ہو جائے گا — بس وہی ہار جائے گا۔" انھوں نے جواب دیا۔

" ہوں — تب تو ہمیں اسلحہ بہت احتیاط سے استعمال کرنا چاہیے۔" فرحت بولی —

"ہاں - بات تو ٹھیک ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا، پھر بلند آواز میں بولے:

"اسلحہ بہت احتیاط سے خرچ کریں - ورنہ یہ لوگ ہم پر چھا جائیں گے۔"

اچانک انھوں نے ایک کشتی میں سے چار آدمیوں کو پانی میں چھلانگیں لگاتے دیکھا - وہ چونک اٹھے - اسی وقت دوسری کشتی میں سے بھی چار آدمیوں نے چھلانگیں لگا دیں، پھر باقی دو کشتیوں میں سے بھی چار چار آدمیوں نے چھلانگیں لگائیں - اب انھوں نے دیکھا - وہ غوطہ خوری کے جدید ترین لباس سے لیس تھے -

"اُف خدا - یہ - یہ تو غوطہ خور ہیں - آخر ان کا پروگرام کیا ہے۔"

"میں شدید خطرہ محسوس کر رہا ہوں - ان کا پروگرام جہاز کو نیچے سے نقصان پہنچانے کا نہ ہو - اس صورت میں ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔" آفتاب نے جلدی جلدی کہا۔

"لل - لیکن ہم غوطہ خوروں کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں - یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے جب ہمارے پاس بھی غوطہ خوری کا لباس موجود ہو۔" آصف نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"اور جہاز پر غوطہ خوری کا لباس موجود ہے، لیکن ہم میں سوائے کپتان کے کسی کو غوطہ خوری نہیں آتی - یہ لباس اس لیے موجود ہے کہ اگر جہاز کے نچلے حصے میں کوئی خرابی واقع ہو جائے

تو پانی میں اُتر کر اس نقص کا کچھ انتظام کیا جا سکے۔"

"ایک لباس -" فرحت کانپ کر بولی۔

"ایک لباس نے تمھیں کانپنے پر کیوں مجبور کر دیا۔" آفتاب نے بُرا سا منہ بنایا۔

"یہ اندازہ لگا چکی ہے کہ ایک لباس سے اب کیا کیا جائے گا -"

"اوہ -" آفتاب کے مُنہ سے نکلا - کیونکہ اس وقت وہ بھی سمجھ گیا تھا -

"نصیر بیگ صاحب - جلدی کریں - وہ لباس لے آئیں۔"

"جج - جی - کیا مطلب؟" نصیر بیگ ہکلایا۔

"میں وہ لباس پہن کر پانی میں اُتروں گا اور دیکھوں گا - یہ لوگ کیا کرنا چاہتے ہیں، جلدی کیجیے - وقت بہت کم ہے۔"

"لل - لیکن جناب - ان سولہ غوطہ خوروں کے مقابلے میں آپ کیا کر سکیں گے۔"

"میں صرف یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ یہ لوگ کیا ارادہ رکھتے ہیں، تاہم مجھے ٹارچ اور خنجر کی لازمی ضرورت ہو گی۔"

"یہ چیزیں لباس کا لازمی حصہ ہیں - میں ابھی آیا۔" نصیر بیگ نے کہا اور ایک بار پھر انجن روم کی طرف چل پڑا -

"ا ا جان - آپ ایک بہت سنگین خطرہ مول لے رہے ہیں۔"

"ہاں! مجھے اس کا احساس ہے، لیکن پھر۔۔تم ہی بتاؤ۔ میں کیا کروں۔کیا کر سکتا ہوں۔آخر یہ جہاز ہمارے ملک کا ہے۔ اس پر لدا ہُوا سونا بھی ہمارے ملک کا ہے۔مُلک اور قوم کے کام آنے والا ہے۔کیا میں ان دونوں چیزوں کو دشمن ملک کے ان لڑاکوں کے ہاتھ لگ جانے دوں اور پھر اس جہاز پر مُلک اور قوم کے کچھ لوگ بھی مُوجود ہیں۔ساتھ ہی وہ بھی تو اپنی جانوں سے جائیں گے۔ان حالات میں تم ہی بتاؤ۔میں کیا کروں۔ اگر غوطہ خوروں کا مقابلہ نہ کروں تو بھی موت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پھر کیوں نہ میں مردانہ وار ان کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دوں۔یا انھیں تہس نہس کر دوں۔"

"غوطہ خوری کے لباس میں مقابلہ کرنے کا آپ کو تجربہ بھی تو نہیں ہے۔"

"ہاں۔ٹھیک ہے، لیکن میں غوطہ خوری کر سکتا ہوں۔اور جہاز پر ایک عدد لباس موجود بھی ہے، پھر بھلا میں کیوں آگ میں نہ کُود دوں۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

"آپ۔آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" آفتاب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

تینوں انھیں بھترائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔اسی وقت نصیر بیگ لباس لے آیا۔

"کپتان صاحبان انجن روم میں ہی مُوجود رہیں گے۔جہاز بدستور چلتا رہے گا۔تم لوگ برابر ان کی گولیوں کے جوابات دیتے رہو گے۔"

"ٹھیک ہے۔ہم ایسا ہی کریں گے۔" جالب نیاز نے ڈھیلی ڈھالی آواز میں کہا۔اب وُہ بھی انسپکٹر کامران مرزا سے بہُت متاثر نظر آ رہا تھا۔

اُن کے دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے غوطہ خوری کا لباس پہن لیا۔گیس کا سلنڈر لباس کے ساتھ ہی تھا۔اس کی نالی اُنھوں نے مُنہ میں لگا لی۔خنجر دائیں ہاتھ میں اور ٹارچ بائیں ہاتھ میں لے کر وُہ چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہو گئے، لیکن چھلانگ لگانا بھی تو ایک مسئلہ تھا۔ادھر وُہ چھلانگ لگاتے، ادھر ان پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو جاتی۔

"فرحت۔اب کیا کیا جائے؟" انسپکٹر کامران مرزا اس کی طرف مڑے۔

"ان کی توجہ کسی اور طرف لگانا ہو گی۔" فرحت بڑبڑائی۔

"لیکن کیسے؟" آصف بولا۔

"آؤ غور کریں۔"

"لیکن انکل کے پاس اتنا وقت کہاں کہ غور کر سکیں۔سولہ غوطہ خور کافی دیر پہلے چھلانگیں لگا چکے ہیں۔" آصف نے کہا۔

"ہاں بات تو ٹھیک ہے۔ اچھا تو پھر کچھ کپڑے وغیرہ جمع کرکے انھیں آگ لگا دی جائے۔ دھواں اٹھے گا تو اچانک سب دشمن ادھر دیکھیں گے۔ وہی وقت چھلانگ لگانے کا ہوگا۔" فرحت نے جلدی جلدی کہا۔

"بہت اچھی ترکیب ہے۔ جالب نیاز اور نصیر بیگ صاحبان، جلدی سے کپڑوں کا ڈھیر دائیں طرف لگا دیں اور اسے آگ دکھا دیں۔"

"اچھی بات ہے۔ آپ تیار رہیں۔"

"میں تیار ہوں۔" وہ بولے۔

دو منٹ بعد آگ اور دھوئیں کا ایک بادل جہاز سے اُٹھا۔ ساتھ ہی آفتاب، آصف اور فرحت نے بچاؤ بچاؤ کی بلند آوازیں نکالیں۔ جونہی دشمنوں نے دھوئیں کی طرف دیکھا، انسپکٹر کامران مرزا نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ چھپاکے کی زور دار آواز گونجی تو سام لٹ چلّا اُٹھا:

"بے وقوفو۔ وہ غوطہ خوری کا لباس پہن کر چھلانگ لگا گیا۔"

فوراً ہی گولیوں کی ایک بوچھاڑ ماری گئی۔ گولیاں اس جگہ پانی پر لگیں جہاں انسپکٹر کامران مرزا نے چھلانگ لگائی تھی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ چھلانگ لگانے کے بعد وہ اُبھرے نہیں تھے۔

"ہم نے صرف ایک آدمی کو چھلانگ لگاتے دیکھا ہے۔ جب کہ ہمارے سولہ آدمیوں نے غوطہ لگایا ہے۔ ایک کا سولہ سے کیا مقابلہ۔ وہ بھی پانی کے نیچے۔" سام لٹ کے ایک ساتھی کی آواز اُبھری۔

"تم۔ تم نہیں جانتے۔ چھلانگ کس نے لگائی ہے، اگر جانتے تو یہ بات ہرگز نہ کہتے۔" سام لٹ بولا۔

"کیا مطلب۔ آخر وہ ایسا کون شخص ہے؟"

"انسپکٹر کامران مرزا۔ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ اب ہمیں اپنے منصوبے پر بخیر و خوبی عمل کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔" سام لٹ نے کہا۔

"خیر دیکھا جائے گا۔ یہ ہیں ہی کتنے۔"

ایک بار پھر گولیوں کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ آفتاب، آصف اور فرحت کے ذہن انسپکٹر کامران مرزا میں اٹکے ہوئے تھے۔ اچانک انھوں نے ایک نئی بات محسوس کی۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

○

پانی کے نیچے پہنچتے ہی انسپکٹر کامران مرزا نے جہاز کے نچلے

حصے کا رُخ کیا۔ نیچے کارروائی کرتے ہوئے غوطہ خوروں کو ابھی یہ معلوم
نہیں تھا کہ ان کا کوئی دشمن بھی ان کے آس پاس پہنچ چکا ہے۔
اور یہی بات ان کے حق میں جاتی تھی۔ اچانک ان کی نظر غوطہ
خوروں پر پڑی۔ وہ سولہ کے سولہ جہاز کے نچلے حصے میں موجود
تھے۔ سب جہاز کے ساتھ ساتھ تیر بھی رہے تھے اور اپنا کام
بھی کر رہے تھے۔ ان میں سے چار کے ہاتھوں میں سیاہ رنگ
کے آلات تھے۔ وہ ان آلات کو جہاز کے نیچے چپکا رہے تھے،
گویا کام آسان نہیں تھا، لیکن وہ جٹے ہوئے تھے۔ انسپکٹر کامران
مرزا خنجر کو ہاتھ میں مضبوطی سے تھامے ان کی طرف بڑھے۔
جونہی وہ ان میں سے ایک کی کمر پر پہنچے۔ خنجر والا ہاتھ
پوری طاقت سے اس کی کمر پر مارا۔ خنجر دھنستا چلا گیا۔
سُرخ سُرخ خون پانی میں شامل ہونے لگا۔ غوطہ خور تڑپا
اور نیچے جانے لگا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کے جسم سے
خون نکلتے دیکھا تو سب کے سب بوکھلا اُٹھے۔ وہ یک دم
ان کی طرف مڑے اور انھیں یہ بات جاننے میں دیر نہ لگی کہ
کیا ہوا ہے، کیونکہ ان کے غوطہ خوری کے لباس اور طرح
کے تھے اور ان کا اور۔ لہذا برے نکال نکال کر ان کی
طرف متوجہ ہوئے۔ دوسرے ہی لمحے انھوں نے اپنی پنڈلیوں
میں اڑسے ہوئے خنجر کھینچ لیے۔ اب پندرہ خنجر ان کی

طرف بڑھے۔ مشکل یہ تھی کہ وہ باقاعدہ غوطہ خور تھے۔
تجربہ کار تھے۔ اور یہ اناڑی۔ انھوں نے گہرائی میں ایک غوطہ
لگایا۔ اور ان کے نرغے سے نکل آئے۔ ایسے میں ایک غوطہ خور
نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور ان کی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ پلٹے۔
ساتھ ہی اس نے ان کے سینے پر خنجر دے مارا۔ وہ لہرا
گئے۔ اپنا خنجر والا ہاتھ گھما دیا۔ ان کا خنجر اس کے پیٹ میں
لگا۔ ہاتھ سے خنجر نکل گیا۔ انھوں نے خنجر اس کے ہاتھ
سے گرتے صاف دیکھا۔ اچانک انھیں ایک ترکیب سوجھ
گئی۔ وہ اس غوطہ خور سے لپٹ گئے۔ اس کا خون ان کے
لباس کو بھی رنگین کرنے لگا؛ تاہم یہ رنگ گہرا نہیں تھا،
کیونکہ خون تو پانی میں ملتا جا رہا تھا۔ پھر وہ بھی اس کے
ساتھ نیچے گرتے چلے گئے۔ اس کے ساتھیوں نے سمجھا۔
وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے گئے۔ اس لیے پھر
جہاز کا رُخ کر گئے۔ بہت نیچے جا کر انسپکٹر کامران مرزا نے
اسے چھوڑ دیا۔ وہ نیچے کی طرف چلا اور یہ اوپر اٹھنے لگے۔
قدرے فاصلے سے پھر جہاز کی طرف آئے۔ جہاز بھی اپنی جگہ
تو کھڑا نہیں تھا۔ برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس لیے ان
لوگوں کو بھی ساتھ ساتھ آگے بڑھنا پڑ رہا تھا۔ آگے بھی
بڑھ رہے تھے۔ اپنا کام بھی کر رہے تھے اور جنگ بھی۔ انسپکٹر

کامران مرزا پھر ان کی کمر پر پہنچے اور اس مرتبہ دو کو لے بیٹھے۔
ایک کی کمر سے خنجر نکالتے ہی دوسرے کی کمر میں بھونک دیا۔
ایک بار پھر وُہ پلٹے۔ اور انہیں گھیرے میں لینے کی
کوشش شروع کر دی۔ اس مرتبہ وُہ بہت غصّے میں تھے۔ اور
پلٹ پلٹ کر حملے کر رہے تھے۔ انھوں نے بھی انتہائی تیزی
سے خنجر چلانا شروع کر دیا۔ سمندر میں ایک ہولناک جنگ شروع
ہو گئی، لیکن اس جنگ کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ یُوں
بھی لڑنے والوں کو دکھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو بس ایک
دُوسرے پر ہر حالت میں فتح پا لینا چاہتے تھے۔

انسپکٹر کامران مرزا نے اچانک ایک پلٹنی کھائی اور تڑپنے
کے انداز میں نیچے گرتے چلے گئے۔ ایسے میں وُہ سوچ رہے
تھے۔ کاش۔ وُہ سام لٹ والی تلوار ساتھ لے آئے ہوتے۔
اس سے ان لوگوں کا صفایا نسبتاً آسانی سے اور جلد کیا جا سکتا
تھا۔ وہ برابر نیچے گر رہے تھے۔ ایک غوطہ خور ان کے پاس
سے نیچے گرتا نظر آیا۔ وہ بُری طرح زخمی ہو چکا تھا، لیکن خنجر
ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے اپنی ٹارچ خنجر
والے ہاتھ میں پکڑی اور اس کے خنجر پر ہاتھ ڈال دیا —
دوسرے ہی لمحے ان کے ہاتھ میں دو خنجر تھے۔ بائیں ہاتھ میں
انھوں نے ٹارچ کے ساتھ خنجر پکڑ لیا تھا اور دائیں میں صرف

خنجر۔ ٹارچ والے ہاتھ میں خنجر کی نوک ٹارچ سے کافی آگے
نکلی ہوئی تھی۔ اب وہ پھر اوپر اٹھے۔ اور غوطہ خوروں کے
پاس جا کر ایک بار پھر ان پر حملہ آور ہوئے۔ عین اسی وقت
انھیں نیچے کھینچا جانے لگا۔ انھوں نے بوکھلا کر نیچے دیکھا۔
دو آدمی ان کی ایک ایک ٹانگ پکڑے نیچے گھسیٹ رہے تھے،
انھوں نے سنبھلنے کی کوشش کی، لیکن چونکہ پانی میں تھے —
اس لیے دو کے مقابلے میں زور نہ لگا سکے۔ ایسے میں اوپر سے
بھی غوطہ خور ان پر حملہ آور ہوئے۔ ایک کا خنجر ان کے دائیں
شانے میں لگا — تو دوسرے کا بائیں بازو میں — انھیں یُوں لگا،
جیسے آگ سی لگ گئی ہو۔ تاہم انھوں نے ایسے میں بھی
ہمت نہ ہاری اور دونوں ہاتھ پوری تیزی سے گھما دیے —
دونوں غوطہ خور بچنے کی لاکھ کوشش کے باوجود ان کی زد میں
آ گئے۔ اور نیچے کی طرف چلے۔ اب وہ آدھے دھڑ سے جھکے
اور دوہرے ہوتے ہوئے ان دونوں غوطہ خوروں کے ہاتھوں
پر وار کیے۔ ان کے ہاتھ فوراً ہی الگ ہو گئے۔ اب وہ اوپر
اُٹھے۔ سمندر کا نمکین پانی زخموں پر بہت مزا دے رہا
تھا۔ جان پر بن گئی تھی، لیکن ان غوطہ خوروں کو کارروائی
کرنے کے لیے چھوڑ کر جانا وُہ کس طرح پسند کر سکتے تھے۔
جہاز کے نزدیک اب قریباً آٹھ غوطہ خور باقی تھے۔ اور موقع سے

فائدہ اُٹھا کر وُہ اپنا کام کر رہے تھے ۔

آٹھ غوطہ خوروں کا مطلب یہ تھا کہ قریباً نِصف کام آ چکے تھے یا شدید زخمی ہو چکے تھے ۔ انسپکٹر کامران مرزا پر جوش کی حالت طاری ہو گئی ۔ دونوں ہاتھ گھماتے وُہ ان پر حملہ آور ہوئے ۔ وُہ بوکھلا کر پلٹے ، لیکن اتنی دیر میں تین اور زخمی ہو چکے تھے ۔

اب ان کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے ۔ اِدھر اُدھر بھاگنے کی کوشش شروع کر دی ۔ بھاگتے دشمنوں کا شکار آسان ہوتا ہے ۔ انھوں نے بھی تعاقب کیا اور جس کے نزدیک پہنچتے گئے، خنجر سے اس کی خبر لیتے گئے ۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے وُہ سب بے کار ہو گئے ۔

اب اُنھوں نے اُوپر کی راہ لی ۔ اور پھر ٹھٹک گئے ۔ وُہ جہاز کے پاس سطح سمندر پر نہیں اُبھر سکتے تھے ۔ اس طرح تو وُہ کشتیوں پر مُوجود دشمنوں کی زد میں آ جاتے ۔ انھوں نے نیچے ہی نیچے جہاز سے دُور ہونا شروع کر دیا ۔ اور جب اپنے اندازے کے مطابق اس قدر دُور ہٹ گئے کہ دُشمن انھیں نشانہ نہ بنا سکیں تو سطح پر اُبھر آئے ۔ انھوں نے جہاز کی طرف دیکھا اور پھر دھک سے رہ گئے ، پھر چاروں طرف نظریں دوڑائیں ۔ اور پریشان ہو گئے ۔

جہاز اور کشتیوں کا دُور دُور تک پتا نہیں تھا ۔ جب کہ تھوڑی دیر پہلے تک وُہ جہاز کے نچلے حصّے کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے تھے ۔

زمین یہاں کہاں

"کیا کہا۔ جزیرہ کہاں گیا ۔ دماغ تو نہیں چل گیا۔ جزیرہ بھی بھلا کہیں جا سکتا ہے ۔ ہم ہی اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں گے۔" شوکی نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"آپ کہتے ہیں تو ضرور چل گیا ہوگا دماغ، لیکن بات یہ ہے کہ لانچ تو بالکل جزیرے کی سیدھ میں چل رہی تھی، پھر بھلا ہم اِدھر اُدھر کیسے ہو سکتے ہیں۔" آفتاب بولا۔

"لیکن جزیرہ بھی تو کہیں نہیں جا سکتا۔"

"میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا۔ سمندر میں چلتے پھرتے جزیرے بھی ہوتے ہیں۔" اشفاق بولا۔

"اچھا۔ کمال ہے۔ میں نے تو نہیں سنا۔" اخلاق نے حیران ہو کر کہا۔

"تو اس میں میرا کیا قصور۔" اشفاق بے چارگی کے انداز میں بولا۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ ارے۔ ارے۔ ارے۔ یہ کیا؟" اچانک منور علی خان چلّا اُٹھے۔

وہ بھی بوکھلا اُٹھے۔ ان کی زندگی کا شاید عجیب ترین منظر ان کے سامنے تھا۔ لانچ کا انجن چل رہا تھا۔ اور اس نے چند سیکنڈ پہلے آگے بڑھنا بند کر دیا تھا۔ یہی نہیں — اب وہ پیچھے ہٹنے لگی تھی۔ منور علی خان نے اسے آگے لے جانے کی کوشش کی، لیکن وہ پیچھے ہی ہٹتی رہی۔

"انکل۔ ذرا اسے دائیں یا بائیں تو لے جا کر دیکھیں۔" آفتاب چلّا اُٹھا۔

اُنھوں نے کوشش کی تو لانچ دائیں طرف مڑ گئی، پھر بائیں طرف موڑا تو ادھر بھی مُڑ گئی۔ اب پھر جزیرے کی طرف لے جانے کی کوشش کی، لیکن اس طرف نہیں گئی، بلکہ پھر پیچھے ہٹنے لگی۔

"یہ ۔ یہ ضرور جادو کا جزیرہ ہے۔" آفتاب بڑبڑایا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا۔ کیا تم بھول گئے۔ وہاں کچھ لوگ بھی موجود ہیں۔" شوکی نے منہ بنایا۔

"تو کیا ہوا بھائی جان۔ جادو بھی تو آدمی ہی چلاتے ہیں۔"

"آخر یہ سب کیا ہے؟" منور علی خان نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

اچانک انھیں جزیرہ نظر آنے لگا۔ پانی کی چھالیں یک دم غائب ہوگئیں۔ گویا ان چھالوں نے جزیرے کو ان کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا:

"لو۔ وہ رہا جزیرہ۔" اخلاق بولا۔

"ہاں! اب تو سبھی کو نظر آ رہا ہے، لیکن تھوڑی دیر پہلے نہیں تھا۔" اشفاق نے کہا۔

"یہ ضرور ان چھالوں کی کارستانی تھی۔" آفتاب نے کہا۔

"حیرت ہے۔ ان چھالوں کو اپنی کارستانی دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"اف خدا۔ اب تو لانچ بھی جزیرے کا رُخ کر رہی ہے۔"

"ارے باپ رے۔ گویا ہم پھر مسٹر شوبرا سے مُلاقات کرنے جا رہے ہیں۔" آفتاب بے بسی کے انداز میں بولا۔

"ہم نہیں جا رہے۔ وہ ہمیں اپنی مُلاقات کے لیے بُلا رہا ہے۔" شوکی نے اسے گھورا۔

"تو آپ مجھے گھور کیوں رہے ہیں۔ کیا ان دونوں باتوں میں بہت فرق ہے۔" آفتاب نے بھنا کر کہا۔

"ہاں! بہُت فرق ہے۔ بلکہ زمین آسمان کا فرق ہے۔" شوکی نے جھنجلا کر کہا۔

"لیکن زمین یہاں کہاں۔ زمین کو تو ہم گویا ترس گئے ہیں۔

ہاں، آپ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ سمندر آسمان کا فرق ہے۔" آفتاب نے جلدی جلدی کہا۔

"لو اور سنو۔ یہاں جان پر بنی ہے اور انھیں مذاق کی سوجھی ہے۔"

"لیجیے۔ وُہ شوبرا صاحب بھی کھڑے نظر آ رہے ہیں۔"

"اور کیا کریں گے۔ آخر نظر تو آنا ہی ہوگا۔" آفتاب نے جلدی سے کہا۔

"بھئی کوئی بات تو سیدھی بھی کر لیا کرو۔" اشفاق نے تنگ آ کر کہا۔

"جی بہت بہتر۔ اب میں ہر بات بالکل سیدھی کیا کروں گا۔"

"وعدہ رہا۔" اشفاق خوش ہو کر بولا۔

"ہاں۔ بالکل رہا۔"

"خیر دیکھتے ہیں۔ کب تک وعدہ نبھاتے ہیں۔"

لانچ ایک بار پھر ساحل پر آ کر رُک گئی۔

"آجاؤ۔ ہمارے مہمانو۔ کیسی رہی۔" شوبرا شوخ آواز میں بولا۔

"اور تو سب اچھی رہی۔ یہ جزیرے صاحب غائب کس طرح ہو گئے تھے۔" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"جزیرے صاحب۔" شوبرا حیران ہو کر بولا۔

"جی ہاں۔ جو چیز غائب ہونے کی صلاحیت رکھے۔ کم از کم اسے صاحب تو کہنا ہی چاہیے۔"

"پتا نہیں۔ تم کیا باتیں کر رہے ہو۔ میری سمجھ سے باہر ہیں۔"

"اس کا دماغ تو ہے خراب۔ آپ فرمائیے۔ ہمیں بتانا کیا چاہتے ہیں؟"

"یہ کہ اگر ہم چاہیں تو اس جزیرے کو جہاز رانوں وغیرہ کی نظروں سے غائب کر دیں۔ اور چاہیں تو لانچیں اور جہاز اس طرف کا رُخ بھی نہ کر سکیں اور چاہیں تو لانچیں اور جہاز سیدھے ادھر ہی چلے آئیں۔"

"گویا۔ جو آپ چاہیں۔ بس وہی ہو جائے گا۔" اشفاق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ہاں بالکل۔" شوبرا نے خوش ہو کر کہا: "تم بہت عقل مند ہو۔" شوبرا نے اس کی تعریف کی۔

"اگر میں عقل مند ہوں تو میرا ایک سوال پورا کر دیں۔"

"سوال۔ کیسا سوال۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"آپ نے کہا ہے کہ آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" اشفاق بولا، سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا مطلب؟" شوبرا نے چونک کر کہا۔

"میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے کہ جو چاہے سو کرے۔ اگر آپ اس بات کے دعوے دار ہیں تو ذرا سُورج کو اِسی وقت غروب کر کے دکھا دیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" شوبرا تلملا اُٹھا۔

"یہ بات یہ ہوئی کہ آپ کی بات کا جواب ہوا۔" آفتاب مسکرایا۔

"میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا، ہاں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اب تم لوگوں کو میرے حکم سے سمندر میں دھکا دیا جائے گا، اگر تم زندہ بچ کر دکھا دو تو مانوں۔" اس نے سرد آواز میں کہا۔

"دیکھیے جناب! آپ ہمیں سمندر میں دھکا دلوا رہے ہیں، ہم کمزور ہیں، بے بس ہیں، آپ کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے، لیکن ہم اپنے اللہ سے مدد کی دُعا ضرور کریں گے۔ ہماری دُعا قبول ہوتی ہے یا نہیں، اس بارے میں ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ ویسے اجازت ہو تو ایک بات کہوں۔" شوکی جلدی جلدی بولا۔

"کہو۔ کیا بات ہے۔"

"آپ ہمیں موت کے حوالے کیوں کر رہے ہیں، اپنے وعدے پر کاربند رہیے اور ہمیں ساحل تک جانے دیجیے۔"

"اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ تم ساحل پر جا کر ہمارے بارے

میں کسی کو نہیں بتاؤ گے ۔ تو میں ضرور تم لوگوں کو چھوڑ دیتا ، لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوگا ، اس لیے میں بھی مجبور ہوں۔ ویسے بھی تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جنگل کے اس پار جا کر اپنی زبانیں بند رکھو گے ، اگر یہ بات کہو بھی تو بالکل جھوٹ بولو گے۔"

"نہیں ، ہم یہ نہیں کہہ سکتے ، کیونکہ جھوٹ سے ہمیں نفرت ہے ، ہمارا دین اسلام ہمیں جھوٹ کی اجازت نہیں دیتا۔" شوکی نے منہ بنا کر کہا۔ شوبرا نے اس کی طرف حیرت بھری نظروں سے دیکھا شاید اس کا خیال تھا کہ اپنی جانوں کو بچانے کے لیے وہ ضرور جھوٹ کا سہارا لیں گے ، لیکن شوکی کے الفاظ نے اسے حیران کر دیا۔

"اٹاری ۔ ان لوگوں کو لانچ پر سوار کر کے جزیرے سے بہت دور لے جاؤ ، اس قدر دور کہ یہ لوگ نہ تو تیر کر جزیرے تک آ سکیں اور نہ ساحل تک جا سکیں ۔ اور ایسی جگہ پہنچ کر انہیں دھکا دے دینا ۔ خود ادھر آ جانا۔"

"اوکے سر ! چلو بھئی ۔ لانچ میں سوار ہو جاؤ ۔ اور ہاں ۔ سر میرے ساتھ تین آدمی اور بھیج دیں ۔ ہو سکتا ہے ۔ یہ گڑبڑ کرنے کی کوشش کریں۔"

"ضرور کیوں نہیں ۔ میرے پاس تو بس تم راجر کو چھوڑ دو ۔ باقی سب کو لے جاؤ۔"

"اوکے ۔ ارے ۔ تم لوگ ابھی تک یہیں کے یہیں کھڑے ہو ، میں نے کہا ہے لانچ میں سوار ہو جاؤ۔"

"لانچ میں نہیں ۔ موت کی کشتی میں۔" اشفاق نے منہ بنایا۔

"کیا خیال ہے انکل ۔ کیا کریں ؟"

"ٹھہرو ۔ میں ذرا اپنے تھیلے میں سے جادو کی کتاب نکال کر دیکھ لوں ۔ وہ کیا کہتی ہے۔" منور علی خان بولے۔

"جی ۔ جادو کی کتاب ۔ تو آپ کے تھیلے میں کوئی جادو کی کتاب بھی ہے ۔ پہلے تو آپ نے ذکر نہیں کیا۔" اخلاق حیران ہو کر بولا۔

"موقع ہی نہیں ملا ۔ بتاتا کیسے۔" وہ بولے ۔

اس وقت تک وہ تھیلے میں ہاتھ ڈال چکے تھے ۔

"خبردار ! کہیں یہ تھیلے میں سے کوئی ہتھیار نہ نکال رہا ہو۔" شوبرا چلایا ۔

"ارے ہاں ۔ اس بات کا تو خیال ہی نہیں رہا۔" راجر نے چونک کر کہا اور ان کی طرف جھپٹا ۔

منور علی خان بھی بھڑک کر بھاگے ۔ ان کا رخ جزیرے کی طرف تھا ۔

"ارے ارے انکل ۔ آپ کہاں بھاگے جا رہے ہیں ، ہمیں چھوڑ کر۔" آفتاب بوکھلا اٹھا ۔

"تم بھی آ جاؤ ۔ وہاں ٹھہر کر کیا کرو گے ۔ ہم ساحل سے

جس قدر دُور ہو جائیں، ان لوگوں کے لیے اتنی ہی مُشکل پیدا کریں گے۔" منور علی خان نے چیخ کر کہا۔

"بات تو ٹھیک ہے۔" شوکی بولا اور انھوں نے بھی راجر کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

"یہ۔ یہ کیا؟" انھوں نے شوبرا کی آواز سُنی۔

"بس۔ اب دوڑنے کی ضرورت نہیں۔" اچانک انھوں نے منور علی خان کی آواز سُنی۔

"کیوں انکل۔ اب کیا ہوگیا؟" شوکی بولا۔

"تھیلے میں سے جادو کی کتاب نکال کر پڑھ چکا ہوں۔ کتاب کا کہنا ہے۔ ان لوگوں کا مقابلہ، ہاتھی کا مقابلہ کرنے والے ہتھیار سے کیا جائے۔" وُہ بولے۔

انھوں نے دیکھا۔ اب ان کے ہاتھ میں ایک عجیب سا ہتھیار لٹک رہا تھا۔ وُہ ایک گرز نما ہتھیار تھا، لیکن اس پر چاروں طرف نوک دار سرے اُبھرے ہوئے تھے۔ یہ ہتھیار لوہے کی ایک مضبوط زنجیر میں پرویا گیا تھا اور زنجیر کا دُوسرا سرا اب منور علی خان کی طرف تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے زنجیر کو گھمانا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر راجر ٹھٹکا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ پھر بھنّا کر بولا:

"ہمیں کیا ضرورت ہے، تم لوگوں کو سمندر میں لے جانے

کی۔ ہم تمھیں یہیں کیوں نہ مسل دیں۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک پستول نکال لیا، لیکن اس سے پہلے کہ وُہ پستول کا رُخ منور علی خان کی طرف کرتا۔ پیچھے سے شوکی اس تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ راجر کے ہاتھ پر دے مارا اور پھر خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ آیا۔ تاہم اس کی اس حرکت سے پستول راجر کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ منور علی خان ہتھیار کو بجلی کی سرعت سے گھماتے اس کی طرف بڑھے۔ راجر خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹا۔ اس کے پیچھے آفتاب تھا۔ جو حیرت زدہ انداز میں اس ہتھیار کو دیکھ رہا تھا۔ راجر اور آفتاب ایک دُوسرے سے ٹکرائے اور دھڑام سے گرے۔ راجر نے تلملا کر ایک ہاتھ اس کے مُنہ پر مارا۔

"ارے باپ رے۔ مر گیا۔" آفتاب چلّا اُٹھا۔

"کیا کر رہے ہو۔ صبر سے کام لو۔" اشفاق نے مُنہ بنایا۔

اتنی دیر میں راجر اُٹھ کر شوبرا کی طرف بھاگ کھڑا ہوا تھا، اب منور علی خان دیوانہ وار ان کی طرف بھاگے۔ ساتھ میں وُہ گرز کو بھی گھما رہے تھے:

"کیا کر رہے ہیں۔ ان کی طرف جانے کا کیا فائدہ۔" شوکی چلّا اُٹھا۔

"بھئی میں شکاری آدمی ہوں۔ جاسوس آدمی نہیں۔ تم بتاؤ —
اب کیا کریں؟"

"درختوں کی پناہ لے لیں۔ اگر وہ لوگ ادھر کا رُخ کریں
تو موقع پا کر آپ اپنے اس شاندار ہتھیار سے ان پر حملہ
کر دیں، لیکن اس سے پہلے یہ دیکھ لیجیے گا کہ ان میں سے
کسی کے پاس پستول تو نہیں ہے۔"

"ارے۔ راجر کا پستول بھی تو یہیں کہیں گرا تھا۔" آفتاب نے
چونک کر کہا۔

"ہاں۔ وُہ رہا۔" اخلاق نے کہا اور پستول کی طرف لپکا —
دُوسرے ہی لمحے پستول اس کے ہاتھ میں تھا —

"ارے! یہ تو بالکل ویسا ہی نقلی پستول ہے۔ جیسا بھائی
جان آپ کے پاس پہلے ہی مَوجود ہے۔"

"یہ۔ یہ کیا بات ہوئی۔ ذرا دکھانا تو۔" شوکی بولا۔

شوکی نے پستول ہاتھ میں لیا اور ایک درخت کی طرف نالی
کرکے ٹریگر دبا دیا۔ انھوں نے اس میں سے ایک سوئی نکلتے
دیکھی۔ جو درخت میں جا کر دھنس گئی —

"کمال ہے۔ اُس پستول میں سے بھی ایک عدد سوئی نکلی
تھی۔ اور اِس میں سے بھی۔ آخر یہ لوگ سوئیوں والے پستول کیوں
لیے پھر رہے ہیں۔"

"ارے باپ رے۔" منور علی خان بوکھلا اُٹھے۔

"آپ کو کیا ہوا انکل؟"

"کک۔ کہیں۔ کہیں۔"

"یہ اڑھائی کہیں آپ نے کیوں کہے؟"

"اڑھائی کہیں۔ کیا مطلب۔" منور علی خان حیران ہو کر بولے۔

"آپ نے کہا ہے نا۔ کک۔ کہیں۔ کہیں۔ گن لیجیے۔ یہ
اڑھائی کہیں ہی تو ہیں۔"

"اوہ!" وُہ بے ساختہ مسکرا دیے، پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے
بولے:

"ذرا یہ پستول مجھے دکھانا۔"

شوکی نے پستول ان کی طرف بڑھا دیا۔ انھوں نے پستول
لیا اور درختوں پر نظر ڈالی۔ ایک درخت پر انھیں ایک عجیب
سا پرندہ بیٹھا نظر آیا۔ انھوں نے پستول کی نالی اس کی طرف
کی اور ٹریگر دبا دیا۔ سوئی سیدھی پرندے کے جا لگی۔ دُوسرے
ہی لمحے پرندہ نیچے آ رہا۔ وُہ مر چکا تھا۔ پرندہ کافی بڑا تھا اور
صرف ایک سوئی جسم میں چبھ جانے سے مر نہیں سکتا تھا:

"یہ۔ یہ کیا۔" شوکی ہکلایا۔

"دراصل یہ سوئیاں زہریلی ہیں۔ اگر ہم میں سے کسی کے
جسم میں لگ جاتی تو ہم بھی اس پرندے کی طرح مُردہ ہوتے۔

یہ ہتھیار افریقی باشندوں کا ہے۔" وہ بولے، پھر اچانک ان کے منہ سے چیخنے کے انداز میں نکلا:

"ارے یہ کیا۔"

ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں گویا پھٹ پڑیں۔ شوکی برادرز نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔

○

"اُف خدا۔ یہ کیا ہوا؟"

"یہ ضرور انہی لہروں کی کارستانی ہے۔ جو لانچ کو جزیرے کی طرف کھینچ لاتی ہیں۔" وہ بولے اور فضا میں اُڑتے ہوئے اپنے ہتھیار کی طرف دوڑے۔ ہتھیار کی زنجیر ان کے ہاتھ سے اچانک نکل گئی تھی۔ اور اب وہ جزیرے کے درمیانی حصّے کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔ وہ اس کے پیچھے دوڑے، لیکن گرز کی رفتار بھی کم نہیں تھی۔ ان کے چہرے ہوا ہو رہے تھے۔ یہ جزیرہ بھی عجیب تھا۔ اور پھر ان کے اٹھتے قدم رُک گئے۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ گرز اس عجیب سے ستون سے لگا ہُوا تھا جو جزیرے کے عین درمیان میں کھڑا تھا۔ اس کی زنجیر بھی ستون سے چمٹی ہوئی تھی۔ یہ ستون ان کی سمجھ میں

نہیں آیا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر شوکی پکار اُٹھا:

"تت۔ تت تو یہ ستون ہی کشتی یا لانچ کو کھینچتا ہے۔"

"اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔"

منور علی خان آگے بڑھے۔ شوکی برادرز گھبرا گئے۔

"انکل! ستون کی طرف نہ جائیے۔ نہ جانے یہ کیا بلا ہے؟"

"بھئی اس نے لوہے کو کھینچا ہے۔ ہمیں تو نہیں کھینچ رہا، گھبراؤ نہیں۔"

"جج۔ جی۔ بہتر۔ اگر آپ فرماتے ہیں تو نہیں گھبرائیں گے۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

منور علی خان ستون کے نزدیک پہنچے اور زنجیر کو پکڑ کر کھینچ لینا چاہا، لیکن زنجیر ستون سے ذرا بھی نہ ہٹی۔ انھوں نے پورا زور لگایا، پھر شوکی وغیرہ کو مدد کے لیے اشارہ کیا۔ وہ بھی ڈرتے ڈرتے ان کے نزدیک پہنچے۔ اب سب نے مل کر زنجیر کو ستون سے الگ کرنا چاہا، لیکن ذرا بھی کامیابی نہ ہوئی۔

"بہت مشکل ہے بے وقوفو۔"

ایک درخت پر سے آواز آئی۔ انھوں نے صاف پہچانا۔ آواز راجر کی تھی۔ دُوسرے ہی لمحے راجر نے اُوپر سے چھلانگ لگا دی۔ وہ زیادہ اونچائی پر نہیں تھا:

"آ ۔ آپ ۔ آپ ۔ یعنی کہ آپ اوپر کیا کر رہے ہیں؟"

"تم لوگوں کی بے بسی کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔"

"بہت بہت شکریہ۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"شکریہ ۔ کس بات کا شکریہ۔" وہ حیران ہو کر بولا۔

"اس بات کا کہ آپ ہماری بے بسی کا تماشہ دیکھ رہے تھے، اگر آپ نہ دیکھتے تو ہم آپ کا کیا بگاڑ لیتے۔" آفتاب نے مسمی صورت بنائی۔

"ممکن ۔ دماغ تو نہیں چل گیا۔" شوکی نے بھنا کر کہا۔

"اب تو تم لانچ میں سوار ہو گئے نا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی راجر کے ہاتھ میں ویسا ہی ایک پستول نظر آیا۔

"ارے باپ رے ۔ اس خوفناک پستول کو ذرا پرے ہی رکھیے۔" اشفاق نے کانپ کر کہا۔

"افسوس! اس وقت ہتھیار میرے ہاتھ میں نہیں۔" منور علی خان بولے۔

"اگر ہاتھ میں ہوتا تو تم خود بھی اس مرکز سے پلٹے ہوتے۔"

"مرکز ۔ کیا مطلب ۔ آپ اس ستون کو مرکز کہہ رہے ہیں۔" اخلاق نے حیران ہو کر کہا۔

"کہنے دیں بھئی ۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"وقت نہ ضائع کرو ۔ ہمیں ابھی یہاں بہت کام ہے ۔ تم لوگ

تو یونہی یہاں ٹپک پڑے ۔ آخر کیا ضرورت تھی لانچ میں سوار ہو جانے کی، لیکن نہیں ۔ اس میں تمھارا بھی کیا قصور ۔ تمھاری تو دراصل موت تمھیں آواز دے چکی تھی۔"

"افسوس! ہم نے اس آواز کو نہیں سنا۔" آفتاب بولا۔

"میں کہتا ہوں چلو، ورنہ یہیں کام ختم کر دوں گا ۔ تم لوگوں کی لاشیں سمندر میں پھینکنا ہمارے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہوگا۔" راجر بولا۔

"تب پھر ۔ کیا ضرورت ہے سمندر میں لے جانے کی ۔ یہیں اپنا کام مکمل کر گزرو۔" اخلاق جل کر بولا۔

"نہیں ۔ مسٹر شوبرا کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی۔"

مجبوراً وہ اس کے آگے آگے چلنے لگے ۔ شوبرا اور اس کے ساتھیوں کے نزدیک پہنچے تو ان کے چہرے غصے کی وجہ سے سرخ نظر آئے ۔

"لے جاؤ انھیں ۔ اب یہ کسی رعایت کے حق دار نہیں۔" شوبرا غرایا ۔

"تو پہلے ہی آپ کب ہمارے ساتھ کسی رعایت کا ارادہ رکھتے تھے۔" منور علی خان نے منہ بنایا۔

"چلو۔" اٹاری اور اس کے ساتھیوں نے انھیں دھکیلنا شروع کیا ۔ یہاں تک کہ وہ لانچ کے نزدیک پہنچ گئے ۔

" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم " شوکی نے باآوازِ بلند پڑھا اور لانچ میں سوار ہوگیا۔

" یہ تم نے کیا پڑھا ؟" اٹاری حیران ہو کر بولا۔

" مسلمان جو کام بھی کرتا ہے ، اپنے اللہ کا نام لے کر کرتا ہے۔ ان الفاظ کا مطلب ہے ۔ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔"

" اور جو تمھارے کسی کام آنے والا نہیں ۔" راجر ہنسا۔

" میرے مالک ۔ تو سُن رہا ہے ۔ یہ ہم سے کیا کہہ رہا ہے۔"

" ہا ہا ہا۔" راجر نے قہقہہ لگایا۔

" شوکی ۔ تم لوگوں کو تیرنا آتا ہے ؟" منور علی خان فکرمندانہ انداز میں بولے۔

" جی ۔ جی ۔ بس یونہی کام چلا لیتے ہیں ، مجھے اور مکھن کو غوطہ خوری بھی آتی ہے ۔" شوکی نے کہا۔ منور علی خان مُسکرا دیے۔

" اگر تیرنا آتا بھی ہے تو کیا۔ آخر تم لوگ کب تک تیرو گے ۔ لانچ پوری رفتار سے چلے تو کئی گھنٹے بعد جزیرے پر پہنچتی ہے ۔ تم تیر کر جزیرے یا ساحل تک ہرگز ہرگز نہیں پہنچ سکتے ۔ یہ انسانی طاقت سے باہر ہے۔"

اٹاری کے ساتھ اس کے باقی ساتھی بھی سوار ہو گئے ۔ ساحل پر صرف راجر اور شوبرا رہ گئے ۔ لانچ سمندر کی طرف تیر کی طرح بڑھی،

اور وُہ ساحل کی طرف دیکھتے ہی رہ گئے۔

" اچھا مسٹر شوبرا ۔ پھر ملیں گے ، اگر زندگی رہی۔" شوکی نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

" مجھے سو فیصد اُمید ہے ۔ اب تم لوگوں سے ہرگز مُلاقات نہیں ہو سکے گی۔" شوبرا کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

اور پھر شوبرا اور راجر ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے :

" مسٹر اٹاری ۔ اب تم کیا کہتے ہو ؟" منور علی خان کی آواز اُبھری۔

" کیا مطلب ؟" وُہ چونکا۔

" اگر تم اس لانچ پر ہمیں ساحل تک چھوڑ آؤ تو تمھارا کیا حرج ہے ۔ اس صورت میں میں تمھیں ایک نایاب چیز دوں گا۔"

" نایاب چیز ۔ ظاہر ہے ۔ وُہ تمھارے تھیلے میں ہی ہو گی ۔ تمھیں سمندر میں دھکا دینے کے بعد وُہ نایاب چیز مَیں حاصل کر ہی لوں گا۔ اس لیے مجھے لالچ دینے کی کوشش نہ کرو۔"

" وُہ نایاب چیز بے شک تھیلے میں موجود ہے ، لیکن جب تک میں تمھیں اس کے بارے میں بتا نہیں دوں گا۔ اس وقت تک وُہ کسی کے لیے بھی نایاب ثابت نہیں ہو سکتی۔"

" کیا مطلب ؟" وُہ چونکا۔

" ظاہر میں وُہ ایک بالکل عام سی چیز ہے ، لیکن اس کی حقیقت

سے صرف میں واقف ہوں۔"

"تم مجھے پھسلانے کی کوشش کر رہے ہو، لیکن کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکو گے، کیونکہ تم لوگوں کو زندہ چھوڑ دینے سے ہمارے کام میں بہت رکاوٹ پڑ سکتی ہے ۔ ہمیں ہدایات یہی ہیں کہ کوئی بھی ایسا آدمی جس کا تعلق ہمارے کام سے نہ ہو، ہمارے کام سے باخبر نہ ہو سکے ۔ ان ہدایات کی روشنی میں ہم تم لوگوں کو زندہ چھوڑ ہی نہیں سکتے۔"

"اچھا ۔ جیسے تمھاری مرضی ۔ اب ہمیں اپنے اللہ کو یاد کرنے دو۔"

"ہاں ضرور ۔ پکارو اس خدا کو ۔ جو تمھاری مدد کو نہیں آ سکتا۔"

"وہ سب کچھ کر سکتا ہے مسٹر اٹاری ۔ سب کچھ۔" شوکی بولا۔

"مجھے تو یقین نہیں ۔ ایک فیصد بھی اُمید نہیں کہ تم بچ جاؤ گے ۔ سمندر اس جگہ سے یوں بھی بہت خوفناک ہے اور خوفناک بلاؤں سے بھرا پڑا ہے ۔ اس جگہ سے تو اچھے اچھے جہاز ران بھی گزرتے ہوئے ڈرتے ہیں ۔ اور پھر اب تو جزیرے پر ہمارا قبضہ ہے اور ہم نے اس پر آلات نصب کر دیے ہیں، ان حالات میں تو آس پاس کا علاقہ اور بھی خراب ہو گیا ہے۔" اس نے جلدی جلدی کہا۔

"آخر تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"بہت ضروری کام۔" وہ بولا۔

"اس لانچ کو ساحل پر یہ تجربہ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ ساحل کی طرف سے جزیرے کی طرف خود بخود آتی ہے یا نہیں ۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔" شوکی نے کہا۔

"ہاں بالکل ٹھیک ۔ ہم اپنے آلات کی چیکنگ کر رہے تھے۔" اس نے کہا۔

"کیا یہ چیکنگ کسی خاص مقصد کے تحت کی جا رہی تھی؟"

"یہی سمجھ لو ۔" وہ بولا۔

"تم ہمیں کچھ نہیں بتانا چاہتے ۔ حالانکہ تمھیں سو فیصد یقین ہے کہ اب ہماری زندگیاں چند گھڑیوں کی رہ گئی ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے، لیکن بتانے کا فائدہ بھی کیا ۔ مرنے کے بعد تم ان باتوں سے کیا فائدہ اُٹھا سکو گے۔"

"مرنے کے بعد تو واقعی ان معلومات سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا ۔ مرنے کے بعد تو بس اچھے اعمال ہی فائدہ دے سکتے ہیں۔" اشفاق نے منہ بنایا۔

"تم گھما پھرا کر بات کو اپنے مذہب پر ہی کیوں لے آتے ہو؟"

"اس لیے کہ شاید اللہ تعالیٰ تمھارے خیالات کو بدل دے ۔ اور تم ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاؤ۔"

" اِس خیال کو دِل سے نکال دو۔" اٹاری ہنسا۔

" جی اچھا۔ فکر نہ کریں۔ نکال دیں گے۔" آفتاب نے کہا۔

لانچ کا سفر جاری رہا۔ اور آخر وہ جزیرے اور ساحل کے عین درمیان میں پہنچ گئے۔ یہ اندازہ اٹاری نے گھڑی دیکھ کر لگایا تھا:

" لو بھئی۔ ہم وسط میں پہنچ گئے۔ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

منور علی خان نے ان کی طرف دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں ویسے ہی پستول تھے۔ گویا وہ کوئی حرکت کرنے کی کوشش کرتے تو زہر کی سوئیوں کا شکار بننا پڑتا۔ اس صورت میں موت یقینی تھی، لیکن سمندر میں کود پڑنے کی صورت میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

" تم میں سے پہلے صرف ایک چھلانگ لگائے گا۔ اس کے بعد دُوسرا، پھر تیسرا اور چوتھا۔ سمجھ گئے۔ اے مسٹر اپنا تھیلا لانچ میں ہی چھوڑو۔ تم سمندر میں اس کا کیا کرو گے۔" اٹاری نے سرد آواز میں کہا۔

" بہت بہتر۔" انھوں نے کہا اور تھیلا نیچے گرا دیا۔

" شوکی۔ پہلے تم کودو۔" منور علی خان بولے۔

" ج۔ جی کیا فرمایا۔ پہلے میں کودوں۔" شوکی کانپ اُٹھا۔

" ہاں۔ بالکل۔"

" بہت اچھا۔ خدا حافظ۔" شوکی نے کہا اور چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہو گیا۔

" ٹھہریے بھائی جان۔ پہلے مَیں چھلانگ لگاؤں گا۔" آفتاب بول پڑا۔

" نہیں۔ پہلے مَیں۔" اخلاق نے کہا۔

" تم تو یونہی مَیں مَیں کرتے رہو گے۔" اشفاق نے کہا اور سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

" ارے ارے۔ یہ کیا کیا۔" شوکی بول اُٹھا، پھر ساتھ ہی خُود بھی چھلانگ لگا دی۔ اخلاق اور آفتاب نے بھی دیر نہ لگائی۔ اسی وقت منور علی خان بجلی کی سرعت سے جھکے اور تھیلا اٹھاتے ہوئے اٹاری کو زور دار دھکّا دیا اور خود بھی سمندر میں کود پڑے۔ اٹاری نے سنبھلنے کی پوری کوشش کی، لیکن سنبھل نہ سکا۔ اور چھپاک کر کے سمندر میں گرا۔ منور علی خان اُس وقت تک ابھر کر سطح پر آ چکے تھے۔ انھوں نے اٹاری کے ایک مُکّا رسید کیا۔ وہ پہلے ہی نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ مُکّے کی وجہ سے اور بھی تیزی سے چلا۔ ادھر لانچ پر موجود اٹاری کے ساتھی گھبرا گئے۔

" ارے۔ یہ کیا ہوا؟"

منور علی خان اب تیر رہے تھے۔ تھیلا وہ کندھے سے لٹکا
چکے تھے۔ شوکی برادرز بھی جیسے تیسے کرکے تیر رہے تھے۔ اُلٹے
سیدھے ہاتھ مار رہے تھے۔

"مسٹر اٹاری۔ اب ہم کیا کریں؟" اس کا ایک ساتھی چلّایا۔
اسی وقت وُہ سطح پر اُبھرا تھا۔

"مجھے۔ مجھے۔ لانچ پر سوار کر لو۔" وُہ گھبرائے ہوئے لہجے
میں بولا۔

"آئیے۔ لانچ کی طرف آنے کی کوشش کیجیے۔" ایک ساتھی
نے نیچے جھکتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ کیا۔ یہ میری ٹانگ سے کیا چیز آ چمٹی۔" اٹاری نے
خوف زدہ آواز میں کہا۔

دُوسرے ہی لمحے وُہ پانی میں نیچے کی طرف چلا۔

"ایک آنکڑا۔ اسی لیے تو میں تھیلا ساتھ لے آیا تھا۔ میں
اس آنکڑے سے ہمیشہ ریچھوں کو پھانستا ہوں۔ اس کا وزن کافی
ہے۔ اس لیے۔ یہ تمھیں سیدھا سمندر کی تہہ میں لے جائے
گا۔ وہاں تم مزے سے رہو گے۔ تم نے دیکھا۔ ہم سے پہلے تم
مر رہے ہو۔ یہ ہے خُدا تعالیٰ کی شان۔"

"بب۔ بب۔ بچاؤ۔ بچاؤ۔" اٹاری کا پورا دھڑ اس وقت
تک پانی میں جا چکا تھا۔ صرف سر نظر آ رہا تھا۔ وُہ پوری قوت

سے چلّایا۔

"افسوس مسٹر اٹاری۔ اب ہم کیا کریں۔ تمھارے لیے کیا کر سکتے
ہیں۔ یُوں بھی۔ اگر تم مر گئے۔ تو تمھاری جگہ مجھے مل جائے
گی؛ گویا میری ترقی ہو جائے گی۔" اس کے ساتھی نے خوش
ہو کر کہا۔

اٹاری کی آنکھوں میں آخری بار نفرت کے شعلے چمکے اور
پھر اس کا چہرہ غائب ہو گیا۔

"اب ہمیں رُک کر ان لوگوں سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔
مسٹر شوبرا کا حکم پورا ہو چکا ہے"

ان الفاظ کے ساتھ ہی لانچ جزیرے کی طرف مڑ گئی۔ اسی وقت
منور علی خان نے کوئی چیز کھینچ کر لانچ پر دے ماری، لیکن ان کا
وار اوچھا پڑا۔ یہ کوئی آنکڑہ تھا، اگر لانچ پر جا گرتا تو وُہ
اسے آگے نہ جانے دیتے۔ اور ان لوگوں کو بھی ساتھ ہی لے
ڈوبتے؛ تاہم انھوں نے اٹاری کو تو جہنم میں پہنچا ہی دیا تھا،
لانچ لمحہ بہ لمحہ دُور ہوتی چلی گئی۔ اب انھوں نے شوکی برادرز
کی طرف دیکھا۔

"اوہو بھئی۔ ہمت کرو۔ اس طرح کام کیسے چلے گا۔" وُہ
بولے، کیونکہ ان چاروں کی حالت پتلی تھی۔

"اب ہمت کرکے کیا کریں گے انکل؟" شوکی اُداس انداز

میں مسکرایا۔

"یہ بات تو ٹھیک نہیں۔ ہمیں آخر دم تک ہاتھ پیر مارتے رہنا چاہیے۔ مایوسی کو پاس نہیں پھٹکنے دینا چاہیے۔" منور علی خان بولے۔

"آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا انکل۔ اللہ تعالیٰ اب بھی ہمیں بچا سکتے ہیں۔" اشفاق نے کہا۔

"ہاں! اس میں کیا شک ہے۔"

وہ جیسے تیسے تیرتے رہے۔ انھوں نے اپنے رُخ ساحل کی طرف کر لیے تھے، کیونکہ اس جزیرے کی طرف جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس تک اگر وہ پہنچ بھی جاتے تو بھی موت ہی پلے پڑتی۔ ساحل پر ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا، لیکن سوال تو یہ تھا کہ وہ ساحل تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں ۔۔ کیونکہ دشمنوں کا خیال تو یہ تھا کہ وہ تیر کر ساحل تک نہیں پہنچ سکتے۔

"کیا خیال ہے انکل۔ کیا ہم ساحل تک پہنچ سکیں گے؟"

"کم از کم میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ پہنچ جاؤں گا، لیکن اس صورت میں جب کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ ساتھ تیرنے کی بجائے پوری رفتار سے تیرنا شروع کر دوں، کیونکہ میں آٹھ نو گھنٹے مسلسل تیرنے کا تجربہ رکھتا ہوں۔ آپ لوگوں کی وجہ

سے مجھے بہت آہستہ تیرنا پڑ رہا ہے، لیکن۔ مایوس میں ان حالات میں بھی نہیں۔" انھوں نے کہا۔

"تب تو انکل۔ آپ اپنی رفتار سے ساحل کی طرف چل پڑیے، ہماری وجہ سے آپ اپنی زندگی خطرے میں نہ ڈالیں۔" شوکی نے جذبات سے لبریز آواز میں کہا۔

"یہ۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔" منور علی خان بولے۔

"جی۔ کیا مطلب۔ ہو کیوں نہیں سکتا۔ یہ کیا مشکل ہے۔"

"میں آپ لوگوں کو اپنے ساتھ اس مہم پر لایا تھا۔ آپ تو اچھے بھلے اپنے دفتر میں بیٹھے تھے۔ اب میں آپ کو سمندر کی بے رحم موجوں میں گھرا چھوڑ کر کیسے چل دوں۔ زندہ رہیں گے تو ہم پانچوں، ورنہ پانچوں ہی مریں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ یہ بھی تو ضروری نہیں کہ ہم ساحل کی طرف ہی بڑھ رہے ہوں، یہ تو صرف ہمارا اندازہ ہے، ہو سکتا ہے ہم ساحل سے دور ہوتے جا رہے ہوں۔"

"لیکن انکل۔ خودکشی حرام ہے۔ آپ اگر اپنی زندگی بچا سکتے ہیں تو آپ کو بچانی چاہیے۔"

"نہیں۔ یہ خودکشی نہیں۔ ہم نے سمندر میں خود چھلانگ نہیں لگائی۔ دشمن نے دھکیلا ہے۔ آپ میرے ساتھی ہیں، میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتا۔ ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو بچا سکوں۔

کوئی جزیرہ ہی ہمارے راستے میں آ جائے اور وہاں آپ میری میزبانی محسوس کریں۔ اس لیے میں رفتار نہیں بڑھاؤں گا۔ رفتار ہی بڑھائی ہے تو آپ لوگ اپنی بڑھائیں۔" انھوں نے روانی کے عالم میں کہا۔

"ہم تو پہلے ہی بڑھائے ہوئے ہیں۔" شوکی نے کہا۔

"آہا۔ وہ دیکھیے۔ وہ کیا چیز چلی آ رہی ہے۔" ایسے میں آفتاب چلّا اُٹھا۔

عرشے پر

آفتاب، آصف اور فرحت نے محسوس کیا کہ کشتیاں ایک سمت کی طرف بڑھ رہی ہیں، ان کا اور جہاز کا درمیانی فاصلہ برابر بڑھ رہا ہے۔

"یہ کیا۔ یہ کشتیوں والے کوئی چال تو چلنے کے موڈ میں نہیں۔" فرحت نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"جہاز سے پیچھے ہٹ کر وہ بھلا کیا چال چلیں گے، ہاں نزدیک ہو کر کوئی چال چلی بھی جا سکتی ہے۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"پہلے کشتیاں جہاز کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ اب ایک سمت میں بڑھ رہی ہیں؛ اگرچہ جہاز کا رُخ بھی اسی سمت میں ہے۔ ان حالات میں تو کشتیوں کو رُک جانا چاہیے۔ جہاز تو ان کی طرف ہی جا رہا ہے۔" آصف نے کہا۔

"ہاں؛ تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ ضرور کوئی چال چلنے کے موڈ میں ہیں۔ لو۔ اب تو درمیانی فاصلہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ان

کی چلائی ہوئی گولیاں پانی میں گر رہی ہیں۔ آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔" فرحت بولی۔ اسی وقت ایک کشتی سے سام لٹ کی آواز اُبھری:

"یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو۔ کس سمت میں چل پڑے ہو، جہاز کی طرف بڑھو۔"

جواب میں اس سے پتا نہیں کیا کہا گیا۔ وُہ سن نہیں سکے، لیکن کشتیوں کا رُخ پھر بھی جہاز کی طرف ہوتا محسوس نہیں ہوا۔ انھوں نے پھر سام لٹ کی چیختی آواز سنی:

"تم لوگوں نے سُنا نہیں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ جہاز کی طرف بڑھو۔"

عین اسی وقت نصیر بیگ تیزی سے ان کی طرف بڑھا:

"آپ۔ آپ کو۔ آپ کو کپتان صاحب بلا رہے ہیں۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"کیوں۔ خیر تو ہے۔ اب تو ہم ان کی گولیوں کی زد سے باہر ہیں۔" آصف بولا۔

"جی ہاں، لیکن کوئی اور بات ہے۔ جلدی چلیے۔"

"اچھی بات ہے۔ آپ یہیں موجود رہیے۔ ہم ابھی خطرے سے باہر نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی گہری چال ہو۔ اور یہ صرف دکھاوا ہو۔" آفتاب نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"مسٹر جالب۔ آپ بھی یہیں ٹھہریے۔"

"ہوں۔ تم لوگ جاؤ۔ دیر نہ کرو۔"

وُہ تیزی سے چلتے انجن روم کی طرف آئے۔ انھیں دیکھ کر عبداللہ جانی نے دروازہ کھول دیا اور وہ اندر داخل ہو گئے:

"آپ لوگوں نے کچھ محسوس کیا؟" کپتان عالم جاہ بولا۔

"ہاں۔ یہ کہ کشتیاں جہاز سے پیچھے ہٹتی جا رہی ہیں۔"

"جی ہاں۔ پہلے کشتیاں جہاز کے چاروں طرف تھیں، لیکن اب صرف ایک طرف ہیں اور دُور ہی دُور ہوتی جا رہی ہیں۔ ان حالات میں اگر میں جہاز کو روک دوں۔ تو یہ ہم سے دُور نکل جائیں گے۔" عالم جاہ بولا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ تو پھر۔ آپ روک کیوں نہیں دیتے۔ یوں بھی اس جگہ سے ہم آگے نہیں جا سکتے۔ ابا جان سمندر کے نیچے سول دشمنوں سے اُلجھے ہوتے ہیں۔ کیا خبر وُہ کب سطح پر اُبھر آئیں۔"

"ہاں۔ بات تو ٹھیک ہے۔ یہی سوچ کر ہم نے جہاز کو روکنے کی کوشش کی تھی، لیکن ہم کامیاب نہیں ہو سکے۔" عالم جاہ نے کہا۔

"جی! کیا مطلب۔ آپ نے روکنے کی کوشش کی تھی اور آپ

کامیاب نہیں ہو سکے۔ یہ کیا بات ہوئی۔ کیا جہاز میں کوئی خرابی ہو گئی ہے" آصف نے بوکھلا کر کہا۔

" نہیں۔ جہاز کی ہر چیز بالکل درست ہے۔ ہم چیک کر چکے ہیں، لیکن جہاز ان کشتیوں کی سمت میں ہی چل رہا ہے۔ پہلے ہم نے اسے روکنے کی کوشش کی، پھر دائیں بائیں اور پیچھے موڑنے کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ بس صرف ایک سمت میں جا سکتا ہے۔ یعنی کشتیوں کی طرف۔ یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ ایسا کیوں ہے۔"

" اُف۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں" آصف نے کانپ کر کہا۔

" کشتیاں چونکہ جہاز کی نسبت ہلکی ہیں، اس لیے وہ اس سمت میں زیادہ تیزی سے جا رہی ہیں۔ جہاز نسبتاً آہستہ جا رہا ہے۔ لیکن جا ایک ہی سمت میں رہے ہیں۔ ہم نے صاف دیکھا ہے کہ کشتیوں کے ڈرائیوروں نے بھی ان کے رُخ تبدیل کرنے یا ان کو روکنے کی بہت کوشش کی تھی، لیکن کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ ان حالات میں آپ کیا کہتے ہیں۔"

" کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کوئی نظر نہ آنے والی طاقت کشتیوں اور جہاز کو ایک خاص سمت میں کھینچ رہی ہے اور آپ کی کوشش کے باوجود اپنا رُخ تبدیل نہیں کر پا رہے" فرحت بولی۔

" جی ہاں۔ بالکل یہی بات ہے۔"

" تب پھر آپ انجن بند کر دیں۔ ہمیں یہاں سے اس وقت تک آگے نہیں بڑھنا جب تک ہمارے ابا جان اُوپر نہ آ جائیں۔" آفتاب جلدی جلدی بولا۔

" اوہ ہاں۔ یہ کام میں نے اب تک نہیں کیا۔ خیر میں یہ بھی کر دیکھتا ہوں۔"

عالم جاہ نے کہا اور پھر انجن بند کر دیا گیا۔ لنگر ڈال دیے گئے، لیکن جہاز کے اس سمت میں بڑھنے میں کوئی فرق نہ آیا:

" اُف خدا۔ یہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ تو کوئی بہت ہی خوفناک بات ہے۔" آفتاب بڑبڑایا۔

" آؤ۔ عرشے پر چل کر حالات کا جائزہ لیں۔ کشتیاں اب کہاں ہیں۔" آصف بولا۔

تینوں باہر نکلے۔ اور باقی لوگوں کے پاس آئے۔ اسی وقت اُنھوں نے سام لٹ کی چیختی آواز سُنی:

" تو پھر کشتیوں کے انجن بند کر دو۔"

" انجن بند کرنے سے بھی کچھ نہیں ہوگا مسٹر سام لٹ۔ ہم کسی شیطانی چکر میں پھنس چکے ہیں۔" آفتاب بلند آواز میں بولا۔

" کک۔ کیا مطلب؟"

" ہم نے بھی جہاز کا رُخ تبدیل کرنے کی بہت کوشش کی ہے، لیکن کر نہیں سکے۔ انجن بھی بند کر کے دیکھ چکے ہیں۔"

" اُف ۔ یہ میں کیا سُن رہا ہوں ۔ ہم کسی شیطانی چکر میں پھنس چکے ہیں ۔ نہیں نہیں ۔ ہم اس چکر میں نہیں پھنسیں گے ۔ ہمیں ہر حال میں اس جہاز کو لوٹنا ہے ۔ ساتھیو ۔ کشتیوں کو چھوڑ دو اور تیر کر جہاز پر سوار ہو جاؤ ۔" سام لٹ نے حکم دیا۔

اس کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی ۔ اور وُہ سب لوگ جہاز کی طرف تیرنے لگے ۔ خالی ہونے کے بعد بھی کشتیاں اسی سمت میں چلتی رہیں ۔

" لیکن مسٹر سام لٹ ۔ ان حالات میں آپ جہاز کو کس طرح لوٹ سکتے ہیں ۔ جب تک جہاز کا اس سمت میں چلنا نہیں رُک جاتا ؟" آفتاب نے حیران ہو کر پُوچھا۔

" پروا نہیں ۔ ہم اس جہاز پر تو سوار ہوں گے نا ۔ کشتیاں تو ہمیں جہاز سے دُور لے جا رہی تھیں ۔"

" ہوں ۔ اچھا تو پھر آؤ ۔" آصف نے کہا اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا :

" کچھ بھی ہو ۔ یہ لوگ جہاز پر سوار نہ ہونے پائیں ۔ ان کی تعداد کافی ہے ، لیکن یہ پانی میں ہیں ۔ ہم انھیں نشانہ بنا سکتے ہیں ۔"

" بالکل ٹھیک ۔" جالب نیاز نے چلّا کر کہا۔

جونہی وُہ لوگ ان کی زد پر آئے ۔ انھوں نے فائرنگ

شروع کر دی ۔ پہلی ہی باڑھ میں کئی دشمن مارے گئے ، لیکن باقیوں نے آگے بڑھنا جاری رکھا ۔ شاید ان پر جنون سوار تھا ۔ دُوسری باڑھ ماری گئی ۔ ان میں سے کئی غوطہ لگا گئے اور کئی مارے گئے :

" شاباش ساتھیو ۔ ہم بہت جلد اِن کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے ۔"

" سام لٹ نظر نہیں آ رہا ۔" فرحت نے پریشان ہو کر کہا۔

" غوطہ لگا گیا ہو گا ۔ ابھی اُوپر آ جائے گا ۔" آصف نے کہا ۔

" نہیں ۔ غوطہ لگانے سے پہلے بھی میں نے اسے نہیں دیکھا ۔" فرحت نے کہا۔

" اچھا ، نہیں دیکھا ہو گا ۔ تمھیں اس کی کیا فکر پڑ گئی ۔"

" وُہ خطرناک دُشمن ہے ۔ ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے ۔"

" اور اللہ کی مہربانی سے ہم ہوشیار ہیں ۔ بس مجھے ابّا جان کی فکر کھائے جا رہی ہے ۔"

" ہاں ۔ ہم اس جگہ سے دُور بھی تو بہت نکل آئے ہیں ۔ وُہ ان لوگوں سے وہیں کہیں لڑ رہے ہوں گے ۔"

" اللہ مالک ہے ۔ ہمارا جہاز اس شیطانی چکر سے اگر آزاد ہو جائے تو پھر ہم آسانی سے ان کے پاس پہنچ سکتے ہیں ۔"

اس وقت ایک بار پھر فائرنگ کی گئی ۔ اور پھر فرحت کی

آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے کہا:

"دیکھا! میں نہ کہتی تھی — سام لٹ نظر نہیں آ رہا — وُہ جہاز کی سیڑھی تک پہنچ چکا ہے۔ اور اب اُوپر آنے کی تیاری کر رہا ہے۔" فرحت نے یہ الفاظ نیچے کی طرف جھک کر کہے۔ اب چونکہ دشمنوں کی طرف سے فائرنگ نہیں ہو رہی تھی، اس لیے اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

"تو آنے دو — جونہی وُہ اُوپر آئے گا — گولی کا نشانہ بن جائے گا۔" آصف نے جھنّا کر کہا۔

"اور اگر ہم اسے نشانہ نہ بنا سکے تو۔" فرحت بولی۔

"کیا مطلب — بھلا نشانہ کیوں نہ بنا سکیں گے؟"

"سام لٹ کوئی معمولی آدمی نہیں — اسے بھی یہ معلوم ہے کہ اوپر سے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو سکتی ہے، اس کے باوجود وُہ پھر بھی آ رہا ہے — آخر کیوں — انکل کو بھی دیکھ کر چونکا تھا، گویا انھیں جانتا ہے۔" فرحت نے حیران ہو کر کہا۔

"ہوں — بات تو فرحت کی ٹھیک ہے، لیکن پھر ہم کیا کریں؟"

"اس کی طرف سے پوری طرح ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

"اچھا — اسے آنے دو، پھر دیکھیں گے۔"

"کیوں نہ ہم کوئی فائر کر کے دیکھ لیں — وقت سے پہلے ہی

معلوم ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے — میں اس کا نشانہ لے کر فائر کرتا ہوں۔" آفتاب نے کہا اور پستول لے کر ریلنگ پر جھک گیا۔ اس پر گولی چلانے کے لیے ضروری تھا کہ آدھے دھڑ سے جھکا جائے۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" نصیر بیگ چلا اُٹھا۔

"ایک دشمن جہاز کی سیڑھی تک پہنچ گیا ہے — اسے نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا ہوں — یہی ان لوگوں کا سرغنہ ہے، اگر یہ مارا گیا تو باقی فوراً حوصلہ ہار جائیں گے۔"

"لیکن اس جگہ سے فائر کرنا خطرناک ہے — آپ پر بھی فائر ہو سکتا ہے۔"

"جب سے ان لوگوں نے کشتیوں سے چھلانگیں لگائی ہیں، ایک بھی فائر نہیں کیا — اب یہ بچارے کیا فائر کریں گے۔" آفتاب نے کہا اور فائر جھونک مارا — اس کی گولی سام لٹ کے پیٹ سے ٹکرائی، لیکن وُہ سیڑھی سے نیچے گرتا نظر نہ آیا — بلکہ اس نے سر اوپر اُٹھا کر دیکھا، مسکرایا اور پھر سر نیچے جھکا لیا، ساتھ ہی اس نے کہا:

"آ رہا ہوں — بیٹے آ رہا ہوں — فکر نہ کرو — سب حساب چکا دوں گا۔"

اس کی آواز انتہائی سنسنی خیز تھی — آصف نے اپنے جسم

میں کپکپی محسوس کی ۔

" ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے اسے اپنے اوپر چڑھ آنے کا پوری طرح یقین ہو ۔" فرحت بولی ۔

" ہاں ۔ یہی محسوس ہوتا ہے ۔" آصف بڑبڑایا ۔

" اسی لیے میں فکر مند تھی ۔"

" تمہارا کیا ہے ۔ تم بات بے بات فکر مند ہونے لگتی ہو ۔ کبھی کبھی تو میں سوچا کرتا ہوں ۔ کہیں تم نے فکر مند ہونے کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا ۔" آفتاب نے بُرا سا منہ بنایا ۔

" تمام دشمنوں کا قریب قریب خاتمہ ہو گیا ہے ۔ شاید ہی کوئی بچا ہو گا ۔ وہ بھی سمندر کی نذر ہو جائے گا ۔" نصیر بیگ نے گویا اعلان کیا ۔

" لیکن ان کا گرو ابھی زندہ ہے اور اوپر چلا آ رہا ہے ۔"

" تو کیا ہوا ۔ ہم اسے پھر نیچے دھکیل دیں گے ۔" نصیر بیگ بولا ، پھر چونک اٹھا :

" لو ۔ یہ تو آ ہی گیا ۔" یہ کہتے ہی اس نے ایک مکا سام لٹ کے جبڑے پر دیا ۔ وہ تیزی سے ایک طرف جھک گیا ، اس کا ہاتھ نصیر بیگ کی کلائی پر پڑا ، ساتھ ہی اسے ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ گویا فضا میں اڑتا ہوا پانی میں جا گرا ۔ اس کے منہ سے ایک چیخ بھی نکلی تھی ۔

وہ سکتے میں آ گئے ۔ یہ غلطی خود نصیر بیگ کی تھی ، اس نے دشمن کو حقیر سمجھا تھا ، اس کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا تھا ۔ ان کا سکتے میں آنا بھی سام لٹ کے حق میں گیا ۔ وہ اچک کر جہاز کے عرشے پر آ گرا ۔ اور گرتے ہی اٹھا ۔ اس کے سامنے جالب نیاز آ گیا ۔ جالب نیاز کی ٹھوڑی پر ایک مکا لگا ۔ وہ دوسری طرف الٹ گیا ۔ اب ریلنگ سے چپکے ہوئے جالب نیاز کے ساتھی مل کر اس پر حملہ آور ہوئے ۔ یہ حملہ اندھا دھند انداز میں اور غصے میں آ کر کیا گیا تھا ۔ نتیجہ یہ کہ آن کی آن میں سام لٹ نے انھیں چکرا کر رکھ دیا ۔ ان پر تابڑ توڑ قسم کے مکے پڑے ۔ ادھر ان کے اکثر مکے خالی گئے ۔ یہ لڑائی پانچ منٹ سے زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکی ۔ پانچ منٹ بعد کوئی اپنی پنڈلی پکڑے بیٹھا تھا ۔ تو کوئی ٹھوڑی ۔ اس لڑائی میں البتہ آفتاب ، آصف اور فرحت نے حصہ نہیں لیا تھا ۔ وہ ایک طرف الگ تھلگ کھڑے رہے تھے ۔ جب سام لٹ کے آس پاس کوئی نہ رہا ، تو تینوں ایک ایک قدم اٹھاتے اس کی طرف بڑھے ۔ آصف نے پُر سکون آواز میں کہا :

" ابھی ہم باقی ہیں مسٹر سام لٹ ۔"

اس نے نظریں اوپر اٹھائیں ، دھیمے انداز میں مسکرایا اور بولا :

" تم ۔ تم بہت چالاک ہو۔ اس لڑائی سے بالکل الگ رہے ۔ خیر آؤ ۔ تم بھی آؤ ۔ ابھی میں تھکا نہیں۔ تم سے نبٹنے کے بعد کپتان صاجبان سے نبٹوں گا ۔ جو انجن روم میں بیٹھے یہ سارا نظارہ کر رہے ہیں۔"

" لیکن مسٹر سام لٹ ۔ اس کے بعد تم کیا کرو گے ۔ اس جہاز کو کس طرح روکو گے؟" فرحت نے شوخ آواز میں کہا۔

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے ۔ چند لمحے تک وہ انھیں گھورتا رہا پھر بولا :

" یہ اُلجھن بھی ہے ، لیکن اس اُلجھن کی طرف میں بعد میں توجہ دوں گا ۔"

یہ کہہ کر وُہ ان کی طرف جھپٹ پڑا ۔ وُہ بھڑک کر پیچھے ہٹ گئے ۔ اور تین سمتوں میں ہٹ گئے ۔ اب سام لٹ ایک وقت میں ان میں سے ایک پر حملہ کر سکتا تھا ۔ اس کے سامنے آصف تھا ؛ چنانچہ وُہ آصف پر ہی حملہ آور ہوا ۔ آصف نے اسے ایک جھکائی دی اور اس کے مُکے کی زد سے نکلتا چلا گیا ۔

اس منظر نے شکست کھانے والوں کی آنکھیں کھول دیں ۔ وُہ حیرت زدہ انداز میں یہ لڑائی دیکھنے لگے ۔ انھوں نے جلد بازی میں مار کھا لی تھی ۔ جب کہ آفتاب ، آصف اور فرحت بہت جم کر لڑ رہے تھے ۔ اس وقت تک آصف اور فرحت سام لٹ کی طرف بڑھ چکے تھے ۔ جونہی وُہ دوبارہ آصف پر جھپٹا ۔

آفتاب نے سر کی ایک ٹکر اس کی کمر پر رسید کر دی۔ وُہ لڑکھڑایا، فرحت نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی ٹانگوں میں ٹانگ اڑا دی۔ نتیجہ یہ کہ دھڑام سے گرا ۔ آصف نے وقت ضائع نہ کیا اور جھپٹ کر اس کی ایک ٹانگ پکڑ لی ۔ اور اسے گھما ڈالا۔ اس نے چکر کھانے سے بچنے کی پوری کوشش کی اور اس کوشش میں جہاز کا ایک مستول اس کے ہاتھ سے ٹکرا گیا۔ اس کا ہاتھ مستول پر جم کر رہ گیا اور جسم مستول سے لپٹتا چلا گیا۔ آصف نے اس کی ٹانگ اب بھی نہ چھوڑی ۔ اتنے میں آفتاب اس کی دُوسری ٹانگ پر قابو پا چکا تھا ۔ فرحت نے یہ دیکھا تو پاؤں کی ایک ٹھوکر اس کے سر پر ماری۔ سام لٹ کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی ۔ فرحت نے ایک ٹھوکر پر ہی بس نہیں کی۔ پے در پے وار کرتی چلی گئی ۔ سام لٹ کے مُنہ سے نکلنے والی چیخیں بلند ہوتی گئیں یہاں تک کہ وُہ ساکت ہو گیا۔ جالب نیاز ، اس کے ساتھیوں اور کپتان صاجبان کی حیرت کا کیا ٹھکانا۔ انھوں نے مل کر فوراً ہی اس کو باندھ دیا ۔

" اب ۔ اب ہم کیا کریں ۔ جہاز ہمارے کنٹرول میں نہیں ہے، ایک خاص سمت میں جا رہا ہے ۔ ابّا جان کو ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں ۔ فرض کیا انھوں نے پانی کے اندر دشمنوں کو شکست دے دی ۔ اور اس کے بعد سطح سمندر پر ابھرے تو ان کے احساسات

کیا ہوں گے۔ وُہ اپنے چاروں طرف سمندر ہی سمندر پائیں گے۔۔
اور سوچیں گے۔ ہم نے ان کے ساتھ یہ کیا کیا۔ انھیں ساتھ لے
جانے کے لیے وہیں ٹھہرنے کی کوشش بھی نہ کی۔" آفتاب جذباتی آواز
میں کہتا چلا گیا۔

"ہاں! یہ بہت سنگین معاملہ ہے، لیکن ہم بالکل مجبور اور
بے بس ہیں، یہ بات سمجھ میں آ ہی نہیں سکی کہ جہاز کنٹرول میں
کیوں نہیں رہا، وُہ کشتیاں کنٹرول سے باہر کیوں ہوگئیں۔ وُہ
تو اب نظر بھی نہیں آ رہیں۔ اس سمت میں ان کے بڑھنے کی
رفتار جہاز کی نسبت زیادہ تیز تھی۔"

"ان حالات میں ہم اس سمت میں بڑھتے رہنے کے سوا کر ہی
کیا سکتے ہیں، جہاز کو چھوڑ کر سمندر میں چھلانگیں لگانے کا بھی کوئی
فائدہ نہیں، اس طرح بھی ہم موت کے مُنہ میں جائیں گے۔ اور
جہاز پر لدی ہوئی چیز بھی اپنے وطن تک نہیں لے جا سکیں گے۔"
جالب نیاز نے کہا۔

"افسوس! کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا۔ اس قدر پیچیدہ
صورتِ حال سے شاید پہلی بار سابقہ پڑا ہے۔" کپتان عالم جاہ نے
کہا۔ اب سب لوگ ایک جگہ جمع ہو چکے تھے۔ انجن روم میں ٹھہرنے
کی ضرورت اس لیے نہیں رہ گئی تھی کہ اب جہاز انجن کے سر
پر تو چل ہی نہیں رہا تھا۔

"گویا فیصلہ یہ ہُوا کہ ہم جہاز پر ہی رہیں گے۔ جہاز کہاں جاتا
ہے۔ وہاں جانے کے بعد کیا ہوتا ہے، یہ بعد میں دیکھا جائے
گا۔" عبداللہ جانی بولا۔

"ل۔ لیکن۔ ہم کیا کریں؟" آفتاب بے قرار ہو کر بولا۔

"آفتاب۔ تم جو کہو۔ ہم کرنے کے لیے تیار ہیں، اگر تم سمندر
میں چھلانگ لگا کر اس سمت میں جانا پسند کرو جہاں انکل نے غوطہ
لگایا تھا، تو ہم تمھارا ساتھ دیں گے۔" آصف بولا۔

"لیکن۔ خودکشی حرام ہے۔ اور اس طرح سمندر میں چھلانگ لگانا تو
خودکشی کے برابر ہے، انکل کوئی عام آدمی نہیں ہیں، مشکل ترین حالات
میں بھی ہمت نہیں ہاریں گے۔ لہٰذا ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے،
ہو سکتا ہے، انھیں کوئی ٹوٹی پھوٹی کشتی مل جائے اور وُہ اس
پر سوار ہو جائیں اور وہی طاقت ان کی کشتی کو بھی اس سمت میں
کھینچ لے جس میں ہم جا رہے ہیں۔ لہٰذا میں تو یہی کہوں گی
کہ سمندر میں چھلانگ لگانا عقل مندی نہیں۔ اس طرح شاید انکل
تو وہاں پہنچ جائیں۔ جہاں سب لوگ جا رہے ہیں، لیکن ہم سمندر
کی تہہ میں پہنچ جائیں گے۔ بلکہ مچھلیوں کی خُوراک بن جائیں گے۔
ان سب باتوں کے باوجود اگر آفتاب کا فیصلہ یہی ہے کہ چھلانگ
لگائی جائے تو میں بھی تم سے پیچھے نہیں رہوں گی۔" فرحت پُرسکون
انداز میں کہتی چلی گئی۔

آفتاب سوچ میں ڈوب گیا، باقی لوگ بھی ان کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ یُوں بھی جہاز پر کرنے کے لیے کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ آخر آفتاب بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

" ٹھیک ہے ۔ ہم چھلانگ نہیں لگائیں گے اور خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیں گے ۔"

" یہی عقل مندانہ فیصلہ ہے۔" عالم جاہ فوراً بولا۔

اب تینوں سام لٹ کی طرف متوجہ ہوئے :

" ہیلو پیارے سام لٹ ۔ ہم تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں، پیاری پیاری باتیں ۔ کیا تم جواب دینا پسند کرو گے ۔ آخر ہم اور تم پرانے واقف ہیں ۔" آفتاب شوخ آواز میں بولا ۔ انھوں نے اس کی آواز کی شوخی کو صاف محسوس کیا اور حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔

" میرے پاس تمھارے لیے پیاری باتیں نہیں ہیں، زہر میں بُجھی باتیں ضرور ہیں۔" وُہ غرّایا ۔ اتنی مار کھا کر بھی وُہ بے ہوش نہیں ہُوا تھا۔

" چلو ہم ان سے ہی گزارا کرلیں گے ۔ یہ بتاؤ ۔ یہ جہاز ہمیں کہاں لیے جا رہا ہے ؟"

" میرے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم ۔ تم نے دیکھا نہیں تھا ۔ کشتیوں کے کنٹرول سے باہر ہونے کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں

کے ساتھ پانی میں چھلانگ لگا دی تھی ۔"

" ہاں ! یہ تو خیر ہم نے بالکل صاف دیکھا تھا۔" آفتاب نے کہا ۔

" پھر مجھ سے ایسے احمقانہ سوالات کیوں کر رہے ہو ؟"

" تم اس جہاز کے سونے کو کہاں لے جاتے ؟" آصف بولا۔

" اپنے مُلک ۔ اور کہاں ؟"

" تم لوگوں کو یہ خبر کس طرح ہو گئی کہ اس جہاز میں سونا لے جایا جا رہا ہے ؟" فرحت نے پُوچھا۔

" بس ہو گئی کسی طرح ۔ تمھیں کیوں بتاؤں۔" اس نے جھلا کر کہا ۔

" اچھا نہ بتاؤ ۔ بُرا تو نہ مانو ۔ تمھارے خیال میں ہم کسی آسیبی چکر میں تو نہیں پھنس گئے ۔"

" میں کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ ہو سکتا ہے، یہ کوئی آسیبی چکر ہی ہو ۔ یا سمندر کا کوئی خوفناک بھنور ہمیں اپنی طرف کھینچ رہا ہو ۔ شاید کوئی طلسمی جزیرہ ہمیں کھینچے لیے جا رہا ہو۔" اس نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

" بھنور تو خیر یہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس صورت میں ہم ایک سیدھ میں نہیں، گولائی میں سفر کرتے ۔" فرحت بولی ۔

" میری زندگی میں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا کہ جہاز اور کشتیاں

خود بخود ایک سمت میں چل پڑیں ۔ انجن بے کار ہو جائیں اور انھیں
اِدھر اُدھر بھی نہ موڑا جا سکے۔"

" گویا اس معاملے میں تمھاری معلومات صفر ہیں ، پھر ہم تم سے مغز کیوں ماریں ۔ پڑے رہو آرام سے۔" آفتاب نے جھنّائے ہوئے انداز میں کہا اور تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے :

" کپتان صاحب ۔ کیا آپ کی زندگی میں کبھی ایسا ہوا ؟"

" ن ۔ نہیں ۔ اسی لیے تو میں خوف زدہ ہوں۔"

" خوف زدہ تو خیر ہم بھی ہیں ۔ خیر کوئی بات نہیں ۔۔۔ خوف زدہ ہونا صحت کے لیے اتنا بُرا بھی نہیں کہ ہم ۔" آفتاب کہتے کہتے رُک گیا ۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ، پھر وہ کانپتی آواز میں بولا :

" وہ ۔ وہ دیکھو ۔ اب ۔ ابا جان ۔"

سب نے چونک کر سمندر میں اس طرف دیکھا ، جس طرف آفتاب کا ہاتھ اُٹھا ہوا تھا ۔ اور پھر ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ۔ دُور بہت دُور ایک انسان واقعی سمندر میں تیر رہا تھا ۔ کبھی وہ نظر آجاتا اور کبھی لہروں کے پیچھے چھپ جاتا ۔

" ضروری نہیں کہ یہ انکل ہوں ۔ انکل کو تو ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں ۔ وہ اس طرف کس طرح آسکتے ہیں۔"

" ہوں ! یہ کوئی بھی ہوں ۔ ہیں مصیبت میں ۔ اور انھیں بچانا

ہمارا فرض ہے۔" آصف بڑبڑایا۔

" کیا بات کرتے ہو ۔ ہم تو خود کو نہیں بچا سکتے ۔ انھیں کیا بچائیں گے۔" جالب نیاز بولا۔

" ہاں ! یہ ٹھیک ہے ، لیکن ہم کم از کم اس جہاز پر ان کی نسبت زیادہ محفوظ ہیں ۔"

" خیر ۔ جہاز اسی سمت میں بڑھ رہا ہے اور وہ ہماری طرف آ رہے ہیں ۔ انھیں اوپر چڑھا لینے کی پوری کوشش کی جائے گی۔" کپتان عالم جاہ بولا۔

" تو پھر آپ رسیوں کی سیڑھیاں تیار کرلیں ۔" آفتاب نے گھبرا کر کہا ۔

" کئی سیڑھیوں کی کیا ضرورت ہے ؟" عبداللہ جانی نے حیران ہو کر کہا ۔

" جہاز کافی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے ، اگر وہ ایک سیڑھی کو نہ پکڑ سکے تو کم از کم دوسری یا تیسری تو ان کے ہاتھ لگ ہی جائے گی ۔"

" خیر ۔ یونہی سہی ۔"

" ارے ۔ یہ کیا ۔ ان کے ساتھ تو کچھ اور لوگ بھی ہیں۔" فرحت چلّا اُٹھی ۔

" اور یہ وہی دشمن ہوں گے ۔ جن کے پیچھے انھوں نے غوطہ

لگایا تھا:

" بھئی آفتاب - تم غلط فہمی کا شکار ہو - یہ انکل ہرگز نہیں ہیں کیونکہ انھوں نے غوطہ خوری کے لباس میں چھلانگ لگائی تھی — دوسرے بھی غوطہ خوری کے لباس میں تھے، لیکن ان میں سے — ارے - ہماری عقلوں پر شاید پتھر پڑ گئے ہیں - جہاز کا انجن کیا بیکار ہو گیا - شاید سب کی عقلیں بے کار ہو گئیں - بھئی آخر ہم دُوربین تو کام میں لا ہی سکتے ہیں -" آفتاب نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا -

" اوہ واقعی - آپ ٹھیک کہتے ہیں " یہ کہہ کر عبداللہ جانی انجن روم کی طرف لپکا - اور پھر فوراً ہی دو دُوربینیں سنبھالے ہوئے وہاں آ گیا - اس نے ایک دُوربین عالم جاہ کو دی اور دُوسری خُود اپنی آنکھوں پر لگا لی - آفتاب، آصف اور فرحت بے چین ہو گئے - وُہ چاہتے تھے - دُوربینیں پہلے انھیں دی جائیں، لیکن کہہ کیا سکتے تھے، اسی وقت عالم جاہ کی آواز سنائی دی:

" نہیں بھئی - یہ آپ کے والد ہرگز نہیں ہیں - یہ تو کوئی اور ہی مصیبت کے مارے ہیں اور ان کے علاوہ جو لوگ نظر آ رہے ہیں - وُہ زیادہ عُمر کے نہیں - آپ لوگوں کی عُمر کے ہوں گے "

" کیا " ان کے منہ سے ایک ساتھ نِکلا، پھر آصف جلدی سے بولا:

" لگ - کہیں - کہیں یہ انکل جمشید وغیرہ تو نہیں "

" مہربانی فرما کر دُوربینیں ہمیں دے دیں " آفتاب بولا -

اُنھوں نے دُوربینیں ان کی طرف بڑھا دیں - آفتاب اور آصف نے انھیں آنکھوں سے لگایا اور پھر ایک ساتھ چلّا کر بولے:

" اُف خُدا - یہ تو انکل منور علی خان ہیں "

" کیا !!! " فرحت پوری قوّت سے چلّا اُٹھی - اس نے آصف کے ہاتھ دُوربین جھپٹ لی - پھر جونہی اسے آنکھوں سے لگایا - چلّا اُٹھی:

" ابّا جان "

" ابّا جان - یہ کیا بات ہوئی؟ " کپتان عالم جاہ کے منہ سے نِکلا -

" ابّا جان کا مطلب تو جناب ابّا جان ہی ہوتا ہے - آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ جو سمندر میں تیرتے ہوئے آ رہے ہیں - فرحت کے ابّا جان ہیں " آفتاب پُرجوش لہجے میں بولا -

" اوہ " ان کے منہ سے ایک ساتھ نِکلا -

" لیکن بھئی - یہ ان کے ساتھ کون ہیں - یہ یُوں بھی چار ہیں، تین نہیں "

" ابھی وُہ کافی دُور ہیں - صاف نظر نہیں آ رہے، لیکن ہیں ان کے ساتھ ہی - کیونکہ ابّا جان بار بار مُڑ کر ان کی طرف دیکھنے

گئے ہیں ۔ اُف خدا ۔ کک ۔ کہیں ۔ کہیں یہ ششش ۔" فرحت ہکلا کر رہ گئی ۔

" کہیں یہ ۔ ششش کیا ؟" آصف حیران ہو کر بولا اور دُوربین فرحت کے ہاتھ سے چھین لی ۔

" کپتان صاحب ۔ بہتر ہوتا کہ آپ تین دُوربینیں لے آتے ۔ اب ہم لڑ لڑ مر جائیں گے ۔"

" لیکن جہاز پر یہی دو تھیں ۔"

" اوہ ، پھر تو آپ تین دُوربینیں لا ہی نہیں سکتے تھے ، خیر ۔ کوئی بات نہیں ۔ ہاں تو آصف ۔ کیا دیکھا ۔ کون لوگ ہیں انکل کے ساتھ ۔"

" اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں ۔ یہ شوکی برادرز ہی ہیں ۔"

" شوکی برادرز ۔ یہ کون ہیں ؟" کپتان عالم جاہ نے حیران ہو کر کہا ۔

" ہماری ہی قسم کے لوگ ۔ کپتان صاحب ۔ یہ ایک طرح سے ہمارے ساتھی ہی ہیں ۔ نہ جانے سمندر میں کیا کر رہے ہیں ۔ ان سب کو جہاز پر چڑھانا بہت ضروری ہے ۔ شاید ہمیں ان سے کام کی باتیں معلوم ہو جائیں ۔"

" ٹھیک ہے ۔ یہ آپ کے ساتھی نہ ہوتے ، تب بھی انھیں سوار

کرانا میرا فرض تھا ۔ ہم جہاز کے چاروں طرف رسیوں کی سیڑھیاں لٹکا دیں گے ۔ آپ فکر نہ کریں ۔"

کچھ اور نزدیک ہونے پر انھیں اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ وُہ لوگ منور علی خان اور شوکی برادرز ہی ہیں ۔ اُدھر وُہ لوگ بھی جہاز کو دیکھ چکے تھے اور بُری طرح ہاتھ ہلا رہے تھے ۔ ان کے پاس دُوربینیں تو تھیں نہیں ۔ یہ کس طرح جان سکتے تھے کہ جہاز پر خود ان کے ساتھی بھی موجود ہیں ۔ اِدھر آفتاب ، آصف اور فرحت نے بھی بے تابانہ انداز میں ہاتھ ہلانا شروع کر دیے ۔ آخر وُہ اور نزدیک آ گئے ۔ اب انھوں نے بھی آفتاب ، آصف اور فرحت کو پہچان لیا ۔ وُہ سب خوشی میں بھر گئے ۔

" یہ ۔ یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں ؟" منور علی خان چلّا اُٹھے ۔

" خُدا کی قدرت ۔ ابّا جان ۔ صرف اور صرف خدا کی قدرت ۔" فرحت چلّا اُٹھی ۔

" ہاں فرحت ۔ تم نے ٹھیک کہا ۔ یہ خدا کی قدرت ہی ہے ۔" منور علی خان بولے ۔

" لیکن انکل ۔ ہماری زندگی کا یہ شاید حیرت انگیز ترین منظر ہے ، آخر شوکی برادرز آپ کے ساتھ کس طرح نظر آ رہے ہیں ۔" آفتاب نے کہا ۔

"یہ بھی خدا کی قدرت ہی ہے آفتاب صاحب۔" ادھر سے بھی آفتاب نے کہا اور وہ مسکرانے لگے۔

"یعنی باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ پہلے جہاز پر تو سوار ہو لو۔" منور علی خان نے منہ بنایا۔

"رسیوں کی سیڑھیاں لٹکا دی گئی ہیں۔ آپ لوگ جونہی نزدیک پہنچیں۔ ان کو پکڑنے کی کوشش کریں، اگر سیڑھیوں کو پکڑنے میں ناکام رہے تو پھر جہاز آپ کے نزدیک سے گزر جائے گا اور آپ سوار نہیں ہو سکیں گے۔"

"اللہ نے چاہا تو ہم ضرور سوار ہوں گے۔"

جہاز اب ان کے بالکل نزدیک ہو گیا۔ رسیوں کی سیڑھیاں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ ان کی سیدھ میں ہو گئے — گویا جہاز کی ایک سمت میں آ گئے۔ سامنے آنے کی صورت میں ٹکرا جانے کا ڈر تھا —

"شوکی — پہلے آپ لوگ سیڑھیوں کو پکڑیں، پھر میں ہاتھ ڈالوں گا۔ جب تک آپ لوگ کامیاب نہیں ہوں گے، میں سیڑھی کو نہیں پکڑوں گا۔"

"ہم۔ اپنی پوری کوشش کریں گے۔"

وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ اور ان کو پکڑنے کی کوشش شروع کر دی۔ جہاز ان کے پاس سے نکلا چلا جا رہا تھا۔

"شاباش شوکی برادران۔" منور علی خان چلّائے۔

وہ جوش میں بھر گئے اور پھر سب سے پہلے اخلاق ایک سیڑھی پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے چیخ کر کہا:

"آپ بھی اسی طرف آ جائیے۔"

انھوں نے یہی کیا۔ تینوں اس سیڑھی کی طرف بڑھنے لگے اور آخر ایک دوسرے کی مدد سے پکڑنے میں کامیاب ہو ہی گئے، اب منور علی خان دوسری سیڑھی کی طرف بڑھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اوپر چڑھ رہے تھے۔ آخر انھیں عرشے پر کھینچ لیا گیا... وہ عرشے پر چت لیٹ گئے اور لمبے لمبے سانس لینے لگے —

"آپ لوگ جب بولنے چالنے کے قابل ہو جائیں۔ ہمیں بتا دیجیے گا۔" آفتاب بے چارگی کے عالم میں بولا۔

جواب میں کوئی بھی نہ بولا تو آفتاب نے پھر کہا:

"کیا آپ لوگ کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں رہے؟"

"بولنے کے قابل ہوں گے تبھی بولیں گے نا۔" آفتاب نے منہ بنایا —

"اور یہ جملہ کس طرح کہہ دیا؟"

"بڑی مشکل سے۔"

"کم از کم ہمیں یہ بتا دیں کہ آپ لوگ یک جا کس طرح ہو گئے اور سمندر میں کیا کر رہے تھے۔" فرحت نے پریشان ہو

کر کہا۔

"سمندر میں ہم تیر رہے تھے اور ہمارا ساتھ کس طرح ہوا، ایک جگہ کس طرح جمع ہو گئے۔ یہ انکل منور علی خان سے پوچھیں۔"

"انکل منور علی خان۔ یہ میرے ابا جان آپ کے انکل کب سے بن گئے۔" فرحت نے چونک کر کہا۔

"جب سے ان سے ملاقات ہوئی، اگر آپ کو کوئی اعتراض ہے تو یہ اعتراض اپنے ابا جان سے ہی کریں، کیونکہ اس کا حق انھوں نے ہمیں دیا ہے۔"

"نہیں خیر۔ مجھے کوئی اعتراض تو نہیں۔ ہاں خوشی ضرور ہے، کیا آپ جلدی سے واقعات نہیں بتا سکتے۔ ہم اس لیے بھی پریشان اور بے چین ہیں کہ جہاز کا انجن ہمارے کنٹرول میں نہیں رہا۔ ہم اسے اپنی مرضی سے کسی طرف نہیں لے جا سکتے۔ یہ ایک خاص سمت میں خود بخود آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ سُن کر آپ لوگوں کو بہت حیرت ہوئی ہو گی۔ ہم بھی بہت حیران ہیں۔" فرحت نے جلدی جلدی کہا۔

"جی نہیں۔ ہمیں تو بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔" آفتاب بولا۔

"بھئی ککھن۔ کیوں نہ پہلے ہم سنجیدگی سے ایک دوسرے کے حالات سُن لیں۔" شوکی نے منہ بنایا۔

"ککھن۔ یہ کیا نام ہوا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، ان کا نام

آفتاب ہے اور اسی وجہ سے سابقہ ملاقات پر ہم نے ان کے نام آفتاب نمبر ۱ اور آفتاب نمبر ۲ رکھے تھے۔"

"یہ ان کا پیار کا نام ہے، ہم گھر میں انھیں ککھن ہی کہتے ہیں۔"

"ارے واہ۔ تب تو پچھلی مرتبہ ہم نے اس مسئلے کا بالکل غلط حل تلاش کیا تھا۔ یعنی انھیں آفتاب نمبر ۱ اور آفتاب نمبر ۲ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمارے والا آفتاب جوں کا توں آفتاب رہتا اور دوسرے آفتاب کو سب ککھن کہتے رہتے۔" آصف بولا۔

"خیر۔ وہ وقت تو اب گزر گیا۔ اس مرتبہ یہی کر لیتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک۔ یہ طے رہا۔" انھوں نے ایک ساتھ کہا۔

"یہ سب باتیں ہوتی رہیں گی۔ پہلے تو یہ جاننا چاہیے کہ یہ لوگ سمندر میں کیوں تیر رہے تھے اور ان لوگوں کو اس بات پر کیوں حیرت نہیں کہ جہاز ہمارے کنٹرول میں نہیں ہے۔" آصف بولا۔

"اس کا مطلب تو صاف ہے۔ یہ جس جہاز یا لانچ پر سوار رہے ہوں گے، وہ بھی اسی طرح کنٹرول سے باہر ہو گئی ہو گی۔" آفتاب نے کہا۔

"ہاں۔ یہی سمجھ لیں۔ ویسے اس کی تفصیل بہت دلچسپ ہے، لیکن ہم بھی تو یہ جاننے کے لیے بے چین ہیں کہ آپ لوگ اس جہاز پر کس طرح نظر آ رہے ہیں اور اگر نظر آ ہی رہے ہیں تو آپ

کے ساتھ انکل کامران مرزا کیوں نظر نہیں آ رہے ہے ؟"

"انھیں ہم بہت پیچھے سمندر میں چھوڑ آئے ہیں۔"

"کیا۔ وہ کیسے ؟" وہ چلاّئے۔

"بھئی یوں چیخنے چلاّنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ اطمینان سے سب لوگ بیٹھ جائیں۔ پہلے ہماری کہانی سُن لیں، پھر آپ اپنی سُنائیں، اس طرح سب کے ذہنوں کی اُلجھن دُور ہو جائے گی۔" منور علی خان بھنّا کر بولے۔

"بات تو ٹھیک ہے۔" جالب نیاز نے فوراً کہا، کیونکہ اب باقی لوگ بھی بہت بے چین نظر آ رہے تھے، ادھر جہاز برابر اسی سمت میں بڑھ رہا تھا۔

سمندر میں آواز

ایک دُوسرے کی کہانی سُن کر وُہ خوف زدہ ہو گئے۔ حیرت زدہ رہ گئے۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور مُنہ کُھلے کے کُھلے رہ گئے، کئی سیکنڈ تک کسی کے منہ سے آواز نہ نکل سکی، آخر فرحت بولی:

"اس کا مطلب ہے۔ ہم کسی خوفناک چکر کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔"

"خوفناک سے بھی دو ہاتھ آگے۔" آفتاب بولا۔

"تو آپ اسے خوفناک تر یا خوفناک ترین کہہ لیں۔" مکھن نے مُنہ بنایا۔

"بھئی پہلے اچھی طرح سانس لے لو، پھر میرے مُنہ آنے کی کوشش کرنا۔" آفتاب مُسکرایا۔

"اور یہ آپ واپ کا تکلّف اچھا نہیں لگ رہا، ہمیں چاہیے، بے تکلّفی کی فضا پیدا کریں۔ ایک دُوسرے کو تم کہہ کر مخاطب کریں۔" فرحت نے منہ بنایا۔

"اب ہم انکل کو تو تم کہہ کر مخاطب نہیں کر سکتے۔" آفتاب جھنّا اُٹھا۔

"میں ابّا جان کی بات نہیں کر رہی۔" فرحت نے اسے گھورا۔

"سب باتوں سے زیادہ پریشان کُن مسئلہ کامران مرزا کا ہے، آخر ہم ان کے لیے کیا کریں؟" منور علی خان بولے۔

"یہی تو مشکل ہے۔ ہم ان کے لیے کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ہم تو خود مجبور اور بے بس ہیں۔" آصف نے کہا۔

"انھیں تم لوگ اِس سمت میں چھوڑ آئے ہو؟" انھوں نے اشارہ کرکے پُوچھا۔

"جی ہاں۔ دُور بہت دُور۔ سولہ غوطہ خوروں میں گھرا ہوا۔ پانی کے نیچے چھوڑ آئے۔" آفتاب دُکھ بھرے لہجے میں بولا۔

"اس لیے کہ جہاز کنٹرول سے باہر ہو چکا تھا۔ ہم وہاں رُک ہی نہیں سکے۔ چھلانگیں لگانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔"

"ہاں۔ ٹھیک ہے۔ ان حالات میں تم کر بھی کیا سکتے تھے۔" انھوں نے کہا اور کپتان کی طرف مڑے:

"تو کیا آپ کے پاس کوئی اور غوطہ خوری کا لباس نہیں تھا۔"

"نہیں۔ صرف ایک تھا۔" عالم جاہ نے جواب دیا۔

"افسوس۔ خیر۔ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم جس جزیرے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس میں ہمیں کیا حالات پیش آنے

والے ہیں۔"

"مجھے تو یہ ساری کارروائی سونے کے اس جہاز کو اغوا کرنے کا منصوبہ معلوم ہوتی ہے۔ جزیرے پر وہ ستون دراصل کوئی مقناطیسی قسم کی قوّت ہے۔ جو جہازوں اور کشتیوں کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

"یہ تو خیر ٹھیک ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اس چنگل سے کیسے نکلیں؟"

"صاف ظاہر ہے۔ اس جزیرے کے چنگل سے نکلنے کے لیے ہمیں جزیرے پر جانا ہی ہو گا۔ اس مقناطیسی قوّت کو ختم کرکے ہی ہم اپنے جہاز کو آزادانہ چلا سکتے ہیں۔"

"حیرت ہے۔ اُنھوں نے صرف ایک سونے کے جہاز کے لیے اتنا بڑا منصوبہ ترتیب دیا۔"

"یہ سونے کا جہاز کم مالیت کا نہیں۔" جالب نیاز نے جھنّا کر کہا۔

"اوہ ہاں! یہ تو ہم بھول ہی گئے کہ اس جہاز پر آپ بھی موجود ہیں۔ معاف کر دیجیے۔" آفتاب نے بوکھلا کر کہا۔

"معافی کس بات کی؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"آفتاب۔ اِدھر اُدھر کی باتوں سے پرہیز کرو۔" منور علی خان نے کہا، پھر اُٹھ کھڑے ہوتے اور ٹہلنے کے انداز میں چلتے ہوئے بولے:

"ہم کامران مرزا کو کتنی دُور چھوڑ آئے ہوں گے، کچھ اندازہ ہے؟" یہ کہتے ہوئے ان کا رُخ کپتان کی طرف ہوگیا۔

"کوئی اندازہ نہیں، کیونکہ جہاز اس وقت سے ہی انجن کی مدد کے بغیر چل رہا ہے، پھر بھی ایک گھنٹے کی مُسافت تو ضرور ہو گی۔"

"ہوں۔ اگر ہم کسی طرح جہاز کا رُخ تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور اس سمت میں اسے لے جانے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو کیا آپ لوگ چلیں گے؟"

"کیوں۔ نہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" کپتان نے کہا۔

"کپتان صاحب۔ یہ بات آپ کو کہنے کا اختیار نہیں۔ اس صورت میں آپ کو مجھ سے اجازت لینا ہو گی۔ اور میں ہرگز اجازت نہیں دوں گا، کیونکہ سب سے پہلا اہم ترین کام اس جہاز کے سونے کو ملک تک پہنچانا ہے۔ کسی ایک انسان کی جان بچانے کی خاطر سونے کے جہاز کو خطرے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔"

"خطرے میں تو ہم ویسے ہی ہیں۔"

"میں اس صورت کی بات کر رہا ہوں۔ جس کا ذکر ہمارے نئے ساتھی نے کیا ہے۔" جالب نیاز کے لہجے میں طنز تھا۔

"ہوں" میں سمجھ گیا۔ اس صورت میں بھی ہمارا سفر اپنے مُلک کی طرف جاری رہے گا۔ تب تو مجھے بھی اپنا فیصلہ سُنانا ہو گا۔" منور علی خان بولے۔

اب انھوں نے چہل قدمی کی رفتار بڑھا دی تھی۔ یُوں لگتا تھا جیسے کسی گہری سوچ میں غرق ہوں۔ ان کے چہرے پر بھی ایک عجیب سی کیفیت تھی۔

"آپ کا فیصلہ۔ کیا مطلب۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"یہ کہ۔ میرے لیے۔ میرا دوست اس دُنیا کی قیمتی ترین چیز سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اگر ہم جہاز کو اس سمت میں لے جانے میں کامیاب ہو جائیں تو میں ہرگز اپنے دوست کو ساتھ لیے بغیر مُلک کا رُخ نہیں کروں گا۔ اور میں ہی کیا۔ شاید ہمارے مُلک کے صدر بھی اس بات کو پسند نہ کریں۔"

"کوئی پسند کرے یا نہ کرے۔ میں اپنا فرض ادا کرتا رہوں گا اور میرے ذمے یہ فرض عاید کیا گیا ہے کہ اس سونے کو مُلک تک پہنچا دوں۔"

"میں سمجھ گیا۔ آپ اپنے فرض کے پکّے ہیں اور ہم اپنے ارادوں کے بھی اور فرض کے بھی۔ خیر۔ اب ذرا میرا دُوسرا فیصلہ سُن لیں۔" انھوں نے کہا۔ یہ کہتے وقت ان کا انداز ڈرامائی ہوگیا، ٹہلتے ٹہلتے بھی وہ دُور نکل گئے۔ اور پھر اچانک ان کی طرف

مڑے۔ فرحت زور سے چونکی اور گھبرا کر بولی:

"ابا جان۔ آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"گھبراؤ نہیں فرحت۔ میں اپنے ضمیر کی آواز کو دبا نہیں سکتا، میری زندگی جنگلات میں گزری ہے، لیکن انسان ہوں۔"

"آپ۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں انکل۔" آفتاب چلّا اٹھا۔

"میں۔ میں اپنے دوست کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ سمندر میں پھنسے ہوئے ہوں اور میں جہاز میں آرام سے بیٹھا رہوں۔ میں جا رہا ہوں دوستو۔ انھیں لینے کے لیے۔ فکر مت کرنا۔ میں انھیں ساتھ لے کر آپ لوگوں سے آ ملوں گا۔"

"ابا جان!" فرحت چلا اٹھی۔

لیکن منور علی خان اس وقت تک پانی میں چھلانگ لگا چکے تھے۔ چھپاکے کی آواز ابھری۔ وہ سب دوڑ کر ریلنگ تک پہنچے۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے منور علی خان کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ تیزی سے پیچھے کی طرف تیر رہے تھے۔

"آجائیے انکل۔ آجائیے۔ ابھی وقت ہے۔" آفتاب نے چیخ کر کہا۔

جواب میں منور علی خان نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ الوداعی انداز میں ہاتھ ضرور اٹھا دیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے،

جھلملاتی آنکھوں سے وہ منور علی خان کو دور ہوتے دیکھتے رہے۔ یہاں تک وہ ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

O

انسپکٹر کامران مرزا کی زندگی میں بے شمار خوفناک ترین لمحات آئے تھے، لیکن شاید اس قسم کا موقع پہلی مرتبہ آیا تھا۔ ان کے چاروں طرف سمندر تھا۔ پندرہ سولہ دشمنوں سے مقابلہ بھی کچھ کم تھکا دینے والا نہیں تھا۔ گویا وہ تھکن سے چور بھی تھے اور دور دور تک کوئی جہاز، کشتی یا جزیرہ بھی نہیں تھا کہ کچھ دیر کے لیے سانس ہی لے سکتے۔ ایسے میں ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو فوراً ہمت ہار جاتا اور پانی کے نیچے پہنچ جاتا، لیکن وہ انسپکٹر کامران مرزا تھے، انھوں نے اس سمت میں تیرنا شروع کیا جس سمت میں ان کے خیال کے مطابق جہاز گیا تھا۔ اس کے سوا وہ اور کر ہی کیا سکتے تھے۔ تیرنے کی طاقت نہیں تھی، لیکن تیر رہے تھے۔ نہ جانے وہ کتنی دیر تک تیرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے بازو شل ہو گئے، حواس جواب دینے لگے۔ انھوں نے سوچا۔ کیا موت آنے والی ہے۔ یہ سوچ کر انھوں نے اللہ کو یاد کیا، کلمۂ طیبہ کا ورد کیا۔ تاکہ مرتے وقت کلمہ تو نصیب ہو جائے۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ

اس کا شکر آدمی کو ہر حال میں کرنا چاہیے اور ہاتھ پیر چلاتے رہے۔ ایسے میں بھی انھوں نے سوچا۔ زندگی کے آخری سانس تک میں زندگی کو بچانے کی کوشش جاری رکھوں گا۔ ابھی انھوں نے یہ سوچا ہی تھا کہ دُور سے ایک شخص تیر کر آتا نظر آیا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

" تو میرا کوئی دشمن ابھی تک زندہ ہے، لیکن یہ بے چارہ بھی زندگی بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوگا۔ اب یہ مجھ سے کیا لڑے گا۔ مجھے اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اسے مگر یہ تو غوطہ خوری کے لباس میں نہیں ہے۔ تب یہ کوئی اللہ [illegible] لگ۔ کیا یہ جہاز پر سوار لوگوں میں سے کوئی ہے۔" انھوں نے سوچا اور پھر حواس جمع کر کے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ ان کے تیرنے کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایسے میں ایک آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

" ہمت نہ ہارنا کامران مرزا۔ میں آگیا ہوں۔"

گم ہوتے حواس کے ساتھ انھوں نے یہ آواز سنی۔ انھیں یوں لگا جیسے وہ بھی ریگستان میں بھٹکتے ہوئے پیاسے ہیں۔ جسے دُور سے پانی چمکتا دکھائی دیتا ہے، لیکن دراصل وہ چمک ریت کی ہوتی ہے۔ اسی طرح انھیں بھی سمندر میں آواز سنائی دی ہے۔ بھلا اس جگہ میری مدد کو کون آسکتا ہے۔ یہ ضرور میرا وہم ہے۔

ہم ہاں، اللہ جو چاہے سو کر سکتا ہے۔

ابھی وہ ان خیالات میں اُلجھے ہوئے تھے کہ کوئی ان تک پہنچ گیا۔ انھوں نے منور علی خان کی آواز سنی:

" میں آگیا ہوں دوست۔ میں آگیا ہوں۔"

منور علی خان کی آواز میں نہ جانے کیا جادو تھا۔ ان کے رگ و ریشے میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ سمندر کی آواز سراب نہیں حقیقت ثابت ہو گئی تھی۔ سمندر میں یہ ملاقات بھی کس قدر عجیب تھی۔ اس ملاقات کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ منور علی خان نے انھیں سہارا دیا اور دونوں دوست پھر جہاز کی سمت میں تیرنے لگے۔ ایسے میں بھی منور علی خان کے کندھے سے ان کا شکاری تھیلا لٹکا ہوا تھا۔

" کیا تمھیں یقین ہے منور علی۔ کہ ہم جہاز کی سمت میں ہی جا رہے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

" یقین تو نہیں، امید ضرور ہے۔"

" خیر۔ اگر ہم غلط سمت میں بھی جا رہے ہیں اور غلط سمت ہمیں موت کے منہ میں بھی لے جا رہی ہے، تو بھی تمھارے ساتھ مرتے ہوئے مجھے کوئی اُلجھن محسوس نہیں ہوگی۔ کوئی تو اپنا پاس ہے۔"

" میرا بھی یہی خیال ہے۔" منور علی خان مسکرائے۔

○

" یہ ابا جان نے کیا کیا؟" فرحت روتے ہوئے بولی۔

" وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے فرحت ۔ دوست کے لیے دوست سے بڑھ کر کوئی چیز عزیز نہیں ہوتی۔" آصف نے کہا۔

" ہاں ، لیکن پھر بھی انھیں نہیں جانا چاہیے تھا۔ ابا جان تو اپنی زندگی خطرے میں ڈال ہی چکے تھے۔ اب یہ ضروری تو نہیں کہ انکل ان تک پہنچ ہی جائیں۔" آفتاب بھی درد بھری آواز میں بولا۔

" اوہو۔ ہم شاید جزیرے کے نزدیک پہنچ رہے ہیں۔" انھوں نے شوکی کی آواز سنی اور سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے بھی اس سمت میں دیکھا۔ دور بہت دور۔ ایک جزیرے کی جھلک دکھائی دے رہی تھی:

" تو یہ ہے وہ پُراسرار جزیرہ۔" آصف بڑبڑایا۔

" بلکہ جادوئی جزیرہ کہو۔" مکھن بولا۔

" اچھا بھائی۔ جادوئی جزیرہ ہی سہی۔" فرحت بولی۔

ان کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ اس سارے ہنگامے کی جڑ جزیرہ ان کے سامنے آ چکا تھا اور بہت جلد وہ اس تک

پہنچنے والے تھے۔ آدھ گھنٹے کے بعد ہی انھیں جزیرے کا ساحل صاف نظر آنے لگا اور ساحل پر کھڑے لوگ بھی نظر آنے لگے۔

" لو بھئی۔ مسٹر شوبرا ، راجر اور رولڈن وغیرہ سے ملاقات کے لیے تیار ہو جاؤ۔" شوکی بولا۔

" نام تو انھوں نے بڑے زوردار مارے۔ ارے۔" آفتاب کے منہ سے نکلا۔

" پُرسکون انداز میں جملہ کہنے کے بعد یہ چونکے ہوئے انداز کا ارے ہاں سے ٹپک پڑا۔" فرحت نے منہ بنایا۔

" یہ کہنا چاہتا تھا کہ کیا یہ ملاقات اُدھوری ہی رہ جائے گی۔"

" ہاں ، ابا جان اور انکل کے بغیر تو واقعی اُدھوری رہ جائے گی۔" فرحت حسرت زدہ لہجے میں بولی۔

" تم غلط سمجھیں فرحت۔" آفتاب نے کہنا چاہا۔

" یہ اس کی پرانی عادت ہے۔" آصف بول پڑا۔ فرحت نے اسے گھور کر دیکھا ، اسی وقت آفتاب بول اُٹھا۔

" میرا مطلب یہ تھا۔ کیا اس مرتبہ انکل جمشید، محمود ، فاروق اور فرزانہ سے ملاقات نہیں ہو گی ، جب کہ شوکی برادرز ہم تک پہنچ چکے ہیں۔"

" یہ ضروری تو نہیں کہ اگر ایک پارٹی سے ملاقات ہو جائے تو

دُوسری سے بھی ضرور ہی ہو گی۔ یعنی تینوں پارٹیاں ضرور ہی جمع ہوں گی۔" فرحت نے کہا۔

"ہاں، ضروری تو نہیں، لیکن کچھ پھیکا پن ضرور محسوس ہو رہا ہے۔"

"وہ تو اس لیے بھی ہو رہا ہے کہ دونوں انکل اس وقت ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔"

"خدا کرے۔ وُہ جلد ہی ہم سے آملیں۔ کیا اس صورت میں بھی ہم محمود، فارُوق، فرزانہ اور انکل جمشید کی کمی محسوس نہیں کریں گے۔" آفتاب بولا۔

"یہ ہم اُس وقت دیکھیں گے۔ اِس وقت تو مسئلہ ہے۔ جزیرے پر پہنچنے کا۔ یہ کس قدر عجیب حالات ہیں۔ اُف۔" آصف نے کہا اور ان کی نظریں ساحل پر جم گئیں۔

"شوکی۔ اب یہ لوگ صاف نظر آ رہے ہیں۔ ذرا ان کا تعارف تو کرا دو۔ تاکہ جزیرے پر اُترنے سے پہلے ہی ہم ان سے واقف ہو جائیں۔"

"ضرور۔ کیوں نہیں۔ وُہ جو نیلی قمیض والا نظر آ رہا ہے نا۔ سب سے لمبا۔ وہ شوبرا ہے۔ یہی ان کا سرغنہ ہے۔ سفید لباس والا راجر ہے۔ اس جگہ انھوں نے جو بھی آلات لگا رکھے ہیں، یہ ان آلات کا گویا انچارج ہے، کیونکہ جب بھی کوئی تبدیلی لانا ہوتی ہے۔ شوبرا اسی کو بھیجتا ہے۔ موٹے جسم والا رولڈن ہے۔ باقیوں کے نام

ہمیں معلوم نہیں۔"

"لیکن یہ تو تھوڑے سے ہیں۔ ان سے تو ہم بہت آسانی سے نبٹ سکیں گے۔" آصف بڑبڑایا۔

"ان کے پاس زہریلی سوئیاں پھینکنے والے پستول ہیں۔ سوئی کسی کے جسم میں آ کر لگی نہیں اور وُہ گر کر مرا نہیں۔" شوکی نے گویا خبردار کیا۔

"دیکھو بھئی۔ ہمیں ڈرانے کی کوشش نہ کرو۔" آفتاب مُسکرایا۔

"ہم ڈرا نہیں رہے۔ اِطلاعات فراہم کر رہے ہیں۔" ممتحن نے جل کر کہا۔

"یار تم تو ممتحن ہو۔ ممتحن کو جلنا زیب نہیں دیتا۔ رنگ کالا ہو جاتا ہے۔" آفتاب مُسکرایا۔

"ہاں! یہ تو ہے۔" آصف بول اُٹھا۔

"آپ لوگ بھی عجیب ہیں۔ بلکہ عجیب ترین۔ ان حالات میں بھی ایک دوسرے سے کس بے فکری سے باتیں کر رہے ہیں۔"

"تو پھر۔ اور کیا کریں۔ اور ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ویسے بھی اس قسم کے حالات ہماری زندگیوں میں آتے ہی رہتے ہیں۔" فرحت نے جھنّائے ہوئے انداز میں کہا۔

"نہ جانے کیا بات ہے۔ آج مجھے فارُوق بہت یاد آ رہا ہے۔" آفتاب بولا۔

"لیکن مجھے تو ان لوگوں کی آمد کے دور دور تک آثار نظر نہیں آتے۔" آصف نے کہا۔

"امکان تو شوکی برادرز اور ابا جان کی آمد کا بھی نہیں تھا۔" فرحت نے کہا۔

"ہاں۔ بالکل۔ ہمیں دراصل اس پر یقین رکھنا چاہیے کہ اس دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

اسی وقت جہاز رک گیا۔ وہ اس قدر کم پانی تک آ چکا تھا کہ آگے بڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔ جزیرے کی طاقت بھی اب اسے اور نہیں کھینچ سکتی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر شوبرا اور اس کے ساتھی کھڑے تھے اور درمیان میں پانی تھا۔ انھوں نے سنا۔ شوبرا کہہ رہا تھا:

"تم لوگ اگر چاہو تو جہاز سے اتر کر سمندر کا رخ کر سکتے ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

اس کا وار

چند لمحات کے لیے سناٹا طاری ہو گیا۔ آخر شوکی نے ہمت کر کے کہا:

"کیا مطلب مسٹر شوبرا۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم سمندر میں کود جائیں اور اپنے رخ جزیرے کی طرف نہ کریں؟"

"ہاں! اس لیے کہ مجھے صرف اس جہاز کی ضرورت تھی۔ تم لوگوں کی نہیں۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ تم سمندر میں چھلانگیں لگا دو۔ جہاز کو خالی کر دو۔"

"یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنی دور سے تو ہم آئے ہیں۔ ہمیں اس جزیرے کی سیر تو کرنے دیجیے، پھر جیسے آپ کہیں گے۔ کر لیں گے۔" آفتاب نے جلدی جلدی کہا۔

"میں وقت ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ پہلے ہی ان لوگوں کی وجہ سے کافی وقت ضائع ہو چکا ہے۔" اس کا اشارہ شوکی وغیرہ کی طرف تھا۔

"گویا تم ہمیں موت کے حوالے کر دینا چاہتے ہو۔ وہ بھی سمندری موت کے۔" اشفاق جل بھن کر بولا۔

"ہاں ۔تم لوگ اسی قابل ہو۔"

"ہم لوگ اسی قابل ہیں، یہ کس طرح کہہ دیا تم نے۔تمھیں کیا معلوم کہ ہم لوگ کس کس قابل ہیں۔ لوگوں کا تو خیال ہے کہ ہم لوگ بے شمار قابلیتوں کے مالک ہیں۔" مکھن نے بلند آواز نکالی۔

"ہو گے ۔ اپنے گھر میں ۔ میرے لیے بے کار ہو۔ لہٰذا سمندر میں کود جاؤ۔"

"اگر نہ کودیں تو؟" آصف نے تنک کر کہا۔

"تو پھر ہم تمھیں منٹوں میں ختم کر دیں گے اور یہ موت بہت تکلیف دہ ہوگی ۔ اس کے مقابلے میں سمندر میں ڈوب کر مرنا بہت آسان ہے۔"

"تمھارا اشارہ زہریلی سوئیوں کی موت کی طرف ہے؟"

"نہیں۔اس جزیرے پر موت ایک اور طرح بھی آتی ہے۔"

"ایک اور کس طرح ۔ذرا ہم بھی تو سنیں۔"

"مجھے وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں۔" شوربا بولا۔

"تب پھر ہم سمندر میں نہیں کودیں گے ۔تم ہمیں جزیرے کی موت کے حوالے کر دو۔ کم از کم ہمیں یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ موت ایک اور کس طرح آتی ہے۔" آصف نے اعلانیہ انداز میں کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر یونہی سہی ۔ اب تم اس جزیرے کا اصلی روپ دیکھو گے۔ راجر یہ لوگ اس طرح نہیں مانیں گے ۔ حرکت میں آ جاؤ۔"

"چلو بھئی ۔ اتر آؤ جزیرے پر۔" راجر چند قدم آگے بڑھ کر بولا۔

"ہمیں کیا ضرورت ہے اتر آنے کی ۔ یہ ہمارا جہاز ہے۔ ہمارے ملک کا جہاز ہے ۔تم لوگ ہوتے کون ہو ہمیں اس سے اتارنے والے۔" آصف نے جل بھن کر کہا۔

"یہ لوگ یوں نہیں مانیں گے راجر۔ یہ لاتوں کے بھوت ہیں۔"

"یہ تو خیر تم نے ٹھیک کہا کہ ہم لاتوں کے بھوت ہیں ، لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ آپ کو یہ بات بتائی کس نے؟" آفتاب حیران ہو کر بولا۔

راجر تیزی سے مڑا اور جزیرے کی طرف دوڑ پڑا۔

"لو بھئی ۔ وہ تو گیا کوئی گل کھلانے۔" شوکی نے جلدی سے کہا۔

"اوہو اچھا۔آؤ میرے ساتھ جلدی کرو۔میں ان کا منصوبہ خاک میں ملا دوں گا۔" آفتاب نے دبی آواز میں کہا۔

"کیا مطلب ۔ کیسے خاک میں ملا دیں گے؟" جالب نیازنے پہلی

مرتبہ اس گفتگو میں حصّہ لیا۔

"بس، میرے ساتھ آئیں۔ اور لیٹ کر آئیں۔ جہاز کے دُوسری طرف۔ جہاں سے یہ لوگ ہمیں دیکھ نہ سکیں۔"

"آخر پروگرام کیا ہے؟" فرحت نے اُلجھ کر کہا۔

"راجر کچھ کرنے گیا ہے۔ جزیرے پر نہ جانے کس قسم کے آلات ہیں۔ شاید یہ لوگ ہمیں لہروں کے ذریعے جہاز سے کھینچ لینا چاہتے ہیں۔ اس لیے ہم جہاز پر رہیں گے ہی نہیں، ہم سے غلطی ہوئی۔ شوبرا کو للکار بیٹھے۔ ہمیں تو پہلے ہی اس ترکیب پر عمل کرنا چاہیے تھا۔"

"آخر کس ترکیب پر؟"

"باتوں میں وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا۔"

یہ کہہ کر آفتاب نیچے گر گیا اور سینے کے بل رینگ کر دُوسری طرف جانے لگا۔ آصف اور فرحت نے فوراً اس کا ساتھ دیا۔ شوکی برادرز نے ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر وُہ بھی سینے کے بل لیٹ کر رینگنے لگے۔ باقی لوگ چند لمحوں تک ہچکچاہٹ کے عالم میں کھڑے رہے، آخر وُہ بھی لیٹ گئے۔ ایسے میں انھوں نے شوبرا کی ہنستی آواز سُنی:

"ارے بھئی۔ یہ تم لوگ کہاں غائب ہو گئے۔ ابھی تو تم لوگوں نے ہمارا کمال دیکھا ہی نہیں۔ کچھ دیر تو جہاز پر ٹھہرے

رہو۔"

اُنھوں نے یہ الفاظ گویا سُنے ہی نہیں۔ تیز تیز رینگتے دُوسرے کنارے پر پہنچے اور پھر آفتاب کے اشارے پر رسیوں کی سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اُترنے لگے۔ یہاں تک کہ پانی میں اُتر گئے۔ اب وہ بہت آہستہ انداز میں تیر رہے تھے اور جزیرے سے دُور ہو رہے تھے۔

"شوکی برادرز۔ کیا تم غوطہ لگا سکتے ہو۔ میرا مطلب ہے۔ پانی کے اندر تیر سکتے ہو؟" آفتاب نے آہستہ آواز میں پُوچھا۔

"کسی حد تک۔"

"تو پھر آؤ۔ اب ہمیں کچھ دُور غوطہ لگا کر تیرنا ہے، تاکہ وُہ لوگ ہمیں دیکھ نہ سکیں۔ اور ہم جزیرے کے دُوسری طرف پہنچ جائیں۔ راجر کے وار سے ہم اسی صورت میں بچ سکتے ہیں۔"

"اوہ!"

اب ان کی سمجھ میں آفتاب کی ترکیب آئی اور وُہ خوش ہو گئے۔

اس طرح تیرنے میں کسی قدر دِقّت ضرور ہوئی؛ تاہم وُہ جزیرے کے دُوسری طرف پہنچ گئے اور پھر جزیرے میں داخل ہو گئے۔ اب وُہ درختوں کی اوٹ لے کر آگے بڑھ رہے تھے۔

"جہاز پر ہمارے سو محافظ بھی ہیں۔ ہم انھیں تو بھول ہی

گئے۔" ایسے میں عبداللہ جانی کو خیال آیا۔

"لیکن سوئے ہوئے محافظ۔ظاہر ہے، ہم ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔انھوں نے تو الٹا ملک اور قوم کو نقصان پہنچایا ہے، اور وہی نہیں، عرشے پر تو سام لٹ بھی بندھا پڑا ہے۔اب ہم ان کے لیے کیا کریں۔"

"آخر ان لوگوں کا پروگرام کیا ہے۔" شوکی بڑبڑایا۔

"ہونا کیا ہے۔بس یہ جہاز کا سونا حاصل کریں گے۔" مکھن بولا۔

"لیکن یہ تو چند آدمی ہیں۔اتنا وزن اٹھا کر جزیرے پر کس طرح لائیں گے اور اگر کسی طرح لے بھی آئے تو جزیرے پر اس کا کیا کریں گے یا جزیرے سے اسے کس طرح لے جائیں گے۔" شوکی نے اسے گھورا۔

"یہ ان کا مسئلہ ہے۔ ہمیں تو اپنے مسئلے کی طرف دھیان دینا چاہیے۔اور ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ سونے کے جہاز کو کس طرح بچایا جائے۔" آصف بولا۔

"ہوں! کاش ابا جان ہمارے ساتھ ہوتے۔اس صورت میں ہم ضرور کچھ کر سکتے تھے۔" آفتاب نے سرد آہ بھری۔

"فکر نہ کرو۔میرے ابو گئے ہیں تو کچھ کر کے ہی لوٹیں گے، ورنہ۔"

فرحت کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔اسی وقت انھوں نے بہت تیز ہوا چلنے کی آواز سنی تھی۔جیسے شدید طوفان کی ہوتی ہے۔انھیں بہت حیرت ہوئی، کیونکہ طوفانی ہوا کا تو دور دور تک پتا نہیں تھا، آسمان پر مطلع صاف تھا اور ہوا پُر سکون۔سمندر کی سطح پر بھی کسی ہل چل کے آثار نظر نہیں آئے۔

"یہ آندھی کی آواز کیسی ہے؟" فرحت چونک کر بولی۔

"ہو گی مصنوعی آندھی۔ورنہ ہم اپنے پیروں پر اتنے اطمینان سے تو نہ کھڑے رہتے۔" آصف نے فوراً کہا۔

"اوہو۔وہ دیکھو۔آندھی تو اس طرف چل رہی ہے۔" آفتاب دبی آواز میں چلایا۔

انھوں نے سامنے دیکھا۔وہ عجیب و غریب ستون اب ان کے سامنے تھا اور اس کے دوسری طرف ہوا اس قدر شدید تھی کہ درخت جھک کر زمین سے لگے جا رہے تھے۔ان کے دیکھتے ہی دیکھتے کئی درخت تو اکھڑ بھی گئے۔

"اف خدا۔یہ۔یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔" جالب نیاز نے کانپ کر کہا۔کپتان صاحبان کے چہرے بھی زرد پڑ گئے۔

"خدا کی قدرت۔بلکہ قدرتِ کاملہ۔" آفتاب بولا۔

"یہ ہماری زندگی کا عجیب ترین منظر ہے۔ہم سے صرف

دو سو میٹر دور ہیبت ناک قسم کی آندھی چل رہی ہے اور اس
جگہ کچھ بھی نہیں — ارے مگر شوبرا اور اس کے ساتھی تو ساحل
پر کھڑے ہیں۔ اس آندھی میں وہ کس طرح کھڑے ہیں۔" عالم
جاہ نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا۔

" یہ آندھی انھی کی لائی ہوئی ہے۔ اپنے بچاؤ کا انتظام
انھوں نے پہلے ہی کر لیا ہو گا۔ آؤ ذرا اور آگے چل کر
دیکھیں۔" آصف نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

" میرا خیال ہے۔ آگے جانا خطرناک ہو گا۔" عبداللہ جانی گھبرا
کر بولا۔

" آپ یہیں ٹھہریے۔ ہم آگے بڑھے بغیر نہیں رہ سکتے۔"
آفتاب نے بُرا سا منہ بنایا۔

وہ اور شوکی برادرز آگے بڑھے، پھر ان کی دیکھا دیکھی
باقی لوگ بھی رُک نہ سکے۔ یہاں تک کہ ستون کے بالکل نزدیک
پہنچ گئے۔ اب انھیں ساحل پر کھڑا جہاز صاف نظر آنے لگا۔
طوفانی ہوا میں وہ کسی پتے کی طرح لرز رہا تھا، پھر اس کا کچھ
حصہ الگ ہو گیا اور اُڑتا ہوا سمندر میں جا گرا۔

وہ کانپ اُٹھے — انھوں نے اپنی زندگی میں اتنا ہولناک
منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جہاز کے ٹکڑے فضا
میں اُڑنے اور سمندر میں گرنے لگے۔ نہ جانے یہ ہُوا تھی یا کیا

تھا۔ ایک مضبوط جہاز ان کی آنکھوں کے سامنے بکھرتا جا رہا تھا،
اور پھر جہاز کی اوپر والی منزل پوری کی پوری صاف ہو گئی —
انھوں نے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس کیے —

" شش۔ شاید۔ شاید ہم کسی بہت بڑے شیطانی چکر میں
پھنس گئے ہیں۔" عالم جاہ کی مُردہ سی آواز سُنائی دی۔

" اگر یہ شیطانی چکر ہے تو کیا شوبرا اور اس کے ساتھی شیطان
اور شیطان کے چیلے ہیں۔" مکھن نے منہ بنایا۔

" میں تو یہی سمجھتا ہوں۔"

" آپ کے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے، حالات پکار پکار کر کہہ
رہے ہیں کہ یہ کوئی جاسوسی چکر ہے۔" آفتاب بولا۔

اب جہاز کی درمیانی منزل آہستہ آہستہ صاف ہو رہی تھی،
اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے:

" اس طرح تو جہاز کا سونا بھی سمندر میں جا گرے گا۔" اشفاق
نے بوکھلا کر کہا۔

" جو لوگ یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ ہم سے بہتر وہ جانتے
ہیں کہ کیا ہو گا۔" شوکی نے منہ بنایا۔

" اوہ۔ اف۔ مم۔ میں۔" مکھن نے گڑبڑا کر کہا۔

" کیا کہنا چاہتے ہو؟" شوکی جھلا کر بولا۔

" مم۔ میں سمجھ گیا۔ یہ لوگ کیا کرنا چاہتے ہیں۔"

" کیا کرنا چاہتے ہیں ؟"

" اُف خُدا — یہ بات تو میری سمجھ میں بھی آ گئی ہے ۔" فرحت کانپ کر بولی ۔

" اس کا مطلب ہے — یہاں بس تم دو ہی عقل مند موجود ہو — اس گھمنڈ میں نہ رہنا ، میں بھی جان چکا ہوں کہ ان لوگوں کا کیا پروگرام ہے ۔" آصف نے مسکرا کر کہا ۔

" شاید یہ بات اب ہم سبھی کی سمجھ میں آ چکی ہے ۔" عالم جاہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری ۔

انھوں نے دیکھا — درمیانی منزل کے بعد نچلی منزل کی باری شروع ہو چکی تھی — ایک بڑا بحری جہاز طوفانی ہوا نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُڑا دیا تھا — نچلی منزل کا ابھی کچھ حصہ ہی ہوا میں اُڑا تھا کہ آندھی یک لخت رُک گئی — انھیں یوں لگا جیسے کسی نے سوئچ آف کر کے آندھی کو بجھا دیا ہو —

" ارے باپ رے — سونے کی پیٹیاں اب صاف نظر آ رہی ہیں ۔" جالب نیاز نے کپکپاتی آواز میں کہا ۔

" یہی تو ان کا پروگرام تھا — انسانی مدد کے بغیر پیٹیاں جزیرے تک لائی جائیں — اور اب ۔" آفتاب کہتے کہتے رُک گیا — ایک پیٹی جہاز پر سے سرک کر پانی میں آ گری تھی — اور اب پانی سے ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی — انھیں یوں لگا جیسے اس پیٹی میں

کوئی انسان ہو اور وہ پیروں پر چل کر ساحل کی طرف آ رہا ہو —

" ایسی کتنی پیٹیاں ہیں جالب صاحب ۔"

" دو سو ۔" اس نے کہا ۔

اسی وقت انھوں نے دوسری پیٹی کو حرکت کرتے دیکھا ، پھر تو گویا پیٹیوں کی قطار ساحل کی طرف چل پڑی — سب سے اگلی پیٹی سیدھی ستون کی طرف آ رہی تھی —

" کتنی سمجھ دار پیٹیاں ہیں — ایک قطار میں چلی آ رہی ہیں — ایک ہم ہیں ۔" مکھن کہتے کہتے رک گیا ۔

" ایک ہم ہیں کیا — کیا ہم ایک قطار میں نہیں چل سکتے ۔" آفتاب جل کر بولا ۔

" کم از کم اس وقت تو ایک قطار میں نہیں کھڑے ۔" مکھن مسکرایا —

" تم شاید عقل سے پیدل ہو — ہم اس وقت درختوں کی اوٹ میں کھڑے ہیں — لہذا ایک قطار میں کھڑے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔" آفتاب نے طنزیہ لہجے میں کہا ۔

" اس میں تو کوئی شک نہیں کہ میں عقل سے پیدل ہوں — یوں تو اس وقت سبھی پیدل ہیں ۔" مکھن نے مسکرا کر کہا ۔

" کیا مطلب — کیا تم ہم سب کو عقل سے پیدل کہہ رہے ہو ؟" کپتان عالم جاہ کاٹ کھانے والے انداز میں بولا ۔

"بچ — جی نہیں تو — میں نے تو صرف پیدل کہا ہے — اب
یہ آپ کی اپنی مرضی کی بات ہے — کچھ بھی سمجھ لیں۔"
"لو — پیٹی ستون پر چڑھ رہی ہے۔" انھوں نے فرحت کی
آواز سُنی —
"ارے — لل — لیکن کیسے — ستون میں سیڑھیاں تھوڑا ہی بنی ہوئی
ہیں۔" آصف بوکھلا اُٹھا۔
"لیکن اس کے باوجود یہ اُوپر چڑھ رہی ہے۔"
"عجیب نامعقول پیٹی ہے — اچھی طرح جانتی ہے کہ ستون میں
سیڑھیاں نہیں ہیں، پھر بھی اُوپر چڑھ رہی ہے — لاحول ولاقوۃ۔"
آفتاب نے بھنا کر کہا۔
"حیرت ہے — اتنی وزنی پیٹی خود بخود کس طرح اوپر اُٹھ رہی
ہے — وُہ بھی اس ستون کے ساتھ لگی ہوئی۔"
"یہ دَور سائنس کا دَور ہے، جس قدر ترقی سائنس نے اس
دَور میں کی ہے، پہلے کبھی نہ کی ہو گی — اور ابھی تو یہ نہ جانے
کہاں کی کہاں پہنچے گی۔" آصف بولا۔
"ابھی تو صرف ایک پیٹی اس ستون پر چڑھ رہی ہے، جب
یہ ساری پیٹیاں آگے پیچھے ستون پر چڑھیں گی تو کیسا منظر ہو گا۔"
اخلاق بولا —
"ایسا کہ اگر ہم اپنے مُلک جا کر لوگوں کو بتائیں تو ہرگز یقین

بھی نہیں کریں گے — اور یہی خیال کریں گے کہ ہم گپ ہانک رہے ہیں۔"
اچانک پیٹی واپس آنے لگی — ایسے میں شوبرا کی آواز جزیرے
میں گونجی:
"یہ — یہ کیا ہوا راجر؟"
"شاید — کہیں کوئی گڑ بڑ ہے۔" راجر کی آواز سنائی دی۔
"اس حد تک کامیابی حاصل کرنے کے بعد گڑ بڑ — راجر تم جانتے
ہو — باس ہماری کھال اُترا دیں گے۔"
"ہاں! اچھی طرح جانتا ہوں — ہمیں اندر چل کر ہی دیکھنا ہو
گا — خیر — فکر کی کوئی بات نہیں — سب پیٹیاں اب جزیرے پر
تو آ ہی چکی ہیں — میں ابھی جا کر دیکھ لیتا ہوں۔"
ان الفاظ کے ساتھ ہی دائیں طرف کے درختوں میں سے
راجر نکلا، ساتھ ہی اس کی نظر ان پر پڑی، اس کا مُنہ کُھلا
کا کُھلا رہ گیا:
"ارے! یہ لوگ تو جزیرے پر موجود ہیں۔" اس نے حیرت زدہ
ہو کر کہا —
"کون لوگ؟"
"وہی — جو جہاز اور لانچ پر آئے تھے۔"
"حد ہو گئی — یہ لوگ بھی کسی طرح پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہے،
میں تو سمجھا تھا، ڈوب گئے ہوں گے۔"

"آپ کے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے جناب۔ ہوتا تو وہی ہے جو ہمارا پروردگار چاہتا ہے۔"

"سامنے آؤ۔ کہاں کہاں چھپے ہوئے ہو تم؟" شوبرا کی غرّاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"سامنے کس طرح آئیں۔ آپ تو ہمیں نظر ہی نہیں آرہے، پہلے تو آپ ہمارے سامنے آئیں۔" مکھن بولا۔

"ابھی لو۔" شوبرا بولا اور درختوں کے جھنڈ میں سے نکل کر سامنے آگیا۔ اس کی آنکھوں سے شدید غصہ ٹپک رہا تھا:

"تمھاری وجہ سے ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔ تمھارا کیا حرج تھا جو سمندر میں ڈوب جاتے۔ مر تو ویسے بھی جاؤ گے۔"

"جی ہاں! حرج تو واقعی کوئی نہیں تھا۔ بس بھول ہوگئی۔ معاف کر دیجیے۔ اس مرتبہ ڈوبنے کی پوری پوری کوشش کریں گے، اجازت دیں۔" آفتاب نے جلدی جلدی کہا اور ساحل کی طرف رُخ کر لیا۔

"اب تم نہیں جا سکتے۔ میں تم لوگوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ختم کروں گا۔" شوبرا بھنّا اُٹھا۔

"آپ کو۔ ڈر نہیں لگے گا۔" مکھن ڈرے ڈرے لہجے میں بولا۔

"بکو مت۔ راجر۔ پہلے ان لوگوں کا صفایا کرو، پھر نقص دُور

کرنے جانا۔"

"نہیں شوبرا۔ ان لوگوں کو میرے پاس بھیج دو۔"

اچانک جزیرے میں ایک آواز ابھری۔ وہ سب چونک اٹھے، شوبرا کا رنگ اڑ گیا، کانپ کر بولا:

"او کے باس۔ یہ آ رہے ہیں۔"

"پیٹیاں پہنچنے میں جو دیر ہوئی، اس کے لیے سزا بھگتنے کے لیے بھی تیار رہو۔"

"بب۔ باس۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟" شوبرا کانپ اٹھا۔

"تم جانتے ہو شوبرا۔ میرے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ ان میں لچک نہیں ہوتی۔ تمھیں ہر طرح پہلے ہی اپنی تیاری مکمل رکھنی چاہیے تھی۔"

"تیاری ہر طرح مکمل تھی باس۔ عملی طور پر تجربات کر کے دیکھ لیے تھے۔ اس کے باوجود کوئی نقص پیدا ہو گیا۔ جو راجر چند منٹ میں دُور کر دے گا۔"

"خیر۔ پیٹیوں اور ان لوگوں کو اندر بھیجنے کے بعد تم بھی اندر آجانا اور ہاں۔ جزیرے اور جزیرے کے آس پاس سے انسانی ہاتھوں اور پیروں کے آثار ختم کر کے آنا۔ تاکہ ان لوگوں کی تلاش میں کوئی اور نہ آ جائے۔ اس بار تمھیں معاف کرتا ہوں۔"

"شکریہ باس! آپ کے ہر حکم کی تعمیل ہو گی۔" شوبرا نے کانپتی

آواز میں کہا۔

آواز آنی بند ہوگئی ۔ اب شوبرا ، راجر اور دوسرے ساتھیوں کی طرف مڑا :

" تم نے باس کا حکم سنا۔"

" ہاں مسٹر شوبرا ۔ ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں ۔ ہماری بہتری تو اسی میں ہے کہ ان کا ہر حکم بجا لائیں۔"

" تم نے ٹھیک کہا راجر۔ باس آخر باس ہیں۔ ہم تو ان کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہو سکتے۔ خیر۔ اب تم پہلے نقص دُور کرو۔ اس کے بعد ان لوگوں کو اندر پہنچاؤ اور پھر پیٹیاں جائیں گی۔"

" صرف پندرہ منٹ لگاؤں گا مسٹر شوبرا۔"

راجر نے کہا اور ایک سمت میں مڑ گیا۔ جلد ہی وُہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔ کیا خیال ہے۔ بھاگ کھڑے ہوں۔ شوبرا نے جیسے ان کے خیالات بھانپ لیے۔ مسکرا کر بولا :

" کوئی فائدہ نہیں ۔ بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟"

" یہی تو مشکل ہے۔ تم نے تو جہاز کو بھی نہ چھوڑا ۔ آخر جہاز کو تباہ کرنے کی کیا ضرورت تھی ۔ سونا تو تم اسے توڑے بغیر بھی نکال سکتے تھے۔"

" اس کے لیے بہت آدمیوں کی ضرورت ہوتی۔ یا پھر کرین لایا جاتا ، لیکن یہ ترکیب زیادہ آسان تھی ، اس لیے اس پر عمل کیا گیا۔"

" ہوں ! خیر اب ہمارے لیے کیا حکم ہے۔ ہم ذرا اِدھر اُدھر گھوم پھر آئیں۔ اور کچھ نہیں تو جزیرے کی سیر ہی کر لیں گے۔"

" راجر اپنا کام چند منٹ میں مکمل کر لے گا۔ اس لیے تم لوگوں کو اِدھر اُدھر ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

" آخر باس کو ہماری کیا ضرورت پڑ گئی۔" آصف نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

" یہ باس جانیں۔"

" اور ہمیں کہاں جانا ہوگا؟"

" ابھی دیکھ ہی لو گے۔ اتنے بے چین کیوں ہو۔" اس نے بھنا کر کہا۔

وُہ بے چین نہ ہوتے تو کیا کرتے۔ ان کے دو ساتھی سمندر میں رہ گئے تھے۔ اگر اس وقت وُہ ساتھ ہوتے تو ہرگز بے چینی کا اظہار نہ کرتے۔ وُہ سوچ رہے تھے۔ انھیں تو باس کے پاس لے جایا جا رہا ہے۔ ان کے بعد اگر کسی طرح ان کے دونوں ساتھی جزیرے پر آ گئے تو انھیں کس طرح معلوم ہوگا کہ اس جزیرے پر ان کے ساتھ کیا بیت چکی ہے۔ ابھی وُہ اسی اُلجھن

میں تھے کہ راجر کی آواز سنائی دی :

" نقص دُور کر دیا گیا ہے مسٹر شوبرا — اب ہم پیٹیاں اندر بھیج سکتے ہیں —"

" اور ان لوگوں کو بھی —" شوبرا مسکرایا۔

" ہاں بالکل — ان کے بعد خود ہمیں بھی جانا ہے ، پھر ہم جزیرے پر رہ کر کیا کریں گے —" راجر بولا۔

" بالکل ٹھیک — چلو جلدی کرو —"

اور انھوں نے اپنا کام جلد جلد شروع کر دیا — ایک گھنٹے بعد جزیرے پر نہ پیٹیاں رہیں ، نہ آفتاب وغیرہ اور نہ شوبرا اور اس کے ساتھی — پھر اچانک وُہ ستون بھی نیچے بیٹھنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ستون بھی غائب ہو گیا — اس کے غائب ہونے سے بننے والے خلا کی جگہ ایک درخت آ کر ٹک گیا — اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے اس جزیرے پر کیا کچھ تھا — اور ساحل پر بچا کھچا جہاز بھی بکھر کر بہہ چکا تھا —

○

" شش — شاید ہم کوئی بہت طویل خواب دیکھ رہے ہیں ۔" آفتاب بے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

" لیکن آخر کتنا طویل — یہ کب ختم ہو گا — ستون کا یہ سفر ہی ختم نہیں ہو رہا — آخر یہ ستون کس قدر گہرا ہے — یوں معلوم ہوتا ہے — جیسے ہم کسی لفٹ میں بیٹھے ہوں اور لفٹ نیچے ہی نیچے جا رہی ہو ، لیکن بھئی آخر یہ کس قدر نیچے جائے گی — کیا ہمیں پاتال میں لے جایا جا رہا ہے ۔" آصف بڑبڑایا۔

" کچھ نہیں کہا جا سکتا — کہ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے — میں تو اتنا جانتا ہوں کہ مسٹر شوبرا نے راجر کو حکم دیا تھا کہ ہمیں اندر پہنچانے کا انتظام کیا جائے — اس نے نہ جانے کیا کیا کہ ستون پر سیڑھی نمودار ہو گئی — اس سیڑھی کے ذریعے ہم ستون کے اوپر والے حصے تک پہنچے اور اس گول ڈبے میں داخل ہو گئے ، اب یہ ڈبا ہمیں نیچے لیے جا رہا ہے — نیچے ہی نیچے — نیچے جانے کا یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا — آخر مسٹر شوبرا اور اس کے ساتھیوں کی باری کب آئے گی ۔" شوکی کہتا چلا گیا۔

" ہمارے بعد شاید وُہ بھی اسی لفٹ کے ذریعے آئیں گے ، پیٹیاں پہلے ہی جا چکی ہیں — حیرت تو اس پر ہے کہ ہمیں اپنے دَم بھی گھٹتے محسوس ہو رہے — گویا ہوا کی آمد و رفت کا بھی انتظام ہے ۔"

" اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی بہت منظم گروہ کے جال میں پھنس گئے ہیں — سب سے زیادہ پریشانی اس بات کی

ہے کہ اگر کسی طرح ابا جان اور انکل اس جزیرے تک پہنچ گئے تو انھیں اس جزیرے کے بارے میں یہ سب باتیں کس طرح معلوم ہوں گی؟"

"انکل منور علی خان انھیں ستون وغیرہ کے بارے میں تو بتا ہی سکیں گے۔" آصف نے منہ بنایا۔

"ارے باپ رے۔" مکھن چیخ اُٹھا۔

"کیا بات ہے۔ خیر تو ہے۔"

"یہ۔ یہ دیکھیے۔ اب ہم چاروں طرف کا منظر دیکھ سکتے ہیں، اُف خدا۔ ہم تو سمندر میں نیچے ہی نیچے اُتر رہے ہیں۔"

وہ سب اس طرف متوجہ ہوگئے۔ اب تک وہ لوہے کے بنے ہوئے خول میں اترتے رہے تھے، اب لوہے کے خول کی جگہ شیشے کے خول نے لے لی تھی۔ ان کا ڈبا پہلے ہی شیشے کا بنا ہوا تھا۔ ان کے چاروں طرف سمندر کا پانی تھا۔ وہ سمندری مخلوق کو صاف طور پر دیکھ رہے تھے۔ بڑی اور چھوٹی مچھلیاں اور دوسری سمندری مخلوق انھیں تیرتی نظر آ رہی تھیں۔ ایسا منظر انھوں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ساتھ ہی ان پر شدید قسم کی گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ یہ احساس انھیں بے چین کرنے لگا کہ وہ سمندر کے نیچے ہی نیچے جا رہے ہیں، واپسی کس طرح ہو سکے گی۔

"اُف اللہ۔ یہ اس مرتبہ ہم کہاں پھنس گئے۔" اشفاق لرز اٹھا۔

"جیتے جی زمین کے نیچے پہنچ گئے۔" اخلاق نے فوراً کہا۔

"زمین کے نہیں۔ سمندر کے نیچے۔" مکھن نے مُنہ بنایا۔

"اور ابھی تک اس باس صاحب کے آثار نظر نہیں آئے۔ آخر۔ آخر وہ کہاں ہے؟"

"جہاں بھی ہے۔ ہم بھی وہیں جا رہے ہیں۔"

"مجھے تو اپنا ہارٹ فیل ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔" جالب نیاز نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس جگہ ہارٹ فیل کرانے کا کیا فائدہ۔" آفتاب بولا۔

"ہاں اور کیا۔ موقع محل بھی دیکھنا چاہیے۔"

"کک۔ کیا۔ آپ لوگوں کے دماغ اُلٹ چکے ہیں؟" کپتان عالم جاہ چیخا۔

"ہاں شاید۔ ان حالات میں دماغوں کا اُلٹ جانا کیا مشکل ہے۔ بلکہ دماغ کیا۔ سب کچھ اُلٹ سکتا ہے۔" آفتاب بولا۔

"اللہ اپنا رحم فرمائے۔ ایسے واقعات تو ہم نے کبھی خوابوں میں بھی نہ دیکھے ہوں گے۔" جالب نیاز بڑبڑایا۔

اچانک لفٹ کی رفتار بہت بڑھ گئی۔ مچھلیاں اور سمندر کی دوسری مخلوق بلا کی رفتار سے ان سے اوپر ہونے لگی۔ یہاں

یک کر انھوں نے خود کو سمندر کی تہہ سے بھی نیچے جاتے دیکھا
اور پھر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا، لیکن لفٹ اب بھی اسی رفتار
سے چل رہی تھی —

" ارے باپ رے — اس قدر گہرائی — مارے گئے —" آصف چلّا
اُٹھا —

" ظالمو — یہ ہمیں کہاں لیے جا رہے ہو ؟" شوکی چلایا۔

" اب شاید واقعی آپ لوگوں کے دماغ الٹنے لگے ہیں، حالانکہ
خود پر قابو رکھنے کی بہت ضرورت ہے۔ جو لوگ اس ستون کے
ذریعے اس جزیرے پر جا سکتے ہیں — اور ہمیں نیچے بھیج سکتے
ہیں — وہ ہمیں واپس جزیرے پر بھی پہنچا سکتے ہیں — میں تو حیران
ہوں — اس باس کو ہماری کیا ضرورت پڑ گئی — ہمارے لیے اس
قدر تکلیف کرنے کی اسے کیا ضرورت تھی ؟"

" کس قدر تکلیف — بھلا اسے کیا تکلیف ہو رہی ہے — آرام
سے بیٹھا ہمیں آتے دیکھ رہا ہوگا اور دل ہی دل میں ہماری اس
بے بسی پر ہنس رہا ہوگا — بلکہ کہہ رہا ہوگا — بڑے آئے جاسوس کہیں
کے —" آفتاب بولا۔

" اچھا کان نہ کھاؤ — تُمھاری زبان ان حالات میں بھی اسی رفتار
سے چل رہی ہے ؟" آصف جھلّا اٹھا۔

" تو کیا — اس کی رفتار کم ہو جانی چاہیے تھی ؟" آفتاب حیران

ہو کر بولا۔

" نہیں — پہلے کی نسبت کچھ بڑھ جانی چاہیے تھی — حالات ہی
ایسے ہیں ؟" مکھن مسکرایا۔

" اے — تم اپنی زبان قابو میں رکھو — کہیں لینے کے دینے نہ پڑ
جائیں ؟" آفتاب جھلّا کر بولا۔

" اگر لینے کے دینے پڑ گئے تو دے دیں گے — ایسی کون سی
بات ہے ؟" مکھن کی بجائے اخلاق بول اُٹھا۔

" لو چیونٹی کے بھی پر نکل آئے ؟" آصف ہنسا۔

" ایسے میں چیونٹی کہاں — میاں دماغ تو ٹھکانے ہے تمھارا ؟"
اشفاق بول اٹھا۔

" ہائیں ہائیں — یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ لوگ باقاعدہ
ہمارے مُقابلے پر اُتر آئے ہوں ؟" فرحت نے آنکھیں گھمائیں۔

" باقاعدہ تو خیر نہیں کہہ سکتے — ہاں بے قاعدہ ضرور مقابلے پر
اُتر آئے ہیں ؟" آفتاب نے منہ بنایا۔

" خود بڑے باقاعدہ ہیں نا ؟" مکھن جل کر بولا۔

" ویری گڈ — یہ ہوا نا جواب ؟" اشفاق خوش ہو کر بولا۔

" اگر یہ بات ہے تو پھر ہو جائے مقابلہ — دن میں تارے
نہ دکھا دیے تو میرا نام بھی آفتاب نہیں ؟"

" خیر — نام تو میرا بھی آفتاب ہے — حالات نے مکھن کہلوانے

پر مجبور کر دیا، یہ اور بات ہے۔" مکھن نے جلدی جلدی کہا اور وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ جالب نیاز اور کپتان صاحبان وغیرہ انھیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے:

"مجھے تو تم لوگ بھی کسی دوسری دنیا کی مخلوق جان پڑتے ہو۔ یہاں دم نکلا جا رہا ہے اور تم لوگوں کو بحث مباحثے کی پڑی ہے۔" عالم جاہ بولا۔

"آپ بڑے ہیں، کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہیں ہم آپ ہی کی دنیا کے انسان۔" فرحت مسکرائی۔

"حیرت ہے۔ اس سفر کا ابھی تک اختتام نہیں ہوا۔"

"کبھی تو ہوگا ہی۔"

اسی وقت انھیں روشنی دکھائی دی۔ ساتھ ہی ایک جھٹکا سا لگا، پھر اس ڈبے کا دروازہ کھل گیا۔

"باہر تشریف لے آئیے۔" ایک آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"خدایا تیرا شکر ہے۔ تو نے اس ڈبے کے سفر سے تو نجات دی۔" آفتاب بولا۔

باہر انھیں ایک کھلا میدان دکھائی دے رہا تھا۔ ڈبا سیدھا کھڑا تھا اور اس میں ایک دروازہ نمودار ہو چکا تھا۔ بالکل لفٹ والا سسٹم تھا۔ ڈبے سے باہر نکلے تو انھوں نے خود کو دس

آدمیوں کے درمیان کھڑے پایا۔ یہ دس کے دس آدمی بھی ان کی دنیا کے ہی تھے۔

"حیرت ہے۔ سمندر کہاں چلا گیا۔" مکھن بڑبڑایا۔

"سمندر بہت دور رہ گیا۔ بلکہ تمھاری دنیا بھی بہت دور رہ گئی۔"

"کک۔ کیا مطلب۔" وہ سب زور سے اچھلے۔ آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں کہ تم لوگ اپنی دنیا سے باہر نکل آئے ہو۔"

"نن۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"بالکل اسی طرح جس طرح خلا میں خلا نورد دوسرے سیاروں پر جا اترتا ہے۔ تم لوگ سمندر کے راستے ہوتے ہوئے دنیا سے باہر نکل آئے ہو۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" جالب نیاز چلا اٹھا۔

"خیر۔ تم لوگوں کے نزدیک نہیں ہو سکتا، لیکن یہ ہو چکا ہے۔"

"لیکن۔ تم لوگ تو ہماری دنیا کے ہی لگتے ہو؟"

"ہاں! جب ہم پہلی مرتبہ یہاں آئے تھے تو ہم نے بھی یہی محسوس کیا تھا جو اس وقت تم لوگ محسوس کر رہے ہو۔" ان

ہیں سے ایک نے کہا۔

" اور اس جگہ تمھارا ایک باس بھی موجود ہے ؟" آصف بول اُٹھا۔

" ہاں ، لیکن ذرا تمیز سے بات کرو۔ باس بہت معزز ہستی ہیں۔ اس دُنیا پر ان کی حکومت ہے۔ تم اپنی دُنیا سے ان کی دُنیا میں آ گئے ہو۔ یُوں سمجھ لو۔ یہ دُنیا ، دُنیا کے مقابلے میں ایک بالکل دُوسری دُنیا ہے۔"

" اور اس دُنیا کے باشندے ؟" شوکی نے سوال کیا۔

" باشندے بھی ہیں۔ جلد تم ان سے بھی ملو گے۔"

" لیکن اِس دُنیا اور اِس دُنیا کے باشندوں کو تم لوگوں اور ہم لوگوں کی کیا ضرورت پڑ گئی ؟" آصف نے حیران ہو کر پُوچھا۔

" یہ ایک بہت لمبا سوال ہے۔ میرا مطلب ہے۔ اس کا جواب بہت طویل ہے۔ مختصر طور پر کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔" اس نے کہا۔

" خیر۔ جو کچھ آپ لوگ بتا سکتے ہیں۔ وُہ بتا دیں۔"

" نہیں۔ ہمیں تو تم لوگوں کو صرف باس تک پہنچانا ہے ، آؤ چلیں۔"

" کیا ہم اس لفٹ کے ذریعے اس جزیرے پر واپس بھی جا سکتے ہیں ؟"

" کس جزیرے پر۔ اب اپنی دُنیا کا خیال دِلوں سے نکال دو ،

یہاں آنے کے بعد آج تک کوئی دُنیا میں واپس نہیں جا سکا۔"

" آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے ہم مر گئے ہیں ، کیونکہ مرنے کے بعد ہی انسان دُنیا میں واپس نہیں جا سکتا۔"

" ایک طرح سے تم لوگ مر ہی چکے ہو۔ اپنی دُنیا کے لوگوں کے لیے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

" لو بھئی۔ اب مرنا بھی کئی طرح سے ہونے لگا۔ ان کئی طرح میں سے ہم ایک طرح سے مر چکے ہیں ؟" مکھن نے رونی صورت بنائی۔

" تب تو ہمیں اپنے آپ پر رو دُھو بھی لینا چاہیے ، کیونکہ اور تو کوئی ہم پر روئے گا نہیں۔"

" کیوں۔ روئے گا کیوں نہیں۔ دُنیا میں جب تم لوگ گم شدہ تصور کر لیے جاؤ گے تو تمھارے عزیز رشتے دار ضرور روئیں گے۔" وُہ ہنسا۔

" گویا تمھارے رشتے دار بھی تمہیں رو دھو چکے ہیں۔" آصف نے منہ بنایا۔

" ہم گم شدہ نہیں ہیں ، ان کے پاس جاتے رہتے ہیں۔"

" اوہ۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔" آفتاب خوش ہو کر بولا ، لیکن پھر فوراً ہی اس کی مسکراہٹ بُجھ گئی۔ پہلے اسے خیال آیا تھا کہ وُہ بھی باس سے کہہ کر اپنے ابا جان اور انکل منور علی

خان کو یہاں بلوالے گا، لیکن پھر جب یہ بات یاد آئی کہ انھیں تو وہ سمندر میں چھوڑ آئے ہیں تو وہ غمگین ہو گیا۔

"آؤ۔ اب چلیں۔"

انھوں نے دیکھا۔ ان کے چاروں طرف ایک سبزہ زار پھیلا ہوا تھا، ہرے بھرے درخت لہلہا رہے تھے۔ درمیان میں ایک پختہ سڑک تھی۔ اس سڑک پر وہ چلنے لگے۔

"تو کیا یہاں آمد و رفت کے لیے سواریاں نہیں ہیں؟"

"سب کچھ ہے، لیکن یہ حصّہ اِس دُنیا کا ایک خاص حصّہ ہے۔ صرف باس کے لیے ہے۔ ان سے مُلاقات کے بعد جب تم لوگ دُوسرے یعنی عوامی حصّے میں جاؤ گے تو ہر چیز دیکھو گے، بلکہ اپنی دُنیا سے بھی دو ہاتھ آگے پاؤ گے اِس دُنیا کو۔"

"آپ کی باتیں ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔" اشفاق نے مُنہ بنا کر کہا۔

"کیوں؛ ان میں سمجھ میں نہ آنے والی کیا بات ہے۔" اس نے بھی بُرا سا منہ بنایا۔

"معلوم ہوتا ہے۔ بُرا سا منہ بنانے میں آپ ہم سے بھی تیز ہیں۔" آفتاب مُسکرایا۔

"ویسے آپ کا نام کیا ہے۔ کم از کم ہمیں یہ تو معلوم ہونا

چاہیے۔"

یہاں نام نہیں، کام ہوتا ہے اور کام کی نسبت سے پکارا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میں اس خاص حصّے کا رہنما ہوں، تم مجھے گائیڈ کہہ سکتے ہو۔"

"شکریہ مسٹر گائیڈ۔ تمھاری اس دُنیا کی آبادی کس قدر ہو گی؟"

"بس یہ نہ پُوچھو۔ یہی تو اصل مصیبت ہے۔"

"کک۔ کیا مطلب؟"

"اس دُنیا کی آبادی بے پناہ ہے۔"

"تو پھر۔ اس میں مصیبت کی کیا بات ہے؟" آصف حیران ہو کر بولا۔

"باس چاہتے ہیں۔"

گائیڈ کے الفاظ درمیان میں رہ گئے، کیونکہ اسے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ لمحے بھر کے لیے اس کا پورا جسم جھنجھنا اُٹھا، پھر اس نے ایک جھرجھری لی اور کانپتی آواز میں بولا:

"شکریہ باس۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ کہ کسی بھی نئے آنے والے کو یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔"

"حیرت ہے، لیکن اس قدر گہرائی میں ہوتے ہوئے تمھارے باس کو دُنیا کی خبریں کس طرح ملتی رہتی ہیں۔ یہ بات سمجھ میں

نہیں آئی۔" مکھن نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

" یہ تو ذرا بھی مشکل بات نہیں۔ میں بتا چکا ہوں کہ ہم لوگ سائنس میں بہت آگے ہیں۔ اپنی دنیا سے تمہاری دُنیا تک جانے کے لیے ہم نے سمندر میں سے راستہ بنایا ہے۔ تم اسی راستے سے ہو کر تو آئے ہو اور سب کچھ آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔"

" ہوں! تم لوگوں کے جو ساتھی ہماری دُنیا میں کام کر رہے ہیں، وہ اگر اس دُنیا میں آنا چاہیں تو وُہ کس طرح آئیں گے؟"

" وُہ پہلے ہمیں پیغام دیں گے۔ یہ پیغام اس جزیرے۔"

گائیڈ کے جسم کو ایک اور جھٹکا لگا، جسم جھنجھنا کر رہ گیا، وُہ پھر کانپتی آواز میں بولا:

" میں ایک بار پھر معافی مانگتا ہوں باس۔ نہ جانے ان لوگوں کی باتیں کس قسم کی ہیں کہ میں رَو میں بہہ کر وُہ باتیں بھی بتانے لگتا ہوں جن کے بتانے کا حکم نہیں ہے — اب میں ہر طرح محتاط رہوں گا۔" یہ الفاظ کہہ کر وُہ ان کی طرف مُڑا:

" بس۔ اب تم لوگ خاموش ہی رہو۔ تیسرا جھٹکا میرے لیے موت کا جھٹکا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ہماری دُنیا میں جب بھی کوئی شخص باس کی مرضی کے خلاف کام کرتا ہے۔ باس اپنی

دماغی طاقت کے ذریعے اسے ایک جھٹکا دیتے ہیں اور وُہ سنبھل جاتا ہے۔"

" دماغی طاقت۔ کیا مطلب۔" آصف حیرت زدہ ہو کر بولا۔

" مطلب میں نہیں بتا سکتا۔" اس نے بُرا سا منہ بنایا — اور ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے۔

" گویا اب آپ ہم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتے، ویسے ہم سمجھ گئے، یہ ٹیلی پیتھی قسم کی کوئی چیز ہے۔"

" پتا نہیں، تم کیا کہہ رہے ہو۔ اب مجھ سے باتیں نہ کرو۔"

" آؤ بھئی ہم آپس میں باتیں کریں۔" آفتاب بولا۔

" ایسے میں کیا باتیں کریں۔ کرنے کے لیے باتیں رہ ہی کیا گئی ہیں اور پھر میں تو بہت کمی محسوس کر رہا ہوں۔ شدید کمی۔" آصف نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔

" ابا جان اور انکل کی کمی؟" فرحت نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

" ہاں! اور ان کے ساتھ ساتھ انکل جمشید، محمود، فاروق اور فرزانہ کی بھی۔ کیا اس مرتبہ ہمارے ساتھ وُہ لوگ شامل نہیں ہوں گے۔"

" امکانات تو نظر نہیں آتے۔ بھلا وُہ ہم تک کس طرح پہنچ سکیں گے۔"

" اس کی ترکیب میرے ذہن میں آ گئی۔" مکھن بول اُٹھا۔

"کیا مطلب؟" فرحت نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔
"کک۔کیا۔یہ جملہ کہہ کر میں نے کوئی غلطی کی ہے؟" مکھن نے گڑبڑا کر پوچھا۔
"ہاں۔بڑی زبردست غلطی، کیونکہ ترکیبیں بتانے کا ٹھیکا تو اس کے پاس ہے اور یا پھر فرزانہ کے پاس۔بھلا یہ کس طرح چاہیں گی کہ ان کا ٹھیکا کسی اور کے پاس چلا جائے۔"
"یقین کیجیے فرحت صاحبہ۔میرا یہ ٹھیکا لینے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں۔" مکھن نے معصومانہ انداز میں کہا اور وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔
"مجھے ان لوگوں پر حیرت ہو رہی ہے۔یہاں جان نکلی جا رہی ہے۔اور یہ لوگ بے فکری سے ہنس بول رہے ہیں۔" جالب نیاز نے الجھن کے عالم میں کہا۔
"شاید یہ اس قسم کے حالات کے عادی ہیں۔" کپتان عالم جاہ بولا۔
"کوئی ایسے ویسے عادی۔بہت پرانے عادی کہیے۔ایسے حالات تو ہماری گھٹی میں پڑے ہیں۔" آفتاب جلدی جلدی بولا۔
"بس۔اب خاموش ہو جاؤ۔تم لوگ نزدیک پہنچنے والے ہو۔یاد رکھو۔باس کے ہر حکم کی تعمیل کرنے میں ہی تمہاری زندگی ہے۔ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔اور ہاں۔تم لوگوں کو

ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کے آگے جھک جانا ہوگا۔"
"کیا کہا۔مسٹر گائیڈ۔جھک جانا ہوگا۔" آفتاب چونک کر بولا۔
"ہاں۔یہاں رہنے والوں کو باس کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔جو نہیں جھکتا، اسے اس حد تک جھکا دیا جاتا ہے کہ پھر سیدھا ہونے کے قابل نہیں رہتا، اگر تم بھی یہ چاہتے ہو کہ پھر کبھی سیدھے نہ ہو سکو تو پھر بے شک نہ جھکنا۔"
وہ سکتے میں آگئے۔سوالیہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔اسی وقت ان کے سامنے ایک عالی شان سفید عمارت آگئی۔اس عمارت کے دوسری طرف دودھیا شیشے کی ایک بہت اونچی دیوار کھڑی تھی۔دائیں بائیں اور اوپر جہاں تک ان کی نظریں جا سکیں۔یہ دیوار نظر آئی۔مطلب یہ کہ دیوار کہیں بھی ختم ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔
"یہ۔یہ دیوار کیسی ہے؟"
"یہی وہ پردہ ہے۔اس پردے کے دوسری طرف ہماری دنیا آباد ہے۔"
"اوہ! اور باس اس عمارت میں ہے؟"
"تمیز سے، اگر نئے نہ ہوتے تو اسی وقت جل کر راکھ ہو جاتے۔" گائیڈ نے غرا کر کہا، وہ سہم گئے۔
"مم۔معاف کر دیں۔غلطی ہو گئی۔بچے ہیں نا۔" جالب نیاز نے

کانپ کر کہا۔

"میں اس عمارت کے دروازے تک آ سکتا تھا۔ اس جگہ سے آگے صرف وُہ لوگ جا سکتے ہیں جن سے باس ملاقات کرنا پسند کریں — سیدھے چلے جاؤ۔ دروازے خود بخود کھلتے جائیں گے۔"

گائیڈ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ وُہ دھک دھک کرتے دلوں کے ساتھ آگے بڑھے، عمارت کافی بڑی تھی، لیکن اس میں صرف ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ پوری کی پوری عمارت دُودھیا شیشے کی بنی ہوئی تھی۔ دروازے کے سامنے تین سیڑھیاں تھیں۔ یہ بھی شیشے کی تھیں۔ انھوں نے جونہی ان پر قدم رکھا، دروازہ کُھل گیا۔ وہ اس میں داخل ہو گئے۔ اب ان کے سامنے ایک برآمدہ تھا۔ سامنے ہی ایک اور دروازہ نظر آیا۔ اس کے سامنے بھی تین سیڑھیاں تھیں — انھوں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو یہ دروازہ بھی کھل گیا۔ اسی طرح تیسرا دروازہ بھی کُھلا۔ جونہی وہ اس میں داخل ہوئے، دروازہ بند ہو گیا۔ انھوں نے خود کو ایک بڑے اور چوکور کمرے میں پایا — اس کی چھت بہت اونچی تھی۔ فرش کے درمیان میں ایک گنبد سا اُبھرا ہوا تھا، اس میں سے ایک سرسراتی آواز آئی:

"جھک جاؤ۔ اس دُنیا کے باس کے سامنے جُھک جاؤ، پھر تم اس کے انعام و اکرام کے حق دار ہو گئے۔"

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ چہروں پر اُلجھنیں نظر

آئیں؛ تاہم کسی نے بھی اپنا سر نہ جھکایا۔

"اگر سر نہیں جھکاؤ گے تو انجام بہت بھیانک ہو گا۔ تم لوگوں کو سمندر میں بھی پھینکا جا سکتا تھا، لیکن میں نے تمھیں ایک خاص مقصد کے تحت یہاں بلا لیا۔ اس سلسلے میں بات پھر ہو گی۔ پہلا مرحلہ تو جھکنے کا ہے۔ تم اب تک جُھکے نہیں، یاد رکھو، اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو تمھیں جھکنا ہو گا۔"

انھوں نے پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آخر آفتاب نے ہمت کر کے کہا:

"کیا ہمیں سے کسی کو کچھ کہنے کی اجازت ہے؟"

"ہاں ضرور۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہ کہ ہم مُسلمان ہیں۔ اور مُسلمان ایک خُدا کے سوا کسی کے آگے نہیں جُھکتا۔ اب آپ ہی بتائیں۔ ہم جُھکیں تو کس طرح؟"

"میں نہیں جانتا۔ کس طرح جُھک سکتے ہو۔ بس تمھیں جھکنا ہو گا۔ یہاں میری حکومت ہے۔ میرا حُکم چلتا ہے۔ میرے حُکم کے بغیر یہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔" باس کی غصیلی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ کمرے میں ابھی تک انھیں کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔

"اور نہ جھکنے کی صورت میں ہماری زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ یہی بات ہے نا؟" آصف نے کہا۔

"ہاں۔ بالکل یہی بات ہے۔"

"کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ آپ ہمیں جھکنے پر مجبور نہ کریں۔ اور جس کام کے لیے یہاں لائے ہیں، وہی کام ہمارے ذمے لگا دیں۔ ہم اسے انجام دیتے رہیں گے۔"

"ٹھہرو۔ پہلے تو تمھیں یہ بتا دوں کہ میرا حکم نہ ماننے کی صورت میں تم لوگوں کا انجام کیا ہو گا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی سامنے والی دیوار سے روشنی کی ایک لکیر سی نکلی اور بالکل کسی تیر کی طرح ان کی طرف آئی۔ وہ بوکھلا اُٹھے، اور اِدھر اُدھر ہو گئے، لیکن اتنی دیر میں وہ جالب نیاز کے ایک ساتھی کے سینے پر لگ چکی تھی۔ انھیں یوں لگا جیسے روشنی کی لکیر اس کے سینے میں گھس گئی ہو۔ اس کے حلق سے ایک دِل دوز چیخ نکلی۔ دُوسرے ہی لمحے وہ کسی شہتیر کی طرح گرا۔ انھوں نے پھٹی پھٹی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ لرز اُٹھے، کیونکہ وہ جل کر کوئلہ بن چکا تھا۔ کمرے میں گوشت کے جلنے کی بُو لمحے بھر کے لیے محسوس ہوئی اور پھر غائب ہو گئی۔ اگر وہ بُو کچھ دیر موجود رہتی تو شاید ان کے دَم گھٹ جاتے۔

ان کے چہرے دُھواں ہو گئے۔ ایسے میں باس کی آواز گونجی:

"اب کیا خیال ہے۔ میرے سامنے جھکنا پسند کرو گے یا نہیں؟"

تیسرا حصہ

حادثاتِ غم سے ہے انسان کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لیے گردِ ملال
(اقبالؔ)

باس صاحب

"وہ۔۔ وہ تو کوئی کشتی معلوم ہوتی ہے۔" فرزانہ چلا اُٹھی۔

"کشتی نہیں۔۔ موٹر لانچ۔" محمود بولا۔

"بلکہ میں تو یہ کہوں گا۔۔ اللہ تعالیٰ کی مدد آ پہنچی۔" فاروق بولا۔

"فاروق کا جملہ پسند آیا۔ بات ہے بھی یہی۔" خان رحمان مسکرائے۔

"بشرطیکہ یہ ہمارے ہاتھ آ جائے۔" اکرام نے اُمید بھری آواز میں کہا۔

"اللہ نے چاہا تو ایسا ضرور ہوگا۔۔ خان رحمان۔۔ تم لوگ اس شہتیر کو مضبوطی سے پکڑے رہنا۔۔ محمود، فاروق اور فرزانہ تم بدستور اس کے ساتھ چمٹے رہنا۔ میں اس کشتی یا لانچ کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے شہتیر پر سے ہاتھ ہٹا لیے اور کشتی کی طرف تیرنے لگے۔ کشتی ان کے دائیں ہاتھ کی طرف سے آ رہی تھی۔ جونہی وہ اس کے نزدیک پہنچے۔۔ انھوں نے اس پر ہاتھ ڈال دیا۔ یہ ایک موٹر لانچ تھی اور بہت بڑی تھی، لیکن دُوسرا لمحہ حیران کن تھا۔۔ لانچ میں کوئی لیٹا ہوا تھا۔۔ اور اس

طرح لیٹا تھا جیسے بہت تھکا ماندہ ہو، کیونکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا
کہ وہ لانچ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوتا اور اسے چلا رہا
ہوتا۔ جونہی انھوں نے لانچ پر ہاتھ ڈالا۔ اسے ایک جھٹکا سا لگا،
اس نے آنکھیں کھول دیں اور ان کی طرف دیکھا:

"کون ہو تم؟" وہ بھنا کر بولا۔

"سمندر میں یہ سوال کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ بھئی جس طرح تم
مصیبت کے مارے ہو، اسی طرح میں ہوں۔ یہاں اس سوال کی
کیا ضرورت کہ کون ہو تم۔ مہربانی فرما کر مجھے لانچ پر سوار
ہونے دو۔"

"کیا تم جانتے ہو۔ ساحل کس طرف ہے؟" وہ بولا۔

"شاید۔ جانتا ہوں۔" انھوں نے کہا۔

"شاید! کیا مطلب۔ کیا تمھیں یقین نہیں؟"

"ہاں! میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اگر اس لانچ پر
سوار ہو سکا تو پھر ساحل تک پہنچنا بہت آسان ہو گا۔"

"ہوں۔ خیر۔ آ جاؤ۔" اس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ اور ان
کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ انھوں نے سٹیرنگ سنبھال لیا، ابھی تک
وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکے تھے۔

"تو کیا ساحل اس طرف ہے؟"

"نہیں اس طرف میرے کچھ ساتھی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" اس نے چونک کر کہا۔

"میں نے کہا ہے۔ اس طرف میرے کچھ ساتھی موجود ہیں۔"

"لیکن مجھے تو اس طرف کوئی کشتی وشتی نظر نہیں آ رہی؟"

"اگر ہمارے پاس کوئی کشتی ہوتی تو تمھاری لانچ پر سوار ہونے
کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ایک شہتیر کی مدد سے تیر رہے ہیں۔"

"اوہ، لیکن میں اس کشتی پر کسی اور کو سوار نہیں ہونے
دوں گا۔" اس نے کہا۔

"وہ کیوں۔ تمھارا کیا نقصان ہے؟"

"اس صورت میں طاقت کا توازن بگڑ جائے گا۔ مجھ ایک
کے مقابلے میں کئی ہو جائیں گے، پھر تم لوگ پہلا کام یہ کرو گے
کہ مجھے سمندر میں دھکا دے دوں گے۔"

"ارے نہیں۔ ہم بھلا ایسا کیوں کرنے لگے؟" انسپکٹر جمشید
ہنسے۔

"کچھ بھی ہو۔ میں کسی اور کو لانچ میں سوار ہونے کی اجازت
نہیں دوں گا۔" اس نے کہا:

"دیکھو دوست۔ ضد نہ کرو۔ ہم پہلے ہی زندگی اور موت کے
درمیان لٹک رہے ہیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں، تمھیں سمندر میں دھکا
نہیں دیں گے۔ آخر ہم ایسا کیوں کریں گے؟"

"میں انسانی فطرت کو جانتا ہوں۔ جب تم لوگوں کا کام نکل

جائے گا تو مجھے دھکا دے دیا جائے گا۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔" انھوں نے کہا۔

"اور میں کہتا ہوں۔ ایسا ضرور ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے وہ ان کی طرف بڑھا۔

"تمھارے ارادے تو نیک ہیں۔" وہ چونک اٹھے۔

"تمھیں لانچ میں سوار کرکے جو غلطی کی ہے، اب اس کے نتیجے سے بچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" یہ کہتے ہی اس نے انھیں بالوں سے پکڑ لیا اور اٹھانے کی کوشش کی۔ لانچ بُری طرح لہرائی۔ انھوں نے جلدی سے اس کا انجن بند کیا۔ اور سٹیرنگ پر سے ہاتھ ہٹا لیے۔ دوسرے ہی لمحے ان کے ہاتھ اس کی گردن پر جم گئے۔ ادھر اس نے ان کے بال پکڑے ہوئے تھے۔ جونہی اس کی گردن پر دباؤ پڑا۔ اس کے ہاتھ بالوں پر سے ہٹ گئے۔ اس کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید نے اس کی ٹھوڑی پر ایک مُکّا دیا۔ وہ دوسری طرف اُلٹ گیا اور اُلٹا گیا۔ لانچ کے کنارے سے ٹکراتا ہوا پانی میں جا گرا۔ انسپکٹر جمشید کنارے پر آ گئے:

"آؤ۔ اپنا ہاتھ مجھے پکڑا دو۔ بلاوجہ موت کو آواز نہ دو، میں تمھیں جان سے مارنا نہیں چاہتا۔ اپنے ساتھیوں کو سوار کرنے کے بعد بھی تمھیں سمندر میں دھکا نہیں دوں گا۔"

اس نے حیرت زدہ سے انداز میں اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور انھوں نے اسے اُوپر کھینچ لیا۔ وہ لانچ میں لیٹ کر ہانپنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد انسپکٹر جمشید اپنے ساتھیوں کو سوار کر چکے تھے:

"اب بتاؤ۔ تم کہاں سے آ رہے ہو دوست؟"

"م۔ میں۔ میں ایک جہاز پر تھا۔ ایک نامعلوم طاقت نے اس جہاز کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ میں نے جہاز کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ایک غلط فہمی کی بنا پر جہاز پر موجود لوگوں نے مجھے باندھ رکھا تھا۔ جہاز تباہ ہونے کے ساتھ میں بھی پانی میں گرا۔ ایسے میں میری رسیاں کھل گئیں۔ اس قسم کی اور لانچیں شاید جہاز پر ہنگامی حالات کے تحت موجود تھیں۔ میں نے اسے پانی میں تیرتے ہوئے پایا تھا۔ سو میں اس پر سوار ہو گیا، لیکن اس قدر تھکا ہوا تھا کہ لیٹ گیا اور نیند آ گئی۔ اگر تم نہ آ جاتے تو نہ جانے میں کب تک سوتا رہتا اور سمندر میں کہاں کا کہاں نکل گیا ہوتا۔" اس نے جلدی جلدی بتایا۔

"نامعلوم طاقت والی بات پلّے نہیں۔" محمود حیران ہو کر بولا۔

"میرا نام انسپکٹر جمشید ہے۔ یہ میرے بچے اور یہ ساتھی ہیں

ہم ایک —"

انسپکٹر جمشید کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ اسی وقت ان کے سر پر کوئی چیز پوری قوت سے لگی۔ وہ غرّا کر مُڑے ، لیکن اس سے پہلے ہی وہ چیز دوبارہ سر سے ٹکرائی۔ اتنی دیر میں محمود اس شخص کی طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔ وہ اس کی کمر کی طرف آیا اور پورے زور سے ٹکرا گیا۔ اس وقت تک خان رحمان غصّے میں بھر چکے تھے۔ انھوں نے اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور پانی میں پھینک دیا —

اب وہ سب انسپکٹر جمشید کی طرف مُڑے۔ ان کے سر سے خون بہہ رہا تھا —

"آپ — آپ ٹھیک تو ہیں؟"

"ہاں۔ فکر نہ کرو۔ اپنے رومال ملا کر میرے سر پر پٹی باندھ دو۔"

اسی وقت لانچ والا تیرتا ہوا لانچ تک آ گیا۔ اس نے جونہی ایک ہاتھ لانچ پر جمایا ، فاروق حرکت میں آ گیا اور اپنا جوتا اس کے ہاتھ پر مارا۔ وہ تلملا اٹھا۔ ہاتھ لانچ پر سے ہٹ گیا — اب وہ لانچ کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا :

"ب — بچاؤ — مجھے بچاؤ — لانچ پر سوار کر لو۔" وہ چلّا اٹھا۔

"تمھیں بچائیں — تم — تم کس قدر ظالم ہو — آخر ہم نے تمھارا کیا

بگاڑا تھا کہ تم یکایک ہم پر حملہ کر بیٹھے۔"

"میرا — میرا دماغ چل گیا تھا۔"

"نہیں محمود — اس کی بات کا یقین نہ کرنا۔ اس نے مجھ پر حملہ دراصل میرا نام سننے کے بعد کیا تھا ؛ گویا یہ مجھ سے واقف ہے اور سمجھ گیا کہ جونہی ہمیں اس کے بارے میں معلوم ہو گا — ہم اسے نہیں چھوڑیں گے — اوہ — اب میں نے اسے پہچان لیا ہے ، یہ سام لٹ ہے۔"

"سام لٹ !!" وہ دھک سے رہ گئے۔

"لیکن — میں — تم لوگوں کی معلومات میں بہت اضافہ کر سکتا ہوں — ایک ایسے جزیرے کے بارے میں بتا سکتا ہوں — جہاں تمھارے مُلک کے سونے کے جہاز کو تباہ کیا گیا ہے اور شاید سونا لوٹ لیا گیا ہے۔" سام لٹ بولا۔

"کک — کیا مطلب ؟" وہ سب کے سب حیرت زدہ انداز میں بولے —

"اگر یہ بات ہے — تو اسے چڑھا لیا جائے ، لیکن اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے جائیں — کہیں یہ پھر دغا نہ دے۔" انسپکٹر جمشید بولے —

"آ جاؤ بھئی۔" محمود نے کہا۔

اس نے ایک بار پھر لانچ کا رُخ کیا ، لیکن فوراً ہی اس

کے مُنہ سے چیخ نکل گئی :

" ارے — یہ میری ٹانگ کس نے پکڑ لی ؟"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر بلا کا خوف طاری ہو گیا — پورے جسم میں کپکپی دوڑ گئی — لانچ کی طرف بڑھتا ہوا اس کا ہاتھ دُور ہوتا چلا گیا — اور اس کا جسم پانی میں جانے لگا —

" اُف — اُف خدا — یہ — یہ تو کوئی مگرمچھ معلوم ہوتا ہے — م — مجھے — مجھے بچاؤ ۔"

" مگرمچھ سے تو تمھیں ہمارے والد صاحب ہی بچا سکتے تھے ، کیونکہ اس کے لیے پانی میں اُتر کر مگرمچھ سے جنگ لڑنا پڑتی — ہم میں سے کسی اور کو اس کا تجربہ نہیں — ہاں — ایک ہمارے انکل ہیں منور علی خان — بہت بڑے شکاری ہیں ، اگر وُہ یہاں ہوتے تو وُہ بھی کچھ کر سکتے تھے — اب مصیبت یہ ہے کہ اباجان کو خود تمھی نے زخمی کیا ہے — زخمی سر کے ساتھ یہ پانی میں نہیں کُود سکتے — سمندر کا نمکین پانی جب زخم پر لگے گا تو ایک تو ان کی جان پر بن جائے گی — دوسرے یہ کہ زخم خراب ہو جائے گا — اس لانچ پر فسٹ ایڈ کا سامان بھی نہیں ہے — اب تم ہی بتاؤ — ہم تمھارے لیے کیا کر سکتے ہیں ۔" فارُوق جلدی جلدی کہتا چلا گیا —

" فارُوق — تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا ۔" محمود بولا ۔

" یہ شاندار اندازہ تم نے کس طرح لگا لیا محمود ۔" فرزانہ مُسکرائی ۔

" اس لیے کہ اس بے چارے کے سر کو پانی کے نیچے گئے کئی سیکنڈ ہو گئے اور یہ حضرت ہیں کہ پھر بھی بولے چلے جا رہے ہیں ۔"

" اوہ — ارے — ہائیں — میں نے تو دیکھا ہی نہیں اسے غرق ہوتے — خدا اسے غریقِ سمندر کرے ۔" فارُوق بولا ۔

" لو اور سنو — غریقِ سمندر تو وُہ ہو ہی چکا ہے ۔"

" نہ جانے کس مذہب کا تھا — اب میں اس کے لیے غریقِ رحمت ہونے کی دُعا تو کرنے سے رہا — ویسے تھا ہمارا دشمن ہی — آخر یہ اس جہاز پر بندھا کیوں پڑا تھا — جس پر ہمارے مُلک کا سونا لے جایا جا رہا تھا ۔"

" اور وُہ جہاز لوٹ لیا گیا — ایک جزیرے پر — اباجان — وُہ جزیرہ یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہو سکتا — کیا خیال ہے ؟"

" بہت نیک — خان رحمان — لانچ تم سنبھال لو — اور اس کا رُخ اس طرف کر دو — جس طرف سے یہ لانچ آ رہی تھی — ہم اس جزیرے پر جائے بغیر نہیں رہ سکتے ۔"

" اچھی بات ہے ۔"

ابھی لانچ کا رُخ تبدیل ہوا ہی تھا کہ ان کی آنکھیں حیرت

سے پھیل گئیں ، پھر فرزانہ کے منہ سے نکلا :

" یا اللہ رحم ۔ اس سمندر میں کیا کچھ ہونا باقی ہے ۔ اب دو آدمی اور بہتے چلے آ رہے ہیں ۔ ابا جان ۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے ۔"

" یہ ہمارے ملک کے بھی ہو سکتے ہیں ، کیونکہ اس شخص کے بیان کے مطابق ہمارے ملک کا جہاز پہلے تباہ کیا گیا ہے اور اس کے بعد لوٹا گیا ہے ۔" انسپکٹر جمشید بولے ۔

" ہوں ۔ بات تو ٹھیک ہے ۔ اچھا تو پہلے ان کی طرف رخ کر لو ۔"

لانچ ان دو آدمیوں کی طرف بڑھنے لگی ۔ ادھر انھوں نے بھی لانچ کو دیکھ لیا تھا ۔ وہ ایک ایک ہاتھ بار بار ہلا رہے تھے ۔ ابھی وہ کافی دور تھے ، پھر جوں جوں وہ نزدیک آتے گئے ۔ ان کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیلتی چلی گئیں ۔

" اف خدا ۔ یہ ۔ یہ ۔ یہ تو ۔ انکل کامران مرزا اور انکل منور علی خان ہیں ۔ ہائیں یہ پانی میں کیا کر رہے ہیں ۔" فاروق نے گڑبڑا کر کہا ۔

وہ سب گھبرا گئے ۔ انھوں نے فاروق کا جملہ جیسے سنا ہی نہیں ۔

" یہ ۔ یہ تو قریباً بے ہوش ہونے کے قریب ہیں ۔ شاید

بہت دیر تک تیرنا پڑا ہے ۔ جلدی کرو ۔ انھیں سنبھال لو ۔"

ان سب نے مل کر انسپکٹر کامران مرزا اور منور علی خان کو لانچ پر چڑھا لیا ۔ انھوں نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور پھر جیسے ان کے جسموں میں زندگی دوڑ گئی ۔ چہروں پر رونق آ گئی ۔

" آ ۔ آپ ۔ یعنی کہ آپ ۔" انسپکٹر کامران مرزا ہکلائے ۔

" اور ہم بھی تو یعنی کہ انکل ۔" فاروق بولا ۔

" اوہ ہاں ۔ واقعی ۔ کیا ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہیں ۔" وہ بولے ۔

" جی نہیں ۔ ویسے ایک بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں ۔" فاروق بولا ۔

" کیا بات ؟" ان میں سے کئی حیران ہو کر بولے ۔

" یہ کہ انکل منور علی خان کی عمر بہت بڑی ہے ، کیونکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے ان کا نام لیا تھا ۔"

" ہاں واقعی ۔ یہ تو خیر ٹھیک ہے ۔" خان رحمان مسکرائے ۔

" لیکن کس سلسلے میں ؟" منور علی خان بولے ۔

" پہلے تو ہمیں ایک دوسرے سے مل لینا چاہیے ، نہ جانے کتنی مدت بعد تو ملے ہیں ۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے حالات سنیں گے اور سنائیں گے ۔"

"اور آپ لوگ جا کس طرف رہے ہیں؟" انسپکٹر کامران مرزا بولے ۔

"ایک جزیرے کی طرف۔ سنا ہے۔ اس جزیرے کے ساحل پر ہمارے ملک کا ایک جہاز لوٹا گیا ہے۔ اور اس پر سونا لدا ہوا تھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اوہ۔ بالکل ٹھیک۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ اس جزیرے کی طرف چلا جائے۔" منور علی خان بولے۔

"کیا مطلب۔ کیا آپ کو اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟"

"ہاں۔ بہت کچھ۔ اور سب سے دلچسپ بات یہ کہ آفتاب، آصف، فرحت اور شوکی برادرز شاید اس وقت اس جزیرے پر ہی ہیں۔"

"کیا!!!" محمود، فاروق اور فرزانہ پوری قوت سے چلا اٹھے، باقی لوگ مسکرانے لگے۔

"کیا آپ کو یقین ہے انکل؟"

"نہیں۔ امید ضرور ہے۔"

"بھئی پہلے حالات سن لو، پھر کچھ اندازہ ہو سکے گا۔" خان رحمان بولے۔

"اوہو۔ اکرام صاحب بھی نظر آ رہے ہیں، لیکن پروفیسر داؤد نہیں نظر آ رہے۔"

"ہاں! وہ نہیں آ سکے۔ حالات عجیب و غریب ہیں۔ انھیں ساتھ لینے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"خیر۔ پہلے آپ حالات سنائیں گے یا ہم۔"

"پہلے ہمارے حالات سن لیں۔ اور لانچ کا رخ ٹھیک جزیرے کی طرف ہی رکھیں، لیکن آپ کو اس کے رخ کے بارے میں بھلا کیوں کر معلوم ہو سکتا ہے؟"

"یہ لانچ اس طرف سے ہی آئی تھی۔ اس پر ایک شخص بھی سوار تھا۔"

پھر ان لوگوں نے اپنی کہانی انھیں سنائی۔ ان کے بعد انسپکٹر جمشید نے انھیں اپنے حالات سنائے۔ اور حالات سننے کے چکر میں راستہ کٹ گیا۔ انھیں جزیرہ نظر آنے لگا۔ ان کی نظریں ساحل پر جم گئیں:

"آفتاب وغیرہ ساحل پر کھڑے نظر تو آ نہیں رہے۔" فاروق بڑبڑایا۔

"جزیرے پر مجرم بھی تو موجود تھے، اگر وہ سب لوگ ابھی تک جزیرے پر ہی موجود ہیں تو وہ جزیرے کے درمیان میں اسی ستون کے پاس موجود ہوں گے۔"

"ایک تو یہ ستون میری سمجھ میں نہیں آیا۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"شاید وہ کوئی مقناطیسی ستون ہے۔ جو لانچوں اور جہازوں کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اور کیا انھوں نے یہ سارا انتظام صرف سونے کے جہاز کو کھینچنے کے لیے کیا تھا؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

آخر ان کی لانچ جزیرے سے آ لگی۔ وہ اللہ کا نام لے کر اُتر پڑے اور آگے بڑھے۔ ہتھیار تو ان کے پاس تھے نہیں۔ نہ ہی ساحل کے پاس درخت تھے۔ گویا دشمن سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ان حالات میں زیادہ سے زیادہ یہ کیا جا سکتا تھا کہ پیٹ کے بل رینگ کر آگے بڑھتے، لیکن یہ احتیاط بھی اس وقت اچھی لگتی تھی جب کسی خطرے کا امکان نظر آتا۔ انھیں تو ابھی تک جزیرے پر کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آئے تھے، آخر وہ آگے بڑھتے چلے گئے اور پھر منور علی خان ٹھٹک کر رُک گئے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، پھر وہ کسی چیز کی طرف دوڑ پڑے۔

○

چند لمحے تک کمرے میں موت کا سناٹا طاری رہا، پھر اشفاق

نے لب کھولے:

"دیکھیے۔ باس صاحب۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ہم میں سے ایک کو جلا کر بھسم کر چکے ہیں۔ باقیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کر سکتے ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا کہ باقیوں کا انجام کیسا ہو گا۔ زیادہ آپ کے اس ہتھیار سے جلیں گے یا نہیں، کیونکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ ہمیں جلنے سے بچا سکتا ہے۔ وہ تو وہ خدا ہے جو نمرود کی جلائی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کر سکتا ہے۔ آگ کو حکم ہو جاتا ہے کہ ٹھنڈی ہو جا۔ یہ آگ تو چیز کیا ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ ہمیں جھکنے کا حکم نہ دیں۔ یہ بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے، مسلمان صرف خدا کے سامنے جھکتا ہے۔"

"اب میری بات سنو۔ شوبرا اور اس کے ساتھی جب تم لوگوں کو سمندر میں پھینکنے والے تھے۔ تو مجھے یہی خیال آیا تھا اور میں نے تمھاری مسلمانی کو آزمانے کے لیے ہی تمھیں یہاں تک بلایا ہے، ورنہ تمھارا اچار نہیں ڈالنا تھا۔ اور نہ تم یہاں کسی کام کے ہو۔"

"گویا آپ کا مطلب ہے۔ ہم ناکارہ ہیں۔ ہم کسی کام کے نہیں۔" مکھن نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ہاں بالکل۔" اس نے کہا۔

"تب آپ نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔" مکھن جھنجھلا کر بولا۔

"کیا مطلب ۔ میں نے نئی بات نہیں کہی۔"

"ہاں ! یہ بات تو ہماری امّی ہم سے قریباً قریباً روز ہی کہہ دیتی ہیں ۔ لڑکو ۔ تم کسی کام کے بھی ہو یا بالکل نکمّے ہی ہو۔"

"مکھن ۔ یہ تم کہاں کی لے بیٹھے؟" شوکی نے اسے ڈانٹا۔

"امّی جان کے ہاں کی۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

"اچھا خدا کے لیے خاموش رہو۔"

"اب میں تمھیں ایک منٹ کی مہلت دیتا ہوں ۔ ٹھیک ایک منٹ بعد تم میں سے جو جھک گیا ۔ وہ زندہ رہے گا اور جو نہ جھکا ۔ وہ جل جائے گا۔" آواز آئی۔

اُن کے دل دھک دھک کرنے لگے ۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ۔ ہر ایک کی آنکھ میں ایک سوال تھا ۔ یہ کہ کریں تو کیا کریں ۔ کیا اس کے سامنے جھک کر مشرک بن جائیں ۔ شرک سے بڑا تو گناہ ہی کوئی نہیں ۔ اور تو سب گناہ معاف ہو سکتے ہیں ، شرک معاف نہیں ہو سکتا ۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ آواز اُبھری :

"ایک منٹ ہو گیا ۔ جھک جاؤ۔"

جالب نیاز ۔ عالم جاہ اور ان لوگوں کے ساتھی فوراً رکوع کی شکل میں جھک گئے ، لیکن ان میں سے کوئی بھی نہ جھکا ۔ سیدھے کھڑے رہ گئے ۔ انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور کلمۂ طیبّہ پڑھنا

شروع کر دیا ۔ چند لمحوں کے بعد ان کے جسم راکھ ہو جانے والے تھے ۔ اور پھر کمرے میں کئی دل دوز چیخیں بلند ہوئیں ، لیکن یہ چیخیں ان کے حلق سے نہیں نکلی تھیں ۔ چیخیں تو جالب نیاز ، عالم جاہ اور اس کے ساتھیوں کی تھیں ۔

انھوں نے بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں اور لرز اُٹھے ۔ وہ سب کے سب جل کر سیاہ ہو چکے تھے ۔ ایک لمحے کے لیے انسانی گوشت کے جلنے کی بُو ان کے نتھنوں میں آئی اور پھر ہوا صاف ہو گئی ۔ شاید ہوا کو صاف کرنے کے لیے بہت ہی تیز انتظام کیا گیا تھا :

"یہ ۔ یہ کیا باس صاحب؟"

"میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جو جھک جائیں گے ۔ موت بھی انھیں کی آئے گی ۔ اس طرح تم بچ گئے ، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے اپنا نظام بدل دیا ۔ یہاں آنے والے میرے سامنے جھکتے رہیں گے ۔ تم لوگوں کو تمھاری دلیری کی وجہ سے بخشتا ہوں، اب تم لوگ جا سکتے ہو۔"

"لیکن کہاں؟"

"گائیڈ بتائے گا۔"

"لیکن جناب باس ۔ ہم اس طرح کیونکر جا سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"ہم نے آپ کو تو دیکھا ہی نہیں۔"

"مجھے تو یہاں کسی نے بھی نہیں دیکھا۔"

"کسی ایک نے بھی نہیں؟" آفتاب حیران ہو کر بولا۔

"ہاں ۔ کسی ایک نے بھی نہیں ۔ کوئی نہیں جانتا ۔ میں کون ہوں ۔ بس سب کو یہی معلوم ہے کہ میں باس ہوں ۔ اور یہاں میری حکومت ہے ۔ یہ سب لوگ میرے اشاروں پر ناچتے ہیں۔"

"اچھا ایک سوال اور ۔ کیا ہمارے ملک کا سونا یہاں تک پہنچ چکا ہے؟"

"ہاں بالکل ۔ سونا ہی نہیں ۔ اور بھی بہت کچھ۔"

"اور بھی بہت کچھ ۔ کیا مطلب؟" شوکی نے حیران ہو کر کہا۔

"بس ۔ جاؤ ۔ تم ابھی بچے ہو ۔ ورنہ یہاں کسی کو سوال کرنے کی اجازت نہیں۔"

اس کے ساتھ ہی آواز بند ہو گئی ۔ وہ واپس مڑے ۔۔۔ جونہی انھوں نے قدم اٹھائے ۔ دروازہ کھل گیا ۔ اس طرح وہ عمارت سے نکلے ۔ جلی ہوئی لاشوں کو وہ کمرے میں ہی چھوڑ آئے تھے ۔ انھوں نے گائیڈ اور اس کے ماتحتوں کو اسی جگہ کھڑے پایا جہاں چھوڑ گئے تھے:

"مسٹر گائیڈ ۔ اندر کچھ جلی ہوئی لاشیں پڑی ہیں۔"

"ان کی تم فکر نہ کرو ۔ باس ایک بٹن دبائیں گے اور وہ لاشیں

ہوا ہو جائیں گی ۔ سناؤ ۔ کیا رہا؟"

"ہم تمھارے باس کے سامنے نہیں جھکے ۔ یہی دیکھنے کے لیے اس نے ہمیں بلایا تھا ۔ گویا ہم امتحان میں کامیاب ہو گئے اور جو فیل ہوئے، وہ جل کر راکھ ہو گئے۔"

"اوہ!" گائیڈ کانپ کر بولا۔

"اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟"

"تم لوگوں کے بارے میں فیصلہ بعد میں کیا جائے گا ۔ باس کا حکم یہی ہے، اس لیے آبادی میں بھیجنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ۔ آؤ تمھیں اس پردے کے دوسری طرف بھیج دوں۔"

"چلیے ۔" انھوں نے کندھے اچکائے ۔

گائیڈ پردے کی طرف چلا ۔ انھوں نے بھی قدم اٹھا دیے، نزدیک پہنچ کر اس نے دیوار پر ہاتھ رکھ کر نہ جانے کیا کیا کہ اس میں ایک دروازہ نمودار ہو گیا۔

"چلو بھئی ۔ دوسری طرف پہنچ جاؤ ۔ کوئی شرارت نہ کرنا، ورنہ یہاں باس کی ہر ہر گوشے پر نظر رہتی ہے۔"

"لیکن ہم جائیں گے کہاں ۔ رہیں گے کہاں؟"

"اپنے لیے مناسب سی رہائش تلاش کرنا تمھارا اپنا کام ہو گا۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

انھوں نے دروازہ عبور کیا اور دوسری طرف آ گئے ۔ فوراً ہی

ان کی کمر پر دروازہ بند ہو گیا۔ اب دیوار میں دروازے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ آصف نے ہاتھ پھیر کر دیکھنا چاہا، لیکن فوراً ہی اس کی چیخ نکل گئی۔ دیوار میں کرنٹ دوڑ رہا تھا۔ اسے ایک بہت زور دار دھکا لگا اور وہ کئی میٹر دور جا گرا:

"ارے باپ رے۔ یہ۔ یہ کیا ہوا؟"

"دیوار نے دھکا دیا ہے۔" مکھن بوکھلا کر بولا۔

انھوں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا۔ رنگ زرد پڑ چکا تھا اور پورے جسم میں زبردست قسم کا لرزہ پیدا ہو چکا تھا۔

"یہ۔ یہ ہم کہاں پھنس گئے؟" وہ ہکلایا۔

"حوصلہ رکھو، اگر ہم حوصلہ ہار بیٹھے تو کہیں کے بھی نہیں رہیں گے۔" فرحت نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد آصف اٹھ کر کھڑے ہونے کے قابل ہو گیا، اسی وقت ایک عجیب سی کار ان کے قریب آ کر رکی:

"کہاں جائیں گے؟" ڈرائیور بولا۔

"پپ۔ پتا نہیں۔" شوکی بولا۔

"پپ۔ پتا نہیں۔ کیا مطلب؟"

"بات دراصل یہ ہے جناب کہ ہم یہاں بالکل نئے ہیں۔ پہلی بار آئے ہیں آپ کی اس دنیا میں۔"

"اوہ سمجھا۔ آئیے۔ بیٹھ جائیے۔ میں آپ کو آبادی تک پہنچا

دیتا ہوں۔ اس کے بعد آپ جانیں، آپ کا کام۔"

وہ اس کار میں بیٹھ گئے، شاید یہ یہاں کی ٹیکسی تھی۔ جونہی ٹیکسی چلی۔ ان کے رنگ اڑ گئے، کیونکہ وہ اس قدر تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی کہ آج تک انھوں نے کسی کار کو چلتے نہیں دیکھا ہو گا۔ ہر آن انھیں یوں لگا۔ وہ اب ٹکرائے کسی چیز سے کہ اب ٹکرائے۔ لیکن ٹھیک ایک منٹ بعد انھوں نے آبادی کے آثار دیکھے۔ عجیب طرز کے مکان بنے ہوئے تھے۔ تکونے سے اور ایک ایک منزلہ۔ سفید رنگ کے۔ سب کے سب دودھیا شیشے کے بنے ہوئے۔ چہل پہل بھی نظر آئی۔ لیکن چلتے پھرتے لوگ عجیب و غریب شکل صورت کے ہرگز نہیں تھے۔ بالکل ان جیسے تھے۔ کسی نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ گویا یہ اس دوسری دنیا کی آبادی تھی، لیکن بہت ہی مختصر سی۔

"اتر جائیے جناب۔ یہی بستی ہے۔ میرا کام ختم ہے۔"

"بہت بہت شکریہ۔ کیا ہمیں آپ کو کرایہ بھی ادا کرنا ہو گا۔"

"نہیں۔ اس دنیا میں یہ نظام نہیں ہے۔ ہر چیز مفت ملتی ہے۔ باس کے احکامات کی تعمیل کرو۔ تمھاری تمام ضروریات وہ خود پوری کرے گا۔" اس نے کہا۔

"اوہ!" ان کے مُنہ سے نکلا، پھر وُہ ٹیکسی سے اُتر آئے۔

انھوں نے اس قسم کی اور ٹیکسیاں بھی آتے جاتے دیکھیں۔ ایسے میں شوکی کا ہاتھ ایک ٹیکسی کی طرف اُٹھ گیا۔ ٹیکسی فوراً ہی رُک گئی:

"یس سر!"

"ہم۔ ہم اس آبادی کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔" شوکی بوکھلا کر بولا۔ اس نے تو بس یونہی بے خیالی میں ہاتھ اٹھا دیا تھا۔

"تشریف رکھیے۔ کیا آپ یہاں نئے ہیں؟"

"جی ہاں۔ ابھی ابھی آئے ہیں۔"

"بھئی شوکی یہ کیا؟" آصف جھنا کر بولا۔

"آبادی کی سیر کر لینے میں کیا حرج ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ کوئی حرج نہیں۔"

آخر وُہ اس میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی چل پڑی۔ اور اس قدر تیز چلی کہ انھیں تارے نظر آ گئے۔ حلق سوکھ گئے۔ دو منٹ میں آبادی کی سیر مکمل ہو چکی تھی۔ بالکل چکنی سڑکوں کے دونوں طرف تکونے دُودھیا مکان بنے تھے۔ ان سب میں لوگ آباد تھے، اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف۔ آخر ٹیکسی ڈرائیور انھیں اسی جگہ اُتار کر چلا گیا، جہاں سے سوار کر کے لے گیا تھا۔

"آؤ بھئی۔ ابھی رہائش کا مسئلہ بھی حل کرنا ہے۔" آفتاب

نے کہا۔

وُہ آگے بڑھے اور ایک مکان کے قریب پہنچے، دروازے پر نام کی تختی لگی تھی۔ انھوں نے انگریزی میں لکھا ہُوا نام پڑھا اور سناٹے میں آ گئے۔

آرڈر کی تعریف

منور علی خان نے جُھک کر کوئی چیز اُٹھا لی :

" ارے ! یہ کیا ہے ؟" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

" یہ میرا ایک ہتھیار ہے۔ میں اسے درندوں سے بچنے کے لیے استعمال کیا کرتا ہوں۔ کچھ دیر پہلے جزیرے پر موجود دشمنوں کے خلاف استعمال کرنا چاہا تھا، لیکن پھر یہ میرے ہاتھ سے نکل کر اس ستون سے جا چپکا۔ ہم نے مل کر اسے کھینچ لینے کے لیے زور لگایا، لیکن یہ الگ نہ ہوا، اب یہ یہاں موجود ہے، لیکن وُہ ستون نہیں ہے۔"

" حیرت انگیز۔ ناقابلِ یقین، لیکن چونکہ یہ سب آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس لیے یقین کرنا ہی پڑتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ ستون تو چلو غائب ہوا تھا۔ آفتاب اور آصف وغیرہ کہاں چلے گئے۔ ان پر کیا گزری ؟"

" جہاز کی تباہی کا منظر سام لٹ نے خود دیکھا تھا۔ اس کا

مطلب ہے، وُہ سب لوگ جزیرے تک پہنچ گئے تھے۔ سام لٹ چونکہ بندھا ہوا تھا، اس لیے پانی میں چھلانگ نہ لگا سکا۔ ان لوگوں نے ضرور بروقت چھلانگیں لگا دی ہوں گی یا پھر جزیرے پر موجود دشمنوں نے جہاز تباہ کرنے سے پہلے انھیں اُتار لیا ہوگا، لیکن عجیب ترین بات یہ ہے کہ یہاں صرف ہمارے ساتھی ہی نہیں، دشمن بھی موجود نہیں ہے۔ آخر سب کے سب کہاں چلے گئے۔" انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

" ہمیں پورے جزیرے کا بغور جائزہ لینا ہوگا۔ اسی طرح ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے مشورہ دیا۔

" ٹھیک ہے۔" خان رحمان بولے۔

انھوں نے جزیرے کے چپّے چپّے کا جائزہ شروع کر دیا۔ اچانک اکرام کی آواز سنائی دی :

" اوہو۔ یہ اس درخت کے نیچے کیا پڑا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وُہ جھکا اور اس چیز کو اٹھا لیا، دوسرے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انھوں نے دیکھا، اس کے ہاتھ میں ایک رُومال لٹک رہا تھا۔

" یہ۔ یہ رومال شوکی کا ہے، میں نے اس کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔" منور علی خان بولے۔

" تب ہو سکتا ہے، یہ اس وقت یہاں گرا ہو، جب آپ

کی موجودگی میں دشمنوں سے یہاں جھڑپ ہوئی تھی۔" انسپکٹر جمشید بولے —

" نہیں — ہم اس وقت اس حصے میں نہیں آئے تھے۔"

" اس کا مطلب ہے، وہ جہاز سے اُتر کر جزیرے پر آئے تھے۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

" ان تمام باتوں سے زیادہ عجیب بات اس ستون کا غائب ہونا ہے۔ آخر ہم اس جگہ کو کیوں نہ غور سے دیکھیں جہاں ستون کھڑا تھا۔ ایک ایسا ستون جو بحری جہاز کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔" فرزانہ بے تابانہ بولی۔

" بات تو ٹھیک ہے۔ آفتاب وغیرہ کو تو ہم بعد میں تلاش کر لیں گے۔ پہلے تو اس ستون کو تلاش کرنا چاہیے۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرا کر بولے۔

" ستون کی تلاش۔" فاروق نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

" بس بس۔ یہ نہ کہہ اٹھنا کہ یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

" اچھا نہیں کہتا۔" فاروق معصومانہ لہجے میں بولا۔

وہ پھر اس جگہ پہنچے جہاں ستون کھڑا تھا اور جس جگہ سے منور علی خان نے اپنا ہتھیار اُٹھایا تھا:

" میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس جگہ یہ درخت نہیں تھا،

بلکہ ستون تھا۔" منور علی خان بولے۔

" گویا ستون کی جگہ درخت نے لے لی۔ تو پھر اسی درخت سے پوچھیے نا۔"

" اوہ۔ ارے۔ ہائیں۔" اچانک منور علی خان کے منہ سے نکلا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ چونک اٹھے۔

" یہ الفاظ تو ہم نے پہلے بھی سُنے ہوئے ہیں انکل۔" فاروق بولا —

" مجھے ایک بات سوجھی ہے۔ ہو سکتا ہے، وہ کام کی بات ہو۔" انھوں نے کانپتی آواز میں کہا۔

" خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ اور ہمیں چاہیے کیا۔ اس جزیرے پر بس کام کی باتوں ہی کی تو کمی ہے۔" فاروق بولا۔

" یار تم تو چُپ رہو۔" انسپکٹر جمشید جھلا کر بولے۔

" کیا خیال ہے انکل صاحبان۔ میں چُپ رہوں۔" فاروق شریر انداز میں بولا۔

" انکل صاحبان سے تو اس طرح پوچھ رہے ہو جیسے ابا جان کا حکم سُنا ہی نہیں۔" فرزانہ جھلا کر بولی۔

" بالکل سُنا ہے۔ میں تو اس خیال سے کہہ رہا ہوں۔ کہیں انکل صاحبان اداس نہ ہو جائیں۔"

" فاروق۔ میں نے کہا تھا، چُپ رہو۔ اس وقت ہم بہت

سنگین حالات سے دوچار ہیں۔"

"جی بہت بہتر۔ اب میں بالکل چُپ رہوں گا۔ جب تک کہ آپ مجھے بولنے کی اجازت نہ دے دیں۔"

"اور میں تمہیں یہ اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔" انھوں نے بھنّا کر کہا۔

"جی کیا مطلب۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اب کبھی بھی نہیں بول سکوں گا۔"

"ہاں! از کم اس مہم کے دوران۔" انھوں نے جل کر کہا۔

دُوسرے بے ساختہ انداز میں مُسکرا رہے تھے۔ ان کے رُخ فاروق کی طرف ہو گئے:

"ارے باپ رے۔ اتنا سخت آرڈر۔ ابا جان میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے اتنا سخت حکم پہلے کبھی نہیں دیا ہو گا۔"

"یہ تم چُپ ہوئے ہو؟"

"میں تو آپ کے آرڈر کی تعریف کر رہا ہوں۔"

"اور میں نے آرڈر کی تعریف کرنے کے لیے نہیں، تعمیل کرنے کے لیے کہا ہے۔" وُہ تیز آواز میں بولے۔

فاروق نے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لیے۔ اس کوشش میں

اس کا چہرہ بہت عجیب سا لگا۔ خان رحمان بے اختیار ہنس پڑے۔

"محمود اپنا چاقو دینا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ فاروق کانپ اٹھا۔

"ن۔ نہیں ابا جان نہیں۔" محمود ہکلایا۔ فرزانہ کا بھی رنگ اڑ گیا:

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابا جان؟"

"تم دونوں احمق ہو۔" انسپکٹر جمشید تلملا اُٹھے۔

"شش شکریہ ابا جان۔" محمود بولا۔

"تم نے چاقو نہیں دیا۔" وُہ غرّائے۔

محمود نے ڈرے ڈرے انداز میں جوتے کی ایڑی میں سے چاقو نکال کر دے دیا۔ ان کے رنگ سفید پڑ گئے، لیکن یہ دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی کہ وُہ فارُوق کی بجائے چاقو لے کر اس درخت کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"اُف خدا۔ ہم سمجھے تھے، آپ فارُوق کی زبان کاٹنے چلے تھے۔" فرزانہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

"اوہ۔ تو تم تینوں اس لیے خوف زدہ ہو گئے تھے۔ میں بھی حیران تھا۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ ویسے ہم لوگوں کی موجودگی میں تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے تھا۔ ہم جمشید کو ہرگز ایسا نہ کرنے دیتے۔" خان رحمان بولے۔

"انکل۔ آپ کو ایک بات سوجھی تھی۔"

"اوہ ہاں ۔ شوبرا کو جب بھی کوئی تبدیلی کرنا ہوتی تھی ۔ وہ اپنے ماتحت راجر کو حکم دیتا تھا اور وہ جزیرے کے ستون کی طرف دوڑ پڑتا تھا ۔ اور ایک درخت پر سوار ہو جاتا تھا ۔ جہاں تک میرا خیال ہے ۔ وہ درخت یہی ہے ، اگرچہ یہ پہلے یہاں نہیں ۔ یہاں تھا۔" انھوں نے اس جگہ کی طرف اشارہ کیا ۔ جو اب خالی پڑی تھی ۔

اب وہ اس جگہ کی طرف متوجہ ہوئے ۔ انسپکٹر جمشید بھی واپس مڑ آئے ۔ انھوں نے دیکھا ۔ وہاں ایسے کوئی آثار نہیں تھے کہ جیسے کوئی درخت جڑ سے اکھڑا ہو ؛ البتہ کچھ پہیوں کے چلنے کے نشانات ضرور تھے ۔

"اوہو ۔ یہ تو پہیوں والا درخت ہے ۔ یعنی چلتا پھرتا درخت ، اس قسم کے درخت ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں ۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا ۔

"ہاں ۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ درخت نقلی ہے ۔" انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے ۔

"آئیے ۔ دیکھتے ہیں ۔"

وہ درخت کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے ۔

"بھئی جمشید ۔ یہ تو مناسب نہیں ۔ مجھے مزا نہیں آ رہا ۔" ایسے میں خان رحمان بول اٹھے ۔

"کیا مطلب ۔ کیا مناسب نہیں ۔ اور تمھیں کس سلسلے میں مزا نہیں آ رہا ۔"

"فاروق کی زبان بندی کی وجہ سے ۔ مہربانی فرما کر اسے بولنے کی اجازت دے دو ۔"

"دھت تیرے کی ۔ ہوئی نا وہی بات جس کا مجھے پہلے ہی ڈر تھا ۔" انسپکٹر جمشید جھلا کر بولے ، پھر فاروق کو گھورتے ہوئے کہا :

"جاؤ ۔ تمھیں بولنے کی اجازت ، لیکن ایک حد تک ۔"

"لو ۔ لیکن ابا جان ۔ میں جاؤں کہاں ۔" فاروق نے اجازت ملتے ہی کہا ۔

"دیکھا خان رحمان ۔ یہ ہے اجازت دلوانے کا نتیجہ ۔ اب بھگتو خود ہی ۔"

"فکر نہ کرو جمشید ۔ بھگت لوں گا ۔"

انھوں نے چاقو کے ذریعے درخت کے پتے اور شاخیں کاٹ کاٹ کر دیکھیں ۔ دیکھنے میں تو درخت بالکل اصلی نظر آ رہا تھا اور بغور جائزہ لینے پر بھی کوئی اسے نقلی نہیں کہہ سکتا تھا ، لیکن چاقو کی مدد سے ان پر یہ حقیقت کھلی کہ وہ پورا کا پورا درخت نقلی ہے ۔

"تب منور علی خان ۔ تم ٹھیک کہتے ہو ۔ یہ درخت واقعی اس جگہ نہیں رہا ہو گا ، اس کی جگہ وہ ستون موجود تھا ۔ اب ستون

پتا نہیں کہاں ہے ؟" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

" یہ تو کوئی بہت ہی لمبا چکر معلوم ہوتا ہے " اکرام کانپ کر بولا۔

" ہاں خیر۔ اس کی لمبائی میں تو کوئی شک نہیں " فاروق نے کہا۔

" گویا ہمیں اس درخت کو یہاں سے ہٹانا ہوگا ، لیکن کیوں نہ اس سے پہلے درخت کے اوپر والے حصّے کا جائزہ لے لیا جائے ، کیونکہ راجر درخت پر چڑھتا رہا ہے۔ آخر وہ اوپر کیا کرتا تھا ، فاروق ۔ ذرا چڑھنا درخت پر۔ سنا ہے تم بہت ماہر ہو درختوں پر چڑھنے میں " منور علی خان بولے۔

" ماہر ضرور ہوں انکل ، لیکن مصنوعی درختوں پر چڑھنے میں نہیں " فاروق نے گھبرا کر کہا۔

" ایک ہی بات ہے۔ یہ درخت بالکل اصلی درختوں جیسا ہے ، شاباش چڑھ جاؤ " محمود نے شوخ لہجے میں کہا۔

" سمجھ لوں گا تم سے " فاروق نے اسے گھورا اور جوتے اُتار کر درخت پر چڑھنے لگا۔ درخت کا پھیلاؤ بہت تھا۔ نچلا حصّہ تو تھا ہی بہت بڑا ، اوپر بھی کچھ کم پھیلا ہوا نہیں تھا ، انھوں نے بغور چاروں طرف دیکھا تو باقی درخت اس درخت کے بچّے نظر آئے۔

" گویا یہ سردار درخت ہے " محمود بڑبڑایا۔

" آہستہ بولو ۔ فاروق سُن لیتا تو ابھی کہہ اٹھتا ۔ یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے " فرزانہ مسکرائی۔

فارُوق نے دونوں کے جملے سُن لیے ، لیکن جواب میں کچھ نہ بولا ، بس منہ بناتا اُوپر چڑھتا چلا گیا ، یہاں تک کہ بالکل چوٹی تک جا پہنچا :

" اب میں کیا کروں ؟"

" اس کا بغور جائزہ لو ۔ دیکھو کہ کوئی عجیب چیز تو اُوپر مُوجود نہیں ۔ کوئی ریموٹ کنٹرول جیسا آلہ " انسپکٹر جمشید بولے۔

" ج ۔ جی ہاں ۔ ایک بڑا سا آلہ مُوجود ہے تو سہی "

" اوہ ۔ تب تو تم نیچے آ جاؤ " انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔

" ج ۔ وہ کیوں ؟"

" اس لیے کہ اس آلے سے تم نہیں اُلجھ سکو گے ۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ کر بیٹھو "

" جی بہتر ۔ میں آ رہا ہوں " اس نے کہا۔

" کیا خیال ہے کامران مرزا ۔ ہم دونوں اوپر چڑھ کر دیکھیں " انسپکٹر جمشید بولے۔

" ہاں ! ٹھیک ہے "

اتنی دیر میں فارُوق اُتر چکا تھا ۔ انسپکٹر جمشید نے چاقو

محمود کو دیا اور انسپکٹر کامران مرزا کو ساتھ لے کر درخت پر چڑھنے لگے۔

"محمود۔ ذرا چاقو مجھے دینا۔" فرزانہ بولی۔

"کیوں۔ کیا چاٹو گی چاقو کو؟" فاروق نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تم سے اپنا دماغ چٹوانے سے تو یہی بہتر ہے کہ میں چاقو چاٹنا شروع کر دوں۔" فرزانہ جل کر بولی۔

"دے دو بھئی محمود۔ چاقو اسے۔ یہ بھی کیا یاد کرے گی۔" فاروق مسکرایا۔

"کیا چاک دے دوں۔" محمود تلملا کر بولا۔

"کک۔ کیوں، کیوں۔ کیا ہوا۔" فاروق نے ہکلا کر کہا۔

"چاقو تو یہ پہلے ہی مجھ سے لے چکی ہے، تم تو یونہی لکیر کے پیچھے پڑ جاتے ہو۔" محمود بھنا کر بولا۔

"دیکھا فارُوق۔ محمود تمہیں لکیر کا فقیر کہہ رہا ہے۔" فرزانہ شوخ انداز میں مسکرائی۔ ساتھ ہی ایک درخت کی طرف بڑھنے لگی۔

"کیا! محمود۔ تم نے مجھے لکیر کا فقیر کہا ہے۔" فاروق جھلّا کر اس کی طرف الٹ پڑا۔

"ہرگز نہیں۔ میں نے تو اس ضرب المثل کے وزن پر کہا ہے، سانپ نکل گیا، اب لکیر پیٹا کر۔"

"اور میں کہتا ہوں۔ یہ تم لکیروں اور سانپوں کے پیچھے کیوں پڑ

گھبرگئے ہو۔" اکرام بھی مسکراتا ہوا ان کی طرف بڑھ آیا۔

"کیا کیا جائے انکل۔ اس جزیرے پر اور ہے ہی کیا۔"

"لیکن فرزانہ۔ تم کیا کر رہی ہو؟"

"میں آس پاس کے درختوں کو دیکھ رہی ہوں۔ اوہو۔ ارے۔" پُرسکون انداز میں کہتے کہتے وُہ چونک پڑی۔

"کیا ہوا۔ کہیں سچ مچ کسی سانپ نے تو نہیں کاٹ لیا۔" محمود جلدی سے بولا، اب وہ سب فرزانہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"نن نہیں۔ سانپ نظر آجاتا تو یہ عجیب بات نہ ہوتی۔ کیونکہ جزیروں پر ایسی چیزیں ہُوا ہی کرتی ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"کیا بات ہے فرزانہ؟" اوپر سے انسپکٹر جمشید بولے۔

"ایک بہت ہی عجیب، لیکن پہلے آپ بتائیے۔ اوپر کیا رہا۔"

"درخت میں فٹ آکر ہماری سمجھ سے باہر ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"تب پھر نیچے آجائیے۔ ہم واقعی بہت سنگین صورتِ حال سے دوچار ہیں۔" فرزانہ کی آواز میں کپکپاہٹ انھوں نے صاف محسوس کی۔

انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا جلدی جلدی نیچے اترنے لگے، پھر مناسب فاصلے پر پہنچتے ہی انھوں نے چھلانگیں لگا دیں۔

"ہاں فرزانہ۔ کیا بات ہے؟"

"یہ۔ یہ تو سارا کا سارا جزیرہ ہی مصنوعی ہے۔"

"کیا!!!" وہ سب چلا اُٹھے۔

○

"اُف خدا۔ یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟" آفتاب نے کانپتی آواز میں کہا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں۔" پاس سے گزرتے ایک آدمی نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ۔ اس مکان میں۔ جو صاحب ہیں۔ ان کا نام یہی ہے؟" آصف نے دروازے پر لگی نام کی تختی کی طرف اشارہ کیا۔

"اگر یہاں یہ صاحب نہ رہ رہے ہوتے تو اس نام کی تختی کیوں لگی ہوتی۔" اس نے بُرا سا منہ بنایا۔

"اوہ۔ مم۔ معاف کیجیے گا۔" آصف گڑبڑا کر بولا۔ اور وہ آدمی آگے گزر گیا۔

"ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔"

"تو پھر دستک دے کر دیکھ لیتے ہیں۔" شوکی بولا۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔ اب جب کہ یہاں آ ہی گئے ہیں۔ پھر نہ کچھ

یہ کرنا ہی ہوگا۔" فرحت بولی۔

آفتاب ایک قدم آگے بڑھا اور دروازے پر لگا بٹن دبا دیا، اندر گونجنے والی آواز گھنٹی کی تو ہرگز نہیں تھی، انھوں نے جلترنگ سے بجتے محسوس کیا۔ ایک منٹ بعد قدموں کی آہٹ سُنائی دی، اور پھر دروازہ کھلتے ہی یہ الفاظ ان کے کانوں میں در آئے:

"معاف کیجیے گا۔ میں سو رہا تھا۔ ارے۔ یہ کیا۔"

"ہم بھی یہی کہہ سکتے ہیں، ارے یہ کیا۔" آصف نے منہ بنایا۔

"مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔" وہ شخص بولا۔

"تو ہمیں ہی کب آرہا ہے۔ اور یقین آ بھی جائے تو کیا ہے، ایسے یقین سے کیا ہوتا ہے۔ آخر آپ یہاں کیسے ہو سکتے ہیں۔ بھلا ہے کوئی تُک۔ آپ تو ہمارے مُلک کے مغربی حصّے میں قید تھے۔ ہاں ہم نے آپ کے فرار کی خبر ضرور سُنی تھی۔"

"اور جس نے ہمیں فرار کروایا تھا۔ وہ ہمیں یہاں لے آیا۔"

"کیا مطلب مسٹر لی کاف۔" آصف چونک کر بولا۔

"ہمیں فرار کرانے میں ہماری حکومتوں کا ہاتھ ہرگز نہیں تھا، ان کو تو معلوم بھی نہیں کہ ہمیں جیل سے نکلوا لیا گیا ہے۔ ہاں اخبارات میں فرار کی خبر پڑھ کر وہ ضرور حیران ہوئے ہوں گے کہ یہ کن لوگوں کا کام ہے اور یہ کہ ہم کہاں ہیں۔ اب انھیں کیا معلوم کہ ہم دوسری دُنیا میں ہیں۔"

"دُوسری دُنیا۔ تت۔ تو کیا مسٹر لی کاف۔ آپ مر چکے ہیں؟"
مکھن کانپ کر بولا۔

"ارے نہیں۔ تم غلط سمجھے۔ یہ دُوسری دُنیا دراصل ہماری زمین سے باہر ایک دُنیا ہے۔ اس دُنیا کا جو حکمران ہے۔ اس نے ہمیں جیل سے نکلوایا اور سیدھا یہاں لے آیا۔ اب یہاں صرف میں ہی نہیں۔ انورا کا اور آرٹی بناشا بھی موجود ہیں۔ آؤ۔ تمھیں ان سے بھی ملواؤں۔ ساتھ والے گھر ان کے ہی ہیں۔"

لی کاف نے کہا اور اپنے دروازے سے باہر نکل آیا۔ دروازہ کھلا ہی چھوڑ کر وُہ انھیں ساتھ لے کر چند قدم کے فاصلے پر بنے مکان تک پہنچا۔ انھوں نے دیکھا۔ اس دروازے پر انورا کا کا نام تھا۔

"ہم اس شخص سے کبھی نہیں ملے۔" آصف بولا۔

"اوہ ہاں۔ اس کا واسطہ دراصل انسپکٹر جمشید سے پڑتا رہا ہے، وُہ اور ان کے بچّے نظر نہیں آرہے۔ ارے ہاں میں تم سے یہ پُوچھنا تو بُھول ہی گیا کہ تم لوگ یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

"یہ ایک لمبی داستان ہے مسٹر لی کاف، لیکن تم اتنے بجھے بُجھے کیوں نظر آرہے ہو۔"

"ایک قیدی کس طرح خوش رہ سکتا ہے۔"

"کیا کیا۔ مسٹر لی کاف۔ آپ یہاں قیدی ہیں۔" آفتاب چلّا کر

بولا۔

"ہاں، لیکن چیخو نہیں۔ یہاں چیخنا منع ہے۔ یہاں صرف باس کا حکم چلتا ہے۔ پہلے ہم تمھارے مُلک کی جیل میں تھے، اب اس دُنیا کی قید میں ہیں۔ میں اُداس نہ ہوں تو کیا ہوں۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ جلد ہی انھوں نے انورا کا کی صورت دیکھی۔

"یہ۔ یہ کون لوگ ہیں مسٹر لی کاف۔ کیا نئے آئے ہیں؟"

"ہاں، نئے ضرور ہیں، لیکن میرے لیے نہیں۔ یہ لوگ انسپکٹر کامران مرزا کے ساتھی ہیں۔"

"آؤ بھئی۔ آرٹی بناشا سے بھی ملواؤں۔ آیئے مسٹر انورا کا۔"
آرٹی بناشا بھی بجھا بجھا نظر آیا۔ وہ اس قید میں خوش نہیں تھے۔

"تو پھر۔ آپ لوگ یہاں سے نکلنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

"ہر طرح ٹکر مار چکے ہیں، لیکن کامیاب نہیں ہوسکے۔" لی کاف بولا۔

"آپ جیسے اور بھی لوگ ہوں گے؟"

"ہاں۔ کئی بڑے بڑے جاسوس یہاں جمع ہو چکے ہیں۔ یہ ساری لائن ان لوگوں کی ہی ہے۔"

"اوہو اچھا۔ ذرا دیکھیں تو سہی۔ شاید ان میں کوئی ایسا بھی ہو جس سے ہم واقف ہوں۔"

وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ عجیب و غریب نام پڑھنے میں آئے، لیکن جانا پہچانا نام ایک بھی نہ نکلا، البتہ ایک دروازے پر مسٹر شوبرا لکھا دیکھ کر وُہ ضرور اُچھل پڑے۔ آفتاب نے بے اختیارانہ انداز میں شوبرا کے دروازے پر لگا بٹن دبا دیا، دروازہ کھلا اور شوبرا کی صورت دکھائی دی:

"تو آپ بھی یہاں قیدی ہیں، لیکن آپ تو اوپر جزیرے پر موجود تھے۔ وہاں سے آپ فرار ہو سکتے تھے۔"

"اگر فرار ہونا اتنا ہی آسان ہوتا تو یہاں مجھ سے بھی بڑے بڑے لوگ مُوجود ہیں۔ وُہ کبھی کے فرار ہو گئے ہوتے۔" شوبرا بولا۔

"اوہ۔ تو آپ جزیرے پر موجود ہوتے ہوئے بھی فرار ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔"

"جرأت ضرور کر سکتے تھے۔ باس کی طرف سے اجازت ہے، لیکن ہم مجبور ہیں، فرار نہیں ہو سکتے۔"

"آخر کیوں۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

"ابھی تم لوگوں کو اس دُنیا کی پہلی خوراک نہیں دی گئی۔ پہلی خوراک کھاؤ گے تو پتا چل جائے گا۔"

"یا اللہ رحم۔ وُہ۔ وُہ کیسی خوراک ہو گی؟"

اسی وقت نزدیک کے ایک مکان کا دروازہ کھلا اور ایک پتلا دبلا چھوٹے سے قد کا آدمی باہر نکلا، اس کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں، گال پچکے ہوئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ جلد کا رنگ نیلگوں تھا۔

"آئیے آئیے مسٹر گماٹا۔ آئیے۔"

"گماٹا!" ان کے مُنہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ہاں! گماٹا۔ یہ بے چارے بھی آ پھنسے، حالانکہ دُنیا کے خطرناک ترین آدمیوں میں سے ایک ہیں۔"

"اوہو اچھا۔" شوکی کانپ کر بولا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہاں دُنیا کے سبھی خطرناک آدمی آ جمع ہوئے ہیں۔ آخر یہ باس چاہتا کیا ہے؟" آفتاب پریشان ہو کر بولا۔

"یہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ وُہ کیا چاہتے ہیں؟"

"لیکن یہاں اتنی آبادی تو نظر نہیں آ رہی۔" فرحت چاروں طرف دیکھ کر بولی۔

"تم نے دُودھیا رنگ کی ایک لمبی چوڑی دیوار تو دیکھی ہو گی۔" لی کاف بولا۔

"جی ہاں! بالکل دیکھی تھی۔"

" تو بس پھر — ہم قیدیوں کی [illegible] آبادی سے آگے ویسی ہی ایک دُوسری دُودھیا دیوار ہے ، اس دیوار کے دُوسری طرف باس کی قوم آباد ہے — اس کا کہنا ہے کہ اگر وُہ اس دیوار میں صرف ایک دروازہ کھول دے تو اس کی قوم اتنی بڑی تعداد میں اس طرف آجائے گی کہ ہم لوگ صرف اس کے دھکّے کھا کھا کر ہی مر جائیں گے اور اگر اس قوم کو لفٹ کے ذریعے اوپر بھیجنے کا عمل شروع کر دیا جائے تو زمین پر بس یہ لوگ ہی نظر آئیں گے — گویا کہنے کا مطلب یہ کہ ان کی آبادی اس قدر زیادہ ہے ۔"

" اف خدا — گویا ہم دو دُودھیا دیواروں کی قید میں ہیں ، ایک دیوار کے اس طرف باس ہے تو دوسری دیوار کے اس طرف اس کی قوم — اب ہمارا کیا بنے گا ؟"

" بننا کیا ہے — باس ہمیں یہاں کسی مقصد کے تحت لایا ہے ، جب تک وُہ اپنا مقصد حل نہیں کر لیتا ، اس وقت تک ہم اس کے قیدی ہیں اور اس کے بعد وہ ہمیں ختم کر دے گا — بس یہی ہمارا انجام ہے — یا اپنی قوم کی طرف ایک دروازہ کھول دے گا اور وُہ ہمیں پیس ڈالے گی ۔"

" آپ کو بھی مسٹر لی کاف ۔" اخلاق حیران ہو کر بولا ۔

" ہاں تو اور کیا — میں ہزاروں لوگوں کا کیا بگاڑ سکوں گا ، جب

ایک ہی وقت میں وُہ مجھ پر آ ٹوٹیں گے ۔"

" اوہ ۔" ان کے منہ سے نکلا ۔

" اور فرار کا کوئی راستہ ہے نہیں ۔" انورا کا بولا ۔

" افسوس — ہم اپنے آپ کو بڑے تیس مار خان سمجھا کرتے تھے ، یہاں آ کر معلوم ہوا ہم کچھ بھی نہیں ہیں ۔" گماٹا کی لڑکھڑاتی آواز سُنائی دی ۔

" مسٹر لی کاف — آپ نے ان صاحب کے بارے میں کہا تھا ، یہ بھی دُنیا کے خطرناک ترین آدمیوں میں سے ایک ہیں — کیا یہ سچ ہے ؟"

" ہاں ! اس میں کوئی شک نہیں ۔" وُہ بولا ۔

" لیکن ہمیں تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی ایک ان کے ایک ہاتھ بھی جڑ دے تو دُور جا کر گرے ۔" مکھن نے منہ بنایا ۔

" تم — تم نے یہ الفاظ میری شان میں کہے — تمہیں یہ الفاظ واپس لینا ہوں گے ۔"

" ارے میاں جاؤ — بڑے آئے الفاظ واپس دینے والے ، ہم لوگ دی ہوئی چیز کو واپس نہیں لیا کرتے — جاؤ — جو چیز دے دی ، وُہ دے دی ۔" مکھن نے جلدی جلدی کہا ۔

" مسٹر لی کاف — میں اس ننھے بچّے کو سبق دینے پر خود کو

بالکل مجبور پا رہا ہوں۔"

"تو دے دو نا بھئی سبق۔ روکا کس نے ہے۔ یہاں کسی کو یہ حق نہیں کہ کسی دوسرے کی شان میں گستاخی کرے۔" لی کاف بولا۔

"شکریہ مسٹر لی کاف۔" گماٹا نے کہا اور مکھن کی طرف بڑھا۔

"تت۔ تو کیا آپ سب لوگ مسٹر لی کاف کے ماتحت ہیں؟"

"ارے نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس چونکہ قیدی ہیں، اس لیے مل جل کر وقت گزار لیتے ہیں۔ یوں مسٹر گماٹا مجھ سے کم خطرناک نہیں ہیں۔"

"ارے باپ رے۔ یہ میں کیا سُن رہا ہوں؟" مکھن کانپ اُٹھا۔

"اب کانپنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب تمھیں سزا جھیلنا ہوگی۔"

"لل۔ لیکن۔ مسٹر گماٹا۔ یہ تو سوچ لیں کہ ابھی ہم یہاں بالکل نئے نئے آئے ہیں۔"

"تو پھر۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو کہہ رہا ہوں۔ اپنے الفاظ واپس لے لو۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔ میں دی ہوئی چیز کو واپس نہیں لیا کرتا۔" مکھن بولا۔

"اسی لیے تو تمھیں سزا بھگتنا ہوگی۔"

"اور کیا مسٹر باس بھی اس کی اجازت دے گا۔"

"وہ ہمارے آپس کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔ ہاں جب ہماری یا ہم میں سے کسی کی ضرورت پڑتی ہے تو طلب کر لیتا ہے۔ اور ہدایات دے دیتا ہے۔ اس کے بعد ہمیں صرف اور صرف اس کی ہدایت پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ گویا اس وقت ہم ایک حد تک آزاد ہیں۔"

"لیکن یہ کیا انصاف ہے کہ نئے آنے والوں کی چٹنی بنا دو۔" آفتاب نے منہ بنا کر کہا۔

"اور نئے آنے والوں کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ یہاں موجود لوگوں کی بے عزتی کر ڈالیں۔" اتنا کہتے ہی گماٹا اُچھل کر ان کے نزدیک پہنچ گیا۔

"ارے باپ رے۔ اتنا پھرتیلا پن اور ہڈیوں کے اس ڈھانچے میں۔ مَیں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" مکھن نے کانپ کر کہا اور بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔ اس کے پیچھے اشفاق تھا۔ وہ اس سے جو ٹکرایا تو دونوں بُری طرح لڑکھڑائے۔ ادھر گماٹا نے ایک مُکّا مکھن کی طرف اُچھالا۔ اس وقت تک مکھن کو بچانے کے لیے آصف آگے بڑھ چکا تھا۔ لہذا یہ مکّا اسے وصول کرنا پڑا:

"ارے باپ رے۔ اتنا زبردست مکّا۔" آصف چیخ پڑا اور ٹھوڑی دونوں ہاتھوں میں پکڑے بیٹھتا چلا گیا۔

گماٹا نے اپنا نشانہ چوکتے دیکھا تو بھنّا کر آگے بڑھا۔ اور مکھن

کو دونوں شانوں کو پکڑ لیا۔ پکڑتے ہی اس بُری طرح جھنجوڑا کہ
مکھن میاں کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ اور پھر جو جھٹکا دیا تو
وُہ دُور تک لڑکھڑاتا چلا گیا۔ اب ان کے اردگرد تماشائی بھی رُکنے
لگے۔ آخر یہ قیدیوں کی پوری آبادی تھی۔ کوئی دو چار قیدی تو
تھے نہیں۔

گماٹا نے جب دیکھا کہ وُہ مکھن کو سزا دے چکا ہے تو مطمئن
انداز میں اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا۔ ایسے میں شوکی کو نہ جانے کیا
سوجھی، اچانک نیچے بیٹھ گیا اور گماٹا کی ٹانگ پکڑ لی۔ گماٹا سوچ
بھی نہیں سکتا تھا کہ ان میں سے کوئی اب حرکت کر سکتا ہے۔
لہذا وُہ منہ کے بل گرا۔ یہ دیکھتے ہی اخلاق نے تالی بجا دی، لیکن
دوسرے ہی لمحے اس کی تالیوں کا گلا گھٹ کر رہ گیا۔ گماٹا گرتے ہی
بجلی کی سرعت سے اٹھا تھا۔ ساتھ ہی اس کے دُوسرے پیر کی ٹھوکر
شوکی کے سر میں لگی۔

یہ دیکھ کر آفتاب، آصف اور فرحت جوش میں آ گئے۔
تینوں تین طرف سے گماٹا کی طرف بڑھے۔ ادھر مکھن، اشفاق اور
اخلاق کو بھی غصہ آ گیا۔ شوکی بے چارہ تو اپنا سر پکڑے بیٹھا
تھا۔ آصف نے اچھل کر گماٹا پر وار کیا، اس نے بے فکری سے
ایک طرف ہو کر اس کا وار خالی دیا اور اسے دونوں ہاتھوں سے
پرے اُچھال دیا۔ وُہ ہوا میں اُڑتا۔ شوکی پر گرا۔

"ارے یہ میرے اُوپر کیا گرا؟"

"لگ کوئی ایسی ویسی چیز نہیں۔ صرف میں ہوں۔" آصف
بے چارگی کے انداز میں بولا۔

اتنی دیر میں آفتاب حملہ کر چکا تھا۔ اس نے موقع پا کر سر
کی ٹکر گماٹا کی کمر میں دے ماری، لیکن وُہ یک دم مُڑا اور
اس کی ٹکر اس کے پہلو میں لگی، ساتھ ہی گماٹا کا ہاتھ اس کی
گدی پر آ جما اور اس نے اسے آگے کی طرف دھکیل دیا۔ وُہ بھی
سیدھا شوکی سے جا ٹکرایا:

"ارے مرا۔ یہ اور کیا چیز آ گری؟"

"یہ بھی۔ چیز نہیں۔ آفتاب ہے۔" آصف بولا۔

ادھر فرحت نے اُچھل کر گماٹا کی گردن میں بازو ڈال دیے، لیکن
گماٹا نے بجلی کی سی سرعت سے ایک جھٹکا دیا۔ وُہ چکر کھاتی اخلاق
سے جا ٹکرائی۔ دونوں دھڑام سے گرے۔

گویا پل بھر میں میدان صاف تھا۔ اسی وقت انھوں نے
پُرجوش انداز میں تالیاں بجنے کی آواز سنی۔ دیکھا تو لی کاف وغیرہ
زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے۔ ایسے میں لی کاف کی آواز
گونجی:

"بھئی واہ۔ قید کی اس زندگی میں یہ پہلی تفریح میسّر آئی
ہے۔"

عین اسی وقت ایک تیز آواز گونجنے لگی۔ وُہ سب چونک اُٹھے:

"اوہو۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ آؤ بھئی چلیں۔ ان لوگوں کو بھی تو قید کی زندگی کا پہلا کھانا کھانا ہے۔ گویا پہلی خوراک ملنے والی ہے۔ اس کے بعد یہ بھی ہماری طرح باس کے غلام بن جائیں گے۔" لی کاف کی آواز سے شوخی غائب تھی۔

انھوں نے دیکھا۔ وہ سب سر جھکائے ایک طرف جا رہے تھے۔ انھوں نے بھی قدم اسی طرح اٹھا دیے۔ گماٹا بھی ان کے ساتھ ہی چل رہا تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے تھوڑی دیر پہلے ان کے درمیان کوئی لڑائی ہوئی ہی نہ ہو۔

وُہ ایک ہال میں داخل ہوئے۔ بہت بڑا کمرہ تھا۔ اس کے درمیان میں بہت لمبی میز بچھی تھی۔ اس میز کے چاروں طرف کُرسیاں تھیں۔ پورے میز پر برتن سجے تھے۔ وُہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ آفتاب اور شوکی وغیرہ نے بھی کرسیاں سنبھال لیں۔ ان کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ لی کاف کے ساتھ والی کرسی شوکی کے حصے میں آئی تھی۔ اس نے لی کاف کے کان میں کہا:

"مسٹر لی کاف۔ کچھ بتائیے تو سہی۔ پہلی خوراک سے آپ کی مراد کیا ہے؟"

"تت۔ تم۔ تم وہی ہو، جس نے میرے سر میں دے مارنے کے لیے اینٹ انسپکٹر جمشید کو دی تھی؟"[1]

"ج۔ جی ہاں۔ ہوں تو وُہ میں ہی۔" شوکی کانپ اُٹھا۔

"خیر۔ موقع ملا تو تم سے سمجھوں گا۔ پہلی خوراک کا مطلب یہ ہے کہ یہاں سب لوگوں کو کھانے سے پہلے ایک ایک گولی کھانا پڑتی ہے۔ جب تک وہ گولی نہ کھائیں گے، کھانا نہیں ملے گا۔"

"اور وہ گولیاں کیسی ہیں؟"

"غلام بنا دینے والی گولیاں۔ ایک بار کھا لینے کے بعد انسان ان کا عادی ہو جاتا ہے، پھر ان کے بغیر رہ نہیں سکتا۔"

"لیکن ہم انھیں کھائے بغیر اِدھر اُدھر بھی تو پھینک سکتے ہیں، کھانا تو میز پر لگا ہوا ہی ہے۔" شوکی بولا۔

"یہ بات نہیں۔ پہلے دن آنے والوں کے منہ میں نگران خود گولیاں ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد ہی کھانا ملتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہم لوگوں کے سامنے اس وقت جو برتن رکھے ہیں۔ وُہ خالی ہیں۔ ان میں کھانا اس وقت ڈالا جائے گا جب تم لوگ گولیاں نگل لو گے۔ ہاں، باقی لوگوں کو دے دیا جائے گا۔"

"اوہ۔ تو کیا آپ اپنے حصوں میں سے تھوڑا سا کھانا

[1] "دُنیا کے قیدی" پڑھیے۔

ہمیں نہیں دے سکتے۔"

" یہاں کھانا بس اتنا ملتا ہے کہ مشکل سے پیٹ بھر سکے، لہذا ان حالات میں اپنے حصے میں سے کون کھانا دے سکتا ہے۔"

" اور اگر ہم ان گولیوں کو منہ میں لینے سے انکار کردیں۔"

" تو کھانا کھلانے والے زبردستی نہیں کریں گے، بس تم لوگوں کو کھانا نہیں دیں گے۔"

" تب تو۔"

شوکی کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور آٹھ آدمی کھانے کے بڑے بڑے تھال اُٹھائے اندر داخل ہوئے۔ شوکی، لی کاف سے ہونے والی گفتگو باقی ساتھیوں کو بتانے لگا۔ ان کے رنگ اُڑتے چلے گئے۔ اسی وقت ایک میزبان نے آگے آکر کہا:

" نئے آنے والے کون کون ہیں۔ اُٹھ کر کھڑے ہو جائیں۔"

انھوں نے دیکھا، اس کے ہاتھ میں کوئی تھال نہیں تھا، گویا یہ ان آٹھ کے علاوہ تھا جو تھال لیے اندر داخل ہوئے تھے، وہ کھڑے ہو گئے۔ نویں آدمی نے انھیں گنا، پھر بولا:

" ٹھیک ہے۔ یہ پورے ہی ہیں۔ گویا اس وقت تمام قیدی یہاں موجود ہیں۔ آپ سب کھانا شروع کرنا پسند کریں گے یا پہلے ان لوگوں کو پہلی خوراک کھاتے دیکھیں گے۔"

" پہلے انھیں دیکھیں گے۔" گماٹا نے غرّا کر کہا۔

" اوہ ہاں۔ میں سُن چکا ہوں۔ آپ کی ان لوگوں سے جھڑپ ہوئی ہے۔" اس نے مُسکرا کر کہا۔

" اگر کھانے کی گھنٹی نہ بج جاتی تو یہ جھڑپ ابھی جاری تھی۔ اور میں ان لوگوں کو چھٹی کا دُودھ یاد دلا دیتا۔" گماٹا بولا۔

" آپ فکر نہ کریں مسٹر گماٹا۔ چھٹی کا دُودھ ہم لڑے بھڑے بغیر ہی یاد کر لیں گے۔" آفتاب جلدی سے بولا۔

" لو بھئی۔ تم لوگ پہلی خوراک کھا لو۔ ہم سات گولیاں لائے ہیں۔ ایک ایک لے لو۔ لو شاباش۔ منہ کھولو۔"

" ہم۔ ہم یہ گولیاں نہیں کھائیں گے۔" فرحت پُرعزم لہجے میں بولی۔

" بھئی۔ سوچ لو۔ بھوکا رہنا پڑے گا۔"

" پروا نہیں۔" فرحت نے کندھے اچکائے۔

" باقی کیا کہتے ہیں؟"

" ٹھیک ہے۔ ہم سب یہ گولیاں نہیں کھائیں گے۔" شوکی نے سینہ تان کر کہا۔

" لیکن کب تک۔ ابھی شاید تمہیں بھوک نہیں ستا رہی۔ جب بھوک ستائے گی تو تم خود چیخ چیخ کر کہو گے۔ لاؤ۔ وہ گولیاں دو۔ ہمیں بھوک لگی ہے۔"

" جب ہم بچیں گے ۔ تو گولیاں دے دینا " آصف نے مُنہ بنایا ۔

" کیا تم لوگ اچھی طرح سوچ چکے ہو ۔ یہ بھی جانتے ہو کہ اب کھانا صبح سے پہلے نہیں ملے گا ۔"

" یہ بات اسی وقت معلوم ہوئی ۔ خیر پروا نہیں ۔" آفتاب نے کندھے اُچکائے ۔

" بہت اچھا ۔ چلو بھئی ۔ باقی لوگوں کو کھانا دے دو ۔ ان لوگوں کے آس پاس ایک لقمہ بھی نہ گرنے پائے ۔"

" بہت بہتر سر ۔"

کھانا تقسیم ہونے لگا ۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہے ۔ اور باقی لوگوں کو کھاتے دیکھتے رہے ، ایسے میں آر لی بناشا کی آواز سُنائی دی :

" میں نے بھی تین دن تک کھانا نہیں کھایا تھا ، لیکن آخر کھانا ہی پڑا ۔"

" کوئی بات نہیں ۔ ہم بھی کھا لیں گے ۔ ایک دو دن بعد ۔ جب تک ہمت ہے ، اس وقت تک تو غلامی قبول نہیں کریں گے ۔" آفتاب نے منہ بنا کر کہا ۔

" ابھی تک ہم نے یہاں آنے کے بعد باس کی آواز نہیں سُنی ۔ کیا وہ قیدیوں سے بات نہیں کرتا ؟"

" ضرور کرتے ہیں ۔ ان کے بات چیت کرنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ۔ جب جی چاہا بات کر لی ۔"

" ہوں ۔ کس قدر عجیب دُنیا ہے ۔ کتنے خواب ناک حالات ہیں ۔ یقین ہی نہیں آ رہا ۔" آصف بڑبڑایا ۔

" میرا مشورہ تو یہی ہے کہ گولیاں کھا لی جائیں ۔"

" ہرگز ۔ جب تک ہم میں ہمت ہے ، طاقت ہے ، اس وقت تک نہیں کھائیں گے ۔"

آدھ گھنٹے بعد سب لوگ کھانا کھا کر اُٹھ گئے ، لیکن وہ وہیں بیٹھے رہ گئے :

" کیوں ، کیا ارادہ ہے ؟"

" پتا نہیں ۔ کوئی ارادہ ہے بھی یا نہیں ۔" فرحت نے مُنہ بنا کر کہا ۔

" جن مکانات کے دروازوں پر نام کی تختیاں نظر نہ آئیں ، وہ خالی ہوں گے ۔ تم ان میں سے کوئی سے مکان لے سکتے ہو ۔ چاہے ایک دو لے لو ۔ یا سات ۔ یہاں مکانات کی کمی نہیں ۔ قیدی کم ہیں اور مکانات زیادہ ۔" لی کاف نے بتایا ۔

" شکریہ ۔ کہیں ہم ایک دُوسرے کے دوست تو نہیں بنتے جا رہے ؟" آصف بولا ۔

"نہیں۔یہ ایک مجبوری ہے کہ ہم سب یہاں جمع ہو گئے ہیں۔ اور ایک دوسرے کا کسی حد تک ساتھ دینے پر مجبور ہیں، لیکن تم فکر نہ کرو۔ جونہی موقع ملا۔تم لوگوں کا حساب چکا دوں گا اور شاید مسٹر گماٹا بھی میرا ساتھ دیں گے۔"

"گویا ہماری دشمنی اپنی جگہ پر رہے گی۔"

"ہاں بالکل۔" لی کاف نے کہا اور باہر نکل گیا۔تھوڑی دیر بعد وہاں کوئی بھی نہ رہ گیا تو فرحت بولی:

"سنو۔میں نے ایک ترکیب سوچی ہے۔کیوں نہ ہم رات کو باورچی خانے میں گھس جائیں۔"

"لیکن ہمیں کیا معلوم۔ باورچی خانہ کہاں ہے؟"

"ابھی کھانا کھلانے والے برتن اٹھانے نہیں آئے۔وہ جب برتن اٹھا کر باہر نکلیں گے تو ہم ان کا تعاقب کریں گے۔اس طرح باورچی خانے کا پتا چل جائے گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔"

عین اسی وقت وہی آٹھ آدمی خالی تھال لیے اندر داخل ہوئے۔ان پر حیرت بھری نظریں ڈالیں اور خالی برتن تھالوں میں رکھنے لگے۔نواں آدمی ان کے ساتھ نہیں آیا تھا۔برتن رکھ کر وہ باہر چلے تو یہ لوگ بھی اٹھے اور ان کے پیچھے باہر نکل آئے۔اب وہ درمیان میں کچھ فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب کرنے

لگے۔ابھی ایک منٹ ہی چلے ہوں گے کہ وہ آٹھ کے آٹھ ان کی طرف مڑے۔اور ان میں سے ایک نے طنزیہ لہجے میں کہا:

"کیا پروگرام ہے دوستو؟"

"کک۔کچھ نہیں۔نئے ہیں نا۔ذرا گھوم پھر رہے ہیں۔"

"شاید تم یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ باورچی خانہ کہاں ہے۔" دوسرا مسکرایا۔

"جج۔جی ہاں۔" شوکی ہکلایا۔

"آؤ۔آؤ۔شوق سے دیکھو باورچی خانہ۔" تیسرے نے منہ بنا کر کہا۔

اب درمیان میں زیادہ فاصلہ رکھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔وہ بھانپ چکے تھے؛ چنانچہ ان کے ساتھ رہ کر چلنے لگے۔یہاں تک کہ ایک بڑی عمارت نظر آئی۔ایک بار پھر آٹھ کے آٹھ باورچی ان کی طرف مڑے اور ان میں سے ایک نے کہا:

"یہ ہے باورچی خانہ۔اندر ہر طرف کھانے پینے کی چیزوں کے ڈھیر لگے ہیں۔کسی چیز کی کوئی کمی نہیں، لیکن اگر تم یہ سوچ کر آئے ہو کہ رات کو اٹھ کر ادھر آ جاؤ گے اور کسی طرح اندر داخل ہو کر اپنا پیٹ بھر لو گے تو یہ ناممکن ہے۔باس ہر بات کو سمجھتا ہے۔اس نے پہلے ہی سارے انتظامات کر

رکھے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ کہ اس کی مرضی کے بغیر یہاں کوئی
کھانا نہیں کھا سکتا۔ کوئی باورچی خانے میں داخل نہیں ہو سکتا، اگر
میری باتوں پر یقین نہیں تو رات کو آجانا۔ ہم میں سے کوئی
بھی یہاں نہیں ہوگا، لیکن اس کے باوجود تم لوگ اندر داخل
نہیں ہو سکو گے۔" وہ جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔

"آخر کیوں۔ ہم اندر کیوں داخل نہیں ہو سکیں گے؟" آصف
نے منہ بنایا۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔ کیا اور لوگوں نے یہ کوشش نہیں کی ہو
گی۔"

"ہاں، کی تو ہوگی۔" فرحت نے کہا۔

"تو پھر۔ وہ گولیاں کھانے پر کیوں مجبور ہیں۔ اپنی اپنی گولی
حاصل کرنے کے لیے مرے کیوں جاتے ہیں۔ سنو۔ باورچی خانے
میں ہر وقت بجلی کا کرنٹ دوڑتا رہتا ہے۔ اندر داخل ہونے
والا فوری طور پر موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ اور یہ
برقی نظام ایسا ہے کہ باہر سے تم لوگ اسے ناکارہ بھی نہیں
کر سکتے۔ یہاں کوئی ایسی چیز بھی نہیں، مثلاً ربڑ کا لباس
وغیرہ کہ تم اس کا سہارا لے کر اندر داخل ہونے کی کوشش کرو۔
یہ اتنے اتنے بڑے بڑے جاسوس بلاوجہ تو باس کے غلام نہیں
بن گئے۔ تمہیں بھی بننا پڑے گا۔ آج نہیں تو کل اور کل نہیں

تو پرسوں۔"

"اوہ۔" وہ دھک سے رہ گئے۔

اسی وقت ان کے چہروں کے رنگ اُڑ گئے۔ بیک وقت سب
کے چہروں کے رنگ ___

سات ساتھی

چند لمحے تک سکتے کا عالم طاری رہا، آخر منور علی خان بڑبڑائے:

"تو کیا اس جزیرے کی زمین بھی مصنوعی ہے؟"

"ہاں! زمین بھی مصنوعی ہے۔ کچھ بھی اصلی نہیں ہے۔ دیکھیے نا۔ ہم نے ان درختوں پر ابھی تک کوئی پرندہ نہیں دیکھا، کوئی کیڑا مکوڑہ جزیرے کی زمین پر رینگتے نہیں دیکھا۔" فرزانہ پُرجوش لہجے میں بولی۔

"یہ ایک ہولناک انکشاف ہے، انتہائی پُراسرار، ظاہر میں یہ نقلی نظر نہیں آتا۔" منور علی خان بڑبڑائے۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہ شوبرا وغیرہ لوگوں کا بنایا ہوا ہے، لیکن سمندر میں ایک ایسا جزیرہ بنا لینا۔ کمال ہے۔ یقین نہیں آرہا۔" خان رحمان بولے۔

"حالانکہ یہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ کیا کریں؟" محمود بڑبڑایا۔

"کیوں نہ پروفیسر انکل کو یہاں لے آیا جائے۔" فرزانہ بول پڑی۔

یک دم سب لوگ اس کی طرف گھوم گئے، پھر انسپکٹر جمشید مُسکرا کر بولے:

"میرا خیال ہے، ان حالات میں اس سے اچھی ترکیب کوئی نہیں ہو سکتی۔"

"ان حالات میں ہی کیا، ہر حالات میں۔" فارُوق نے منہ بنایا۔

"لانچ ہمارے پاس ہے۔ ہم آسانی سے ساحل تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"تو پھر چلو۔ دیر کس بات کی ہے۔"

"تت۔ تو کیا ہم سب جائیں گے؟" محمود ہکلایا۔

"کیوں۔ تُمھارا کیا خیال ہے؟"

"کیوں نہ ہم میں سے کچھ یہیں ٹھہریں اور باقی لوگ جا کر پروفیسر صاحب کو لے آئیں۔"

"ہاں، ترکیب یہ بھی اچھی ہے۔ آخر کو یہ مصنوعی جزیرہ ہے، کہیں اِدھر اُدھر نہ چلا جائے۔" فاروق بولا۔ خان رحمان اور منور علی خان مُسکرا دیے۔

"اگر یہ اِدھر اُدھر چلا گیا تو اس پر ٹھہرنے والے بھی اِدھر اُدھر چلے جائیں گے اور اس طرح انہیں تلاش کرنے مسئلہ بھی

پیدا ہو جائے گا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔
"ہوں! بات تو ٹھیک ہے۔ہم پہلے ہی اپنے سات ساتھی گم کیے بیٹھے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔
"گویا آپ دونوں کی تجویز یہ ہے کہ ہم سبھی ساحل پر چلیں گے۔"
"ہاں، کیونکہ واپسی اتنی جلدی نہیں ہوسکے گی۔ابھی تو ملک کے مغربی حصّے سے پروفیسر صاحب کو بلوانے میں بھی وقت لگے گا۔"
"تو کیوں نہ پروفیسر عقلان کو لے آیا جائے۔وہ تو فوراً ہی آ سکتے ہیں۔" فرزانہ بول پڑی۔
"بات تو یہ بھی ٹھیک ہے۔خیر چلو۔سبھی چلتے ہیں۔"
وہ لانچ پر سوار ہو گئے۔ساحل کی طرف ان کا سفر شروع ہوگیا۔ساحل پر اُتر کر اُنھوں نے لانچ کو باندھ دیا اور آگے بڑھے۔جلے ہوئے جنگل کے بارے میں اگرچہ منور علی خان انھیں بتا چکے تھے، لیکن پھر بھی وہ حیرت زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔اب انھیں پیدل سفر کرنا تھا۔لہٰذا تیز تیز قدم اُٹھانے لگے۔اچانک ان کے اُٹھتے قدم رک گئے۔جلے ہوئے درختوں کے درمیان تقریباً دس آدمی کھڑے تھے، ان کے ہاتھوں میں مشین گنیں تھیں۔یہ لوگ فوجی وردیوں میں تھے:
"تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو؟" ان میں سب سے آگے والے

نے بلند آواز میں پوچھا۔
"پہلے آپ اپنا تعارف کرائیں، پھر ہم بتائیں گے کہ کہاں سے آ رہے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔
"ہمیں اس علاقے میں حال ہی میں مقرر کیا گیا ہے۔جنگل کے اس حصّے کا پُراسرار طور پر جھلس جانا حکام کی سمجھ میں نہیں آیا؛ تاہم اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ دشمن ملک کی کوئی سازش ہے، ابھی ہم اس سازش کی تہہ تک نہیں پہنچ پائے۔حفاظتی اقدام کے پیشِ نظر ہماری ڈیوٹی یہاں لگائی گئی ہے۔"
"ہوں۔ہم بھی یہی معلوم کرنے کی کوشش میں ہیں کہ یہ کیا ماجرا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔
"لیکن آپ لوگ ہیں کون؟"
"ہمارے کارڈ ملاحظہ کر لیں۔" انسپکٹر جمشید نے یہ کہہ کر جیب کی طرف ہاتھ لے جانا چاہا، لیکن اسی وقت ملٹری آفیسر گرج دار آواز میں بول اُٹھا:
"خبردار۔آپ میں سے کوئی اپنی جیب کی طرف ہاتھ نہیں لے جائے گا۔ہم خود کارڈ نکال کر دیکھیں گے۔"
"بڑی خوشی سے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔
وہ ان کے قریب آ گیا اور ایک ایک کی جیب سے کارڈ نکال

نکال کر پڑھنے لگا، پھر بولا :

"ہوں۔ آپ لوگ تو کافی مشہور ہیں، لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ نقلی ہوں۔ یہ کارڈ بھی نقلی ہوں۔ لہٰذا آپ کو ہمارے ساتھ ہمارے آفیسر کے پاس چلنا پڑے گا۔ وہی آپ کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔"

"کیا ہم نے کوئی جُرم کیا ہے۔ یا مُلک کے اس حصّے میں مُلک کے لوگ نہیں آ سکتے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے بھنّا کر کہا۔

"جی نہیں، آپ نے کوئی جُرم نہیں کیا۔ یہ ایک مجبوری ہے کہ ہم ہر ایک کو چیک کریں۔ ہمارے ذمے یہی ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ چلیے۔ آپ کا کیمپ کہاں ہے۔" انسپکٹر جمشید نے کندھے اچکائے۔

"آئیے۔ نزدیک ہی ہے۔"

وُہ ان کے ساتھ چل پڑے۔ ان سے ہاتھ اٹھانے کے لیے نہیں کہا گیا تھا ؛ تاہم فوجی ان کے پیچھے اور دائیں بائیں چل رہے تھے۔ گویا ان کی نظریں ان پر ہی تھیں۔ پانچ منٹ تک چلتے رہنے کے بعد تین بڑے خیمے نظر آئے، ان کے باہر بھی ایک فوجی رائفل لیے کھڑا تھا۔ ان پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھا اور سیدھا ہو گیا۔ جونہی وُہ نزدیک پہنچے، بول اٹھا :

"معلوم ہوتا ہے۔ آپ لوگ شکار مار لائے ہیں۔"

"ہر وقت مذاق کے موڈ میں رہنا کوئی اچھی بات نہیں۔" ملٹری آفیسر نے منہ بنایا۔

"فارُوق۔ یہ جُملہ تم بھی نوٹ کر لو۔" فرزانہ بول پڑی۔

"کیا مطلب ؟" آفیسر نے چونک کر کہا۔

"ہمارا یہ بھائی بھی ہر وقت مذاق کے موڈ میں رہتا ہے۔"

"اوہ۔ تب تو ان دونوں کو ایک جگہ جمع کر دینا چاہیے۔" آفیسر نے ہنس کر کہا۔

پھر وُہ خیمے میں داخل ہوئے۔ اندر ایک کرنل مُوجود تھا :

"سر۔ یہ لوگ سمندر کی طرف سے آتے دیکھے گئے ہیں۔ ان کی جیبوں میں ہمارے مُلک کی مشہور شخصیتوں کے کارڈ ہیں، لیکن میرا خیال ہے۔ یہ سب کچھ نقلی ہے۔"

"اوہ، اگر یہ بات تھی تو ان لوگوں کو یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہیں گولی مار دی ہوتی۔"

کرنل کے یہ الفاظ سُن کر ان لوگوں کو غصّہ آگیا، خان رحمان تلملا کر بولے :

"کرنل صاحب۔ جب تک تصدیق نہ ہو جائے، آپ کسی کو گولی کس طرح مار سکتے ہیں ؟"

"ان خاص حالات کی بنا پر۔" اس کا اشارہ شاید جنگل کی طرف تھا، یہ کہتے وقت اس نے خان رحمان کو گھورا بھی۔

"کیا قانون آپ کو اجازت دے چکا ہے کہ اس طرف سے آنے والوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا جائے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کاش! مجھے یہ اجازت مل چکی ہوتی۔ میں تم لوگوں کو تو ضرور گولیوں کا نشانہ بناتا۔" کرنل نے جھلا کر کہا، پھر چونک کر بولا:

"آپ نے کیا کہا تھا کیپٹن۔ ان لوگوں کے پاس ہمارے ملک کی مشہور ہستیوں کے کارڈ ہیں۔ تو کیا ان کارڈوں پر تصاویر نہیں ہیں؟"

"بالکل ہیں جناب، لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے میک اپ کر رکھا ہو۔" کیپٹن بولا۔

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ لاؤ کارڈ مجھے دکھاؤ۔"

کرنل نے تمام کارڈ بغور دیکھے، پھر کیپٹن کی طرف مڑا:

"ان لوگوں کو واپس ساحل کی طرف لے جاؤ۔ اور ساحل پر کھڑا کرکے گولی مار دو۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر بولے۔

"یہ لوگ بالکل نقلی ہیں۔ ضرور دشمن ملک کے جاسوس ہیں۔ ورنہ اس طرف سے کیوں آتے۔"

"آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے؟" خان رحمان جھلا کر بولے۔

"میں اس لہجے کا عادی نہیں۔ لہذا تم تو یہیں جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے کرنل نے پستول نکال کر ان کی طرف فائر جھونک دیا، لیکن

اس وقت تک ایک تو انسپکٹر جمشید حرکت میں آ چکے تھے۔ دوسرے خان رحمان فوراً لڑھک گئے تھے۔ ان کے باقی ساتھی بھی زمین پر لیٹ گئے تھے، اس لیے گولی کیپٹن کے ایک ساتھی کے لگی، وہ چیخ مار کر گرا اور تڑپنے لگا۔

"یہ آپ نے کیا کیا سر؟" کیپٹن کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

"جو ہونا تھا ہو گیا۔ میں اس شخص کو اسی جگہ موت کی نیند سلا کر رہوں گا۔ باقی لوگوں کو تم ساتھ لے جانا۔"

"لیکن سر۔ مرنے والا مم۔"

"ہاں! میں جانتا ہوں۔ میری گولی سے مرنے والا تمہارا چھوٹا بھائی تھا، لیکن یہ میرا نہیں، اس کا قصور تھا کہ میری گولی کے سامنے آ گیا" کرنل نے سفاک لہجے میں کہا اور پھر خان رحمان کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ وہ اس وقت تک کرنل کی کمر پر پہنچ چکے تھے۔

"اجازت ہے خان رحمان۔ یہ ضرور نقلی فوجی ہیں، اگر اصلی ہوتے تو ہمارے کارڈ دیکھ کر ہماری عزت کرتے۔ ہم پر فائرنگ ہرگز نہ کرتے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی کرنل کی کمر پر ایک بھرپور لات پڑی، وہ منہ کے بل گرا۔ اور لڑھکتا ہوا انسپکٹر کامران مرزا کے پاس پہنچ گیا۔ انھوں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پاؤں کی ایک ٹھوکر اس کے رسید کر دی۔ اس وقت تک کیپٹن کے ساتھی ان کی طرف

مشین گنوں کے رُخ کر چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ فائر کھلتا۔ ان سب نے مل کر ان پر چھلانگیں لگا دیں۔ کرنل کے گرنے کی وجہ سے کیپٹن کے ساتھی بوکھلا گئے تھے۔ اس لیے وقت پر فائر نہ کھول سکے۔ اور اس طرح انسپکٹر جمشید وغیرہ کو ایک نادر موقع مل گیا۔ حملہ بہت شدید تھا۔ دشمن بوکھلا گئے۔ جب تک وہ سنبھلتے۔ انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا ایک ایک مشین گن ان سے چھین چکے تھے۔ انھوں نے ان کا لاٹھیوں کی طرز پر استعمال شروع کر دیا۔ ادھر خان رحمان اور منور علی خان ایک ایک دشمن سے بھڑ چکے تھے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے ایسے میں کرنل کو خیمے سے نکلتے دیکھ لیا، انسپکٹر کامران مرزا کی ٹھوکر پہلے ہی اسے دروازے کے قریب لے آئی تھی۔ تینوں اس کے پیچھے دوڑے۔

"اے جناب۔ کرنل۔ کہاں چل دیے۔ ابھی تو مقابلہ شروع ہوا ہے۔ ایسی بھی کیا بے رُخی۔" فاروق نے ہانک لگائی۔ وہ بھنا کر مڑا، اگرچہ خالی ہاتھ تھا، پھر بھی ان پر اُلٹ پڑا۔ ادھر ان کے پاس بھی کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ نتیجہ یہ کہ تینوں اس سے اس طرح بھڑ گئے جیسے شہد کی مکھیاں اپنے کسی شکار سے چمٹ جاتی ہیں۔

"یہ۔ یہ کیا کر رہے ہو۔ لڑنے کے طریقے سے لڑو۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔" محمود نے کہا اور اس کی کن پٹی پر

ایک زور دار مکا دیا۔ ساتھ ہی اس کا ہاتھ گھوم گیا۔ یہ ہاتھ محمود کی گردن پر لگا، اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ دوسری طرف الٹ گیا۔ اب چونکہ فاروق اور فرزانہ اس کے مقابل رہ گئے تھے۔ اور وہ بہت بھاری بھرکم اور طاقت ور تھا۔ اس لیے دونوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ایسے میں انھیں اِدھر اُدھر ہو جانے کے سوا اور کچھ نہ سوجھا۔

"ایک تو تم میں سے ہو گیا بے کار۔ اس کی تو ٹوٹ گئی گردن کی ہڈی۔" کرنل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"نہیں!" فاروق اور فرزانہ نے خوف زدہ انداز میں ایک ساتھ کہا، ساتھ ہی انھوں نے بوکھلا کر محمود کی طرف دیکھا۔ اور یہی ان کی غلطی تھی۔ کرنل کے دونوں ہاتھ ان دونوں کے سینوں پر لگے۔ وہ بُری طرح لڑکھڑا گئے۔ اور پھر دھڑام سے گرے۔ کرنل نے ان پر چھلانگ لگائی اور یہاں اس سے غلطی ہوئی۔ اب فاروق اور فرزانہ اتنے بھی گئے گزرے نہیں تھے کہ زمین پر گرنے کے بعد وہیں پڑے رہتے۔ فوراً پلٹنیاں کھا گئے۔ نتیجہ یہ کہ کرنل سینے کے بل گرا۔ اس وقت اس کی کمر پر فاروق اور فرزانہ نے چھلانگ لگائی۔ دونوں ایک ساتھ کئی فٹ کی اونچائی سے اس کی کمر پر گرے۔ اس کے مُنہ سے چیخ نکل گئی:

"بہت دل کش چیخ تھی۔ ایک اور۔"

انھوں نے خان رحمان کی چہکتی آواز سُنی ۔ وُہ خیمے سے نکل رہے تھے ۔ فاروق اور فرزانہ نے ایک بار پھر چھلانگ لگائی ۔ اور چیخ پھر سنائی دی ، ساتھ ہی فارُوق بولا :

" لیجیے انکل ۔ آپ بھی کب کب چیخیں سُننے کی فرمائش کریں گے، اور ہاں ذرا محمود کو دیکھ لیں ۔"

" ہم ۔ میں ٹھیک ہوں ، فکر نہ کریں ۔" اس کی آواز سُنائی دی ۔

" خدا کا شکر ہے ۔ اس شخص نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا اور میں تو یہ سوچ سوچ کر لرز رہا تھا کہ محمود کی ٹوٹی ہوئی گردن نہ جانے کیسی دکھائی دے گی ۔"

" بھئی فاروق ۔ اب اتنا بھی جھوٹ نہ بولو ۔" فرزانہ بول اٹھی ۔

" کیا مطلب ۔ میں نے کیا جھوٹ بولا ۔"

" یہ کہ تم سوچ سوچ کر لرز رہے تھے ، حالانکہ میں اور تم تو ان نقلی کرنل صاحب سے بھڑے ہوئے تھے ۔ ایسے میں تمھیں سوچنے اور لرزنے کی فرصت کس طرح مل گئی ۔"

" بھئی میں دل ہی دل میں سوچ اور لرز رہا تھا ۔" فارُوق نے منہ بنایا ، خان رحمان مسکرا دیے ، اسی وقت خیمے سے انسپکٹر کامران مرزا وغیرہ بھی نکل آئے :

" یہ تم کیا کھیل رہے ہو ؟" انسپکٹر جمشید بُرا سا منہ بنا کر بولے ۔

" معلوم ہوتا ہے ۔ آپ اندر سے فارغ ہو چکے ہیں ۔"

" ہاں ! جلدی کرو ۔"

کرنل اور اس کے ساتھیوں کو انھیں کی ٹائیوں اور رُومالوں سے باندھ کر ڈال دیا گیا ۔

" آئیے ۔ اب چلیں ۔ شہر پہنچ کر پولیس کو ادھر بھیج دیں گے ۔ ان لوگوں کو فوجی وردی میں ضرور انھی لوگوں نے مقرر کر رکھا ہو گا ۔ جو اس سارے چکر کے ذمے دار ہیں ۔" انسپکٹر جمشید بولے ۔

" لیکن ابا جان ۔ چکر کیا ہے ؟"

" پتا نہیں ۔ ابھی تک تو ہمیں صرف یہ معلوم ہے کہ نہایت پُراسرار حالات میں ہمارے ملک کے محکمہ سراغرسانی کے ریکارڈ روم سے تمام اہم ترین ریکارڈ چرا لیا گیا ہے اور سطح سمندر سے ایک بحری جہاز غائب کر دیا گیا ہے جس پر ہمارے مُلک کا سونا آ رہا تھا ۔"

" اس جزیرے پر پہنچ کر ہی ہم مزید کچھ معلوم کر سکیں گے ۔"

تیز تیز چلتے وہ جنگل کے اس حصے میں پہنچے جہاں منور علی خان جیپ کھڑی کر گئے تھے ، انھیں وُہ جیپ بھی مل گئی ۔ جنگل کے دُوسرے سرے پر پہنچے تو شہری حدود کے آثار شروع ہو گئے ۔ اور اسی طرح وُہ اس شہر کے محکمہ سراغرسانی کے دفتر پہنچ سکے ۔ سب سے پہلے نقلی فوجیوں کے لیے پولیس روانہ کی گئی ۔ اس کے بعد پروفیسر عقلان کو فون کیا گیا ، لیکن معلوم ہوا ، وُہ مُلک سے باہر سیر کی غرض سے گئے ہوئے ہیں ، اب اس کے سوا کوئی

چارہ نہیں تھا کہ پروفیسر داؤد کو ہی فون کیا جاتا ؛ چنانچہ انسپکٹر جمشید نے ان کے نمبر ڈائل کیے۔ بیس منٹ کی کوشش کے بعد نمبر ملا اور ان کی آواز سنائی دی۔ جونہی انھوں نے انسپکٹر جمشید کی آواز سُنی، وُہ چلا اُٹھے :

" اُف جمشید۔ تم سب کہاں غائب ہو۔ معلوم بھی ہے۔ یہاں سب لوگ کس قدر پریشان ہیں۔"

" جی ہاں ! میں اندازہ لگا سکتا ہوں۔ سب کو اطلاع دے دیں کہ ہم خیریت سے ہیں اور آپ فوراً یہاں چلے آئیں۔ چاہے کسی خصوصی طیارے سے آنا پڑے۔"

" لیکن کہاں چلا آؤں ؟"

" مُلک کے جنوبی حِصّے میں۔" یہ کہہ کر انھوں نے مختصر طور پر تفصیل سُنا دی۔

" اچھا ! میں آ رہا ہوں۔ تم فکر نہ کرنا۔" اُنھوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا :

" پروفیسر صاحب کو یہاں پہنچنے میں کم از کم چار گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔ یہ چار گھنٹے کس طرح گزارے جائیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

" سب سے پہلے تو شوکی برادرز کے والدین سے مل کر انھیں تسلّی دینی چاہیے۔ وُہ بہت پریشان ہوں گے۔" منور علی خان بولے۔

" اوہ ہاں ! یہ بہت ضروری ہے۔" خان رحمان نے کہا۔

" تو پھر چلیے۔ پہلے یہی کام کرلیں۔"

وُہ منور علی خان کی رہنمائی میں شوکی برادرز کے دفتر کے دروازے پر پہنچے۔ دروازہ بند تھا۔ دستک دی گئی۔ تو ایک منٹ بعد دروازہ کھلا۔ یہ مشتاق احمد خان تھے۔ پہلے تو ان لوگوں کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے، پھر منور علی خان پر نظر پڑتے ہی چونکے :

" مم۔ میرے بچّے کہاں ہیں جناب ؟"

" انھی کے بارے میں تو بتانے آئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

انھوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا :

" کک۔ کہیں۔ کہیں آپ انسپکٹر جمشید تو نہیں ہیں ؟"

" آپ نے ٹھیک پہچانا۔" وُہ مسکرائے۔

" اور۔ اور آپ انسپکٹر کامران مرزا ہیں۔" وہ بولے۔

" ہاں ! یہ بھی درست ہے۔ اور آپ مشتاق احمد خان ہیں، اپنے زمانے کے مشہور و معروف سراغرساں۔ آپ تو بہت بوڑھے اور کمزور ہو چکے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

" ہاں۔ آئیے اندر تشریف لے آئیے۔"

وُہ انھیں ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ شوکی برادرز کی امّی بھی ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے آ کر لگ گئیں :

"نہیں بیگم - پہلے تو تمہیں ان لوگوں کے لیے چائے بنانا پڑے گی۔" مشتاق احمد خان کھڑکی کی طرف منہ کرکے بولے۔

"لیکن یہاں آپ کی بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟" فرزانہ حیران ہو کر بولی۔

"وہ کھڑکی کے دوسری طرف ہیں - اندر کی گفتگو سننے کے لیے بے چین - اپنے بیٹوں کے بارے میں جاننے کے لیے بے تاب۔"

"آپ دونوں کو ان کے بارے میں پریشان نہیں ہونا چاہیے - ان کے ساتھ آصف، آفتاب اور فرحت بھی ہیں - اگرچہ ہم نہیں جانتے، اس وقت وہ کہاں ہیں، لیکن اتنا یقین ہے کہ زندہ اور سلامت ہیں، آپ یہ سوال کریں گے کہ ہمیں یہ یقین کس طرح ہے - تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں ایک طرح کا اطمینان اور سکون ہے۔" انسپکٹر جمشید جلدی جلدی بولے۔

انھوں نے قدموں کی آواز سنی - گویا بیگم مشتاق جا رہی تھیں، کہنے کو انھوں نے یہ بات کہہ دی تھی، لیکن انھیں خود بھی یقین نہیں تھا کہ ان کے ساتھی کس حال میں ہوں گے۔

"یہ سب چکر کیا ہے؟" مشتاق احمد خان بولے۔

"ابھی تک ہم چکر کے بارے میں بھی نہیں جان سکے - ہمارے ملک کے مغربی حصے کے محکمۂ سراغرسانی کے خاص ریکارڈ روم سے تمام اہم ترین ریکارڈ چرا لیا گیا - اور دوست ملک جاپان سے سونے کا ایک جہاز آ رہا تھا، اسے غائب کر دیا گیا - یہ دونوں معاملے ہی

اس قدر بڑے ہیں کہ ہمیں کچھ اور سوچنے کی ضرورت نہیں - یعنی یہ کہ آخر مجرموں کا منصوبہ کیا ہے - وہ چاہتے کیا ہیں - ان کا منصوبہ کچھ بھی کیوں نہ ہو، وہ کچھ بھی کیوں نہ چاہیں - ہمیں تو اپنا سونا اور ریکارڈ ان سے حاصل کرنا ہے اور بس۔" انسپکٹر کامران مرزا کہتے چلے گئے۔

"لیکن مسٹر منور علی خان کو کیا معاملہ پیش آیا تھا، یہ شوکی وغیرہ کو کیوں لے گئے تھے؟" مشتاق احمد خان بولے۔

منور علی خان انھیں جنگل کے بارے میں بتانے لگے، پھر سمندر اور جزیرے میں ان کے ساتھ جو بیتی تھی، اس کی تفصیل بھی سنائی گئی:

"اور اب آپ کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟"

"ہاں! یہی بات ہے - اب ہم پروفیسر داؤد کو ساتھ لے کر۔"

ان کے الفاظ درمیان میں رہ گئے - فرزانہ اسی وقت اچھل کر کھڑی ہو گئی تھی - اس کا رنگ سفید پڑتا نظر آیا:

"خیر تو ہے فرزانہ؟"

"میں نے کسی کے دھم سے گرنے کی مدھم آواز سنی ہے - ہم بیرونی دروازہ کھلا چھوڑ آئے تھے۔" فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا، پھر انسپکٹر جمشید نے ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی، لیکن پھر پیچھے کی طرف گرے - دروازے پر کوئی ان سے پورے زور سے ٹکرایا تھا - دوسرے

ہی لمحے انھوں نے کسی کو کہتے سُنا:

" ہمارے زخمی ساتھیوں نے ہمیں اطلاع دے دی تھی کہ ان کے ساتھ کیا بیتی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے تم لوگوں کے نام بھی بتا دیے تھے۔ ہم تم لوگوں سے پہلے ہی محکمۂ سراغرسانی کے دفتر کے سامنے پہنچ گئے۔ اور وہاں سے تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آگئے ہیں، کیوں کیسی رہی۔"

آواز گونج دار تھی۔ انھوں نے دیکھا۔ دروازے میں چار لمبے چوڑے نوجوان کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں عجیب طرز کے پستول تھے۔ وہی سوئیاں پھینکنے والے۔ ان کے چہروں پر وحشت ناچ رہی تھی:

" یہ عام پستول نہیں ہیں۔ زہریلی سوئیوں والے پستول ہیں۔ تم لوگ جانتے ہی ہوگے۔"

" ہاں۔ بہت اچھی طرح۔ چاہتے کیا ہو؟" فارُوق چمک کر بولا۔

" تم لوگوں کو اپنے ساتھ لے جانا۔"

" لیکن کہاں؟"

" جنگل میں۔ اس جگہ جہاں تم نے ہمارے ساتھیوں کو باندھ کر ڈالا تھا۔ بس وہیں تک جانا ہے۔"

" اچھی بات ہے۔ ہمیں ذرا اپنے ایک ساتھی کا انتظار ہے۔ وُہ آجائیں، پھر ہم آپ کے ساتھ چلیں گے۔"

" ہم یہاں رُک نہیں سکتے۔ جلدی چلو۔"

" بہت اچھا، چلیے بھئی چلیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

دُوسرے بھی ان کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے:

" گ۔ کیا مجھے بھی چلنا ہوگا؟" مشتاق احمد خان ہکلائے۔

" نہیں۔ تم یہیں رہوگے، لیکن اس طرح کہ کسی کو فون نہیں کر سکوگے۔" یہ کہتے ہوئے وُہ اندر آگیا اور پستول کا دستہ ان کے مُنہ پر مارا۔ ان کے بالکل نزدیک انسپکٹر جمشید مُوجود تھے۔ انھوں نے فوراً اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ پستول کا دستہ پوری طاقت سے ان کے بازو کی ہڈی پر لگا۔ بازو جھنجھنا اُٹھا۔ ساتھ ہی انھوں نے کہا:

" نہیں دوست۔ یہ بوڑھے اور کمزور ہیں۔ اس کا اور بھی طریقہ ہو سکتا ہے۔ بے ہوش کرنا کیا ضروری ہے۔"

" کیا مطلب۔ اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟" اس نے بھنا کر کہا۔

" یہ کہ تم فون کے تار کاٹ دو، انھیں کمرے میں بند کر دو اور بس۔"

" لیکن تم مجھے مشورہ دینے والے کون ہوتے ہو۔ میں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔"

" تمھارے لیے بہتر یہی ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں، وُہ کرو۔"

دُوسری صورت میں ہم برداشت نہیں کر سکیں گے اور تم لوگوں کو ہم
سے اسی جگہ فیصلہ کرنا ہوگا۔"

حملہ آور سوچ میں ڈوب گئے، پھر وہی بولا:

"ٹھیک ہے، فون کے تار کاٹ دو اور ان دونوں کو ایک کمرے
میں بند کر دو۔ باہر سے کمرے کا دروازہ بند کر دینا۔"

"پہلے ان لوگوں کو باہر نکالنا ہوگا۔ اس شخص کو ہم اسی کمرے
میں بند کر دیتے ہیں۔ عورت باورچی خانے میں بے ہوش پڑی
ہے۔ اسے وہیں رہنے دیتے ہیں، باورچی خانے کا دروازہ باہر
سے بند کر دیں گے۔"

اس ترکیب پر عمل ہونے لگا:

"ہمیں بہت افسوس ہے۔ آپ لوگ دونوں مرتبہ ہماری وجہ سے
پریشانی میں مبتلا ہوئے ہیں۔" منور علی خان بولے۔

"کوئی بات نہیں، یہ تکلیف اور پریشانی ملک اور قوم کی خاطر آئی
ہے۔ مُلک کے لیے تو جان بھی جائے تو پروا نہیں کرنی چاہیے۔"
مشتاق احمد خان بولے۔ انھیں باندھا جا رہا تھا۔

"بھئی جب دروازہ باہر سے بند کر دو گے تو پھر انھیں باندھنے
کی کیا ضرورت تھی؟" خان رحمان بُرا سا مُنہ بنا کر بولے۔

"چُپ رہو۔ ہم ہر کام تمھاری مرضی کے مُطابق کرنے کے
پابند نہیں ہیں۔" وُہ جھلّا کر بولا۔

"ہاں! یہ تو خیر ٹھیک ہے۔"

"سُرخ رنگ کی ویگن ہماری ہے۔ اس کے پچھلے حصّے میں بیٹھ
جاؤ۔ خبردار کوئی گڑبڑ نہ کرنا۔"

"اچھا بھائی۔ نہیں کریں گے گڑبڑ۔" فارُوق نے منہ بنایا۔

وُہ ان کے دائیں بائیں چلتے ہوئے باہر نکلے۔ ساتھ ہی سُرخ
ویگن کھڑی تھی۔ پستول اب بھی ان کے ہاتھوں میں تھے، لیکن ہاتھوں
پر انھوں نے رومال ڈال لیے تھے۔ ان میں سے ایک نے آگے
بڑھ کر ویگن کا پچھلا دروازہ کھولا:

"چلو۔ بیٹھ جاؤ۔"

وُہ اندر آ کر بیٹھ گئے۔ ان میں سے تین ان کے ساتھ
ہی بیٹھ گئے۔ چوتھے نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اور ویگن چل
پڑی۔

محمود، فارُوق اور فرزانہ کے چہروں پر حیرت کے آثار صاف
نظر آ رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے ان کی حیرت کو بھانپ لیا، لیکن
بولے کچھ نہیں، صرف مسکرا کر رہ گئے۔

"تو تمھارا پروگرام ہمیں اس جگہ لے جانے کا ہے۔ جہاں ہماری
تمھارے ساتھیوں سے لڑائی ہوئی تھی؟"

"ہاں! اسی جگہ تمھیں مزا چکھانے کا پروگرام ہے۔" ان میں
سے ایک بولا۔

" اللہ اپنا رحم فرمائے۔" فاروق نے اوپر دیکھا۔

" تو یہ کہتے وقت اوپر دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ تو ہر جگہ مُوجود ہے۔" فرزانہ نے مُنہ بنایا۔

" ہاں! اس میں کیا شک ہے۔" محمود بولا۔

" اچھا بھائی۔ غلطی ہو گئی، آئندہ اوپر نہیں دیکھوں گا۔" فارُوق بھنا اُٹھا۔

" کیا تم لوگ بتا سکتے ہو۔ یہ چکر کیا ہے۔ جنگل میں تم لوگوں کے ساتھی نقلی فوجیوں کے روپ میں کیوں موجود تھے؟"

" تاکہ کسی کو اس طرف نہ جانے دیں۔ یعنی سمندر کی طرف۔" وُہ بول اٹھا۔

" کیوں۔ سمندر کی طرف جانے میں کیا حرج ہے۔ اور پھر ہم سمندر کی طرف سے آرہے تھے، اُدھر جا نہیں رہے تھے، تمہارے ساتھیوں نے ہمیں کیوں روکا؟"

" وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ تم لوگ کہاں سے آرہے ہو، لیکن تم لوگ کچھ بتانے کی بجائے لڑ پڑے۔"

" یہ ہماری پرانی عادت ہے۔" فارُوق بول اُٹھا۔

" کوئی موقع خالی بھی جانے دیا کرو۔" فرزانہ جل کر بولی۔

" اس موقعے کا ہمیں کیا فائدہ ہوگا جو خالی چلا جائے۔" فارُوق مُسکرایا۔

" تم نے بتایا نہیں۔ اگر کچھ لوگ اس طرف سے سمندر میں چلے جائیں تو اس میں کیا حرج ہے۔"

" اس کی وجہ باس جانیں۔ ہمیں نہیں معلوم۔"

" اور تمہارا باس کون ہے؟" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

" ہم نہیں جانتے۔ نہ جاننا چاہتے ہیں۔"

" تمہیں احکامات کس طرح ملتے ہیں؟"

" آخر ہم تمہاری باتوں کے جواب کیوں دیں۔"

" لیکن ان باتوں کے جوابات تو ہمیں حاصل کرنا ہی ہوں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا بڑبڑائے۔

" کیا مطلب؟" وُہ بھنّا کر بولا۔

" اب ہم تمہیں کس کس بات کا مطلب بتائیں۔" فارُوق بھنّا کر بولا۔ اور وُہ اسے گھور کر رہ گیا، پھر چند لمحے بعد بولا:

" جنگل میں پہنچ لو، پھر بتائیں گے۔"

" کیا بتاؤ گے؟" محمود حیران ہو کر بولا۔

" اچھا بس۔ اب چپ رہو۔ کان کھا لیے ہیں اتنی سی دیر میں۔" وہ تلملا کر بولا۔

" یہی تو ہمارا کمال ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

آخر وُہ جنگل میں پہنچ گئے۔ جھلسے ہوئے درخت نظر آنے

لگے :

" کم از کم اتنا تو بتادو۔ یہ درخت کس طرح جھلس گئے ؟"

" پتا نہیں۔ ہم خود انھیں دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔"

" اللہ اپنا رحم فرمائے۔"

ان خیموں کے پاس ویگن رک گئی۔ ویگن رُکنے کی آواز سنتے ہی ایک لمبے قد کا آدمی ایک خیمے سے باہر نکلا اور انھیں دیکھتے ہی بولا :

" تو یہ ہیں وُہ لوگ۔ جنھوں نے ہمارے ساتھیوں کو زخمی کیا ہے۔"

" ہاں ہم ہی ہیں ، لیکن کیا پولیس اب تک یہاں نہیں پہنچی؟" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

" آکر جا بھی چکی ہے۔"

" تو وُہ تمھارے ساتھیوں کو گرفتار کرکے لے چکی ہے۔"

" ہرگز نہیں۔ بھلا ہم اپنے آدمیوں کو ان کے ہاتھ لگنے دیتے، پولیس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی انھیں اُٹھا کر بہت دُور پہنچا دیا۔ خیموں کو یونہی چھوڑ دیا گیا۔ پولیس اِدھر اُدھر تلاش کرکے واپس چلی گئی۔" اس نے فخریہ انداز میں بتایا۔

" اوہ!" ان کے مُنہ سے نکلا۔

" تب پھر۔ تمھارے ساتھی تو بچ گئے تھے۔ ہمیں یہاں کیوں

پکڑ کر لایا گیا۔"

" یہ جاننے کے لیے کہ تم لوگ سمندر میں کہاں تک ہو آئے ہو۔"

" ہم اس جزیرے تک ہو آئے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا مُسکرائے۔

" کس جزیرے تک ؟" اس نے پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا۔

" جس جزیرے کی فکر میں تم دُبلے ہوئے جا رہے ہو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

" اوہ! تو تم لوگ وہاں تک ہو آئے ہو۔"

" ہاں! اور ہم یہ بھی جان چکے ہیں کہ وُہ جزیرہ پورا کا پورا مصنوعی جزیرہ ہے۔"

" اوہ!" اس کے مُنہ سے نکلا۔

" اب تو ان لوگوں کو ہر حال میں مرجانا چاہیے۔" انھیں لانے والوں میں سے ایک نے کہا۔

" ہاں! یہی میں سوچ رہا ہوں۔ باس کو اگر معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ جزیرے سے ہو کر شہر تک بھی پہنچ گئے ہیں۔ تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے ، اس بات کو چھپانے کا بس یہی راستہ ہے کہ ان کو ختم کر دیا جائے۔ بس ٹھیک ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چلو بھئی ان کے جسموں میں ایک ایک اُتار دو۔"

پستول پہلے ہی ان کے ہاتھوں میں تھے ۔ انھوں نے ہاتھ
اٹھائے ۔ ان کے نشانے لیے اور ٹریگر دبانے ہی چلے تھے کہ خیمے
میں سے ایک تیز آواز اُبھری :
" ٹوں ٹوں ۔"

○

" یہ ۔ یہ کیا ہوا ؟" شوکی پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بولا ۔
" لگ کیا ہوا ۔" آصف نے بھی بوکھلا کر کہا ۔
" اف خدا ۔ میں ۔ میں مرا ۔" اشفاق چلّا اُٹھا ۔
" یا اللہ رحم ۔" فرحت نے کانپتی آواز میں کہا ۔
" آخر یہ یکایک مجھے اتنی شدت کی بھوک کیوں لگ گئی ہے ۔"
مکھن بولا ۔
" یہی میں کہنا چاہ رہا تھا ۔" آفتاب بولا ۔
" میں بھی بھوک کے ہاتھوں مرا جا رہا ہوں ۔" اخلاق نے مُردہ
آواز میں کہا ۔
" لو ۔ اب بھوک کے بھی ہاتھ نکل آئے ۔" آفتاب نے منہ بنایا اور
پھر پیٹ پکڑ لیا ۔
" آخر یہ کیا ہے ۔ ہم سب کو یکایک بھوک کیوں لگنے لگی ؟"

شوکی پریشان ہو کر بولا ۔
" اس دُنیا کی آب و ہوا ہی ایسی ہے ۔ بھوک بہت جلدی لگ
جاتی ہے ۔ بھوک سے بچنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے ۔" وہی بولا ۔
" اور وہ کیا ؟" اشفاق نے فوراً کہا ۔
" یہی کہ کھانا کھا لو ۔" ایک باورچی مسکرایا ۔
" کھانا کھا لیں ۔ تمھارا مطلب ہے ۔ ایک ایک گولی بھی کھا لیں
گے ؟" مکھن پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا ۔
" ہاں ! اس کے بغیر تو کھانا ملے گا ہی نہیں ۔"
" لیکن اب تو کھانے کا وقت گزر چکا ہے ۔ اب ہمیں کھانا
کون دے گا ؟" اشفاق نے مایوسانہ انداز میں کہا ۔
" اس کی فکر نہ کرو ۔ کھانا ہم دیں گے ۔ بس تم کھانے والے
بنو ۔"
" ٹھیک ہے ۔ ہم کھانے کے لیے تیار ہیں ۔ یعنی ہم کھانے والے
بن گئے ۔" آفتاب نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا ۔
" تب پھر تم لوگوں کو پہلے ایک ایک گولی کھانا ہو گی ۔
کیا خیال ہے ؟"
" لاؤ گولیاں کہاں ہیں ۔ اور ساتھ ہی کھانا ہمارے سامنے
رکھ دو ۔" آصف بولا ۔
" بھئی دیکھ لو ، پھر تم ان گولیوں کے عادی بن جاؤ گے اور

جب تک کھا نہیں لیا کرو گے چین نہیں ملا کرے گا۔" باورچی بولا۔

"پروا نہیں۔ یہ بھوک ہم سے برداشت نہیں ہو رہی۔ اس کے لیے ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔" شوکی نے جلدی سے کہا۔

"اپنے مُلک اور قوم کا سودا بھی کر سکتے ہو۔" باورچی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ سب ایک ساتھ چونک کر بولے۔

"یہی مطلب ہے۔ کیا بھوک مٹانے کے لیے اپنے مُلک اور قوم کا سودا کرنا پڑے تو وہ بھی کر گزرو گے۔"

"نن۔ نہیں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا۔" شوکی نے مُنہ بنا کر کہا۔

"اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر کھانا بھی نہیں ملے گا۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب۔ تھوڑی دیر پہلے تو تم نے کہا تھا کہ کھانے سے پہلے ایک گولی کھانا ہو گی۔"

"یہ شرط اس وقت تھی۔ جب ابھی تم لوگوں کو بھوک نہیں تھی۔ اس وقت واقعی تم لوگوں کو پہلے ایک ایک گولی دی جاتی اور پھر کھانا، لیکن اب جب کہ تم لوگ بالکل مجبور ہو گئے ہو تو ہم تمھارا ضمیر بھی خریدنے کی کوشش کریں گے۔ تم لوگوں کو یہ وعدہ کرنا ہو گا کہ تمھارے مُلک و قوم کے خلاف ہم جو بھی قدم اٹھائیں گے۔ اس میں تم ہمارا ساتھ دو گے۔"

"نن۔ نہیں۔ ہم یہ وعدہ نہیں کریں گے۔" آصف بلند آواز میں بولا۔

"ہاں! ہرگز نہیں کریں گے۔"

"بھئی ہم صرف وعدہ لے رہے ہیں۔ تم سے اس سلسلے میں کوئی کام نہیں لے رہے۔" ایک باورچی مسکرایا۔

"ہم وعدہ بھی نہیں کریں گے، کیونکہ اگر وعدہ کر لیا تو پھر پورا بھی کرنا ہو گا۔"

"تو پھر تمھاری مرضی۔ مرو بھوکے۔ یہ بھوک تمھیں چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہیں رہنے دے گی۔"

"اچھا۔ اللہ مالک ہے۔ موت تو ایک دن آ کر رہے گی۔ ہم اپنے اللہ کے پاس پہنچ کر بھوک مٹا لیں گے۔" اشفاق نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"مجھے تم پر ترس آ رہا ہے۔ ابھی تم لوگوں کو یہاں آئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔ تم اس قدر جلد مر جاؤ گے۔"

"تو کیا دُوسروں پر تمھیں رحم نہیں آیا تھا؟" شوکی جل بھن کر بولا۔

"نہیں۔ انھوں نے تو بھوک محسوس ہوتے ہی ہر قسم کا وعدہ کر لیا تھا۔ لی کاف جیسے آدمی گھٹنے ٹیک گئے تھے۔"

"اوہ۔ اُف۔" آفتاب نے کہا اور زمین پر بیٹھ گیا۔

باقیوں نے بھی بیٹھنے میں دیر نہ لگائی:

"ابھی کیا ہے۔ چند منٹ بعد تم بیٹھنے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔"

"یا اللہ۔ رحم فرما۔" اشفاق بولا۔ ساتھ ہی اوندھے منہ لیٹ گیا۔

اُسے دیکھ کر دوسرے بھی لیٹ گئے۔

"لگ۔ کیا ہم مر رہے ہیں۔" آفتاب نے مشکل سے آواز نکالی۔

"ہاں شاید۔ ایسا ہی ہے۔"

"جانوم۔ ان لوگوں کو چند لقمے کھلا کر میری طرف بھیج دو۔"

اچانک باس کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک اُٹھے۔ جانوم بھی حیرت زدہ رہ گیا، اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا:

"انھیں تھوڑا سا کھانا دے دو۔"

فوراً ہی ان کے مُنہ میں کھانا ڈالا جانے لگا، ان کے اپنے ہاتھوں میں تو جان رہی نہیں تھی۔ جُوں جُوں وُہ لقمے کھاتے چلے گئے۔ ان کے جسموں میں جان پڑتی چلی گئی۔ یہاں تک کر وُہ اٹھنے کے قابل ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد جانوم انھیں لے کر دُودھیا دیوار کی طرف روانہ ہوا۔

"مسٹر جانوم۔ کیا تمھیں باس کے نزدیک کوئی خاص مرتبہ حاصل ہے؟" آصف نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"ہاں! باورچی خانے میں انھیں ایک بہت ہی بااعتماد آدمی کی ضرورت تھی، کیونکہ باس بھی چوبیس گھنٹے تو جاگ نہیں سکتے۔ انھیں بھی سونا تو پڑتا ہے۔ اس وقت وُہ ہم لوگوں کی کارگزاریوں پر نظر نہیں رکھ سکتے۔ لہذا باورچی اگر بے ایمان ہو جائے تو گولیاں ان کے منہ میں ڈالنے کی بجائے اِدھر اُدھر کر سکتا ہے، اور باس یہ سمجھتے رہیں گے کہ نئے آنے والوں کو گولیاں کھلا دی گئی ہیں، لہذا اس سیٹ کے لیے انھیں ایک سچے ساتھی کی ضرورت تھی۔ اور انھوں نے مجھے چُن لیا۔ میرا نام جانوم ہے اور میں کسی زمانے میں۔" وُہ کہتے کہتے رُک گیا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں، پھر وُہ کانپ کر بولا:

"اوہو۔ یہ میں کیا غلطی کرنے لگا تھا۔ باس یہ کب پسند کرتے ہیں کہ میں کسی کو بھی کچھ بتاؤں۔ تم لوگ مجھے باتوں میں لگا کر موت کے حوالے کرنے لگے تھے۔"

"کیا کیا۔ موت کے حوالے کرنے لگے۔ یہ غلط ہے۔ بھلا ہم بے چارے کون ہوتے ہیں۔ موت کے حوالے کرنے والے۔ ہم تو خود یہاں مجبور اور بے بس ہیں۔ مسٹر جانوم اب اتنی بھی بے پَر کی نہ اڑاؤ۔ ویسے آپ بے پَر کی اڑانے کا مطلب سمجھتے ہیں۔" شوکی کہتا چلا گیا۔

"اِدھر اُدھر کی نہ ہانکو۔ اگر میں تمھیں کچھ بتا بیٹھتا تو میرے

لیے فوری طور پر موت کی سزا کا حکم ہو جاتا اور یہ سزا بھرے مجمعے۔یعنی تمام قیدیوں کے سامنے دی جاتی۔"

"اوہ۔تب تو تم بال بال بچے۔خیر بال بال بچنے پر مُبارکباد قبول کرو۔ میری دُعا ہے۔تم آیندہ بھی اسی طرح بال بال بچتے رہو۔" آفتاب جلدی جلدی بولا۔

"تم پر بال بال بچنے کا دورہ تو نہیں پڑ گیا۔" فرحت نے منہ بنایا۔

"مجھ پر نہیں ۔مسٹر جانوم پر۔بال بال یہ بچے ہیں، میں نہیں۔ تمھیں اتنا بھی معلوم نہیں۔"

"معلوم اور جانوم ۔کس قدر ملتے جلتے سے ہیں۔" مکھن بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔

"خاموش ۔ ہم دودھیا دیوار تک پہنچ گئے ہیں ۔اب تمھیں باس کے سامنے حاضر ہونا ہے۔"

"کیا اور قیدیوں کو بھی باس اسی طرح جب جی چاہے بُلا لیتا ہے۔"

"ہاں بالکل۔آخر وہ باس ہیں، یہاں ان کا حکم چلتا ہے — کوئی مذاق تو نہیں ہے۔" جالوم نے منہ بنایا۔

"مذاق تو خیر نہیں ہے۔"

اسی وقت دودھیا دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ نمودار

ہوا۔اور وُہ اس میں سے ہوتے ہوئے دوسری طرف آ گئے۔ اب ان کے سامنے پھر وہی باس کی عمارت تھی۔ وہ عمارت کی طرف قدم اُٹھانے لگے۔ ان کے دل دھک کر رہے تھے۔اور وُہ سوچ رہے تھے۔ نہ جانے باس نے کیوں انھیں ایک بار پھر بلایا ہے۔

دیر کا سہرا

"ٹھہرو! پہلے میں باس سے بات کر لوں۔" لمبے آدمی نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور خیمے میں گھس گیا، پستولوں والے ہاتھ اُٹھے کے اُٹھے رہ گئے۔ خیمے کے اندر سے لمبے آدمی کی آواز اُبھرنے لگی:

"یس سر۔ یس سر۔ او کے سر۔ آل رائٹ سر۔"

قریباً تین منٹ بعد وہ باہر نکلا تو اس کی پیشانی بھیگ چکی تھی۔ آنکھوں میں خوف پھیلا ہوا تھا۔ اس نے کانپتی آواز میں کہا:

"اف خدا! یہ باس بھی بہت عجیب چیز ہے، نہ جانے کہاں بیٹھا ہے۔ لیکن کسی وقت بھی کوئی حکم بھی مل سکتا ہے۔ ہمیں فوراً ہی شہر پہنچنا ہے۔ ایک شخص کے خاتمے کا حکم ملا ہے۔ آؤ چلیں۔"

"آؤ چلیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ان لوگوں کو یونہی

چھوڑ جائیں۔ آخر انہیں ہلاک کرنے میں کیا دیر لگے گی۔" اس کے ایک ساتھی نے کہا۔

"نہیں! تم باس کو نہیں جانتے، اس کا حکم ہے کہ سب کام چھوڑ کر پہلے اس شخص کا کام تمام کیا جائے۔"

"اوہ۔ تو پھر چلیے۔ ان کو یونہی چھوڑ جائیں۔" وہی بولا۔

"ہاں۔" لمبے آدمی نے کہا۔

"لیکن سر۔ آپ بھول رہے ہیں، یہ لوگ مصنوعی جزیرے تک ہو آئے ہیں۔"

"اوہ ہاں۔ مجھے تو اس بات کا خیال ہی نہیں رہا۔ اچھا خیر۔ تم دو یہاں رہو۔ ان کو روک کے رکھو۔ میں ان دونوں کو لے کر اس شخص کا کانٹا نکالنے جاتا ہوں۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" اس کا ساتھی بولا۔

"آؤ چلیں۔" لمبے آدمی نے کہا اور ویگن کی طرف مُڑ گیا۔

"ایک منٹ جناب! یہ تو بتاتے جائیے کہ آپ کو کس شخص کو ختم کرنے کا حکم ملا ہے۔"

"سوری! میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔" اس نے کہا اور تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی اس کے پیچھے چلے۔ اسی وقت انسپکٹر جمشید بولے:

"ان لوگوں کو یہاں سے جانے نہیں دینا چاہیے۔"

" تو پھر آپ انھیں روکیں - ہم ان کو روکتے ہیں۔"

یہ کہتے ہی انسپکٹر کامران مرزا نے ان دونوں پر اچانک چھلانگ لگا دی - ان کے رُخ اس وقت کسی قدر ویگن کی طرف تھے - اس لیے سنبھل نہ سکے - ادھر انسپکٹر جمشید بے تحاشہ ان کی طرف دوڑے جو ویگن کی طرف جا رہے تھے - انھوں نے جو دوڑتے قدموں کی آواز سنی تو گھبرا کر مڑے ، لیکن اس وقت تک انسپکٹر جمشید ان سے ٹکرا چکے تھے - ان میں کھلبلی سی مچ گئی - اتنے میں منور علی خان ، خان رحمان ، محمود ، فاروق اور فرزانہ بھی حرکت میں آ گئے - آن کی آن میں ان پانچوں کو مُکّوں اور لاتوں پر رکھ لیا گیا - لمبے قد والے کی ٹھوڑی پر ایک مُکّا جو لگا تو دھڑام سے گرا اور پھر نہ اٹھ سکا - وہ دوسری طرف متوجہ ہو گئے - اس کے چاروں ساتھیوں کو قابو میں کرنے میں صرف ایک منٹ لگا - اب جو ان پر تابڑ توڑ ہاتھ پڑے تو بے دم ہو گئے اور لمبے لیٹ گئے :

" چلو بھئی باندھ لو انھیں بھی - ابھی ہمیں لمبے آدمی سے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ اسے کس شخص کو ختم کرنے کا حکم ملا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے انسپکٹر جمشید ویگن کی طرف مڑے اور پھر دھک سے رہ گئے -

اسی وقت ویگن ایک جھٹکے سے آگے بڑھی تھی - وہ بے تحاشہ

اس کی طرف دوڑ پڑے - لمبا آدمی ان سے چال کھیل گیا تھا - ویگن طوفانی رفتار سے دوڑ پڑی تھی - کسی لمحے بھی اس کے کسی درخت سے ٹکرا جانے کا ڈر تھا ، لیکن شاید لمبے آدمی پر بھی بھوت سوار ہو چکا تھا - دیکھتے ہی دیکھتے انسپکٹر جمشید بہت پیچھے رہ گئے -

" نہیں - ہمیں اس ویگن کا تعاقب کرنا ہے "۔ وہ چلّائے -

باقی سب بھی ان کے پیچھے دوڑ پڑے - ان کی جیپ شوکی برادرز کے دفتر کے باہر رہ گئی تھی ، کیونکہ وہاں سے انھیں سُرخ ویگن میں لایا گیا تھا - لہذا وہ ویگن کے پیچھے پیدل ہی جا سکتے تھے - جنگل میں کوئی جیپ یا ٹیکسی کہاں سے لاتے - آخر دوڑتے ہوئے جنگل کے دوسرے سِرے تک پہنچ گئے - اب وہ سڑک پر دوڑ رہے تھے - اور سُرخ ویگن کا دُور دُور تک پتا نہیں تھا :

" اب دوڑنے کا کیا فائدہ ؟" فاروق بھنّا کر بولا -

" ہم دوڑنے کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں "۔ محمود بولا -

" کچھ بھی ہو - اب ہم اس شخص کو تو ہرگز نہیں بچا سکتے "۔ فرزانہ بولی -

" اور یہ میری وجہ سے ہوا - میں نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ لمبا آدمی بے ہوش ہو چکا ہے ، یہ کیوں خیال نہ کیا کہ وہ مکر کر رہا

ہے۔" انسپکٹر جمشید افسوس زدہ لہجے میں بولے۔

" اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں، شاید اس شخص کی موت کا وقت آ گیا ہے۔"

آخر شہری حدود میں انھوں نے دو ٹیکسیاں پکڑیں اور محکمۂ سراغرسانی کے دفتر پہنچے۔ آئی جی انوار عالم صاحب سے ملاقات کی، انھیں صورتِ حال بتائی اور پھر انسپکٹر کامران مرزا نے کہا:

" کوئی شخص ہلاک کیا جانے والا ہے۔ یا کیا جا چکا ہے۔ آپ تمام پولیس اسٹیشنوں کو خبردار کروا دیں کہ جونہی کوئی اطلاع ملے۔ آپ کو فون پر پیغام دیا جائے۔"

" اچھی بات ہے۔"

" اور ہاں! ہمارے پروفیسر داؤد پہنچے یا نہیں؟"

" ابھی تک نہیں۔"

عین اسی وقت چپراسی اندر داخل ہوا، اس کے ساتھ پروفیسر داؤد بھی تھے۔

" لیجیے۔ آ گئے پروفیسر انکل۔ السلام علیکم۔" فرزانہ جھک کر بولی۔

" وعلیکم السلام۔ آخر تم لوگوں نے مجھے بھی شامل کر کے چھوڑا۔ میں تو سمجھا تھا، اس بار میں بال بال بچا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے، پھر انوار عالم سے مصافحہ کیا۔

" میرا خیال ہے۔ اب ہمیں یہاں نہیں رکنا چاہیے۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔" خان رحمان بولے۔

" اور یہ دیر یقیناً میری وجہ سے ہوئی ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

" آپ کا خیال قریب قریب ٹھیک ہی ہے انکل۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

" قریب قریب۔ کیا مطلب۔ بالکل ٹھیک کیوں نہیں۔"

" اس لیے کہ ہم کچھ دوسرے کاموں میں بھی اُلجھے رہے۔"

" لیکن میرے آنے کے بعد تو ان دوسرے کاموں کی وجہ سے نہیں رُک رہے ہو، لہٰذا یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ دیر میری وجہ سے ہوئی ہے۔"

" چلیے انکل۔ یونہی سہی۔ دیر کا سہرا اس مرتبہ آپ کے سر ہی سہی۔" فاروق شوخ لہجے میں بولا۔

" دیر کا سہرا۔ بھئی واہ۔ کمال ہے۔" پروفیسر داؤد حیران ہو کر بولے۔

" اگر ہم اٹھ نہ لیے تو فاروق اور بھی وقت ضائع کرے گا۔" انسپکٹر جمشید بُرا سا منہ بنا کر بولے۔

" لیکن ابا جان! جزیرے کی طرف روانہ ہو جانے کے بعد ہمیں یہ کس طرح معلوم ہو گا کہ کس شخص کو ہلاک کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔"

محمود نے اعتراض کیا۔

" اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ اس اطلاع کے لیے ہم کب تک رکے رہ سکتے ہیں۔ کیا خبر اس واردات کی خبر کب ہو گی۔"

" ہوں ۔ بات بھی ٹھیک ہے ۔ ہمیں چلنا ہی چاہیے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

اور وہ انوار عالم سے رخصت ہوئے۔ انھوں نے دو جیپوں کا انتظام کر دیا تھا۔ لانچ پہلے ہی ساحل پر موجود تھی۔ اس میں پٹرول وہ پہلے ہی چیک کر چکے تھے۔ جزیرے کے ابھی وہ کئی چکر لگا سکتی تھی۔ اندھا دھند انداز میں جیپیں دوڑاتے جنگل تک پہنچے ، اس وقت انھیں خیال آیا۔ لمبے آدمی کے چاروں ساتھیوں کو وہیں چھوڑ گئے تھے۔ انھوں نے دیکھا۔ وہ ہوش میں آ چکے تھے۔ اور سہمے ہوئے درختوں کے پیچھے چھپنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

" ان کا کیا کریں۔" خان رحمان بولے۔

" کم از کم باندھ تو دینا ہی چاہیے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

یہی کیا گیا ، ابھی باندھ کر فارغ ہوئے تھے کہ خیمے میں وہی آواز گونج اٹھی :

" ٹوں ٹوں۔"

وہ اچانک اٹھے۔ باس لمبے آدمی سے بات کرنا چاہتا

تھا۔ انسپکٹر جمشید خیمے میں داخل ہو گئے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ بھی باہر کھڑے نہ رہ سکے۔ ان کے پیچھے دوسرے بھی خیمے میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے دیکھا۔ زمین میں ایک گڑھا کھدا ہوا تھا۔ قبر نما گڑھا۔ اور اس میں سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا آلہ موجود تھا۔ اس میں سے ٹوں ٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ انسپکٹر جمشید نے پروفیسر داؤد کو اشارہ کیا ، وہ گڑھے میں اتر گئے۔ اور کچھ سوچ کر ایک بٹن دبا دیا ، فوراً ہی آواز گونجی :

" ہیلو گاگال۔ کہو۔ کیا رہا ؟"

پروفیسر داؤد نے گھبرا کر اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا۔ انھوں نے انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود گڑھے میں اتر کر بولے :

" یس باس۔ کام ہو گیا " اب وہ لمبے آدمی کی آواز میں بولے تھے۔

" گڈ ! اب تم لوگ فوراً جزیرے پر پہنچو۔ جزیرے پر بھی تمھیں کچھ شکار ملیں گے۔ انھیں بھی ختم کرنا ہے۔"

" او کے باس۔" وہ بولے۔

آلے میں سے آواز آنا بند ہو گئی۔ وہ باہر نکل آئے۔ آلے کو جوں کا توں چھوڑ کر لانچ کی طرف دوڑے۔

" آؤ بھئی چلیں۔ نہ جانے جزیرے پر اب کن لوگوں سے ملاقات

ہونے والی ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

وہ لانچ پر سوار ہو گئے۔ لانچ تیر کی طرح جزیرے کی طرف روانہ ہوئی۔

" ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم بے مقصد بھاگ دوڑ میں مصروف ہوں۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

" ہاں! تم یہ کہہ سکتے ہو، لیکن یہ نہ بھولو۔ ہمارے سات ساتھی، سونے کا ایک جہاز اور ملک کا انتہائی قیمتی ریکارڈ غائب ہے۔" محمود نے بُرا سا منہ بنایا۔

" ہاں! یہ تو خیر بالکل ٹھیک ہے۔ اور ان تمام واقعات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ جو کوئی بھی ہے۔ ہمارے ملک اور قوم کا پکا دشمن ہے۔"

" اس میں کیا شک ہے۔" فرزانہ فوراً بولی۔

" تو پھر۔ آخر تمہیں شک کس بات میں ہے۔" فاروق بولا۔

" تمہاری اس بے موقع اور بے محل بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔" فرزانہ نے فوراً کہا۔

" اچھا۔ جب جواب سوجھ جائے، بتا دینا۔"

" میرا خیال ہے، یہ وقت بے تکی باتیں کرنے کا ہرگز نہیں ہے۔" محمود نے تلملا کر کہا۔

" بھئی اب اس قدر ناراض بھی نہیں ہونا چاہیے۔ جزیرے

پر پہنچتے تک کچھ نہ کچھ بات تو ہونی ہی چاہیے۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

" پروفیسر انکل۔ زندہ باد۔" فاروق نے خود ہی نعرہ لگایا اور خود ہی جواب دیا۔

" ہائے۔ بے چارے کے نعرے کا جواب دینے والا بھی کوئی نہیں۔" فرزانہ حسرت زدہ لہجے میں بولی۔

" فکر نہ کرو۔ بہت جلد مجھے سات ساتھی نصیب ہونے والے ہیں۔" فاروق نے کہا۔

" تت۔ تمہارا مطلب ہے۔ آفتاب اور شوکی وغیرہ سے ملاقات ہونے والی ہے۔" محمود چونکا۔

" ہاں۔ شاید۔"

" وہم ہے تمہارا۔ اس جزیرے کو ہم پہلے ہی چھان چکے ہیں۔" فرزانہ نے کہا۔

" تب پھر دوبارہ کیوں جا رہے ہیں؟"

" پروفیسر انکل کی مدد سے ان آلات کو چیک کرنے جو درخت میں نصب ہیں۔"

" ارے باپ رے۔ درخت میں آلات۔" پروفیسر داؤد بوکھلا اُٹھے۔

" اصلی درخت میں نہیں انکل۔ نقلی درخت میں۔" محمود مسکرایا۔

" ارے۔ نقلی درخت۔ نقلی درختوں سے تو پچھلی مرتبہ بھی ملاقات ہوئی تھی۔" انھوں نے حیران ہو کر کہا۔

" جی ہاں ہوئی تھی۔ اس مرتبہ پھر ہو گی۔ بلکہ اس مرتبہ صرف درخت ہی مصنوعی نہیں ہیں۔ پورے کا پورا جزیرہ مصنوعی ہے۔"

" کیا کہا۔ پورے کا پورا جزیرہ مصنوعی ہے۔" پروفیسر داؤد اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

" کیا کر رہے ہیں انکل۔ آپ لانچ میں سوار ہیں۔ گھر کے ڈرائنگ روم میں نہیں بیٹھے۔" فاروق بوکھلا کر بولا۔

" ارے باپ رے۔" پروفیسر داؤد گھبرا کر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پر اب بے تحاشہ حیرت نظر آ رہی تھی۔

" خیر تو ہے۔ آپ بہت حیران نظر آ رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے ان کی طرف بغور دیکھا۔

" ہاں جمشید۔ ویسے کیا یہ حقیقت ہے۔ سمندر میں کوئی نقلی جزیرہ موجود ہے۔"

" جی ہاں۔ یہ بالکل درست ہے، اور اسی جزیرے کے جائزے کے لیے ہم نے آپ کو تکلیف دی ہے۔"

" تب تم نے غلطی کی جمشید۔" وہ سرسراہٹ زدہ آواز میں بولے۔

" غلطی کی۔ کیا مطلب۔" انسپکٹر جمشید چونک کر بولے۔

" یہ ساری باتیں مجھے آئی جی انوار عالم کے دفتر میں بتا دینی چاہییں تھیں۔ اس صورت میں شاید ہم اس شخص کو بچا سکتے تھے۔"

" کس شخص کو۔" وہ سب ایک ساتھ بولے۔

" اس شخص کو۔ جس کے قتل کا حکم اس پُراسرار باس نے دیا ہے۔"

" اوہ۔ آپ۔ آپ کو کیا معلوم۔" انسپکٹر جمشید کانپ کر بولے۔

" مصنوعی جزیرے مستقبل کا خوفناک ترین ہتھیار بننے والے ہیں، یہ جزیرے سمندر میں اچانک نمودار ہو کر دشمن کے بحری بیڑوں پر حملہ آور ہوا کریں گے۔ اور بحری بیڑے آن کی آن میں تباہ ہو جایا کریں گے۔ اور مزے کی بات یہ کہ بحری جہاز ان جزیروں کو کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکا کریں گے، کیونکہ ان کی طرف پھینکا گیا گولہ بارود واپس جہاز کو آ لگا کرے گا۔ اور یہ خیال اور فارمولا ہے۔ پروفیسر حاکان کا۔ وہ ملک کے اسی حصے میں گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ خیال انھوں نے برسوں پہلے پیش کیا تھا اور ان کا یہ بیان بھی شائع ہوا تھا کہ وہ اس منصوبے پر عملی کام کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ یعنی پوری تفصیلات طے کریں گے کہ ایسے جزیرے کس طرح بنائے جائیں گے، چلتے پھرتے مصنوعی جزیرے۔"

" پپ۔ پروفیسر حاکان۔" ان کی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

" ہاں پروفیسر حاکان ۔ اگر اس ساحل کے آس پاس کوئی مصنوعی جزیرہ بن چکا ہے تو پھر ضرور پروفیسر حاکان کی زندگی خطرے میں ہے ۔ دشمنوں نے کامیاب تجربہ کرنے کے بعد انھیں ہلاک کرنے کا پروگرام بنایا ہوگا تاکہ وہ ان جزیروں کے بارے میں کسی کو نہ بتا سکیں ۔" پروفیسر داؤد کانپتی آواز میں بولے ۔

" اُف ۔ یہ بہت بُرا ہوا ۔ کاش ۔ ہمیں یہ باتیں پہلے معلوم ہو جاتیں ۔ اس وقت جب ہم سُرخ ویگن کا تعاقب کر رہے تھے ۔" محمود نے بھی لرزتی آواز میں کہا ۔

" اب بھی وقت ہے جمشید ۔ ہمیں فوری طور پر پروفیسر حاکان کے پاس پہنچ جانا چاہیے ۔ شاید ہم ان کی زندگی بچا سکیں ۔"

" اب وقت گزر چکا ہے پروفیسر صاحب ۔ دشمن کبھی کا ان تک پہنچ چکا ہوگا ۔"

" پھر بھی ۔ آخر واپس مڑ چلنے میں کیا حرج ہے ۔ جزیرے کا رُخ تو ہم پھر بھی کر سکیں گے ۔" پروفیسر داؤد بے چین ہو کر بولے ۔

" بات ٹھیک ہے ۔ ہمیں واپس چلنا چاہیے ۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے ۔

" بہت بہتر ۔ اگر آپ لوگوں کی رائے یہ ہے تو یہی سہی ۔"

انسپکٹر جمشید نے کہا ۔

" ارے مگر ۔ ابا جان ۔ ہم تو جزیرے تک پہنچ بھی چکے ہیں ۔ او ہو ۔ یہ ۔ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں ۔" فرزانہ نے کانپتی آواز میں کہا ۔

سب نے جلدی سے جزیرے کی طرف دیکھا اور پھر دھک سے رہ گئے ۔ ان کے سامنے ایک ہولناک منظر تھا ۔

○

جونہی وہ عمارت کے دروازے پر پہنچے ، دروازہ کھل گیا ۔ آخر وہ اسی کمرے میں داخل ہوئے ۔ فوراً ہی آواز سنائی دی :

" تو تم گولیاں کھانے پر تیار نہیں ، بھوکوں مرنے پر آمادہ ہو ۔"

" جی ہاں ! ہم سے ملک اور قوم کے خلاف کام لیا جائے ، اس سے تو یہی بہتر ہے کہ ہم مر جائیں ۔" آصف بولا ۔

" میں نے تم لوگوں کی خواہش پوری کرنے کے لیے ہی تمھیں یہاں بلایا ہے ۔" آواز آئی ۔

" آپ کا مطلب ہے ۔ ہمیں ہلاک کرنے کے لیے ۔" آفتاب نے پُرسکون آواز میں کہا ۔

"یہی سمجھ لو۔"

"یہ کام تو وہاں بھی ہو سکتا تھا۔"

"ہاں! ہو سکتا تھا، لیکن تمہاری جرأت اور دلیری نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ اس کمرے میں بھی تم نے بے مثال جرأت کا مظاہر کیا تھا، یعنی میرے سامنے جھکے نہیں تھے۔ پھر گولیاں کھانے کے معاملے میں بھی تم نے انتہائی دلیری کا ثبوت دیا۔ ان حالات میں میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ تم چوہوں کی طرح مارے جاؤ۔ میں چاہتا ہوں۔ شیروں کی طرح موت کو گلے لگاؤ۔"

"شیر کس طرح موت کو گلے لگاتے ہیں؟" شوکی نے حیران ہو کر کہا۔

"مقابلہ کرتے ہوئے۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے۔ زندگی کے آخری سانس تک لڑتے ہیں، شکست تسلیم نہیں کرتے۔"

"تب ہم بھی یہی کریں گے۔" فرحت بولی۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے۔ تمہیں شیروں کی طرح موت کا سامنا کرنے کا موقع ضرور دیا جائے۔"

"اور اس کا طریقہ کیا ہو گا؟"

"ابھی جان لو گے۔ عمارت سے باہر چلے جاؤ، اگر ایک منٹ کے اندر نکل نہ گئے تو یہ عمارت خود تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دے گی۔" باس کی سرد آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"ارے باپ رے۔ وہ کیسے؟"

"باہر جاؤ۔" آواز میں غراہٹ تھی۔

"ابھی ابھی تو بہت نرم آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ یہ یکایک کیا ہو گیا۔ آپ بھی عجیب باس ہیں۔ باس تو خیر ہم نے نہ جانے کتنے دیکھے ہوں گے، لیکن آپ جیسا نہیں دیکھا۔" مکھن نے منہ بنا کر کہا۔

"مجھے دیکھا ہی کب ہے۔" آواز پھر آئی۔ شاید یہ جملہ ہنس کر کہا گیا تھا۔

"خیر۔ اتنا تو آپ کو بھی ماننا پڑے گا۔ ہم نے آپ کو ہنسا تو دیا ہی۔"

"اب صرف نصف منٹ باقی رہ گیا ہے۔"

"ارے باپ رے۔ بھاگو۔" شوکی نے بوکھلا کر کہا اور مڑتے ہی دوڑ لگا دی۔

سب کے سب دوڑ پڑے۔ اور آدھ منٹ سے بھی پہلے باہر نکل گئے۔ باہر وہی گائیڈ اپنے دس ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا، اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے:

"کیوں بھئی — آپ کس خوشی میں حیران ہیں؟" آفتاب نے خود بھی حیران ہو کر کہا۔

"آج — آج تک ایسا نہیں ہوا، لیکن خیر — یہ باس کی مرضی ہے، میں کیا کہہ سکتا ہوں — چلو —"

"کہاں چلیں — آخر ہمیں کہاں لے جانے کا ارادہ ہے؟"

"آؤ — سوال نہ کرو۔" اس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"چلیے جناب — اب نہیں کریں گے سوال۔" مکھن نے بھی منہ بنا کر کہا۔

وہ ان کے نرغے میں چلتے بالکل اسی جگہ آئے جہاں لفٹ سے اُترے تھے — لفٹ کا دروازہ کھلا تھا:

"چلو بھئی — لفٹ میں داخل ہو جاؤ۔"

"آخر ارادہ کیا ہے؟" شوکی نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"تم نے تو کہا تھا — اب سوال نہیں کریں گے۔" گائیڈ نے بھنّا کر کہا۔

"اوہو تو آخر اس میں اس قدر جلنے بھننے کی کیا ضرورت ہے، تم نے تو فرزانہ کی یاد دلا دی۔" آفتاب تلملا کر بولا۔

"کیا کہا — کس کی یاد دلا دی۔" اس نے حیران ہو کر کہا —

"کسی کی نہیں — تم کیا سمجھو گے ان باتوں کو — تو تم یہ چاہتے

ہو، ہم لفٹ میں داخل ہو جائیں۔"

"یں نہیں — باس۔"

"اچھی بات ہے — آؤ بھئی — حکم حاکم مرگ مفاجات۔" شوکی نے کہا اور لفٹ میں داخل ہو گیا — سب نے اس کا ساتھ دیا — ایسے میں فرحت بولی:

"ویسے مسٹر گائیڈ — شاید تمہارا بھی ہمارے ساتھ لفٹ میں سوار ہونے کو جی چاہ رہا ہے۔"

"نن نہیں — ہرگز نہیں — بھلا میرا کیوں جی چاہنے لگا — میں جانتا ہوں — تم سیدھے موت کے منہ میں جا رہے ہو۔"

"اوہ — تو اب یہ لفٹ موت کے منہ میں جائے گی — عجیب لفٹ ہے یہ بھی — کہیں جانے سے چوکتی ہی نہیں۔" آفتاب بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یہ بھی باس کے حکم کی پابند ہے۔" گائیڈ کے منہ سے نکل گیا —

"کک — کیا مطلب؟"

اسی وقت گائیڈ کا چہرہ سُرخ ہو گیا — ساتھ ہی باس کی آواز اُبھری:

"تم بھول رہے ہو — ضرورت سے زیادہ بات کسی کو نہیں بتائی جا سکتی۔"

"سوری باس۔ میں پھر ان کی باتوں کے ریلے میں بہہ گیا تھا، یہ بھی عجیب لوگ ہیں۔ ان کی باتیں رکنے میں ہی نہیں آتیں۔"

"لفٹ کا دروازہ بند کر دو۔ آواز خود بخود بند ہو جائے گی۔"

"اوکے باس۔ یہی کر رہا ہوں۔"

انھوں نے گائیڈ کی آنکھوں میں دیکھا۔ حسرت جھانک رہی تھی۔ نہ جانے یہ حسرت ان کے لیے تھی۔ یا اس کی کیا وجہ تھی۔ اسی وقت لفٹ کا دروازہ بند ہوگیا۔ گائیڈ اور اس کے ساتھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اور پھر لفٹ اوپر اٹھنے لگی:

"خدا جانے۔ اب یہ باس صاحب ہمیں کہاں بھیج رہے ہیں؟" آصف بڑبڑایا۔

"کہیں ہم واپس جزیرے پر تو نہیں جا رہے۔" شوکی نے خیال ظاہر کیا۔

"بھلا وہ ہمیں واپس کس طرح بھیج سکتا ہے۔ اس طرح تو دنیا میں اس کے بارے میں سب کو معلوم ہو جائے گا۔" اشفاق نے منہ بنایا۔

"شاید وہ یہی چاہتا ہے۔ کہ اوپر کی دنیا کو اس کے بارے میں معلوم ہو جائے۔" مکھن بولا۔

"کچھ بھی ہو۔ میں تو ایک بات جانتا ہوں" آفتاب نے پرزور لہجے میں کہا۔

"ایک بات سے زیادہ تم جان بھی کیسے سکتے ہو۔" فرحت نے جل کر کہا۔

"اور وہ کیا آفتاب؟" اخلاق نے بے چین ہو کر کہا۔

"یہ کہ اتنے عجیب و غریب حالات سے ہمارا کبھی سابقہ نہیں پڑا۔"

"ہاں! یہ تو خیر ٹھیک ہے۔"

لفٹ اب تیزی سے اوپر اٹھ رہی تھی اور پھر انہیں سمندر دکھائی دینے لگا۔ وہ مبہوت ہو کر سمندر کی مخلوق کو دیکھنے لگے۔ مخلوق اس ستون سے بھی ٹکرا رہی تھی، لیکن نہ تو انھوں نے ٹکرانے کی ہلکی سی آواز سنی اور نہ کوئی جھٹکا۔

"سمندر کو دیکھ کر تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ ہم پھر اس مصنوعی جزیرے پر جا رہے ہیں۔" اشفاق نے کہا۔

"ہاں! ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ تت۔ تو کیا باس نے ہمیں آزاد کر دیا ہے۔" مکھن خوش ہو کر بولا۔

"آزاد، لیکن وہ تو کہہ رہا تھا۔ ہمیں موت کے حوالے کر رہا ہے۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"تو اس میں منہ بنانے کی کیا ضرورت ہے۔" مکھن نے اس

سے بھی بُرا منہ بنایا۔

" اب اور کیا بناؤں۔ لے دے کے منہ ہی بنانے کے قابل رہ گیا ہوں۔" آفتاب نے بے چارگی کے عالم میں کہا اور دُوسرے مُسکرا دیے۔

" دوسروں کو زبردستی مسکرانے پر مجبور کرنا تو کوئی تم سے سیکھے۔" فرحت جل کر بولی۔

" پہلے تو تم ہی سیکھو۔" آفتاب بھلا کب رُکنے والا تھا۔

" فرحت بہن۔ تم اگر میرا ساتھ دو تو ہم اسے ناکوں چنے چبوا دیں۔" مکھن نے کہا۔

" لو۔ بڑے آئے۔ ناکوں چنے چبوانے والے۔ ارے میاں، یہ لوہے کے چنے چبانے کے برابر کام ہے۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

" معلوم ہوتا ہے۔ دن رات محاورے رٹا کرتے ہو۔" مکھن جل کر بولا۔

" بس۔ خاموش۔ شاید ہم جزیرے تک پہنچ گئے۔ دیکھو۔ درخت نظر آ رہے ہیں۔" آصف نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

انھوں نے دیکھا۔ درخت واقعی نظر آ رہے تھے۔ ساتھ ہی لفٹ کا دروازہ کھل گیا۔ وہ باہر نکلے تو خود کو اس ستون کی چھت پر پایا۔ نیچے سیڑھیاں جاتی دکھائی دیں۔

" آؤ۔ جلدی کرو۔ ہم اپنی دُنیا میں پہنچ گئے۔" آصف نے

خوش ہو کر کہا۔

وُہ جلدی جلدی سیڑھیاں اُترتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ جزیرے پر آ گئے۔ جزیرہ جُوں کا تُوں موجود تھا۔ ان کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایسے میں باس کی آواز سُنائی دی:

" میرے آدمیوں کی ایک لانچ جزیرے کی طرف آ رہی ہے، اس میں سوار ہو جاؤ۔"

" بہتر۔ بہت بہت باس صاحب۔ آپ کا بہت بہت شکریہ، لیکن آپ تو ہمیں موت کے حوالے کر رہے تھے۔" شوکی نے خوش ہو کر کہا۔

" تم لوگ بھی کیا یاد کرو گے۔" آواز آئی۔

" یاد تو خیر ہم واقعی آپ کو بہت کریں گے۔" مکھن نے فوراً کہا۔

" جاؤ۔ ساحل کی طرف جاؤ۔" باس کی آواز گونجی۔

اور وُہ ساحل کی طرف چلنے لگے۔ تیز تیز قدم اُٹھانے لگے۔ جونہی ساحل پر پہنچے۔ انھیں واقعی ایک لانچ آتی نظر آئی۔ عین اسی وقت ایک عجیب بات ہوئی۔ اس قدر عجیب کہ ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ آصف پوری قوت سے چلّا اُٹھا:

" ارے۔ یہ کیا۔ جزیرہ ڈوب رہا ہے۔"

" جزیرہ ڈوب رہا ہے۔ اُف خدا۔ یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں — شاید — شاید یہ کوئی بہت ہی خوفناک ترین اور طویل ترین خواب ہے — جو ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔" اخلاق نے کانپتی آواز میں کہا۔

ان کی نظریں ساحل پر جم کر رہ گئیں — ساحل غائب ہوتا جا رہا تھا — پانی ان کی طرف بڑھ رہا تھا —

جلدی کی شرط

انھوں نے دیکھا، جزیرہ ڈوب رہا تھا — لمحہ بہ لمحہ پانی میں جا رہا تھا اور خشکی پر کھڑے کچھ لوگ بڑی طرح ہاتھ ہلا رہے تھے —

"یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں پروفیسر انکل۔" فاروق گڑبڑا کر بولا۔

"شاید دنیا کا آٹھواں عجوبہ۔" پروفیسر بڑبڑائے۔

"خان رحمان، لانچ اور تیز چلاؤ — شاید ہم ان لوگوں کو بچا سکیں۔"

انھوں نے رفتار بڑھا دی — جونہی لانچ ڈوبتے جزیرے کے قریب پہنچی، وہ اچھل ہی تو پڑے — جزیرے پر کوئی اور نہیں، آفتاب اور شوکی وغیرہ تھے —

"ارے باپ رے — یہ تو ہمارے اپنے ساتھی ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔ ساتھ ہی انھوں نے چلا کر کہا:

"تم لوگ پانی میں چھلانگیں لگا دو اور لانچ کی طرف آنے کی کوشش کرو۔"

"اب — اب شاید یہی کرنا پڑے گا۔" آصف ہانپ کر بولا۔

اس وقت پانی ستون تک پہنچ چکا تھا۔ ان کے گھٹنوں تک پانی موجود تھا؛ گویا وہ ابھی جزیرے پر ہی کھڑے تھے، لیکن کوئی دم میں ان کے پاؤں اکھڑنے والے تھے۔ آخر انھوں نے خود ہی چھلانگیں لگا دیں اور لانچ کی طرف بڑھنے لگے ۔۔۔ مڑ کر جو دیکھا تو اب سمندر میں صرف وہ ستون کھڑا نظر آ رہا تھا، لیکن وہ بھی لمحہ بہ لمحہ نیچے ہو رہا تھا ۔۔۔ ان کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں ۔۔۔ وہ تیرتے ہوئے لانچ کے نزدیک آ گئے ۔۔۔

"یہ ۔۔۔ یہ آپ لوگ ہیں" آفتاب نے بمشکل کہا۔

"باتیں تو بعد میں بھی کر لیں گے ۔۔۔ پہلے لانچ میں سوار ہو جاؤ" محمود جل کر بولا۔

اب وہ سب لانچ کے چاروں طرف انھیں پکڑنے کے لیے جھک گئے۔ ایسے میں خان رحمان چلا کر بولے:

"لانچ کے توازن کا بھی خیال رکھنا، کہیں یہ الٹ نہ جائے"

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے"

آخر پندرہ منٹ کی جدوجہد کے بعد وہ سب لانچ پر سوار ہو گئے۔

"اُف خدا، یہ ۔۔۔ یہ ۔۔۔ ہم ....." فرحت ہکلا کر رہ گئی۔

اُن کے رُخ ستون کی طرف ہو گئے ۔۔۔ ستون کا اوپر والا حصہ اب بالکل سرخ نظر آ رہا تھا، جیسے آگ میں تپا ہوا لوہا ۔۔۔ عین اس وقت سمندر سے ایک آواز ابھری:

"لو اب اس ستون کا کمال دیکھو ۔۔۔ اس میں سے ایک گولا نکل کر کشتی سے ٹکرائے گا اور کشتی کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ٹکڑوں میں تقسیم نہ ہو جاؤ تو اس سے پہلے ہی لانچ سے چھلانگیں لگا دو۔"

وہ سناٹے میں آ گئے، پھر آفتاب جھنا کر بولا:

"لو اور سنو، ابھی ابھی چڑھے ہیں اور یہ حضرت کہہ رہے ہیں، پھر سمندر میں چھلانگیں لگا دو۔ یہ کیا تک ہوگی"

"تم لوگوں کو صرف ایک منٹ کی مہلت دی جاتی ہے۔ چھلانگیں لگاؤ نہ لگاؤ، کشتی کے پرخچے اڑ کر رہیں گے"

"جمشید، ہمیں چھلانگیں لگانا ہی ہوں گی" پروفیسر داؤد کی آواز سنائی دی۔

"اوہو، پروفیسر انکل، آپ بھی ہیں؟" آفتاب بول پڑا۔

"چلو، کود جاؤ" انسپکٹر جمشید چلائے، کیونکہ ایک منٹ ہوا ہی چاہتا تھا۔

انھوں نے ایک ساتھ لانچ سے چھلانگیں لگا دیں اور اس کے صرف تیس سیکنڈ بعد ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا ۔۔۔ انھوں نے لانچ کے ٹکڑے بہت اونچے اڑتے دیکھے، پھر وہ سمندر میں آ گرے ۔۔۔ اب جو انھوں نے ستون کی طرف دیکھا، تو وہ بھی غائب تھا ۔۔۔

"تو بھئی، ستون بھی گیا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اب، اب ہم کیا کریں۔ کم از کم ہم تیر کر تو ساحل تک جا نہیں سکتے۔" آصف بوکھلا کر بولا۔

"شاید باس کے الفاظ کا مطلب یہی تھا، میں تمھیں موت کے حوالے کر رہا ہوں۔" شوکی بولا۔

"ہم اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے کہ ساحل کی طرف تیرنا شروع کر دیں۔ آخری دم تک زندگی کے لیے کوشش کریں گے — جو اللہ کو منظور۔"

اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ ساحل کی طرف تیرنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کے بازو شل ہونے لگے — سب سے برا حال پروفیسر داؤد کا تھا۔ وہ اگرچہ تیرنا جانتے تھے، لیکن بڑھاپے کی وجہ سے ان کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔ ان کی وجہ سے باقی لوگوں کو بھی آہستہ تیرنا پڑ رہا تھا۔ یہ بات پروفیسر داؤد نے بھی محسوس کر لی، چنانچہ بولے:

"جمشید، میری وجہ سے اپنی زندگیوں کو خطرے میں نہ ڈالو۔ جس قدر تیز تیر سکتے ہو، تیرو۔"

"نہیں پروفیسر صاحب، ہم آپ کے بغیر ساحل پر اترنا پسند نہیں کریں گے۔ یوں بھی ہمارے ساحل پر پہنچنے کے امکانات بہت کم ہیں۔"

"ابا جان، آپ شاید بھول رہے ہیں، جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے۔ اگر اللہ کو ہماری زندگی منظور ہوئی تو یہ سمندر ہمیں ہڑپ نہیں کر سکتا۔" محمود نے جذبات سے لبریز آواز میں کہا۔

"ارے، وہ کیا؟" فرزانہ پوری قوت سے چلائی۔

سب کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ انھوں نے دیکھا، ایک لانچ اوندھی ان کی طرف چلی آ رہی تھی۔

"شاید یہ بھی اس جہاز پر رہی ہو گی۔" انسپکٹر کامران مرزا بڑبڑائے۔

"آئیے، اسے پکڑیں۔"

انسپکٹر جمشید، انسپکٹر کامران مرزا — خان رحمان اور منور علی خان لانچ کی طرف بڑھے اور جلد ہی اسے سیدھا کرنے میں کامیاب ہو گئے — اب وہ اس کے سہارے تیرتے ہوئے ان تک آ گئے۔ خان رحمان نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"محمود، تم نے ٹھیک کہا تھا، جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے۔"

"اب باری باری لانچ پر سوار ہو جاؤ۔"

پانچ منٹ بعد وہ سب لانچ پر سوار ساحل کی طرف جا رہے تھے۔ جب ذرا دم میں دم آیا تو فاروق کی چہکتی آواز سنائی دی:

"ہائیں، ہم تو ایک بار پھر ایک جگہ جمع ہو گئے۔"

"نظر تو یہی آ رہا ہے۔" آفتاب بولا۔

"ابھی نظر ہی آ رہا ہے، کمال ہے۔" مکھن بولا۔

"ویسے لانچ پر جمع ہونا مبارک ہو۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"سب کو السلام علیکم۔" فرزانہ چہکی۔

"فرزانہ، تمہاری آواز سن کر مجھے یقین آ چلا ہے کہ ہم واقعی ایک بار پھر ایک جگہ جمع ہو چکے ہیں۔" فرحت بولی۔

"کیا مطلب، یعنی اگر تم فرزانہ کی آواز نہ سن لیتیں تو اس بات پر یقین ہی نہ آتا۔" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"تو اس میں برُا ماننے والی کیا بات ہے۔ یہ ان کے یقین کا معاملہ ہے، آئے یا نہ آئے۔" مکھن بول اٹھا۔

"اے اے، میرے آڑے آنے کی کوشش نہ کرنا۔" آصف نے بھنا کر کہا۔

"جی، بہت بہتر — یہاں تو آڑے آنے کے لیے اور بہت ہیں۔" مکھن نے معصومانہ لہجے میں کہا اور سب مسکرانے لگے۔

"ہم سب باتوں میں الجھ گئے۔" اشفاق برُا سا منہ بنا کر بولا۔

"تو تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔" اخلاق بولا۔

"خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے، جس نے ہمیں موت کے منہ سے اس طرح نکال لیا، جس طرح مکھن میں سے بال۔" اشفاق نے کہا۔

"مکھن میں سے بال — بھئی مکھن، تم میں بال بھی ہے۔"

"مہربانی فرما کر بال کی کھال نہ اتارو۔ یوں شیشے میں بال آ جاتا ہے۔"

"پڑ گئے سب کے سب بال کے پیچھے، کوئی اور چیز تو نری ہی نہیں جیسے۔" شوکی نے جل بھن کر کہا۔

"اور کیا، شوکی بھائی جو موجود ہیں — ان کے پیچھے پڑو نا۔" آفتاب بولا۔

"ہم تو گئے کام سے۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"بھئی، مجھے تو مزا آ رہا ہے ان کی باتوں میں۔" خان رحمان بولے۔

"اور مجھے بھی۔" پروفیسر داؤد ہنسے۔

"آپ لوگوں کا کیا ہے — آپ کو تو ہمیشہ ہی ان کی باتوں میں مزا آتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اب کیا کیا جائے — ساحل پر پہنچنے تک ہمیں کام ہی کیا ہے۔" منور علی خان نے کندھے اچکائے۔

"خیر یوں تو خاموش بھی رہا جا سکتا ہے۔" اکرام کی آواز سنائی دی۔

"ہائیں، یہ تو انکل اکرام کی آواز ہے۔ آپ اب تک کہاں

تھے ۔" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"آپ لوگوں کی تابڑ توڑ باتیں سن رہا تھا۔ جونہی موقع ملا، بول اٹھا۔ دراصل آپ لوگ جب بولنے پر آتے ہیں تو پھر کسی کو موقع تو دیتے ہی نہیں۔" اکرام کا لہجہ شکایت آمیز تھا۔

"ہاں انکل، یہ تو آپ نے ٹھیک کہا، لیکن اس میں ہمارا بھی کیا قصور ــ جب مدتوں کے بچھڑے ملتے ہیں تو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہتا۔ یہی حال اس وقت ہمارا ہے۔ امید ہے، معاف فرمائیں گے۔"

"خیر، معافی مانگنے والی تو کوئی بات نہیں ــ یوں تو مجھے بھی آپ کی باتیں بہت بھلی لگ رہی ہیں۔" اکرام مسکرایا۔

"شکریہ انکل، یہ جان کر بہت خوشی ہوئی ۔" آصف نے واقعی خوش ہو کر کہا۔

"میں تو ان لوگوں سے یہ سننا چاہتا تھا کہ یہ کہاں غائب ہو گئے تھے ــ لیکن ....." انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔

"یہ بھی سن لیجیے گا انکل، پہلے ذرا ہمیں اپنے دلوں کی بھڑاس نکال لینے دیجیے۔" آفتاب بولا۔

"اچھا، جب بھڑاس نکال چکو تو بتا دینا۔" انسپکٹر جمشید نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"شکریہ انکل، آپ بہت اچھے ہیں۔"

"بھئی چاپلوسی نہیں چلے گی۔" انھوں نے فوراً کہا

"جی بہتر، اب ہم اسے ہرگز نہیں چلائیں گے۔" فرحت بولی۔

"میرا خیال ہے جمشید، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔ جب یہ باتیں کر کر کے تھک جائیں گے تو تم حالات سن لینا۔" خان رحمان نے مشورہ دیا۔

"لیکن اس وقت یہ کس طرح بتا سکیں گے۔" انسپکٹر جمشید بول اٹھے اور سب مسکرا دیے۔

"آپ فکر نہ کریں انکل، ہم بولنے کی تھوڑی سی طاقت بچا لیں گے۔" آصف نے شوخ آواز میں کہا۔

"شکریہ، یہ تم لوگوں کا ہم پر احسان ہوگا، اگرچہ مارے بے چینی کے ہمارا برا حال ہے اور ہم جلد از جلد یہ جان لینا چاہتے ہیں کہ تم لوگ کہاں رہے اور کچھ دیر پہلے جزیرے پر کیوں نہیں تھے، لیکن تمہارے جوش و خروش کو دیکھ کر ہم اپنی بے چینی کو دبا لیتے ہیں۔ اب تم ذرا جلدی جلدی فارغ ہو جاؤ۔"

"انکل، کم از کم جلدی جلدی کی شرط تو نہ لگائیں۔" فرحت نے بوکھلا کر کہا۔

"اچھا بھئی، جتنی دیر جی چاہے لگا لو، بس ۔" انسپکٹر کامران مرزا نے جھنجلا کر کہا۔

"شکریہ، بہت بہت شکریہ ــ انکل ہوں تو آپ جیسے۔" فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے ـــ جیسے یہ سب کے سب باتوں کے سمندر میں بہہ جانا چاہتے ہیں" منور علی خان بولے۔

"ہاں، ان میں بس یہی تو بُری بات ہے۔ کسی طرح بھی باتوں کے سمندر سے خود کو بچا نہیں سکتے؛ حالانکہ اس کیس میں ہم ویسے ہی سمندر میں الجھے ہوئے ہیں" خان رحمان بولے۔

"لیکن انکل، اب تو ایسا معلوم ہو رہا ہے، جیسے ہمارے بجائے آپ لوگ باتیں کرنے پر تلے بیٹھے ہیں" فاروق بولا اور چھوٹی پارٹی ہنس پڑی۔

"اچھا بھئی، اب ہم کچھ نہیں بولیں گے۔ میدان تمہارے ہاتھ ہے" خان رحمان بولے۔

لمحے بھر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ آخر فاروق نے کہا۔

"یہ ـــ یہ ہمیں سانپ کیوں سونگھ گیا"

"سانپ ـــ ارے باپ رے ـــ سانپوں کا نام نہ لو، کہیں سمندر میں کوئی سانپ مقابل نہ آ جائے" آفتاب بولا۔

"تم جیسے بزدل ڈرتے ہوں گے سانپوں سے" فاروق نے منہ بنایا۔

"اگر ہم اس وقت لانچ میں سوار نہ ہوتے تو بتاتے تمہیں، بزدل کون ہے" آفتاب بھنا کر بولا۔

"تو کیا ہوا۔ ساحل پر پہنچ کر بتا دینا۔ میں بغور سننے کی کوشش کروں گا" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"بھئی، اتنی مدت بعد تو ملے ہیں، لڑو تو نہیں" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"ہاں واقعی، لڑنا ہی ہے، تو جلد جلد ملاقات کیا کرو" اشفاق بول اٹھا۔

"ہوا بی مینڈکی کو زکام" فرزانہ نے فوراً کہا۔

"بی مینڈکی تو تم خود ہو سکتی ہو یا فرحت ـــ ہم میں سے تو کوئی نہیں ہو سکتا" شوکی بولا۔

فرزانہ اور فرحت جھینپ کر رہ گئیں، پھر فرزانہ نے فوراً کہا:

"ہم، میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں"

"اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو تیر کمان سے نکل چکا ہے ـــ خیر کوئی بات نہیں" شوکی نے کہا۔

"ارہو، یہ کیا" فرزانہ چونکی۔

"کہاں کیا؟" آفتاب بولا۔

"انکل شاہد نظر نہیں آ رہے"

"ہاں واقعی، وہ شامل نہیں ہو سکے" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اور تو سب موجود ہیں ـــ بس ایک وہی نہیں ہیں" اکرام نے سرد آہ بھری۔

"واقعی، یہ تو انکل اکرام کے ساتھ بڑا ظلم ہوا" فرحت مسکرائی۔

"خیر، کوئی بات نہیں۔ انہیں بھی بلوالیں گے۔ اب تو موقع حاصل ہو جائے گا" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"یہ ضروری نہیں انکل" فاروق بول اٹھا۔

"کیا ضروری نہیں" انھوں نے چونک کر کہا۔

"یہ کہ موقع حاصل ہو جائے گا ـــ یہ موقعے ہمارے بارے میں ذرا کنجوس واقع ہوئے ہیں۔ ذرا مشکل سے ہی ملتے ہیں ـــ ہو سکتا ہے، ساحل پر اترتے ہی ہم پھر الجھ جائیں"

"خیر، دیکھا جائے گا" انھوں نے کندھے اچکائے۔

"ہم نے جو کچھ دیکھا، اس پر اب تک یقین نہیں آیا ـــ کیا جزیرہ واقعی ڈوب چکا ہے؟" شوکی بڑبڑایا۔

"ہاں، اس لیے کہ وہ مصنوعی جزیرہ تھا" فاروق نے انھیں بتایا۔

"کیا؟" وہ ایک ساتھ چلا اٹھے ـ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ـــ

"بھئی، اب اتنی بھی آنکھیں نہ پھیلاؤ ـــ کچھ سٹاک میں بھی رکھ لو، کیونکہ ابھی نہ جانے کتنے مواقع آئیں گے آنکھیں پھیلانے کے" محمود بولا۔

"مشورہ ٹھیک ہے ـ میں آئندہ آنکھیں پھیلانے کے بارے میں پوری احتیاط برتوں گا" آفتاب نے فوراً کہا۔

"ساحل پر پہنچنے سے پہلے اگر ہم ایک دوسرے کے حالات سن لیتے تو یہ کہیں بہتر تھا" انسپکٹر جمشید منہ بنا کر بولے۔

"ہاں، اس کے بعد تم جتنی جی چاہے باتیں کر لینا ـــ تمھیں کوئی نہیں روکے گا" انسپکٹر کامران مرزا نے بھی تائید کی۔

"اگر سب بڑوں کی یہی رائے ہے تو ہم کون ہوتے ہیں اس رائے سے اختلاف کرنے والے"

"تو پھر سب سے پہلے آصف اور شوکی وغیرہ اپنی کہانی سنائیں گے۔ آخر یہ جزیرے پر سے کہاں غائب ہو گئے تھے اور پھر جزیرے پر ہی ہمیں کس طرح نظر آ گئے، وہ بھی اس وقت، جب جزیرہ ڈوب رہا تھا" انسپکٹر جمشید بے تابی کے عالم میں بولے۔

"میں عرض کرتا ہوں" شوکی جلدی سے بولا۔

"لیکن میرا خیال ہے، مجھے بیان کرنے کی اجازت دو" آصف بول اٹھا۔

"لڑنے کی ضرورت نہیں، ٹاس کر لو" آفتاب بول پڑا۔

"اس جزیرے پر پہلے کون پہنچا تھا" انسپکٹر جمشید نے تنگ آ کر پوچھا۔

"جی ہم اور انکل منور علی خان" مکھن بولا۔

"تب تو شوکی کو ہی کہانی سنانے دو۔ اس کے بعد ہم تمھاری کہانی سنیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"لیکن ابا جان، کہانی تو جزیرے پر پہنچنے سے پہلے شروع ہونا تھی۔" آفتاب نے اعتراض کیا۔

"ہاں بالکل، میں بھی جزیرے سے پہلے کے واقعات سے شروع کروں گا۔" شوکی مسکرایا۔

"اچھا بھئی، تم ہارے، میں جیتا۔" آصف نے تنگ آ کر کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو بھئی، تم ہارے میں جیتا ۔۔۔ اس صورت میں تو کہانی پہلے تمھیں سنانی چاہیے۔" فاروق حیران ہو کر بولا۔

"اوہ سوری، الٹ جملہ بول گیا۔"

"الٹ جملہ بولنے والوں سے نہ جانے مجھے کیوں چڑ ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"ہو گئی، ہیں کیا ۔۔۔ اب تم واقعات بیان کرنے دو گے یا نہیں!"

"معاف کرنا، میں نے تمھاری زبان نہیں پکڑ رکھی۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"بس سن لیے ہم نے واقعات۔" اکرام نے منہ بنایا۔

"اس سے تو ہم واقعات کے بغیر ہی بھلے۔" منور علی خان بولے۔

"آپ سب تو ان کے مقابلے میں ڈٹ سے گئے ۔۔۔ ایک موقع تو دیجیے نا۔" خان رحمان مسکرا کر بولے۔

"اور کیا، مجھے تو ان کی یہ باتیں بھی پیاری لگ رہی ہیں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"تو پروفیسر انکل، آپ ہماری باتیں ریکارڈ کر لیا کریں نا۔" مکھن بول پڑا۔

"دھت تیرے کی ۔۔۔ اس کا صرف اور صرف ایک حل ہے۔" محمود نے ران پر ہاتھ مارا۔

"کس کا؟" فاروق حیران ہو کر بولا۔

"واقعات سننے کا ۔۔۔ ساحل پر پہنچ کر ہم سب کو ایک طرف بٹھا دیا جائے اور بڑے الگ جا بیٹھیں، پھر جس کی کہانی سننا ہو صرف اسے بڑوں کے پاس بلایا جائے۔ اس دوران بقیہ چھوٹے اپنی باتیں اچھی طرح بگھارتے رہیں۔"

"اگرچہ محمود کی ترکیب بہت اچھی، بلکہ بہت پیاری ہے، لیکن افسوس اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ باقی لوگ اس طرح واقعات سننے سے محروم ہو جائیں گے۔" فرزانہ بولی۔

"تب پھر سب لوگ مہربانی فرما کر خاموش رہیں اور صرف شوکی کو بولنے دیں۔" فرحت نے سہتا کر کہا۔

"لو بھئی شوکی، تمھیں مبارک، اب صرف تم بولو گے۔" آفتاب مسکرایا۔

"دنیا ۔۔۔ [illegible] مبارک۔" شوکی نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں شوکی، تم شروع کرو۔ اب اگر ان میں سے کوئی بولا تو میں اسے اٹھا کر سمندر میں پھینک دوں گا۔" انسپکٹر جمشید نے جھنا کر کہا۔

"ارے باپ رے۔" فاروق کانپ اٹھا۔

"لیکن انکل، پھر سمندر میں سے اسے نکالنے کے لیے آپ کو ہی چھلانگ لگانا پڑے گی اور اس طرح وقت ضائع ہوگا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" انسپکٹر جمشید نے بُرا سا منہ بنایا۔ پروفیسر داؤد بے ساختہ ہنس پڑے۔

"بس بھئی، کہیں بڑوں کا پارہ اب چڑھ نہ جائے۔ عام خاموشی کا اعلان کیا جاتا ہے۔" محمود نے بلند آواز میں کہا۔

یک لخت خاموشی چھا گئی — یہ دیکھ کر خان رحمان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"محمود، تم نے یہ اعلان پہلے کیوں نہیں کر دیا تھا۔"

"پہلے اس اعلان کا وقت نہیں آیا تھا۔"

"ہاں، بات تو ٹھیک ہے۔"

"خان رحمان، اب یہ چپ ہوگئے ہیں تو تم نے ان سے بات چیت شروع کر دی۔"

"اوہ، مجھے افسوس ہے۔ شاید میرا دماغ چل گیا ہے۔"

"نہیں خیر، ایسی تو کوئی بات نہیں۔" پروفیسر داؤد ہنسے۔

"میرا خیال ہے، بات چیت کا سلسلہ رد کے نہیں رک رہا۔ بڑے ہوں یا چھوٹے، کچھ نہ کچھ بول ہی پڑتے ہیں۔ اس لیے اب میں اپنی کہانی شروع کر دیتا ہوں، تاکہ کسی طرح یہ شروع تو ہو جائے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے کہانی شروع کر دی اور یہ کہانی اس وقت سے شروع کی، جب منور علی خان ان کے پاس آئے تھے — یہاں تک کہ وہ جزیرے کے تمام واقعات سنا گیا اور پھر جزیرے کے نیچے کس طرح پہنچے۔ وہاں نئی دنیا کے باس سے ملاقات کس طرح ہوئی — دودھیا دیوار کے دوسری طرف کن کن لوگوں سے ملاقات ہوئی وغیرہ — ساری تفصیل سناتا چلا گیا۔ جوں ہی وہ خاموش ہوا، محمود نے کانپتی آواز میں کہا:

"اف خدا، ہم نے کیا سنا ہے۔ سمندر کے نیچے ایک اور دنیا آباد ہے۔"

"اور اس دنیا میں ہماری دنیا کے آدمی پہنچے ہوئے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"اس — اس میں کوئی شک نہیں....." فاروق نے کچھ کہنا چاہا، لیکن پھر رک گیا۔

"کس میں، آخر تم جملہ درمیان میں کیوں چھوڑ دیتے ہو۔"

"اس میں کہ ان لوگوں نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہے اور اگر وہ خواب نہیں تھا تو پھر، یہ لوگ واپس کیوں بھیج دیے گئے۔

پاس کو انھیں وہاں رکھنے میں کیا دشواری تھی؟"

"فاروق کا اعتراض وزن دار ہے، لیکن بہر حال یہ خواب نہیں تھا۔" آصف نے منہ بنا کر کہا۔

"اور اگر یہ خواب نہیں تھا تو مجھے کہنے دیں. ان لوگوں نے جزیرے کے سمندر میں سے سفر کیا ہے، جس پر کسی طرح بھی یقین نہیں آ رہا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"جزیرے کا سمندر، اف انکل۔" فاروق اچھل پڑا۔

"خیال رہے، ہم لانچ پر سوار ہیں۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"تم کیوں اچھلے؟" انسپکٹر کامران مرزا حیران ہو کر بولے۔

"یہ، یعنی جزیرے کا سمندر تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔" فاروق نے کانپتی آواز میں کہا۔

"دھت تیرے کی۔" محمود جھلا اٹھا۔

"خیر، اب شوکی کی کہانی ختم ہو گئی۔ انسپکٹر کامران مرزا، میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ آپ اپنی کہانی بیان کریں۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ بولے اور تفصیل سنانے لگے۔ وہ حیرت زدہ انداز میں سنتے رہے۔ آخر ان کے خاموش ہونے کے بعد انسپکٹر جمشید بولے:

"کمال ہے، آخر وہ جہاز کے نیچے آلات کیوں چپکانا چاہتے تھے، وہ بھی پانی میں رہ کر۔ کوئی آسان کام تو نہیں

حیران ہو کر بولے۔

"مشکل یہ ہے کہ سام لٹ مر چکا ہے اور یہ وہی بتا سکتا تھا کہ اس کے ساتھی جہاز کے نیچے کیا کرنا چاہتے تھے۔" اکرام نے کہا۔

"خیر، اب اس سے کیا بحث کہ وہ جہاز کے ساتھ کیا کرنا چاہتے تھے۔ سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ جہاز ہم سے چھن چکا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے اور اب باری آتی ہے جمشید صاحب اور ان کے بچوں کی۔ آخر یہ سمندر میں کس طرح پہنچ گئے تھے؟" منور علی خان بولے۔

"میں عرض کرتا ہوں۔" انھوں نے کہا اور پوری تفصیل سنا دی۔

"تو یہ تھی تفصیل۔ خدا کا شکر ہے. ہم ایک دوسرے کے ساتھ گزرے حالات سے واقف ہو گئے اور یہ جان چکے ہیں کہ دشمن اب ہماری پہنچ سے بہت دور چلا گیا ہے، کیونکہ اگر وہ جزیرہ سمندر کی سطح پر موجود رہتا۔ اس صورت میں تو ہم ضرور ان تک پہنچنے کی کوشش کر سکتے، لیکن اب ہمارے پاس کوئی راستہ، کوئی ذریعہ نہیں رہا۔" خان رحمان نے جلدی جلدی کہا۔

"تم نے بالکل غلط کہا۔ خان رحمان۔" پروفیسر داؤد بول اٹھے۔

"کیا کہا، میں نے غلط کہا — یہ آپ کہہ رہے ہیں پروفیسر صاحب، کم از کم مجھے آپ سے ایسی امید نہیں تھی۔" خان رحمان کا لہجہ شکایتی ہو گیا —

"پہلے یہ تو سن لو کہ میں نے کس لحاظ سے کہا ہے۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"پہلے یہ کس طرح سن لوں، میرے لیے اتنا ہی جملہ کافی ہے کہ میں نے غلط کہا ہے۔" خان رحمان بولے۔

"اوہو، کہیں تم میں پھر سے فوجی روح تو نہیں جاگ اٹھی۔" پروفیسر داؤد حیران ہو کر بولے۔

"تو وہ سوئی کب تھی۔" خان رحمان حیران رہ گئے۔

"میرا خیال تھا، تم نے اسے تھپکیاں دے دے کر سلا دیا ہے۔"

"آپ کا یہ خیال غلط ہے، میں تو اسے ہر وقت بیدار رکھنے کی کوشش میں رہتا ہوں۔"

"چلو، حساب برابر ہو گیا — اب سنو، تم نے کہا ہے کہ ہمارے سامنے اب کوئی راستہ نہیں رہا۔ جب کہ میں یہ کہتا ہوں، راستہ ابھی باقی ہے اور وہ راستہ ہے، پروفیسر حاکان۔"

"کیا کہا انکل، پروفیسر حاکان؟ لیکن ہمارے خیال کے مطابق تو وہ اس وقت تک دوسری دنیا کو سدھار چکے ہوں گے۔" محمود چونکا —

"ہو سکتا ہے، یہ بات درست ہو، لیکن ایک بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔" انھوں نے پراسرار انداز میں کہا۔

"اور وہ کیا؟"

"یہ کہ پروفیسر حاکان نے اپنے اس منصوبے کی تفصیلات لکھ کر کسی بہت ہی محفوظ جگہ رکھ چھوڑی ہوں گی — یہ ان کی بہت پرانی عادت تھی۔"

"لیکن ہمیں اس محفوظ جگہ کا پتا کس طرح چلے گا؟"

"یہ تو وہاں چل کر ہی معلوم ہو گا۔"

"گویا ہمیں سب سے پہلے پروفیسر حاکان کے ہاں جانا ہو گا۔"

"بالکل۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

ساحل پر لانچ سے اتر کر وہ چلتے ہوئے جنگل میں داخل ہوئے اور وہاں سے جیپوں کے ذریعے شہر پہنچے۔

"شوکی، یہ تمھارا شہر ہے۔ اب تم ہماری رہنمائی کرو گے، لیکن میرا خیال ہے، تمھیں پروفیسر حاکان کا پتا معلوم نہیں ہو گا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"جی نہیں، لیکن پتا ابھی معلوم کیے دیتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ بس کسی پبلک فون بوتھ کے سامنے رک جائیں۔" شوکی نے خوش ہو کر کہا۔

"اچھی بات ہے۔"

ایک پبلک فون بوتھ کے سامنے جیپیں روک لی گئیں۔ شوکی اتر پڑا۔ تین منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی:

"وہ شہر کے مشرقی حصے میں رہتے ہیں۔ بہت بڑی تجربہ گاہ ہے وہاں ان کی۔ تلاش کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا۔" اس نے نزدیک آنے پر کہا۔

"ان کی طرف سے کوئی اطلاع تو کسی پولیس سٹیشن کو نہیں ملی؟"

"جی نہیں، میں نے انوار عالم صاحب سے صرف یہ پوچھا تھا کہ ابھی تک کسی کے قتل کی اطلاع تو نہیں ملی۔ انھوں نے انکار میں جواب دیا۔" شوکی بولا۔

"ٹھیک ہے شوکی، تم نے اچھا کیا کہ ان سے پروفیسر حاکان کے بارے میں نہیں پوچھا۔ ہو سکتا ہے ہمارے خدشات بالکل بے بنیاد ثابت ہوں اور پروفیسر حاکان اپنی تجربہ گاہ میں زندہ سلامت موجود ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

وہ تجربہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ قریباً ایک گھنٹے بعد انھیں دو مسلح پہرے دار نظر آئے۔ انھیں دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ چونک اٹھے اور رائفلیں جیپوں کی طرف اٹھ گئیں۔

"ارے باپ رے، کہیں یہ ہم پر فائرنگ تو نہیں کرنے والے۔" آفتاب نے بوکھلا کر کہا۔

"نہیں، ان کا دماغ نہیں چل گیا۔" فاروق نے جھلا کر کہا۔

"تو پھر کس کا دماغ چل گیا؟"

"صاف ظاہر ہے، تمہارے سوا اور کس کا چلا ہوگا۔"

"بھئی، اس میں لڑنے کی کیا بات ہے۔ ہم سب، تم دونوں کا ہی دماغ چلا ہوا تسلیم کر لیتے ہیں۔" مکھن بول اٹھا۔

"اوہو، اچھا۔ یہ بات ہے۔" فاروق اس کی طرف پلٹا۔

"ج، جی ہاں، ہے تو یہی۔" اس نے سہم کر کہا۔

"اور تمہارا اپنے دماغ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" آفتاب نے چیخ کر کہا۔

"الحمد للہ، بہت ہی اچھی پوزیشن میں ہے۔ کیوں، خیر تو ہے، ادھار لینے کا پروگرام تو نہیں۔" مکھن جلدی جلدی بولا۔

"بس بس، معلوم ہوگیا۔ تمہارے بھی پر نکل آئے ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"توبہ ہے، پھر شروع ہوگئے۔" فرزانہ نے پاؤں پٹخے۔ اس وقت تک وہ گیٹ پر پہنچ چکے تھے۔

"کیا بات ہے جناب۔ کہاں بڑھے چلے آرہے ہیں؟"

"ہمیں پروفیسر حاکان سے ملنا ہے۔ جلدی کریں۔ ان کی زندگی خطرے میں ہے۔"

"کیا کہا، زندگی خطرے میں ہے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"بالکل بجا کہہ رہے ہیں۔ یقین کرنے میں دیر نہ لگائیں۔"

"ہرگز دیر نہیں لگائیں گے ــــ خالدین، تم فوراً اندر جاؤ اور دیکھو، کیا معاملہ ہے۔ میں ان لوگوں کو چیک کرتا ہوں۔"

"نہیں چیک کر کے کیا ملے گا۔ ان لوگوں کو چیک کرنا چاہیے تھا، جو اندر داخل ہو چکے ہیں۔"

"کیا مطلب، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، اندر کوئی بھی شخص داخل نہیں ہوا۔ یہ ہمارا دعویٰ ہے، کیونکہ اس تجربہ گاہ کے اندر داخل ہونے کا بس یہی ایک راستہ ہے اور اس راستے پر ہم چوکس کھڑے ہیں۔" پہرے دار نے جھلا کر کہا۔

"خیر، دیکھا جائے گا ــــ نہ کرو ہماری باتوں پر یقین۔ ابھی اپنے ساتھی کی باتوں پر تو یقین کرو گے نا۔" آصف نے جل بھن کر کہا۔

"دیکھو بھئی، تم ایسا کر لو کہ ہمارے کارڈ دیکھ لو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اگر اندر کوئی گڑبڑ نہ ہوئی اور پروفیسر صاحب نے اجازت دی تو ہم آپ لوگوں کے کارڈ ان کے سامنے پہنچا دیں گے، ورنہ نہیں ــــ"

"خیر، کارڈ تو تم لوگوں کو اندر پہنچانا ہوں گے ــــ" خان رحمان بولے۔

"یہ بات آپ اتنے یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہیں۔"

"اس طرح کہ میں ہر بات اتنے ہی یقین سے کہا کرتا ہوں۔"

اسی وقت دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔

"دیکھا، ہم نے کہا تھا نا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کک، کیا مطلب، کیا کہا تھا؟" وہ بوکھلا اٹھا۔

اسی وقت اس کا ساتھی وہاں پہنچ گیا اور آتے ہی اوندھے منہ گرا۔ چند لمحے کے لیے تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔

اب تو وہ بھی بوکھلا اٹھے۔ ان کی نظریں پہرے دار پر جم گئیں۔ فوراً ہی انھوں نے جان لیا کہ وہ مر چکا ہے ــــ

فون کا نتیجہ

"یہ — یہ اسے کیا ہوا؟" تیسرا پہرے دار بوکھلا کر بولا۔

"بس کچھ نہیں، ذرا مر گیا ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ہم نے تم سے کہا تھا نا، پروفیسر حاکان خطرے میں ہیں۔ تم لوگوں نے ہمیں اندر نہیں جانے دیا۔ اب تم بھی اندر چلے جاؤ اور مہربانی فرما کر جلدی سے بتاؤ، اندر کیا گڑبڑ ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"م — میں چلا جاؤں — ن — نہیں۔"

"اچھا تو پھر، اب ہم نہیں رک سکتے — ہم جا رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور اس کے پاس سے گزرتے چلے گئے۔ باقی بھی ان کے ساتھ چلے۔ پہرے دار کچھ نہ بولا۔ دروازے کے ساتھ اندرونی طرف بنے کیبن میں گھس گیا اور فون کرنے لگا۔ انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور جلدی جلدی اندر کی طرف چلے۔

"سر، ہم اندھا دھند اندر کی طرف جا رہے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم

اندر کیا خطرہ موجود ہے۔" اکرام نے پریشان آواز میں کہا۔

"اور کیا کریں، پہرے دار کے جسم پر زخم وغیرہ کا کوئی نشان نظر نہیں آیا؛ گویا اس پر کسی نے حملہ نہیں کیا۔ یوں بھی وہ دروازے پر گر کر مرا ہے — اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی موت خوف سے ہوئی ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بالکل، میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"ایک تو آپ دونوں کے خیالات آپس میں ضرور مل جاتے ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا اور سب مسکرا دیے۔

یہ ایک بہت طویل عمارت تھی۔ کئی برآمدے طے کرنے کے بعد انہیں لفٹ میں سوار ہونا پڑا، کیونکہ تجربہ گاہ اوپر والی منزل پر تھی۔ لفٹ سے اترے تو دو طرف کمرے دکھائی دیے۔ تمام کمروں کا منظر دل ہلا دینے والا تھا — ہر کمرے میں ایک دو لاشیں ضرور موجود تھیں۔ گویا پروفیسر حاکان کو ہی نہیں، ان کے ماتحتوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ لاشوں کی ناکیں نوک پر سے بالکل سرخ نظر آئیں۔

وہ کانپ اٹھے؛ گویا وہی زہر یہاں بھی کام کر رہا تھا۔

"وہ صفایا کر گئے۔ حیرت یہ ہے کہ باہر موجود پہرے داروں کو کانوں کان پتا نہیں چلا۔" اکرام بڑبڑایا۔

"اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی دوسرے راستے سے اندر داخل ہوئے تھے۔" خان رحمان بولے۔

"جیسا کہ پہرے دار کا کہنا ہے، تجربہ گاہ میں اندر داخل ہونے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ہو سکتا ہے، بظاہر کوئی راستہ نہ ہو ۔۔۔ دیکھنا پڑے گا ۔۔۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

ایک کمرے میں داخل ہوتے ہی پروفیسر داؤد بول اٹھے:

"یہی پروفیسر حاکان ہیں ۔۔۔ ایک دو میٹنگوں میں ان سے میری ملاقات ہو چکی ہے ۔۔۔"

"اوہ!" ان سب کے منہ سے نکلا۔

انہوں نے دیکھا، پروفیسر حاکان کو بھی زہریلی سوئی کا نشانہ بنایا گیا تھا ۔۔۔

"سب سے پہلے تو ہمیں یہی دیکھنا ہوگا کہ مجرم اندر کس طرح داخل ہوئے۔"

"ہوں ٹھیک ہے، پوری عمارت میں پھیل جاؤ اور جوں ہی کسی کو یہ بات معلوم ہو کہ مجرم کس راستے سے اندر داخل ہوئے تھے، وہ بلند آواز میں سیٹی بجا دے۔"

وہ ادھر ادھر پھیل گئے، دو دو تین تین کی پارٹیوں میں تقسیم ہو کر ۔۔۔ یہ تقسیم وقتی تھی۔ اس لیے اس میں خاص ترتیب نہیں تھی۔

"دیکھیں کونسی پارٹی کارنامہ انجام دیتی ہے۔" فرزانہ بولی۔

"میں سمجھ گیا، تم دونوں ہی انجام دو گی۔" فاروق فوراً بولا۔ اس نے فرحت اور فرزانہ کو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ایک طرف بڑھتے دیکھ لیا تھا۔

"تو تم کیوں جلے جا رہے ہو۔" آفتاب مسکرایا۔

"جلتا ہے میرا جوتا ۔۔۔ جوتی اس لیے نہیں کہ وہ فرزانہ کی جلتی ہے ۔۔۔"

"اے خبردار، اگر میری جوتی کی شان میں کچھ کہا ۔۔۔" فرزانہ نے گویا للکارا۔

"یہ تم لوگ راستے کی تلاش کر رہے ہو، یا پھر ......" شوکی نے منہ بنایا۔

"خان رحمان، دیکھا تم نے ۔۔۔ قدم ایک نہیں اٹھایا اور باتیں کس قدر کر ڈالیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

خان رحمان اور دوسرے مسکرا کر رہ گئے، پھر سنجیدگی سے مختلف سمتوں میں بڑھنے لگے۔ آخر وہی ہوا، جس کا اندازہ فاروق پہلے ہی لگا چکا تھا ۔۔۔ بیس منٹ بعد بلند آواز میں سیٹی بجی اور وہ سب آواز کی سمت میں لپکے ۔۔۔ سیٹی فرزانہ نے بجائی تھی۔ وہ ایک کمرے کے فرش کا قالین الٹے کھڑی تھی۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی بولی:

"[illegible] ۔۔۔"

انھوں نے دیکھا، سیڑھیاں نیچے اتر رہی تھیں۔

"یہ — یہ کیا — یہ تو شاید تہہ خانہ ہے" محمود ہکلایا۔

"ہاں، میں نے کیا کہا ہے، یہ برف خانہ ہے" فرزانہ بولی۔

"لیکن ہمیں تو تلاش تھی، اندر داخل ہونے والے راستے کی" آصف نے اعتراض کیا۔

"اگر ہم اس تہہ خانے یا سرنگ کے ذریعے یہاں سے باہر جا سکتے ہیں تو باہر سے اندر بھی تو آ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ راستہ معلوم ہو — کیا خبر حملہ آوروں کو یہ راستہ معلوم رہا ہو" فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

"لیکن ان لوگوں کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب کہ وہ دروازے پر موجود دونوں پہرے داروں کو نہایت آسانی سے ختم کرکے اندر داخل ہو سکتے تھے" خان رحمان نے اعتراض کیا۔

"تم لوگوں میں سے کوئی اس اعتراض کا جواب دے سکتا ہے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیوں نہیں انکل، یہ کیا مشکل ہے — انھوں نے پہرے داروں کو اس لیے قتل نہیں کیا کہ پھر دروازے پر کھڑا کوئی نظر نہیں آئے گا اور اندر گڑبڑ محسوس کر لی جائے گی — جب کہ باہر پہرے داروں کے موجود ہوتے ہوئے اندر کسی گڑبڑ کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ جب کہ اندر بہت بے دردی سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا

گیا ہے"

"ہوں، بات دل کو لگتی ہے — تو پھر چلو، اس تہہ خانے کو بھی دیکھ لیں"

"ہاں، یہ ٹھیک رہے گا"

وہ باری باری تہہ خانے کی سیڑھیوں پر اترنے لگے — نیچے پہنچ کر انھوں نے خود کو ایک سرنگ نما ہال میں پایا۔ سرنگ میں گھپ اندھیرا تھا — فاروق کی جیب سے نکلنے والی پنسل ٹارچ نے انھیں کسی قدر دیکھنے کے قابل بنایا — ابھی وہ سرنگ میں دس پندرہ قدم ہی چلے ہوں گے کہ تہہ خانے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ بوکھلا کر مڑے۔

"اف خدا، یہ کیا ہوا" شوکی کانپ کر بولا۔

"دروازہ بند ہو گیا، لیکن یہ خود بخود تو بند ہو نہیں سکتا تھا" انسپکٹر کامران مرزا بڑبڑائے۔

"ہوں، اس کا مطلب ہے، اسے کسی نے بند کیا ہے" فرزانہ بڑبڑائی۔

"لیکن کس نے؟" آصف چیخ کر بولا۔

"یا تو اس پہرے دار کا کام ہے — یا پھر اس نے کسی کو فون کرکے بلایا تھا — ہم نے اس وقت یہ خیال کیا تھا کہ وہ پولیس کو فون کر رہا ہے، حالانکہ یہ بات نہیں تھی" اشفاق نے

خیال ظاہر کیا۔

"تب پھر اس کا ساتھی اندر کا منظر دیکھ کر کیوں مر گیا" انسپکٹر کامران مرزا نے اعتراض کیا۔

"اوہ، ہاں۔۔ یہ بات بھی ہے" اخلاق بولا۔

"حیرت ہے، پھر آخر کیا معاملہ ہے۔" منور علی خان بڑبڑائے۔

"مجھے ایک خیال سوجھ رہا ہے۔" ایسے میں مکھن کی آواز سنائی دی۔

"جلدی بتاؤ، کیا خیال ہے؟"

"یہ کہ کوئی شخص تہہ خانے میں موجود تھا۔ جب ہم سیڑھیاں اُتر کر نیچے پہنچے تو وہ دبے پاؤں اوپر پہنچ گیا اور تہہ خانے سے نکل گیا۔ گھپ اندھیرے کی وجہ سے ہم اسے دیکھ نہیں سکے، یوں بھی ہماری توجہ اس طرف نہیں تھی اور اوپر پہنچ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اب وہ باہر جا رہا ہو گا۔ جاتے ہوئے وہ اکیلے بچ جانے والے پہرے دار کو بھی ختم کر دے گا۔ تہہ خانے کے دروازے کے اوپر قالین پھر بچھا دے گا۔"

"تت، تو کیا ہم پھنس گئے۔" اشفاق ہکلایا۔

"ہاں، اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔" شوکی مردہ آواز میں بولا۔

"لیکن پہرے دار کسی کو فون کر چکا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اوہ ہاں، واقعی۔" خان رحمان نے خوش ہو کر کہا۔

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔ ہم اس تہہ خانے سے نکلنے کی کوشش جاری رکھیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ابا جان، تہہ خانے کا دروازہ بہت ہی مضبوط ہے۔۔ میں اور فرحت آپ لوگوں سے وہاں پہنچنے سے پہلے اس کا جائزہ لے چکی ہیں۔"

"خیر کوئی بات نہیں، پریشانی یہ ہے کہ ہمارے پاس تہہ خانے کو روشن رکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔"

"اوہو، لیکن یہاں بلب تو ضرور ہو گا۔"

"ہاں، اس کا تو خیال ہی نہیں رہا۔ آؤ دیکھیں۔"

انھوں نے سوئچ بورڈ کی تلاش میں دیواروں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ زینے کے ساتھ ہی فرحت کا ہاتھ بورڈ سے ٹکرا گیا اور اس کے ساتھ ہی تہہ خانہ نما سرنگ یا سرنگ نما تہہ خانے میں روشنی ہو گئی۔ اب وہ سرنگ کو بہتر طور پر دیکھنے کے قابل ہوئے۔

"انھوں نے سرنگ کے ذریعے باہر نکلنے والا راستہ بھی بند کر دیا ہو گا۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"گویا اس سرنگ کو ہمارا مقبرہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

فاروق بولا۔

سرنگ کا دوسرا سرا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا یا پھر وہ اتنی لمبی تھی کہ دوسرا سرا ان سے بہت فاصلے پر تھا، لیکن وہ اس کی طرف چلنے کے سوا کر بھی کیا سکتے تھے ۔۔۔ سرنگ تقریباً سو فٹ لمبی ثابت ہوئی ۔۔۔ سرنگ ختم ہوتے ہی سیڑھیاں نظر آئیں اور سیڑھیوں سے اوپر لوہے کا ٹین کا ایک دروازہ ۔۔۔ اسے کھینچ کر دیکھا گیا ۔۔۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ اب وہ واپس پلٹے اور کمرے کے فرش میں بنے دروازے تک آئے۔ سب نے ہاتھوں سے زور لگا کر اسے اوپر اٹھانے کی کوشش کی، لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔

"یوں کام نہیں چلے گا ۔۔۔" انسپکٹر کامران مرزا بڑبڑائے۔

"کام تو خیر یہاں کسی طرح بھی چلتا دکھائی نہیں دیتا۔" آفتاب بولا۔

"مایوسی کی باتیں نہ کرو۔" فاروق جھنجھلا کر بولا۔

"اس تہہ خانے یا سرنگ میں امید کی باتیں کہاں سے لائیں۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"سنو بھئی، دل اور دماغ کو ذرا ٹھنڈا رکھو۔ گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ۔۔۔ محمود، تم اپنا چاقو مجھے دے دو ۔۔۔" انسپکٹر جمشید پرسکون آواز میں بولے۔

محمود نے چاقو جوتے کی ایڑی میں سے نکالا اور ان کی طرف

بڑھا دیا۔

عین اسی وقت اوپر قدموں کی دھمک سنائی دی۔ انسپکٹر جمشید نے یہ محسوس کرتے ہی دروازے کو زور زور سے تھپ تھپانا شروع کر دیا۔ اوپر سے بھی دروازے کو تھپ تھپایا گیا۔ اب تو ان کے چہروں پر رونق آ گئی ۔۔۔ انھوں نے اور بھی زور سے دروازے پر ہاتھ مارے۔

ایک منٹ بعد دروازہ کھل گیا اور کسی کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"اُف خدا، آپ لوگ نیچے کیا کر رہے ہیں؟"

"ارے، یہ تو اپنے جلالی نور انکل ہیں، نائیں۔" شوکی چلا اٹھا۔

"نائیں، شوکی، تم، تم یہاں کیا کر رہے ہو ۔۔۔ بچو آج تم نہیں بچ سکو گے۔ پوری عمارت لاشوں سے پٹی پڑی ہے۔ دروازے پر بھی دو چوکیدار مُردہ پڑے ہیں۔"

"تت ۔۔۔ تو کیا آپ ان سب کے قتل کا ذمے دار ہمیں ٹھہرائیں گے ۔۔۔"

"تو پھر تمہاری یہاں موجودگی کا کیا مطلب ہے، اور کیا تمہارے فرشتوں کو ٹھہراؤں گا۔" جلالی نور بولا۔

"یہاں صرف ہم ہی نہیں، اور بھی لوگ ہیں۔"

"ہاں، میں دیکھ رہا ہوں ۔۔۔ تو تم نے باقاعدہ گروہ بنا لیا ہے،

کمال ہے ۔" جلالی نور پر جوش لہجے میں بولا۔

"ابھی تو ہم بے قاعدہ گروہ بھی نہیں بنا پائے، باقاعدہ کیا بنائیں گے ۔" مکھن نے ہنسا کر کہا۔

"بہتر ہوگا کہ ہمیں باہر نکل لینے دیں۔ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی ۔" انسپکٹر جمشید مسکرا کر بولے۔

"ٹھیک ہے، آپ لوگ ہاتھ اٹھائے ہوئے اوپر آ جائیں۔ یاد رہے کہ میرے ہاتھ میں پستول ہے اور یہ بھرا ہوا ہے۔ میرے ساتھ کانسٹیبل بھی ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں بھی ہتھیار ہیں ۔"

"اس میں یاد رکھنے والی کیا بات ہے، یہ چیز تو ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جناب۔ ویسے آپ ہم سے ہاتھ اوپر نہ اٹھوائیں۔ ہم مجرم نہیں ہیں۔ اگر مجرم ہوتے تو اس قید خانے میں کیوں ہوتے ۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"ہرگز نہیں، قانون کا احترام کرنا پڑے گا ۔۔۔ حالات ایسے ہی ہیں۔ آپ لوگوں کو ہاتھ اوپر اٹھا کر باہر نکلنا پڑے گا ۔"

"چلیے ٹھیک ہے ۔۔۔ ہم آ رہے ہیں ۔۔۔ فاروق، بُرا ماننے کی ضرورت نہیں ۔" انسپکٹر جمشید نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بہت بہتر ۔۔۔ اگر آپ کہتے ہیں تو نہیں مانتا بُرا، ورنہ بُرا تو میں ایسا مانتا کہ کیا کبھی کسی نے بُرا مانا ہوگا ۔"

"یہ ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟" جلالی نور کے لہجے میں

بلا کی حیرت در آئی ۔

"انکل جلالی نور، آپ ان کی باتیں نہیں سمجھ پائیں گے۔ بہت گہری ہوتی ہیں ۔" شوکی ہنسا۔

"سمجھ گیا۔ کنوئیں جتنی گہری ہوتی ہوں گی ۔" جلالی نور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کنواں کیا ہوتا ہے، سمندر کی بات کریں ۔" اشفاق بولا۔

"ارے باپ رے، تب تو ۔۔۔۔" جلالی نور تب تو سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اتنے میں وہ سب اوپر آ چکے تھے ۔

"بھئی شوکی، پہلے تو ان سے تعارف ہو جائے۔ کافی دلچسپ آدمی جان پڑتے ہیں ۔" انسپکٹر کامران مرزا نے مسکرا کر کہا۔

"جی، جی ہاں ۔۔۔ دلچسپ تو یہ واقعی بہت ہیں۔ خاص طور پر ہمارے لیے ۔۔۔ دراصل یہ ہمارے انکل انسپکٹر جلالی نور ہیں۔ اور انکل صاحب، ان لوگوں سے ملیے۔ انسپکٹر جمشید، انسپکٹر کامران مرزا صاحبان ۔۔۔ یہ ہیں ان لوگوں کے دوست پروفیسر داؤد، خان رحمان، منور علی خان صاحبان اور یہ ہیں محمود ۔۔۔۔" شوکی نام گنواتا چلا گیا۔

اچانک کھٹ کی آواز آئی ۔۔۔ انہوں نے چونک کر جلالی نور کی طرف دیکھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے فرش پر گر گیا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیلی ہوئی تھیں، پھر اس کے منہ سے نکلا :

"اُف خدا، یہ مم..... میں کیا سُن رہا ہوں۔"

"آپ صرف سن ہی نہیں رہے، دیکھ بھی رہے ہیں۔" آفتاب بولا۔

"اوہ ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے ــــ مم..... میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ لوگوں کے ہاتھ اوپر اٹھوا دیے۔"

"معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ــــ ہمارے ہاتھ تو گرے پڑے مجرم اٹھوا دیتے ہیں۔ آپ تو پھر قانون کے محافظ ہیں اور اگر آپ ایسا ہی محسوس کر رہے ہیں تو کچھ دیر کے لیے آپ بھی ہاتھ اوپر اٹھا دیں۔" محمود نے شوخ لہجے میں کہا۔

"لیکن آپ یہاں تک پہنچ کس طرح گئے۔"

"پہرے دار نے آئی جی انوار عالم کو فون کیا تھا کہ پروفیسر حاکان کی تجربہ گاہ میں گڑبڑ ہے ــــ انھوں نے فوراً اس علاقے کے انسپکٹر کو فون کیا، لیکن وہ کسی اور جگہ گئے ہوئے تھے۔ اس لیے مجھے بھیجا گیا، لیکن یہاں گڑبڑ نہیں، مکمل طور پر صفایا ہو چکا ہے۔"

"ہاں، انھوں نے پروفیسر حاکان اور ان کے سب ماتحتوں کو ختم کر دیا ہے، افسوس۔" خان رحمان بولے۔

"آئیے، ذرا لاشوں کا معائنہ ہو جائے۔ ہمیں تو تجربہ گاہ کی بھی تلاشی لینا ہو گی ــــ آخر ان لوگوں کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

تفتیش کے گھوڑے دوڑائے گئے۔ لاشوں کو الٹ پلٹ کر کے دیکھا گیا ــــ زہریلی سوئیوں کا سراغ مل گیا ــــ تجربہ گاہ کے تمام کاغذات غائب تھے۔

"اب ہمیں یہ کون بتائے گا کہ پروفیسر حاکان بہت ہی خاص نوعیت کے کاغذات کہاں رکھتے تھے ــــ انھوں نے تو کاغذ نام کی کوئی چیز یہاں نہیں چھوڑی۔" انسپکٹر کامران مرزا نے پریشان ہو کر کہا۔

"ان کے کسی دوست، یا پھر آئی جی انوار عالم صاحب کے ذریعے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ پروفیسر صاحب اپنے کاغذات وغیرہ کسی بنک کے لاکر میں تو نہیں رکھتے تھے۔"

"یہ ٹھیک رہے گا ــــ اس سلسلے میں آئی جی صاحب سے ہی بات کرنا ہو گی۔"

انسپکٹر جمشید نے کہا اور فون کی طرف بڑھ گئے، پھر کچھ سوچ کر بولے۔

"ہو سکتا ہے، مجرموں نے یہاں سے کسی کو فون کیا ہو اور اس پر ابھی تک انگلیوں کے نشانات ہوں، لہٰذا ہمیں کسی اور فون سے بات کرنی چاہیے۔"

ایک ایسے کمرے سے فون کیا گیا، جس میں کوئی لاش موجود نہیں تھی اور نہ کسی اور گڑبڑ کے نشانات تھے، البتہ وہاں میز پر کاغذ کا ایک پرزہ ضرور موجود تھا ــــ انوار عالم صاحب کو جوں ہی

واردات کے بارے میں معلوم ہوا، وہ بوکھلا اٹھے۔

آدھ گھنٹے بعد وہاں سبھی بڑے بڑے آفیسر موجود تھے۔ بنکوں کے منیجروں کو فون کیے گئے، لیکن کسی لاکر کا سراغ نہ مل سکا۔ پروفیسر حاکان کے دوستوں کو بلایا گیا، لیکن ان میں سے کسی کے پاس بھی انہوں نے کاغذات نہیں رکھوائے تھے۔

"یہ — یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" پروفیسر داؤد بڑبڑائے۔

"کیا مطلب، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"یہ کہ پروفیسر حاکان بہت ہی خاص نوعیت کی چیز اپنے پاس رکھنے کے عادی نہیں تھے۔"

"لیکن یہاں ان کے سبھی دوست موجود ہیں۔" انوار عالم الجھن کے عالم میں بولے۔

"ہو سکتا ہے، کوئی اور دوست بھی ہوں، جو اس وقت یہاں موجود نہ ہوں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں، اس کا بھی امکان ہے — کیوں حضرات، آپ میں سے کسی کو ان کے کسی اور دوست کے بارے میں معلوم ہے؟"

انہوں نے سوچنے کے بعد نفی میں سر ہلا دیے — اچانک انسپکٹر جمشید کی آنکھوں میں چمک ابھری:

"اوہو، ذرا ٹھہریے۔ میں ابھی آیا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئے۔ ان سب کے چہروں پر حیرت

کے آثار نمودار ہو گئے۔ تین منٹ بعد انسپکٹر جمشید کی واپسی ہوئی۔

"خیر تو ہے ابا جان، آپ کہاں گئے تھے؟" فرزانہ بے چین ہو کر بولی۔

"میں ایک فون کرنے گیا تھا — ابھی ابھی ایک خیال آیا ہے، اب ہمیں اس فون کا نتیجہ معلوم کرنا ہے۔"

"فون کا نتیجہ۔" فاروق بڑبڑایا۔ اور وہ سب مسکرانے لگے۔

بیس منٹ بعد ایک کار تجربہ گاہ کے باہر آ کر رکی۔ اس میں سے ایک لمبے قد کا آدمی نیچے اترا اور پولیس کی جیپوں اور باہر کھڑے نگرانوں کو پریشان نظروں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ اسے تجربہ گاہ تک پہنچا دیا گیا۔

"میرا نام ریاض جدی ہے — مجھے ابھی ابھی یہاں سے فون کیا گیا تھا — پروفیسر حاکان کو کیا ہوا ہے، جلدی بتائیے۔"

"وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے؛ تاہم وہ آپ کے لیے ایک پیغام چھوڑ گئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید پراسرار لہجے میں بولے۔

"میرے لیے پیغام — مہربانی فرما کر جلدی بتائیے۔ میں بہت پریشان ہو گیا ہوں۔"

"آپ نے یہ نہیں پوچھا، انہیں ہوا کیا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اوہ ہاں، یہ تو میں بھول ہی گیا — واقعی پہلے تو مجھے یہ پوچھنا

چاہیے تھا، انہیں ہوا کیا ہے؟"

"ان پر کسی نے حملہ کیا ہے۔" انسپکٹر جمشید گول مول انداز میں بولے۔

"اوہ، ان کی حالت کیا ہے، وہ ٹھیک تو ہیں۔"

"انھوں نے آپ کے پاس کچھ بہت ہی ضروری کاغذات رکھوائے تھے۔"

"کاغذات ...۔" ریاض جدی پریشان ہو کر بولا۔

"ہاں، کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے کاغذات نہیں رکھوائے تھے۔ اس صورت میں آپ کو خود چل کر جواب دینا چاہیے۔" وہ بولے۔ باقی سب کے سب حیران تھے ۔۔۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا ۔۔۔

"ن، نہیں ۔۔۔ کاغذات انہوں نے میرے پاس ضرور رکھوائے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں، لل ۔۔۔ لیکن ....." ریاض جدی ہکلایا۔

"لیکن کیا ۔۔۔ کیا انہوں نے واپس لے لیے تھے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نہیں، واپس تو خیر نہیں لیے تھے ۔۔۔ ہاں، وہ میرے پاس سے چوری ضرور ہو گئے تھے۔"

"کیا کہا، چوری ہو گئے تھے؟" انسپکٹر جمشید چونک کر بولے۔

"جی ہاں، چوری ہو گئے تھے۔"

"کیا آپ نے ان کاغذات کی چوری کے بارے میں پروفیسر صاحب کو بتایا تھا؟"

"جی نہیں، کس طرح بتا دیتا ۔۔۔ انھیں بہت صدمہ ہوتا اور وہ میرے بارے میں نہ جانے کیا خیال کرتے۔"

"اور ۔۔۔ تو کیا آپ نے کاغذات کی گم شدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی؟"

"ن، نہیں ۔۔۔ اس رپورٹ کی خبر اخبارات میں شائع ہوتی اور اس طرح پروفیسر صاحب کو پتا چل جاتا، لہذا میں نے یہ کام بھی نہیں کیا ۔۔۔"

"لیکن ہم آپ کی بات پر کس طرح یقین کر لیں۔"

"جی، کیا مطلب؟" اس نے چونک کر کہا۔

"وہ کاغذات انتہائی اہم تھے۔ اس قدر اہم کہ ہم بتا بھی نہیں سکتے ۔۔۔ ان کاغذات کی وجہ سے ہی پروفیسر صاحب اور ان کے سب ماتحتوں کو قتل کیا گیا ہے۔"

"کیا کہا، قتل کیا گیا ہے؟"

"ہاں، سب کی لاشیں ابھی تجربہ گاہ میں ہی پڑی ہیں۔"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گیا۔

"اب آپ کیا کہتے ہیں؟" انسپکٹر جمشید کی آواز ابھری۔

"ہم، میں بھلا کیا کہوں گا۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"میرا اشارہ ان کاغذات کی طرف ہے۔"

"میں بتا چکا ہوں — کاغذات چرا لیے گئے تھے۔" اس نے جھنجھلانے کے انداز میں کہا۔

"ہم آپ کے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں، کیا خبر کاغذات وہیں ہوں۔"

"شوق سے لے لیجیے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"شکریہ — اپنے گھر کی چابیاں اور تلاشی کا اجازت نامہ لکھ کر دے دیں، کیونکہ ہم آپ کی عدم موجودگی میں تلاشی لیں گے۔" انھوں نے کہا۔

"کیا خبر، آپ وہاں کوئی قابلِ اعتراض چیز رکھ دیں اور مجھے گرفتار کرا دیں۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں، بات تو ٹھیک ہے، تو پھر تلاشی لینے والی ٹیم کے ساتھ آپ کا کوئی ہمدرد چلا جائے۔"

"یہ ٹھیک رہے گا — میں اپنے ایک دوست کو یہاں بلا لیتا ہوں۔" ریاض جدی بولا۔

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" وہ بولے۔

ریاض جدی نے اپنے کسی دوست کو فون کیا — آدھ گھنٹے بعد وہ وہاں پہنچ گیا —

"یہ مسٹر عالم بجا گٹے والا ہیں — میرے گہرے دوست — یہ

ساتھ جائیں گے۔"

"اچھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ اپنے ساتھیوں کی طرف مڑے ہی تھے کہ ریاض جدی نے کہا:

"یہ حضرات میرے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں — میں چاہتا ہوں، تم تلاشی سے پہلے ان کی تلاشی لے لو اور تلاشی کے وقت ساتھ ساتھ رہو۔"

"اچھا۔" اس نے کہا۔

"محمود، میں اس مہم پر صرف تمہیں بھیجتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی، کیا فرمایا، مجھ اکیلے کو؟" محمود حیران رہ گیا۔

"غلط سمجھے، تم اپنے ساتھ جس جس کو چاہو لے جا سکتے ہو۔ باقی لوگ ابھی یہیں ٹھہریں گے اور مزید چھان بین کریں گے۔ شاید کوئی کام کی چیز مل جائے۔"

"جی بہتر — اجازت ہو تو میں چھوٹی پارٹی تمام کی تمام ساتھ لے جاؤں۔"

"یہ اور بھی اچھا ہے — کچھ دیر کے لیے تو ہمارے کانوں کو سکھ مل سکے گا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"تو پھر یونہی سہی — آؤ میری پارٹی۔" محمود خوش ہو کر بولا۔

"میری پارٹی تو تم نے اس طرح کہا ہے، جیسے ہم سب تمہارے

ماتحت ہوں۔" آفتاب جل بھن کر بولا۔

"نہیں بھئی، ہم میں نہ کوئی ماتحت ہے، نہ افسر۔ سب مل کر کام کریں گے۔ چلیے جناب۔" فاروق نے عالم بھاگتے والا سے کہا۔

"چلیے۔" اس نے کہا اور وہ سب بیرونی دروازے کی طرف چل پڑے۔

"معاف کیجیے گا جناب، میں پوچھ سکتا ہوں، یہ بھاگتے والا کیا چیز ہے؟" محمود حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

"یہ چیز نہیں، ذات ہے۔"

"اوہ، بھاگتے والا ذات ہے ۔۔۔ اچھا، کمال ہے۔" شوکی چونک کر بولا۔

"لیکن اس میں کمال کی کیا بات ہے۔" اس نے جھلا کر کہا۔

"ہاں، اور کیا ۔۔۔ کمال کی بات تو اس وقت ہوتی، عجیب ذات کا نام بھاگتے والا ہوتا۔" فاروق بولا۔

بھاگتے والا نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور پھر بولا:

"آپ کا پروگرام میرا مذاق اڑانے کا تو نہیں۔ اگر ایسا ہے تو میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکوں گا۔"

"جی نہیں، آپ فکر نہ کریں۔ ہمارا کوئی پروگرام ہے نہ ارادہ۔" محمود جلدی سے بولا اور فاروق کو تیز نظروں سے گھورنے لگا۔

"ان تیز نظروں کی بارش کیوں برسائی جا رہی ہے مجھ پر۔"

"اس لیے کہ تم نہ موقع دیکھتے ہو نہ محل۔"

"ہاں، یہ نقص تو اس میں واقعی ہے۔" آفتاب بول اٹھا۔

"اے، زبان سنبھال کر۔" فاروق نے اسے للکارا۔

"کیا مقابلہ کرنے کا ارادہ ہے؟"

"ضرور، لیکن اس تلاشی کے بعد۔" فاروق مسکرایا۔

"اچھا یونہی سہی۔" آفتاب نے جھلا کر کہا۔

"ایک تو تم لوگ بہت جلد لڑنے مرنے پر تل جاتے ہو۔" شوکی نے برا سا منہ بنایا۔

اور پھر وہ ریاض جدّی کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ ایک بہت بڑی اور شاندار کوٹھی تھی ۔۔۔ دروازے پر پہنچ کر عالم بھاگتے والا نے کہا:

"اندر داخل ہونے سے پہلے میں آپ سب کی تلاشی لوں گا۔"

"شوق سے۔" محمود نے کندھے اچکائے۔

اس نے سب کی تلاشی لی اور پھر وہ اندر داخل ہوئے ۔۔۔ ریاض جدّی کے گھر والوں نے انہیں حیرت بھرے انداز میں دیکھا، پھر ان کی نظریں بھاگتے والا پر جم گئیں۔

"یہ — یہ سب کیا ہے عالم بھائی —"

"یہ لوگ کوٹھی کی تلاشی لیں گے — ریاض نے بھی انہیں یہ اجازت دی ہے"

"لیکن کیوں؟" ایک عورت بولی۔

"شاید قانون کے محافظ ریاض پر کسی قسم کا شک کر رہے ہیں —"

"لل — لیکن یہ لوگ پولیس والے تو دکھائی نہیں دیتے"

"بھئی، یہ سادہ لباس والے ہوں گے"

"اس عمر کے لوگ، اور سادہ لباس والے" ایک نوعمر لڑکی نے انہیں دلچسپ نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"اب میں کیا کہہ سکتا ہوں"

"خیر، ہم ایک طرف ہو جاتے ہیں — یہ شوق سے تلاشی لے لیں"

انہوں نے مل کر تلاشی لینے کی بجائے، الگ الگ ہو کر تلاشی لینا پسند کیا — اس طرح وہ ایک ہی وقت میں ساری کوٹھی میں پھیل گئے — عالم بھاگتے والا کبھی ایک کی طرف بھاگتا تو کبھی دوسرے کی طرف — یہ دیکھ کر فرزانہ سے رہا نہ گیا —

"آخر آپ اس طرح کیوں بھاگتے پھر رہے ہیں؟"

"اب میں آپ سب پر نظر کس طرح رکھوں۔؟"

"اس کی ضرورت ہی کیا ہے — آپ لوگ ہماری تلاشی تو لے ہی چکے ہیں"

"ہاں، لیکن ریاض نے تو یہی کہا تھا کہ میں آپ لوگوں پر نظر رکھوں —"

"اچھا، جیسے آپ کی مرضی — بھاگتے رہیے" فرزانہ نے ایک الماری کھولتے ہوئے کہا —

انہوں نے تجوری اور بند الماریاں بھی دیکھیں۔ اس کے لیے گھر کے لوگوں سے چابیاں مل گئی تھیں — آخر سب ایک جگہ جمع ہوئے۔ سب کے چہروں پر مایوسی دوڑ رہی تھی۔

"گویا کسی کو کچھ نہیں ملا" شوکی بولا۔

"نہیں" وہ سب بولے۔

"کیا ہم اچھی طرح اطمینان کر چکے ہیں؟" محمود بولا۔

"ہاں، بالکل"

"تو پھر چلو، واپس چلنے کے سوا کیا چارہ ہے"

آخر وہ واپس ہوئے — اب عالم بھاگتے والا کے چہرے پر بہت رونق نظر آ رہی تھی — شاید اس خیال سے کہ اس کے دوست کے خلاف کوئی بات ثابت نہیں ہوئی تھی۔

جوں ہی وہ تجربہ گاہ میں داخل ہوئے — سب کی نظریں ان پر جم گئیں —

"کیوں بھئی، چہروں سے تو لگتا ہے، ناکام لوٹے ہو۔"

"ج، جی ہاں۔" آصف بولا۔

"لیکن نہیں، شوکی کے چہرے پر جوش کے آثار موجود ہیں۔ کیوں شوکی، کیا تم کچھ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہو؟" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ج، جی ہاں۔" اس نے ہکلا کر کہا۔

"تو اس میں ہکلانے کی کیا ضرورت ہے۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی چیز ہے۔ کوئی کاغذات نہیں ہیں۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے مایوسانہ انداز میں نکلا، لیکن انسپکٹر جمشید نے امید بھرے لہجے میں کہا:

"پھر بھی شوکی، وہ کیا چیز ہے؟"

"کیا میرے دوست کو اب اجازت ہے جناب؟" انھوں نے بھاگٹے والا کی آواز سنی۔

"ایک منٹ — پہلے ہم یہ جان لیں کہ شوکی کو کیا چیز ملی ہے۔"

اب سب کی نظریں شوکی پر جم گئیں — اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر اپنی ہتھیلی ان سب کے سامنے کھول دی —

اس کی ہتھیلی پر سفید رنگ کی ایک گولی چمک رہی تھی۔ اس گولی کو دیکھ کر نہ صرف وہ سب، بلکہ ریاض جدی اور عالم بھاگٹے والا بھی چونکے تھے، بلکہ ان کے چہروں کے تو رنگ ہی اڑ گئے۔

"وہ مارا، یہ ہوا نا کام۔" انسپکٹر کامران مرزا چلا اٹھے۔

"گویا کاغذات واقعی ریاض جدی کے پاس تھے، لیکن اس پراسرار باس نے انھیں اپنی گولیوں کے جال میں پھانس لیا اور ان کی وجہ سے مجبور ہو کر انھوں نے کاغذات ان کے حوالے کر دیے — اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا اور چونکہ گولی کو دیکھ کر عالم بھاگٹے والا بھی چونکے ہیں، اس لیے یہ بھی برابر کے شریک معلوم ہوتے ہیں، لہذا ہمیں ان کو بھی گرفتار کرنا ہوگا۔" انسپکٹر جمشید چہکتی آواز میں بولے۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی عالم بھاگٹے والا اور ریاض جدی نے باہر کی طرف چھلانگیں لگا دیں، لیکن فوراً ہی منہ کے بل گرے۔ ان کے منہ اوپر اٹھے تو ناکوں سے خون بہتا دکھائی دیا۔

"بھئی، ذرا دیکھ کر بھاگو، راستے میں بے شمار رکاوٹیں کھڑی ہیں۔" آفتاب نے شوخ لہجے میں کہا۔

محمود اور آصف نے ان کی ٹانگوں میں ٹانگیں اڑا دی تھیں اور وہ بھی اتنے اطمینان سے کہ بس کھڑے کھڑے ٹانگیں آگے کر

دیں۔ فوراً ہی سادہ لباس والوں نے انہیں جکڑ لیا، لیکن لاکھ پوچھ
گچھ کے بعد بھی وہ باس کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے۔ بات
صرف اتنی ہی تھی کہ پروفیسر حاکان نے وہ کاغذات بطورِ امانت
انتہائی خفیہ طور پر ریاض جدّی کے پاس رکھوائے تھے، لیکن باس
نے کسی طرح اس بات کا پتا چلا لیا اور اسے گولیوں کا عادی
بنا کر کاغذات حاصل کر لیے۔

"میں حیران ہوں، باس نے اس بات کا پتا کس طرح چلا لیا
تھا کہ کاغذات تمہارے پاس ہیں؟" انسپکٹر کامران مرزا نے دونوں
کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا اور پھر چونک کر بولے:

"اوہو، تو عالم بھاگٹے والا دراصل ریاض جدّی کا رازدار ہے۔
اس نے عالم کو کاغذات کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اب سوال یہ
ہے کہ عالم بھاگٹے والا سے یہ بات کس طرح آگے پھیلی۔ باس کو
کس طرح معلوم ہو گیا؟"

عالم بھاگٹے والا اور ریاض جدّی کے ہونٹ بھنچ گئے۔ ان
کی آنکھوں میں فکر کے سائے تیرنے لگے ۔۔۔ وہ بتوں کی طرح
کھڑے تھے۔

"یوں کام نہیں چلے گا، تم لوگوں کو منہ کھولنا ہی ہو گا۔"

"پروفیسر حاکان نے مجھ پر بھروسا کرتے ہوئے کاغذات میرے
پاس رکھوائے تھے۔ ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ یہ بہت اہم کاغذات ہیں،

سرکاری سطح پر ان کاغذات کو نہیں رکھوانا چاہتا، کیونکہ عام طور پر
بڑے بڑے مجرم سرکاری ریکارڈ اُڑا لیتے ہیں، لیکن میں پیٹ کا ہلکا
ہوں۔ میں نے یہ راز بھاگٹے والا کو بتا دیا۔" یہاں تک کہہ کر ریاض
جدّی خاموش ہو گیا۔

"اور بھاگٹے والا، تم سے یہ بات آگے کس طرح پھیلی؟"

"میں ایک دن ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا ۔۔۔ وہاں مجھ سے ایک
پُراسرار آدمی نے ملاقات کی اور باتوں باتوں میں ایک سفید
گولی کھلا دی۔ بس اس روز کے بعد وہ روز مجھ سے ملنے لگا۔ گولی
کے بغیر میرا جینا مشکل ہو گیا اور میں اس کا غلام بن کر رہنے لگا۔
پھر اس نے مجھ سے ریاض جدّی کے بارے میں پوچھا کہ اس کے
تعلقات پروفیسر حاکان سے کیسے ہیں اور اس طرح اس نے سب
کچھ معلوم کر لیا ۔۔۔ پھر گولیوں کے ذریعے ریاض جدّی کو بھی غلام
بنا لیا اور وہ کاغذات حاصل کر لیے ۔۔۔ یہ بہت عرصے کی باتیں ہیں۔
کاغذات حاصل کر لینے کے بعد وہ پُراسرار آدمی پھر کہیں نظر نہیں
آیا ۔۔۔ ہاں، گولیوں کا پیکٹ پندرہ بیس دن بعد ڈاک سے ضرور
مل جاتا ہے، جنہیں ہم ایک روز کے حساب سے کھاتے رہتے
ہیں ۔۔۔ شاید وہ یہ گولیاں بھی اس لیے بھیجتا ہے کہ ہم سے ضرورت
پڑنے پر کچھ کام لے سکے، کیونکہ اگر گولیاں ہمیں نہ ملیں تو ہم مر
جائیں گے۔"

"ہوں۔ بات تو ٹھیک ہے ___ اس پُراسرار آدمی کا حلیہ کیا تھا؟" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"وہ قدرے لمبے قد کا آدمی تھا، پتلا دبلا سا ___ اب نقوش تو یاد نہیں رہے۔" بھاگنے والا بولا۔

"ہوں، خیر ___ گولیوں کے جو پیکٹ ملتے ہیں، کیا وہ بذریعہ ڈاک ملتے ہیں؟"

"جی، جی ہاں ___ ڈاکیا ہی لاتا ہے۔"

"کوئی پیکٹ دے سکتے ہیں آپ؟"

"پچھلی مرتبہ جو پیکٹ آیا تھا، وہ میرے گھر میں موجود ہوگا۔ خالی ہونے کے بعد تو ہم پھینک دیتے ہیں۔"

"چار سادہ لباس والے اس کے ساتھ جائیں اور وہ پیکٹ لے آئیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

وہ چلے گئے ___ ان کے جاتے ہی محمود بولا:

"ابا جان، ہمارا مارے حیرت کے حال بہت پتلا ہے۔"

"اوہو اچھا، پھر تو مجھے بہت افسوس ہے۔"

"سب سے پہلے تو یہ بتائیے، آپ کو ریاض جدّی کے بارے میں کس طرح معلوم ہوگیا کہ یہ بھی پروفیسر حاکان کا دوست تھا؟"

"جس کمرے سے میں نے انوار عالم صاحب کو فون کیا تھا، اس کمرے میں فون والی میز پر فون کے نیچے کاغذ کا ایک پرزہ دبا

ہوا تھا، اس پر کسی کا فون نمبر لکھا تھا۔ بے خیالی میں میں نے وہ اٹھا لیا تھا اور جب یہاں آنے والے پروفیسر حاکان کے تمام دوستوں نے کاغذات کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تو میں نے سوچا، کہیں کاغذات کسی ایسے دوست کے پاس تو نہیں رکھے، جس کے بارے میں باقی دوستوں کو کچھ معلوم نہ ہو ___ یہ سوچتے ہی میرا ذہن کاغذ کے پرزے پر لکھے نمبر کی طرف چلا گیا اور میں نے اسے فون کرکے یہاں بلا لیا ___ فون پر میں نے یہ کہا تھا کہ پروفیسر صاحب کی کوٹھی پر فوراً آئیے اور بس ___" یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہوگئے۔

"ارے ہاں، یہ پوچھنا تو ہم بھول ہی گئے کہ شوکی کو گولی کہاں سے ملی تھی ___ جب کہ ہم سب نے کوٹھی کی اچھی طرح تلاشی لی، اور گولی نام کی کوئی چیز نہیں ملی۔"

"وہ ___ مم ___ میں ___ اب میں کیا بتاؤں۔" شوکی ہکلایا اور انوار عالم مسکرانے لگے۔

"کیوں ___ کیوں، ایسی کیا بات ہے جو بتائی نہیں جاسکتی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میں نے ریاض جدی کے بستر کے سرہانے دیوار پر لگی کھونٹی سے ٹنگی اس کی ایک قمیص کی جیبیں ٹٹول لی تھیں۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"لیکن کیوں، ہم تو کاغذات تلاش کر رہے تھے اور کاغذات جیب میں تو ہو نہیں سکتے تھے، پھر تم نے اس کی قمیص کیوں ٹٹولی۔" آصف نے آنکھیں نکالیں۔

"م م، میں نے سوچا، کاغذات تو ملتے نہیں، کچھ اور ہی مل جائے۔"

اور سب مسکرانے لگے ۔۔۔ ایسے میں انسپکٹر کامران مرزا بولے:

"مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ پروفیسر حاکان نے کاغذات ریاض جدی کے پاس کیوں رکھوائے ۔۔۔ اگر وہ بنک کے لاکر میں رکھ دیتے یا انوار عالم صاحب کے ذریعے کسی محفوظ مقام پر رکھوا دیتے تو وہ ہرگز اڑائے نہیں جا سکتے تھے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے خیال پیش کیا۔

"بس یہ پروفیسر حاکان کی سوچ تھی۔ انہیں کاغذات اس طرح محفوظ محسوس ہوئے۔" خان رحمان بولے۔

"ہاں ۔۔۔ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔" منور علی خان بولے۔

تھوڑی دیر بعد قدموں کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے نظریں اٹھائیں ۔۔۔ عالم بھاگٹے والا اور سادہ لباس والے چلے آ رہے تھے۔ نزدیک آتے ہی ایک سادہ لباس والے نے ایک پیکٹ ان

کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

اور ان سب کی نظریں اس پیکٹ پر جم گئیں ۔۔۔

شکست والی دوڑ

"اس پیکٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔
"بہت نیک خیال ہے اور بہت خوب صورت پیکٹ ہے ــــ
ہم ..... میرا مطلب ہے، پھاڑنے سے پہلے خوب صورت رہا ہوگا۔"
فاروق جلدی جلدی بولا۔

"کوئی اور اپنا خیال پیش کرنا چاہتا ہے؟" انسپکٹر جمشید نے
بُرا سا منہ بنایا، خان رحمان اور پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"جی کیوں نہیں، اس پر ڈاک خانے کی مہر موجود ہے۔ ہم
اس ڈاکخانے سے اپنی تحقیقات کا آغاز کر سکتے ہیں۔" فرزانہ
فوراً بولی۔

"ہاں، بالکل ٹھیک۔" محمود نے کہا۔

"یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ گولیوں کا سٹاک باس کے
پاس ہی موجود رہتا ہوگا اور وہی اپنے خاص لوگوں تک پہنچاتا
ہوگا اور خاص لوگ ان گولیوں کو آگے دیتے ہیں۔ اگر ہم ان

گولیوں کے ذریعے باس تک پہنچ جائیں تو کیسی رہے۔" انسپکٹر
کامران مرزا بولے۔

"لیکن انکل، باس سمندر کے نیچے، بلکہ بہت نیچے کہیں موجود
ہے۔"

"بھئی، وہ ہر وقت نیچے ہی تو نہیں رہتا ہوگا ــــ اوپر بھی آتا
ہوگا اور اوپر آکر کہیں رہتا ہوگا ــــ مطلب یہ کہ اس کا ایک عدد
ٹھکانا موجود ہوگا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اوہ!" سب کے سب چونک اُٹھے۔

"تو پھر اب ہم یہاں کیا کر رہے ہیں ــــ کیوں نہ مہم شروع
کریں۔"

"اگر آپ لوگ پسند کریں تو مہم شروع کرنے سے پہلے ذرا
ہم گھر ہو آئیں، بلکہ آپ لوگ بھی ہمارے ساتھ ہی چلیں تو کیا
ہی بات ہے۔ اباجان سے بھی ملاقات کر سکیں گے۔" شوکی
بولا ــــ

"چلو بھئی، یونہی سہی۔" منور علی خان جلدی سے بولے۔
شاید انہیں ڈر ہوگا کہ کہیں اس تجویز کی کوئی مخالفت نہ
کر دے۔

"ٹھیک ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔"

وہ سب شوکی برادرز کے دفتر پہنچے ــــ گھر اور دفتر کے درمیان

بند تھے۔ شوکی نے دستک دی۔ ایک منٹ بعد ہی دروازہ کھلا اور پھر ان کی امی چونک کر پیچھے ہٹ گئیں — انھوں نے بوکھلا کر کہا:

"لڑکو، تم کسی کام کے بھی ہو یا بالکل نکمے ہی ہو۔"

"امی جان، آج تو ہمیں نکمے نہ کہیے — دیکھیے تو سہی، ہم کن لوگوں کو ساتھ لائے ہیں۔"

"کن لوگوں کو لائے ہیں؟" مشتاق احمد خان کی آواز سنائی دی —

اور پھر ملاقات شروع ہوئی — آدھ گھنٹے بعد وہ اس ڈاکخانے کا رخ کر رہے تھے۔

"کن کن مرحلوں سے گزر چکے ہیں، لیکن ابھی تک مجرم کا دور دور تک پتا نہیں۔" آصف بڑبڑایا۔

"اور اس کے ٹھکانے یعنی ہیڈ کوارٹر کا تو بالکل ہی پتا نہیں — اب فرض کرو، وہ اپنے سمندر کے نیچے والے ہیڈکوارٹر میں جا کر بیٹھ جائے اور پھر اوپر آنا بھول جائے تو ہم اسے کس طرح تلاش کریں گے — اس تک کس طرح پہنچیں گے۔"

"بالکل اسی طرح، جس طرح وہ وہاں پہنچتا ہے۔ آخر وہ بھی تو کسی نہ کسی طرح پہنچتا ہوگا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اوہ ہاں، بات تو ٹھیک ہے۔"

متعلقہ پوسٹ آفس تک پہنچنے میں انھیں بیس منٹ لگے۔ پوسٹ ماسٹر اتنے بہت سے لوگوں کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ انوار عالم صاحب نے پولیس کی جیپیں ان لوگوں کو مہیا کر دی تھیں اور باوردی پولیس والے بھی، تاکہ انھیں وقت نہ ہو۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں — ہمیں صرف اس پیکٹ کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔"

اس نے پیکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا، پھر متعلقہ کلرک کو بلا کر اس کے حوالے کیا — پیکٹ پر پیکٹ بھیجنے والے کا نام حمید خان لکھا تھا اور اس کا پتا بھی نیچے درج تھا۔

"اس کے بارے میں آپ کیا جاننا چاہتے ہیں۔ نام پتا تو لکھا ہے۔" کلرک بولا۔

"اس شخص کا حلیہ — یہ شخص اس قسم کے پیکٹ ہر پندرہ دن بعد لاتا ہے، لہٰذا اس کا حلیہ آپ کو ضرور یاد ہوگا۔"

"ہاں، اس میں کوئی شک نہیں — وہ ایک موٹے سے جسم کا بھلا سا آدمی ہے، گہرے سانولے رنگ کا۔"

"شکریہ — کیا یہ پتا یہاں نزدیک کا ہی ہے۔"

"جی ہاں، بہت نزدیک ہے۔"

"شکریہ، بس یہی معلوم کرنا تھا۔"

اور وہ اس پتے کی طرف روانہ ہو گئے —

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ہم اس قدر آسانی سے کوئی سراغ حاصل کر سکیں گے۔" محمود بولا۔

"ضرورت بھی کیا ہے یقین کرنے کی، ابھی معلوم ہو ہی جائے گا۔" آفتاب نے جواب دیا۔

وہ اس پتے پر پہنچے۔۔۔ باقی لوگ سڑک پر ہی ٹھہرے۔ صرف انسپکٹر جمشید نے دروازے پر جا کر دستک دی۔۔۔ ایک نوجوان نے دروازہ کھولا تو انہوں نے کہا۔

"حمید خان یہیں رہتے ہیں؟"

"جی ہاں، بالکل رہتے ہیں۔"

"میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"بہت اچھا۔" نوجوان نے کہا اور اندر چلا گیا۔

مکان چھوٹا سا تھا۔۔۔ جلد ہی ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا اور نوجوان انہیں اس میں بٹھا کر چلا گیا۔۔۔ جلد ہی ایک ادھیڑ عمر آدمی اندر داخل ہوا، لیکن یہ آدمی نہ تو موٹا تھا نہ بھدا۔۔۔ پتلا دبلا اور اچھی شکل اور صورت کا آدمی تھا۔

"آپ حمید خان ہیں؟" وہ بولے۔

"ہاں جناب، فرمائیے، میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"اس پیکٹ کو دیکھیے، کیا یہ آپ نے رجسٹری کرایا تھا۔" انہوں نے پیکٹ کو اس کے سامنے رکھ دیا۔

"پیکٹ۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں، اس پر بھیجنے والے کا نام آپ کا ہے اور پتا بھی۔"

"ل، لیکن۔۔۔ یہ پیکٹ میں نے نہیں بھیجا کسی کو۔"

"اوہ۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"حیرت ہے، کسی کو یہ پیکٹ میرے نام اور پتے سے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔" حمید خان حیران ہو کر بولا۔

"کیا آپ کسی موٹے اور بھدے سے آدمی۔۔۔ کو جانتے ہیں۔" انہوں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"موٹے اور بھدے آدمی کو؟"

"جی ہاں۔" انہوں نے پُر امید نظروں سے دیکھا۔

حمید خان سوچ میں ڈوب گیا، پھر بولا:

"بات کیا ہے؟"

"اس پیکٹ میں ایک عدد چیز بھیجی گئی ہے۔ ہم یہ جاننے کی کوشش میں ہیں کہ بھیجنے والا کون ہے۔۔۔ پوسٹ آفس والوں نے اس کا حلیہ یہ بتایا ہے یعنی موٹا، بھدا اور گہرا سانولا رنگ۔"

"میں مچھلیوں کا کام کرتا ہوں جناب۔۔۔ سمندر کے کنارے کچھ ماہی گیر آباد ہیں۔ انہوں نے مچھلیاں پکڑنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ میں ان سے مچھلیاں خریدتا ہوں اور اپنی دکان پر فروخت کرتا ہوں۔"

"یہ بات بتانے سے آپ کا کیا مقصد ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ میں نے ان ماہی گیروں میں اس حلیے کے ایک آدمی کو دیکھا ہے۔"

"اوہ۔" انسپکٹر جمشید اچھل پڑے، پھر پرجوش لہجے میں بولے:

"کیا آپ ہمیں ان کے پاس لے کر جا سکتے ہیں۔"

"اگر آپ نے ان میں سے کسی کو گرفتار کیا اور انھوں نے مجھے آپ کے ساتھ دیکھا، تو وہ میرے دشمن بن جائیں گے۔ ان کے بارے میں میں نے بہت کچھ سنا ہے۔ بہت خطرناک لوگ ہیں۔"

"ہوں، بات تو ٹھیک ہے۔ خیر آپ ان تک پہنچنے کا راستہ اور طریقہ بتا دیں، پہنچ ہم خود جائیں گے اور اس پیکٹ کا ذکر بھی نہیں کریں گے۔ اس طرح کوئی مچھیرا آپ کے خلاف نہیں ہو سکے گا۔ پھر بھی اگر آپ کو کسی سے خطرہ محسوس ہو تو آپ آئی جی انوار عالم صاحب کو فون کر دیجیے گا۔ میں ان سے کہہ دوں گا کہ آپ کا خیال رکھیں۔" انھوں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"بہت بہت شکریہ۔"

"آپ کو ساحل کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف جانا ہوگا۔ چٹانوں کے درمیان ہی ایک کھاڑی سی آئے گی۔ مچھیروں کا یہ گروپ

اس کھاڑی میں ہی مچھلیاں پکڑتے ہیں، وہیں دکانداروں کو فروخت کر دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہمارا باقاعدہ حساب کتاب چلتا ہے۔ ہمارے نام پتے ان کے کھاتوں میں درج ہیں۔"

"اوہ، اور ان مچھیروں میں اس حلیے کا آدمی موجود ہے۔"

"جی ہاں، میرا خیال تو یہی ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ اس پیکٹ سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔"

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ خیر اب اس سے ملنا تو پڑے گا ہی۔"

وہ سمندر کی طرف روانہ ہوئے۔ ساحل پر پہنچ کر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

"پھر وہی سمندر، معلوم ہوتا ہے، اس مرتبہ سمندر ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔" فاروق نے سرد آہ بھری۔

"تو پھر کیا ہوا۔ تم ایسا کرو کہ سمندر سے دوستی کر لو۔" آفتاب مسکرایا۔

"ہم کیا دوستی کر لیں گے، سمندر ہم سے دوستی کرنے پر تلا ہوا ہے۔" مکھن نے فوراً کہا۔

چھوٹی پارٹی اس وقت ایک جیپ میں تھی اور بڑے دوسری میں۔ بڑی پارٹی آ گئی تھی، اس لیے اس وقت وہ خوب کھل کر بات چیت کر سکتے تھے۔

"خدا ہی بہتر جانتا ہے، یہ بیل کب منڈھے چڑھے گی۔" محمود نے سمندر پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"بیل منڈھے چڑھے گی، کیا مطلب؟" آصف حیران ہو کر بولا۔

"لو اور سنو، تمہیں بیل منڈھے چڑھنے کا مطلب نہیں معلوم۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"وہ تو خیر معلوم ہے، اس وقت اس محاورے کے استعمال کا کون سا موقع تھا۔" آصف نے فرزانہ کو گھورا۔

"شاید محمود بھائی کا مطلب یہ ہے کہ نہ جانے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔" شوکی بول پڑا اور وہ مسکرا دیے۔

"محاورے کا مطلب محاورے سے۔ یہ بھی خوب رہی، لیکن میرا خیال ہے ان دونوں کا مطلب الگ الگ ہے۔"

"مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم باتونی ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ بھی اوٹ پٹانگ باتوں کے باتونی۔۔۔ بے دریغ محاوروں کے باتونی۔" فرحت جلدی جلدی بولی۔

"معلوم ہے، باتونیوں کی قسموں پر کئی کتابوں کا مطالعہ کر کے اس مہم میں شریک ہوئی ہو۔" محمود مسکرایا۔

"اللہ اپنا رحم فرمائے، کہیں ہم اس حقیقی سمندر کی بجائے باتوں کے سمندر میں نہ بہہ جائیں۔ اس صورت میں بے چارہ حقیقی سمندر کیا خیال کرے گا۔" اشفاق نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"خیال کیا کرے گا، ہماری بے مروتی کا رونا روئے گا۔ پکار پکار کر کہے گا کہ یہ لوگ بھی کس قدر فضول نکلے، مجھے چھوڑ کر خیالی سمندر میں کود گئے۔" اخلاق نے مسرت زدہ لہجے میں کہا۔

"لو اور سنو، اب سمندر بھی پکار پکار کر کہے گا۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"تو اور کیا۔۔۔ یہ جو اس کی چالیں بار بار اٹھتی ہیں، یہ ہم سے کچھ کہتی ہی تو ہیں۔" شوکی پُرزور لہجے میں بولا۔

"کیا کہتی ہیں، ہم تو سمجھ نہیں پائے۔ ذرا ان کا ترجمہ بھی کرتے رہو۔" آفتاب نے جلدی سے کہا۔ اس کی بات پر سبھی ہنس دیے۔

"اوہو، شاید ہم کھاڑی کے قریب پہنچ گئے ہیں، وہ دیکھو مچھیرے جال ڈال رہے ہیں۔" محمود نے چونک کر کہا۔

سب کی نظریں اس طرف جم گئیں۔ محمود کا خیال درست ہی تھا۔ اگلی جیپ کی رفتار بھی کم ہو گئی تھی۔ آخر وہ کھاڑی کے نزدیک پہنچ کر رک گئے۔ اب مچھیرے بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔۔۔ انھوں نے دیکھا، قدرے فاصلے پر سمندر میں ایک بڑی لانچ کھڑی تھی۔ اس لانچ پر ان کی نظریں جم کر رہ گئیں۔۔۔ لانچ جدید قسم کی تھی اور تھی بھی نئی۔۔۔ اس قدر قیمتی لانچ کم از کم ان ماہی گیروں کی تو ہو نہیں سکتی تھی۔

"کیا بات ہے صاحبان، کیا آپ مچھلیاں خریدنے آئے ہیں۔"

اگر یہی بات ہے تو آپ کو خالی ہاتھ لوٹنا ہوگا، کیوں کہ ہم لوگ
اصول کے بہت پکے ہیں ۔۔۔ دیکھیے نا، اگر ہم اس طرح عام لوگوں
کو مچھلیاں فروخت کرنا شروع کر دیں تو بے چارے دکاندار کہاں
جائیں گے ۔۔ مطلب یہ کہ ہم پرچون میں مچھلیاں فروخت نہیں کرتے
یہاں سے صرف بیوپاری لوگ خرید کر لے جا سکتے ہیں۔ وہ بھی مقررہ
بیوپاری ۔۔۔" وہ شاید بہت باتونی تھا، کہتا چلا گیا۔

"فاروق، اس سے دوستی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" آفتاب
بول اٹھا۔

"تمھی کو مبارک ہو۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"چپ رہو، ہر وقت ٹانگ اڑانا اچھا نہیں۔" انسپکٹر جمشید بھنا
اٹھے اور ان کی طرف مڑے۔

"دیکھیں بھئی، ہم مچھلیاں خریدنے نہیں آئے۔ ہمیں تو آپ
لوگوں سے کچھ کام ہے۔"

"اوہ، تب تو ٹھیک ہے۔ آپ کام بتائیے، ہمارے بس کا
ہوا تو ضرور کریں گے۔"

"آپ لوگ غوطہ خوری جانتے ہیں؟"

"جی ہاں، ہم غوطہ خوری کا کام ہی کرتے ہیں۔ ہم میں کئی
بہت ہی ماہر غوطہ خور موجود ہیں۔"

"بس تو پھر بن گیا کام ۔۔ ہمیں چند ماہر ترین غوطہ خوروں کی

بے حد ضرورت ہے۔ سمندر میں ایک چیز تلاش کرانی ہے۔ معاوضہ
خاطر خواہ ملے گا۔ کیا خیال ہے؟"

"یہ تو ہمارا پیشہ ہے، خیال کیا ہوتا ۔۔ ضرور کریں گے۔" اس
نے کہا۔

"تو پھر غوطہ خوروں کو اسی وقت ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، یہ بھی مشکل نہیں، لیکن پہلے کام کی تفصیل معلوم
ہو جائے تو اچھا ہے، تاکہ معاوضہ طے کر لیا جائے۔"

"یہاں سے کافی فاصلے پر ساحل سے ہم لوگ سمندر میں
سفر کریں گے اور اس جگہ کی نشان دہی کریں گے، جس جگہ غوطہ
لگانا ہے۔"

"آخر آپ کو تلاش کیا کرانا ہے؟"

"دھات کی ایک چیز جو عام لوگوں کے لیے قیمتی نہیں،
لیکن ہمارے لیے بہت اہم ہے۔"

"شاید آپ ہم سے کچھ چھپا رہے، لیکن بے فکر رہیں۔ ہم
ایماندار لوگ ہیں۔ آپ کا اگر سونا بھی سمندر میں گرا ہے تو نکال
کر آپ کو ہی دیں گے۔ اسے ادھر ادھر کر کے یہ نہیں کہیں گے
کہ نیچے کچھ نہیں ملا۔" اس نے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ۔۔ اس غوطہ خوری کے دوران جس قدر
بھی سونا ملے، وہ آپ لوگوں کا ۔۔ ہمیں سونے سے کوئی دلچسپی

نہیں ۔" انسپکٹر جمشید بولے ۔

" ٹھیک ہے، ہم اس کام کے دس ہزار روپے لیں گے ۔"

" ہمیں منظور ہے ۔۔۔ غوطہ خور کتنی دیر میں تیار ہو جائیں گے؟"

" ایک گھنٹا لگ جائے گا ۔"

" تو ہم کچھ فاصلے پر سمندر کے کنارے چہل قدمی کر رہے ہیں۔ جب آپ تیار ہو جائیں، بتا دیجیے گا ۔"

" اچھی بات ہے ۔"

وہ وہاں سے ہٹ آئے اور ٹہلتے ہوئے دور نکل آئے۔ سمندر کی چھالیں ان کے پیروں تک آ کر پلٹ رہی تھیں ۔

" انکل، یہ کیا ؟ ہم تو یہاں اس کالے اور بھدے آدمی کی تلاش میں آئے تھے ۔" فرحت حیران ہو کر بولی ۔

" اگر ہم براہِ راست اس کے بارے میں پوچھتے اور پھر اس سے سوالات کرتے تو وہ ہوشیار ہوتا ۔۔۔ اب ہم ایک بالکل ہی الٹ معاملے میں اس سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔ وہ بغیر کسی خوف اور خطرے کے ہمارے پاس چلا آئے گا ۔" انہوں نے کہا ۔

" لیکن ابا جان، ضروری تو نہیں کہ وہ بھی ان غوطہ خوروں میں شامل ہو ۔" فرحت نے اعتراض کیا ۔

" ہاں، اس کا بھی امکان ہے، لیکن زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ بھی ان میں شامل ہو گا ۔"

"یہاں موجود ماہی گیروں میں تو وہ نظر نہیں آیا ۔" آصف نے کندھے اچکائے ۔

" ہاں، لیکن غوطہ خوروں کے آنے تک ہم کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے ۔"

" بالکل، میں آپ کی تائید کرتا ہوں ۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے ۔

" گویا اب ہمیں ایک گھنٹے تک چہل قدمی کرنا ہو گی ۔" محمود نے کہا ۔

" اور اس کا مطلب ہے، ہم چہل قدمی کرتے کرتے دور نکل سکتے ہیں ۔" اخلاق بول اٹھا ۔

" لیکن بھئی، اتنا دور نہ نکل جانا کہ پھر تم لوگوں کی تلاش کا مسئلہ بھی پیدا ہو جائے۔ اور غوطہ خوروں کی خدمات تم لوگوں کی تلاش کے سلسلے میں حاصل کرنا پڑیں ۔" خان رحمان مسکرائے ۔

" فکر نہ کریں انکل، ہم سمندر کی طرف منہ کر کے ہرگز چہل قدمی نہیں کریں گے ۔" شوکی نے شوخ لہجے میں کہا ۔

" اچھا جاؤ، خدا حافظ ۔" منور علی خان مسکرائے ۔

" منور علی خان، معلوم ہوتا ہے، تم ان سے بہت متاثر ہو گئے ہو ۔" انسپکٹر کامران مرزا کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی اور وہ جاتے جاتے رک گئے ۔۔۔ ان کی طرف مڑ کر دیکھنے لگے ۔

"کیوں، تم کیوں رک گئے ۔"

"انکل کا جواب سننے کے پہلے؟" آصف بولا۔

"جی ہاں، ذرا ہم بھی تو سنیں، آخر انکل کیا جواب دیتے ہیں۔" محمود نے کہا۔

"بھئی، بات دراصل یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ان چاروں سے بہت متاثر ہو چکا ہوں — اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ تم لوگوں کی عدم موجودگی میں جب میں نے ان کے ساتھ جزیرے تک کا سفر کیا تو ان کی باتوں نے قدم قدم پر تمہاری یاد دلائی — دوسرے یہ کہ یہ بہت معصوم ہیں۔" منور علی خان بولے —

"جی، کیا فرمایا، معصوم ہیں؟" محمود حیران ہو کر بولا۔

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو، جیسے ہم معصوم ہو ہی نہیں سکتے۔" شوکی برا مان کر بولا۔

"اچھا بھائی، مان لیا، تم بچے معصوم ہو — اب آگے بڑھو۔" آصف نے منہ بنایا۔

وہ بڑی پارٹی سے دور ہونے لگے۔ یہاں تک کہ ساحل کے ساتھ ساتھ چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس جگہ سے پھیلا ہوا جنگل بہت دور تھا —

"کہیں ہم اتنی دور نہ نکل جائیں کہ واپس ہوتے ہوتے ایک گھنٹے سے زیادہ گزر جائے۔" فرحت بڑبڑائی۔

"جب ہم بڑوں کے پاس سے چلے تھے تو میں نے گھڑی دیکھ لی تھی، گویا ہم آدھ گھنٹے تک بے فکری سے چل سکتے ہیں۔ آدھ گھنٹے تک چلنے کے بعد واپس مڑیں گے — اس طرح ہم ٹھیک ایک گھنٹے بعد ان تک پہنچ جائیں گے۔" محمود نے بتایا۔

"اسے کہتے ہیں جاسوسی، ہر کام میں جاسوسی —" فاروق نے منہ بنایا —

"اسے کہتے ہیں ٹانگ اڑانا، ہر کام میں ٹانگ اڑانا۔" محمود جھلا اٹھا۔

"اگر تم دونوں کا آپس میں لڑنے کا ارادہ ہو تو ہم شوق سے تمہارا مقابلہ دیکھنے کے لیے تیار ہیں۔" آفتاب شوخ لہجے میں بولا۔

"اگر تمہیں لڑائی بھڑائی کا اتنا ہی شوق ہے تو خود کیوں میدان میں نہیں آ جاتے۔" فاروق نے برا مان کر کہا۔

"میں بزدل نہیں ہوں کہ کوئی مجھے للکارے اور میں آگے بڑھوں — آجاؤ میدان میں — آج فیصلہ ہو ہی جائے۔"

"یہاں تو ہر طرف میدان ہی ہے — آؤ، آج تمہیں چھٹی کا دودھ یاد دلا ہی دوں۔" فاروق نے چند قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا — آفتاب بھی خم ٹھونک کر آگے بڑھا۔

"ارے ارے، یہ کیا — تم تو سچ مچ لڑنے لگے۔" محمود گھبرا کر ان کے درمیان میں آنے کے لیے آگے بڑھا۔

"تم دونوں کا ضرور دماغ چل گیا ہے۔" آصف بھی بیچ بچاؤ کرانے کے لیے بڑھا اور دونوں ایک دوسرے سے پورے زور سے ٹکرائے۔

"یہ کیا کیا آصف؟" محمود غرایا۔

"میں نے یا تم نے۔ ٹکرائے تو خود تم مجھ سے ہو۔" آصف بھنا کر بولا۔

"میں نہیں ٹکرایا، تم ٹکرائے ہو۔" محمود بلند آواز میں بولا۔

"یہ بات ہے تو پھر آؤ۔ آج ٹکرا ہی جائیں۔"

"ہائیں ہائیں، کیا واقعی تم لوگوں کے دماغ چل گئے ہیں۔ فرحت انہیں روکو۔" فرزانہ چلا اٹھی۔

"تو تم کیا کھڑی تماشا دیکھتی رہو گی، تم بھی روکو اپنے بھائیوں کو۔"

"ہاں ہاں، میں بھی روکتی ہوں ۔۔۔ زیادہ تیزی دکھانے کی ضرورت نہیں۔"

"کیا کہا، میں تیزی دکھا رہی ہوں ۔۔۔ معلوم ہوتا ہے تمہارے دماغ میں بھی انہیں لڑتے دیکھ کر تیزی گھس آئی ہے۔" فرحت تلملا کر بولی۔

"اچھا، یہ بات ہے، تو پھر تم بھی آجاؤ۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"اُف خدا، یہ ۔۔۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں اور ان حالات میں ہم کیا کریں گے ۔۔۔ مم، میرا مطلب ہے، ہم کس سے لڑیں گے۔" شوکی بلند آواز میں بولا۔

ایک دوسرے پر جھپٹ پڑنے کے لیے تیار وہ سب یک دم رک گئے اور ہنس پڑے ۔۔۔ ایسے میں مکھن بولا:

"لڑنے سے یہ کہیں بہتر ہوگا کہ ہم سب ساحل پر دوڑ لگائیں۔ ہم میں سے جو بھی آگے نکل گیا، بس وہ جیت گیا۔"

"تو یوں کہو، تم لوگ بھی ہم سے مقابلہ کرنے کے لیے پر تول رہے ہو۔" آفتاب بولا۔

"پر تولنا کوئی جرم تو نہیں۔" مکھن نے معصومانہ لہجے میں کہا۔

"تجویز شاندار ہے ۔۔۔ یوں بھی ہمیں وقت گزارنا ہے اور یہ وقت گزارنے کا بہترین طریقہ ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، میرا خیال ہے، یہ تجویز سبھی کو منظور ہے۔"

"تو آؤ، ایک لائن میں کھڑے ہو جاؤ ۔۔۔ میں ایک دو تین کہوں گا ۔۔۔ تین پر سب دوڑ پڑیں گے اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے۔ ایسی ایڑی چوٹی کا کرکیا کبھی کسی نے لگایا ہوگا، لیکن خیال رہے، اتنی دور نہ نکل جائیں کہ واپسی میں دیر ہو جائے اور بڑوں کی ناراضی مول لینا پڑے ۔ کیا سب لوگوں نے میری باتیں سن لیں۔" محمود کہتا چلا گیا۔

"ہاں، خوب غور سے سن لیں۔ استاد بننے کی کوشش نہ کرو۔"
آصف نے جھنجھلا کر کہا۔

"اچھا تو پھر تم بن جاؤ استاد — استادی تمہی کو مبارک ۔"
محمود نے منہ بنایا۔

سب ایک قطار میں کھڑے ہو گئے — محمود نے ایک دو تین
کہا۔ تین پر سبھی دوڑے تھے۔ اب وہ سر پر پاؤں رکھ کر دوڑ
رہے تھے؛ گویا سر دھڑ کی بازی لگ گئی تھی۔ کبھی کوئی آگے نکل
جاتا تو کبھی کوئی — مجموعی طور سے کسی کا پلڑا بھاری نہیں تھا۔
اور پھر دوڑتے دوڑتے وہ بہت دور نکل گئے۔ اچانک محمود
چلایا:

"بس ختم — ہم غلطی کر رہے ہیں۔"
ان سب کو یک دم بریک سا لگا۔

"بس ختم، کیا مطلب — ابھی تو دوڑ کا کوئی فیصلہ بھی نہیں
ہوا ۔"

"لیکن ہم اس قدر دور آ گئے ہیں کہ وقت ختم ہونے تک
بڑوں کے پاس نہیں پہنچ سکیں گے۔ ان تک پہنچنے کے لیے اب
ہمیں پھر دوڑ لگانا ہو گی۔ پوری طاقت سے دوڑ کر ہی ہم وہاں
پہنچ سکتے ہیں۔"

"اوہ، تب تو تم نے اچھا کیا کہ ہمیں روک لیا، ورنہ جوش میں

ہم نہ جانے اور کتنی دور نکل آتے۔" فرحت بولی۔

"اوہو، یہ — یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" فاروق بڑبڑایا۔

"اب کچھ دیکھنے کا وقت نہیں رہا — آؤ چلیں۔" آصف بولا۔

"لیکن میں اس جگہ کا مزہ لیے بغیر نہیں جا سکتا۔" فاروق
جھنجھلا کر بولا۔

فرزانہ نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر اس کی نظریں بھی اسی
سمت میں اٹھ گئیں، جس طرف فاروق دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں
میں بھی الجھن تیر گئی اور قدم خود بخود ادھر اٹھنے لگے۔

"یک نہ شد، دو شد — لو یہ بھی فاروق کا ساتھ دینے لگی۔"
آفتاب بولا۔

اتنی دیر میں سبھی ادھر متوجہ ہو گئے تھے اور پھر خود بخود
ان کے قدم ادھر اُٹھ گئے — نزدیک پہنچ کر انہوں نے دیکھا،
ایک چٹان بالکل کسی سائبان کی طرح جھکی ہوئی تھی اور اس کے نیچے
تین بڑی بڑی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ ان تین چٹانوں کے درمیان
میں پانی موجود تھا، لیکن یہ پانی بغور دیکھنے پر ہی نظر آتا تھا، ورنہ دور
سے یہ آسمان دکھائی دیتا تھا۔ تینوں چٹانوں کے درمیان بس اتنی جگہ
تھی کہ کوئی پتلا دبلا سا آدمی ان جگہوں میں سے مشکل سے گزر کر پانی
تک جا سکتا تھا۔

حیرت زدہ سے وہ آگے بڑھے اور پھر جوں ہی انہوں نے

درمیانی جگہ سے اندرونی حصے کو دیکھا' دھک سے رہ گئے۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، ایسے میں شوکی کی کانپتی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی —

"یا اللہ' یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں ؟"

○

ٹھیک پینتالیس منٹ بعد انہیں غوطہ خوروں کی ایک جماعت اپنی طرف آتی دکھائی دی — غوطہ خوری کے لباس ان کے ہاتھوں پر تھے۔ وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑھتے چلے آرہے تھے — نزدیک پہنچتے ہی انہوں نے جان لیا' ان کی کوشش ضائع نہیں ہوئی۔ ان میں وہ موٹا اور بھدا آدمی بھی تھا؛ تاہم وہ اتنا موٹا نہیں تھا۔ اس کی نظریں ان سب کو بری طرح گھور رہی تھیں —

"غوطہ خوروں کی ضرورت آپ لوگوں کو ہی ہے —" کالا اور بھدا آدمی آگے نکلتے ہوئے بولا۔

"ہاں' یہی بات ہے —"

"شکریہ' ہم حاضر ہیں — فرمائیے' کہاں غوطہ لگانا ہے؟"

"آپ لوگوں کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا — سمندر میں پہنچ کر ہی ہم وہ جگہ بتا سکیں گے۔"

"چلیے' ہم تیار ہیں۔" اس نے کہا۔

"ہمیں پندرہ منٹ انتظار کرنا ہوگا — دراصل آپ کے ساتھیوں نے ایک گھنٹے کی مہلت مانگی تھی — اس مہلت کے مطابق ہمارے کچھ ساتھی گھومنے نکل گئے ہیں — بس وہ آتے ہی ہوں گے۔"

"کوئی بات نہیں' ہم انتظار کر لیتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"گھانسی —" وہ بولا۔

"مسٹر گھانسی' آپ حمید خان کو جانتے ہیں؟" انسپکٹر کامران مرزا اچانک بول اٹھے — اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور بولا:

"کون حمید خان؟"

"مچھلیوں کا ایک بیوپاری — وہ آپ لوگوں سے مچھلیاں خرید کر لے جاتا ہے۔"

"اوہ' اب سمجھا' آپ کس حمید خان کی بات کر رہے ہیں۔"

"شکریہ' تو آپ اسے جانتے ہیں؟"

"جی ہاں —"

"آپ اس کے گھر کا پتا بھی جانتے ہیں؟"

"ہاں' کاروبار جو ہوا اس سے۔" گھانسی نے کہا۔

"شکریہ' اس پکیٹ کو پہچانتے ہیں آپ مسٹر گھانسی؟" انسپکٹر

جمشید نے جیب سے پیکٹ نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔

گھانسی نے حیرت زدہ انداز میں پیکٹ کو دیکھا۔ چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا، پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں، میں نہیں جانتا، یہ کیسا پیکٹ ہے۔" وہ بولا۔

"تب پھر آپ کو ہمارے ساتھ پوسٹ آفس تک چلنا ہوگا۔"

"کک، کیا مطلب؟" وہ بوکھلا اٹھا۔

"مطلب آپ بہت اچھی طرح جانتے ہیں مسٹر گھانسی۔" انسپکٹر جمشید کی نظریں اس پر جم گئیں۔

"ہاں، بات تو ٹھیک ہے — میں اچھی طرح جان گیا ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں اور کون ہیں — سنیے، میرا جواب یہ ہے۔"
یہ کہتے ہی اس نے سمندر کی طرف دوڑ لگا دی۔

"ارے ارے، یہ کیا جواب ہوا۔" خان رحمان بوکھلا کر بولے۔

انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا ایک ساتھ اس کی طرف دوڑے، لیکن اتنی دیر میں وہ پانی میں چھلانگ لگا چکا تھا — اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ بھی اس کے پیچھے چھلانگیں لگا دیں — منور علی خان چلا کر بولے:

"کامران مرزا، کیا ہم بھی آئیں؟"

"نہیں، وہیں ٹھہریں۔"

دوسرے راہ گیر حیرت سے آنکھیں پھاڑے کھڑے تھے، شاید

ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے — انہوں نے وہاں سے بھاگنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی تھی — اب ان سب کی نظریں سمندر پر جم گئیں —

گھانسی کے تیرنے کی رفتار بہت تیز تھی — پوری کوشش کے باوجود وہ درمیانی فاصلہ کم نہیں کر پا رہے تھے؛ حالاں کہ تیرنے میں وہ بھی کچھ کم ماہر نہیں تھے۔

"بھئی کامران مرزا، یہ شخص تو آج ہمارے چھکے چھڑائے دے رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہاں، ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے اس کی ساری زندگی تیرتے گزر گئی ہو۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

اچانک گھانسی کا رخ بدل گیا — اب وہ ساحل کے متوازی سمندر میں تیرنے لگا — یہ دوڑ نہ جانے کتنی دیر جاری رہی — اچانک گھانسی غوطہ لگا گیا — انہیں بھی غوطہ لگانا پڑا، لیکن گھانسی انہیں کہیں بھی نظر نہ آیا — وہ سطح پر ابھرے اور ادھر ادھر دیکھا — ایک بار پھر غوطہ لگایا اور اندازے سے پانی کے نیچے ہی نیچے آگے بڑھے۔ پھر سطح پر ابھرے — گھانسی انہیں اب بھی نظر نہ آیا — یہاں تک کہ انہوں نے تیسری بار پھر غوطہ لگایا۔

اب جو انہوں نے سطح سمندر پر ابھر کر چاروں طرف دیکھا تو

چونک اٹھے ـــ دور بہت دور گھانسی ساحل پر دوڑا جا رہا تھا۔ انہوں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ ـــ آؤ اور تاؤ دیکھنے کی فرصت بھی کسے تھی۔ ساحل کی طرف دوڑ پڑے، لیکن اس بات کا احساس انہیں شدت سے ہو رہا تھا کہ گھانسی ان سے بہت فاصلے پر جا نکلا ہے اور اس تک پہنچنا، اب اور بھی مشکل نظر آ رہا تھا، لیکن اس بات کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ دوڑنا بند کر دیتے اور ہمت ہار کر رہ جاتے، دوڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ گھانسی نظروں سے اوجھل ہو گیا ـــ انہوں نے دوڑ پھر بھی جاری رکھی ـــ

"آج تو ہمارے ساتھ بہت بری ہوئی۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"واقعی، شکست والی یہ دوڑ ہمیشہ یاد رہے گی۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"نہ جانے کیا بات ہے، یہ شکست مجھے اچھی لگ رہی ہے ـــ شاید اس لیے کہ اس سے ذرا کم ہی دو چار ہوئے ہیں نا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ انسپکٹر کامران مرزا مسکرا کر رہ گئے اور بولے:

"بھئی گھانسی، تمہیں نہ پکڑا تو کچھ بھی نہ کیا۔"

اچانک ان کے اٹھتے قدم رک گئے ـــ آنکھوں میں چمک نمودار ہو گئی ـــ چہرے جوش سے تمتما اُٹھے ـــ

کشتی یا......

تین چٹانوں کے درمیان گھری اس چیز کو وہ حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"کہیں یہ کوئی وہیل مچھلی تو نہیں" فرحت بڑبڑائی۔

"وہیل بہت بڑی ہوتی ہے" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"لیکن وہیل کا بچہ بھی تو ہوتا ہوگا" آصف بولا۔

"ہاں، لیکن یہ بالکل ساکت ہے، بلکہ بے جان چیز ہے، آؤ آگے بڑھ کر دیکھیں۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں" محمود نے کہا اور اس چیز کی طرف قدم اُٹھا دیے۔

"احتیاط سے محمود، کوئی خطرہ نہ مول لے لینا" فرزانہ بے چین ہو کر بولی۔

اتنی دیر میں محمود پانی میں داخل ہوتا ہوا اس کے بالکل نزدیک پہنچ چکا تھا۔ وہ پانی کی ہلکی ہلکی لہروں پر غیر محسوس طور پر ہل رہی تھی۔

"یہ تو ایسے معلوم ہوتا ہے، جیسے کوئی عجیب و غریب طرح کی کشتی ہو" محمود بڑبڑایا۔

"کشتی؟" وہ سب چونک اٹھے۔

اب تو سبھی جوش کے عالم میں آگے بڑھے۔ شوکی نے تو اس پر ہاتھ ہی پھیر ڈالا اور پھر چلّا اٹھا:

"یہ کوئی مچھلی نہیں ہے"

اچانک آصف کا ہاتھ بٹن نما کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ دوسرا لمحہ بوکھلا دینے والا تھا۔ اس چیز پر سے سیاہ رنگ کا ایک ڈھکنا سا اُٹھتا چلا گیا۔

"اُف خدا، یہ تو کوئی لانچ ہے یا پھر آب دوز۔ لیکن اس قسم کی لانچ یا آبدوز ہم نے پہلے تو کبھی دیکھی نہیں" محمود چلّا اٹھا۔

"چلو، شکر کرو، اب تو دیکھ لی"

سوچے سمجھے بغیر محمود لانچ میں سوار ہو گیا۔

"کیا کر رہے ہو محمود" فرزانہ چلّائی۔

"تم لوگ ڈرتے رہو" محمود نے منہ بنایا۔

یہ لمحہ ایسا تھا کہ کوئی بھی باہر نہ ٹھہر سکا، سبھی اس پر سوار ہو گئے۔

"اوہو، ہم تو اس لانچ کے پچھلے حصے میں آ گئے؛ حالانکہ اگلے

حصے میں پہنچنا چاہیے تھا۔ انجن وغیرہ تو آخر اس کے اگلے حصے میں ہو گا:" اشفاق نے پریشان آواز میں کہا۔

"ہاں، آؤ اگلے حصے میں چلیں۔" اخلاق نے کہا ہی تھا کہ کٹ کی آواز ہوئی اور وہ ڈھکنا جو اوپر اٹھا تھا، گر گیا۔ وہ بوکھلا اُٹھے — اب وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں تھے۔ اس کمرے کی دیواریں شیشے کی تھیں اور ان دیواروں کے چاروں طرف پانی دیکھ سکتے تھے۔

"یہ — یہ کیا ہوا؟" اشفاق بوکھلا کر بولا۔

"ہوتا کیا، اب ہم اس لانچ کے قیدی بن گئے۔" شوکی بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

"لانچ کے قیدی۔" فاروق بڑبڑایا۔

"ہاں ہاں، کہہ دو، یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔" آفتاب جل کر بولا۔

"اُف خدا، یہ — یہ تو نیچے جا رہی ہے۔" فرزانہ چلا اٹھی۔

"اوپر جا بھی کس طرح سکتی ہے۔ ہوائی جہاز تو نہیں ہے۔" آفتاب مسکرایا۔

"اور اب میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں، ہم کسی لانچ کے نہیں، آب دوز کے قیدی ہیں۔ بہت ہی جدید قسم کی لانچ کے۔ جو اب ہمیں پانی کے نیچے لے جا رہی ہے۔"

"پپ۔ پتا نہیں، ہم نے اس میں کسی اور شخص کو بیٹھے تو دیکھا نہیں کہ یہ کہا جا سکے، وہ اسے نیچے لے جا رہا ہے اور فرض کرو، اس کا ڈرائیور اس میں موجود تھا، تب بھی وہ بھلا بغیر ٹکٹ ہمیں نیچے کی سیر کیوں کرانے لگا۔" فرزانہ نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے اس کے ڈرائیور کو کسی کا انتظار تھا۔ اسے زیرِ آب لے جانا تھا، اس کی بجائے بیٹھ گئے ہم۔ اس نے یہی خیال کیا کہ وہ بیٹھ گیا ہے؛ چنانچہ وہ آب دوز کو پانی کے نیچے لے آیا ہے۔"

"لیکن الجھن تو یہ ہے کہ یہ تو نیچے ہی نیچے جا رہی ہے۔" فرحت بڑبڑائی۔

"اب ہم ڈرائیور سے کس طرح کہیں کہ بھئی نیچے ہی نیچے نہ لے جاؤ — کچھ اوپر کا بھی خیال رکھو۔" فاروق بولا۔

"ہم بے تکی باتیں کرنے لگے ہیں، کہیں حواس تو نہیں کھونے والے —" شوکی نے گویا خبردار کیا۔

"میں ایک خیال پیش کروں؟" مکھن چونک کر بولا۔

"کوئی حرج نہیں۔ پہلے تھوڑے خیالات پیش ہو رہے ہیں۔ ایک تم بھی کر دو گے تو کونسی قیامت آ جائے گی۔" محمود بولا۔

"تو پھر میرا خیال ہے، ہم لوگ اس سمندر دوز دنیا میں جا پہنچے

ہیں، جس میں سے ہمیں واپس بھیج دیا گیا تھا اور اس مرتبہ شاید ہم دوسروں کی بے خبری میں جا رہے ہیں۔"

"اوہ۔" ان سب کے منہ سے نکلا، پھر آصف نے بلند آواز میں کہا:

"میں مکھن کے خیال سے سو فی صد متفق ہوں۔"

وہ سب سوچ میں ڈوب گئے، پھر فاروق بولا:

"افسوس، بڑی پارٹی پھر بھی اوپر ہی رہ گئی — کاش، وہ بھی ہمارے ساتھ آ گئے ہوتے۔"

"یہ اس صورت میں ممکن تھا، جب وہ بھی ہمارے ساتھ چہل قدمی کرتے اور پھر دوڑ لگا نامنظور کر لیتے۔" آفتاب بولا۔

اس کی بات پر سب مسکرا دیے۔

"میں تو یہی کہوں گا کہ یہ بہت بُرا ہوا — جس دنیا میں لی کاف جیسے مجرم بے بسی کی زندگی گزار رہے ہیں، وہاں ہم بیچاروں کی دال کیا گلے گی۔" شوکی بولا۔

"تو وہاں دال گلانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ باس کی طرف سے ملنے والا کھانا کھاتے رہیں گے۔" آفتاب بولا۔

"لیکن باس کی طرف سے ملنے والے کھانے سے پہلے ایک سفید گولی بھی کھانا ہوگی۔ بھوک نے ہمارا وہاں کیا حال کر دیا تھا۔ یہ بات ہم میں سے کوئی بھول نہیں سکتا۔"

"تب تو اس آب دوز سے درخواست کرنی چاہیے کہ وہ نیچے جانے کی بجائے اوپر چلے اور ہمیں وہیں پہنچا دے، جہاں سے ہمیں لائی ہے۔"

"یہ آب دوز ہے، کوئی انسان نہیں کہ ہماری بات سن لے گی۔"

"پہلے زمانے کی تو بے جان چیزیں بھی حکم سن لیتی تھیں، جیسے الہ دین کا چراغ۔" فاروق مسکرایا۔

"لو، اب جزیرے کے سمندر کی سیر کرو، سمندری مخلوق سے ملاقات کرو۔" محمود نے گویا اعلان کیا۔

"جزیرے کا سمندر، ہائیں — محمود، یہ کیا کہا۔"

"بھئی، یہ لوگ اس جزیرے کے اندر سے ہی سمندر میں اترے تھے۔ یعنی اس ستون کے ذریعے، جس میں لفٹ لگی ہوئی تھی۔ اب یہ لانچ بھی اسی لفٹ کی طرح نیچے جا رہی ہے، لہذا ہم اسے جزیرے کا سمندر کیوں نہ کہیں۔"

"ضرور کہو، شوق سے کہو — مجھے تو بس ایک اجازت دے دو۔" فاروق مسکرایا۔

"کیسی اجازت؟" محمود چونکا۔

"اور وہ بھی اس آب دوز میں۔" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"کہیں تم مجھ سے مقابلے کی اجازت تو نہیں مانگ رہے؟" آفتاب

بول اٹھا۔

"ایسی بات نہیں سوراما صاحب — میں تو دراصل یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ یہ جو کہا ہے، جزیرے کا سمندر تو یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا — بلکہ بہت زوردار نام ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ سمندر میں جزیرے ہوتے ہیں، جزیروں میں سمندر نہیں ہوتے۔ لہٰذا یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ جزیرے کا سمندر — ان حالات میں اگر میں اسے کسی ناول کا نام قرار دے دوں تو تم سب کا کیا حرج ہے؟"

"ہمارا کیا حرج ہونے لگا — حرج ہو گا تمہارا۔" مکھن بولا۔

"آخر یہ سفر کتنی دیر تک جاری رہے گا؟"

"بہت دیر تک — سمندر کی گہرائی اتنی جلد تو ختم ہو گی نہیں اور پھر ہمیں تو آگے بھی جانا ہو گا۔" شوکی بولا۔

"آگے، یعنی کہ اور نیچے۔" اشفاق بولا۔

"اُف توبہ، سمندر کی تہہ سے بھی نیچے۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں۔" اخلاق مسکرایا۔

"لیکن یہ آب دوز تہہ کے نیچے کس طرح جا سکے گی — وہ لفٹ تو اس ستون میں سفر کر رہی تھی۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"پتا نہیں، کس طرح جا سکے گی، پوچھ لو۔" اخلاق نے کہا۔

"پوچھ لو، کس سے پوچھ لوں؟" فاروق نے اسے گھورا۔

"آب دوز سے، اور کس سے۔"

"ارے بھئی، یہ بولتی آب دوز نہیں ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"وہ دیکھو، سمندر کی تہہ نظر آنے لگی۔"

سب کی نظریں نیچے کی طرف جم گئیں — واقعی تہہ نظر آ رہی تھی — سمندری پودے، جھاڑیاں، گھونگے، سیپیاں اور ہزاروں رنگ برنگی مچھلیاں تہہ کے ساتھ ساتھ تیرتی صاف نظر آئیں۔ کئی ہزاریا بھی دکھائی دیے — اگر وہ پانی میں ہوتے تو اس وقت تک ہزاریا انہیں اپنی لپیٹ میں لے چکے ہوتے۔ آب دوز کے اندر بھی انہیں دیکھ کر وہ کانپ اٹھے اور پھر انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا — سمندر کی تہہ میں وہیل مچھلی جیسا ایک منہ بنا نظر آیا — آب دوز اس منہ میں داخل ہو گئی۔

"باپ رے، کیا ہم وہیل کے منہ میں جا رہے ہیں۔" محمود کانپ اٹھا —

"اُف خدا، یہ تو ہمیں آب دوز سمیت چبا جائے گی۔"

"آخری وقت ہے، اللہ کو یاد کر لو — کلمہ شریف پڑھ لو چیخنے چلّانے اور رونے دھونے سے کچھ نہیں ہو گا۔" اشفاق بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

اور وہ دل ہی دل میں اللہ کا ذکر کرنے لگے۔ اچانک انہیں

ایک جھٹکا سا لگا — وہ ڈھکنا اوپر اٹھتا نظر آیا جو چٹانوں کے درمیان اٹھا تھا — انہوں نے دیکھا، ان کے سامنے ایک کھلا میدان تھا، ایک سرسبز میدان — جس میں عجیب و غریب قسم کے پھول اور پودے لہلہا رہے تھے۔ بس پھر کیا تھا، وہ چھلانگیں لگا کر آب دوز سے نکل آئے — آب دوز اب پانی میں نہیں، بلکہ اس میدان کے کنارے کھڑی تھی؛ البتہ وہیل مچھلی کا سا ایک اور منہ اس کے نزدیک ہی کھلا نظر آ رہا تھا؛ گویا وہ ابھی ابھی اس کے منہ سے نکلی تھی —

جوں ہی وہ آب دوز سے اترے — اس کا ڈھکنا بند ہوا اور وہ وہیل کے منہ میں داخل ہوئی۔

"یہ واپس جا رہی ہے — اب ہم واپس کس طرح جائیں گے۔"

"ہم سے غلطی ہوئی — ہمیں اس سبزہ زار پر نہیں اترنا چاہیے تھا، اس صورت میں ہم واپس پہنچ جاتے۔"

"خیر، اب یہاں آئے ہیں تو ہم بھی ذرا سیر کر لیں اور مسٹر لی کاف وغیرہ سے مل لیں۔"

دُور بہت دُور انہیں آبادی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

وہ اس طرف چل پڑے — جوں ہی نزدیک پہنچے، شوکی پکار اٹھا:

"ارے، یہ تو وہی آبادی ہے۔ یعنی باس کے قیدیوں کی آبادی؛ گویا اس مرتبہ ہم دوسرے راستے سے آئے ہیں، باس والے

حصے سے نہیں آئے۔"

"اوہ، تو کیا — تو کیا ہم مسٹر لی کاف وغیرہ کے پاس پہنچ چکے ہیں۔"

"ہاں، چند منٹ بعد تم لوگ ان سے مل سکو گے، بشرطیکہ وہ یہاں موجود ہوئے۔" آفتاب نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگے — اچانک ایک ٹیلے پر انہوں نے کسی کو کھڑے پایا — وہ اُن ہی کی طرف دیکھ رہا تھا — نزدیک پہنچنے پر انہوں نے اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار دیکھے اور ادھر شوکی اور آفتاب وغیرہ مارے حیرت کے اچھل پڑے۔ مکھن تو چلّا ہی اٹھا۔

"ارے مسٹر شوبرا، آپ اور یہاں؟"

"مسٹر شوبرا، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"کیوں، کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی، وہ بھی اس حد تک غلط کہ تمہارا منہ اس بُری طرح بن گیا۔" مکھن نے جل بھن کر کہا۔

"ہاں مکھن، فاروق ٹھیک کہہ رہا ہے۔" محمود مسکرایا۔

"کیا مطلب؟" شوکی چونکا۔

"یہ مسٹر شوبرا نہیں، مسٹر ڈی سائٹ ہیں۔ ان کا ساتھی سام لٹ ہم لوگوں کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے۔"

"ڈی سائٹ، سام لٹ — یہ تم کیا کہہ رہے ہو محمود؟" آصف

نے بوکھلا کر کہا۔

"ڈی سائٹ[1] اور سام لٹ سے ہماری ملاقات پہلے بھی ہو چکی ہے۔ یہ بہت خطرناک لوگ ہیں، لیکن میں حیران ہوں، یہ یہاں کیا کر رہے ہیں۔"

"یہاں یہ اس دنیا کے باس کے لیے کام کر رہے ہیں۔ کیوں جناب ٹھیک ہے۔" آصف بولا۔

"ہاں ٹھیک ہے، میں شوبرا ہوں اور ڈی سائٹ بھی میں ہی ہوں۔"

"تو پھر ہم سے یہ سن لیں کہ آپ کا نائب سام لٹ مارا گیا ہے۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں اور اسے مارا جانا بھی چاہیے تھا۔ سونے کے جہاز پر اس کی نیت بد ہو گئی تھی ۔۔۔ اس نے باس سے غداری کی تھی اور اکیلے ہی اکیلے جہاز اڑا لے جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ وہ اس جزیرے پر سے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ اس کی گم شدگی کے بعد ہی تو باس نے مجھے جزیرے پر بھیجا تھا۔"

"اوہ، تو یہ بات تھی ۔۔۔ اسی لیے وہ لوگ سمندر میں کود کر جہاز کے نیچے کوئی کارروائی کرنے میں مصروف تھے۔ وہ تو اگر ابا جان ان سے نہ ٹکرا جاتے تو آپ کا نائب جہاز لے گیا تھا۔"

---

[1] بھوانی کے مجرم اور اونچی مہم پڑھیے۔

"خیر، لے جانے تو ہم پھر بھی نہ دیتے۔ ہمیں اس کے پروگرام کا علم ذرا دیر سے ہوا تھا، لیکن میں حیران ہوں، تم یہاں کس طرح پہنچ گئے؟"

"کیا آپ لوگوں کو معلوم نہیں، اس طرف بھی اوپر کی دنیا سے یہاں تک آنے کا راستہ موجود ہے۔" آصف حیران ہو کر بولا۔

"ہاں، معلوم ہے ۔۔۔ بھلا معلوم کیوں نہیں ہو گا۔"

"ہاں تو پھر ہم اسی راستے سے ہی آئے ہیں۔"

"لیکن وہ راستہ تو گھانسی جیسوں کے لیے ہے۔ شاید آپ لوگ آب دوز تک پہنچ گئے ہوں گے۔"

"یہی بات ہے ۔۔۔ پھر آپ لوگوں نے اس طرف سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی ۔۔۔ اور یہی کیا، آپ کے لیے تو آزادی حاصل کرنے کا بہترین موقع تھا، آپ اس جزیرے پر سے آسانی سے فرار ہو سکتے تھے۔"

"یہی تو تمہاری بھول ہے۔" ڈی سائٹ یا شوبرا مسکرایا۔

"کیا مطلب؟" فاروق چونک کر بولا۔

"ہم سب باس کے غلام ہیں۔ اپنی مرضی سے نہیں، مجبوری سے ۔۔۔ ورنہ لی کاف جیسے لوگ اپنی مرضی سے غلام بن سکتے ہیں، نہیں، ہرگز نہیں ۔۔۔ ہم تو دراصل باس کے بھی نہیں، ان گولیوں کے غلام ہیں۔"

"گگ، گوئیوں کے غلام؟" فاروق ہکلایا۔

"ہاں، یہاں سے اوپر والی دنیا میں تو ہم اکثر جاتے رہتے ہیں۔
جاتے ہیں، اپنا کام انجام دیتے ہیں اور پھر آجاتے ہیں۔ اس لیے
کہ ہمیں ایک دن کے لیے صرف ایک گولی ملتی ہے۔ اس گولی کا
اثر ختم ہوتے ہی ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔ ان
حالات میں ہم کریں تو کیا کریں ۔۔ فرار ہونے کا خیال تک دل
میں نہیں لا سکتے۔"

"اوہ، تو یہ بات ہے ۔۔ ارے ہاں، آپ نے کیا کہا تھا،
مسٹر شوبرا ڈی سائٹ، یہ راستہ گھانسی جیسوں کے لیے ہے۔ یہ گھانسی
کون ہے؟"

"ایک ایسا آدمی جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ
وہ بھی باس کا غلام ہو سکتا ہے۔ باس اوپر کی دنیا میں گولیاں اسی
کے ذریعے تقسیم کرتا ہے۔"

"دھت تیرے کی ۔۔ اس کا مطلب آپ لوگ چاہیں تو اس
آب دوز کے ذریعے ساحل پر پہنچ سکتے ہیں۔"

"ہاں، ہم نے شروع میں یہ کام کر بھی دکھایا تھا، لیکن جب
گولیوں کی طلب نے بے قرار کیا اور تکلیف بے تحاشا بڑھ گئی تو ہم
خود ہی اس آب دوز کی طرف دوڑ پڑے ۔۔ وہ خود کار ہے، اس
میں بیٹھ جاؤ، نیچے آجائے گی اور نیچے سے بیٹھ جاؤ، اوپر چلی جائے گی۔"

"تب پھر اس سے پہلے کہ ہم یہاں گولیاں کھانے پر مجبور ہوں،
ہمیں چل دینا چاہیے۔"

"لیکن کیسے؟" ڈی سائٹ مسکرایا۔

"اگر آب دوز خود کار ہے تو اوپر سے اسے نیچے بھی بلایا
جا سکتا ہے۔" محمود نے فوراً کہا۔

"اوہ، تم بہت چالاک ہو، لیکن مشکل یہ ہے کہ میں باس
کا غلام ہوں۔ تم لوگوں کو اس طرح جانے کی اجازت نہیں دے
سکتا۔" ڈی سائٹ نے کہا۔

"ارے، تمہاری تو ایسی کی تیسی۔ آؤ دوستو، خیریت اسی میں
ہے کہ ہم اوپر پہنچ جائیں ۔۔ اگر باس کے قیدی بن گئے تو پھر کبھی
آزادی حاصل نہیں کر سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے، دوڑو۔" آصف چلایا۔

وہ بلا کی تیزی سے مڑے اور اسی سمت میں دوڑ پڑے،
جس سمت سے آئے تھے۔ یہ دیکھ کر ڈی سائٹ چلا اٹھا۔

"خبردار، ٹھہرو۔"

لیکن انہوں نے جیسے سنا ہی نہیں، بدستور دوڑتے چلے گئے۔
ادھر ڈی سائٹ نے جب یہ دیکھا کہ کسی طرح رک ہی نہیں رہے
ہیں، ایک چنگھاڑ ماری اور ان کے پیچھے دوڑ پڑا ۔۔ جلد ہی انہوں
نے اپنے پیچھے کچھ اور لوگوں کو بھی آتے دیکھا۔ شاید ڈی سائٹ کے

چھلانگ مارنے کا یہی مطلب تھا کہ دوسرے بھی اس کے ساتھ شامل ہو جائیں۔"

"سر پر پاؤں رکھ کر دوڑو، ورنہ یہ لوگ ہمیں آلیں گے۔" آفتاب نے بلند آواز میں کہا۔

"سر پر پیر رکھ کر ہم کس طرح دوڑ سکتے ہیں، تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔" آفتاب جھلا کر بولا۔

"خدا کے لیے، اس وقت اپنی باتوں کا دفتر نہ کھولنا۔ ہم بہت خطرناک صورتِ حال سے دوچار ہیں۔" فرزانہ جھلا اٹھی۔

بلا کی رفتار سے دوڑتے ہوئے وہ وہیل کے منہ تک پہنچ گئے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو دشمن کافی فاصلے پر نظر آئے، لیکن وہ بھی طوفانی رفتار سے دوڑے آرہے تھے۔

"جلدی کرو، اس وہیل کے منہ کا جائزہ شروع کرو۔ اس میں کوئی بٹن ایسا لگا ہوگا، جس سے آبدوز نیچے آجائے گی۔"

"ہاں، لیکن وہ اتنی جلدی تو نیچے نہیں آجائے گی۔ آنے میں اتنا ہی وقت لے گی، جتنے وقت میں ہم نیچے پہنچے ہیں۔" شوکی ہکلایا۔

"اوہ ہاں، تب پھر ہم کیا کریں؟"

"ہم غلطی کر بیٹھے ہیں، اس وقت دوڑ پڑنے کی ضرورت نہیں

تھی۔ شوبرا ادھر ادھر ہو جاتا تو آجاتے۔" محمود بولا۔

"اب تو غلطی ہو گئی۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔"

انہوں نے وہیل کے منہ پر ہاتھ پھیرنا شروع کیے۔ وہ مصنوعی وہیل تھی، لیکن بالکل حقیقی نظر آتی تھی۔ اچانک شوکی کا ہاتھ ایک بٹن سے ٹکرا گیا۔

"یہ رہا بٹن۔" وہ چلا اٹھا۔

"تو پھر دبا دو اسے۔ ہم ان لوگوں سے مقابلہ کرتے رہیں گے اور آبدوز میں سوار ہونے کی کوشش بھی کرتے رہیں گے۔"

"مشکل ہے، ڈبی سائٹ کے ساتھ آنے والے لوگ معمولی نہیں ہیں۔ لی کاف، آرٹی بناشا، انوراکا اور گماٹا جیسے مجرم چھائے رہے ہیں۔" فاروق نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"اوہو اچھا۔"

"اور سونے پر سہاگا یہ کہ یہ بٹن تو دب ہی نہیں رہا، معمولی سی حرکت ضرور کرتا ہے۔"

"چلو پھر تو سارا معاملہ ہی ٹھیک ہو گیا۔" مکھن نے منہ بنایا۔

اب انہوں نے اپنے رخ لی کاف وغیرہ کی طرف کر لیے اور خوف زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگے۔ جونہی وہ نزدیک پہنچے، فاروق ہکلایا۔

"آ۔ آپ لوگوں کے ارادے تو نیک ہیں؟"

"ہم تمہیں فرار نہیں ہونے دیں گے۔" شوبرا غرایا۔

"ہمارا دماغ نہیں چل گیا کہ یہاں سے فرار ہو جائیں۔ بھلا اتنی دل پسند اور حسین دنیا سے بھی کوئی فرار ہوا کرتا ہے۔ وحشت تیرے کی۔" محمود نے جھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

" تو پھر ادھر بھاگ کر کس لیے آئے ہو۔" انوراکا نے منہ بنایا۔

"ہم تو ذرا یہ دیکھ رہے تھے کہ آپ لوگ بھاگنے میں کس قدر ماہر ہیں۔" اشفاق نے فوراً کہا اور دوسرے مسکرا دیے۔

"تو پھر کس نتیجے پر پہنچے۔" لی کاف نے منہ بنایا۔

"یہ کہ تم لوگ بھی ہم سے کچھ کم نہیں ہو۔"

"تمہارے بڑے تمہارے ساتھ نظر نہیں آرہے۔" لی کاف نے کہا۔

"وہ اوپر رہ گئے۔ کاش، وہ بھی ہمارے ساتھ ہوتے۔"

"ہاں واقعی، پھر تو خوب لطف رہتا۔" لی کاف ہنسا۔

"کس قسم کا لطف رہتا مسٹر لی کاف۔" فاروق نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہم ذرا اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے۔ تم تو بچے ہو۔ تم سے دو دو ہاتھ کرکے کیا خاک لطف آئے گا۔"

"تو کیا اس دنیا کے باس آپ کو دو دو ہاتھ کرنے کی

اجازت دے دے گا۔"

"ہاں، وہ تو بہت شوقین ہیں ایسے مقابلوں کے۔"

"اوہو، اچھا۔ تب تو آپ کے اور ہمارے درمیان مقابلہ ہو ہی جائے۔ چلیے، آپ کسی حد تک بھڑاس نکال لیجیے گا۔" فاروق بولا۔

عین اسی وقت کھٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک کر مڑے اور پھر سبھی نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔

کیا مطلب؟

انہوں نے دیکھا — وہیل کا منہ کھل گیا تھا اور اس میں آکر رکنے والی اسی آبدوز کا ڈھکنا اوپر اٹھ گیا تھا اور اس میں سے انسپکٹر جمشید وغیرہ اتر رہے تھے۔ اگرچہ ان کی آنکھوں میں بھی حیرت کے بے پناہ آثار تھے، یہ منظر دیکھ کر فاروق پوری قوت سے چلا اٹھا:

"وہ مارا، اب آئے گا مزا — اب دل کی بھڑاس نکالنے کے خوب موقعے ملیں گے ہر کسی کو۔"

لی کاف اور اس کے ساتھیوں نے بھی سب کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔

"یہ — یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں مسٹر لی کاف۔" انوراکا کی آواز ابھری۔

"میں خود حیران ہوں — آخر یہ لوگ اس قدر آسانی سے یہاں کس طرح پہنچ گئے — اگر یہی حال رہا تو ہر کوئی یہاں آنا شروع

کر دے گا۔" لی کاف بولا۔

"باس کی باتیں ہماری سمجھ میں آ بھی کیسے سکتی ہیں۔" آرٹی نباشا بولا —

"لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، ان لوگوں کا یہاں آنا باس کی مرضی سے نہیں ہوا۔" انوراکا بولا۔

"غلط کہتے ہو۔" ڈی سائٹ نے بھنا کر کہا۔

"کیا مطلب؟" انوراکا غرایا۔

"باس کی مرضی کے بغیر ان کی اس دنیا میں بھلا کوئی کس طرح قدم رکھ سکتا ہے — یہ لوگ اگر یہاں نظر آ رہے ہیں تو اس میں باس کی مرضی شامل ہے۔" ڈی سائٹ نے کہا۔

"ہوں، شاید ایسا ہی ہے — مشکل یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں۔"

"مقابلہ، دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے۔" فاروق بول اٹھا۔

"لی کاف، تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں — یہ لوگ میری مرضی سے ہی یہاں آئے ہیں۔ میں نے اسی لیے ان میں سے چھوٹی پارٹی کو اوپر بھیج دیا تھا، تاکہ یہ اپنے بڑوں کو بھی ساتھ لائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آب دوز کو انہوں نے چٹانوں کے درمیان دیکھ لیا — اگر میری مرضی نہ ہوتی تو ان کے فرشتے بھی یہاں تک نہ پہنچ سکتے — جب چھوٹی پارٹی نیچے لائی گئی

تھی۔ اس وقت میں نے تم لوگوں کی اور ان کی باتیں سنی تھیں۔
اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ان سب کو ہی یہاں ہونا چاہیے؛
چنانچہ یہ یہاں نظر آ رہے ہیں۔" باس کی سرسراتی آواز ان
کے کانوں میں گونج اُٹھی۔

"لیکن باس، یہ لوگ ....." لی کاف کہتے کہتے رک گیا۔

"کہو کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہ لوگ بہت خطرناک ہیں — جب تک انہیں گولیوں کے
ذریعے غلام نہ بنا لیا جائے، اس وقت تک ان سے کوئی کام نہیں
لیا جا سکتا۔"

"پروا نہ کرو، مجھے ان سے کام لینے کی جلدی نہیں ہے۔ میری
قوم ہر قسم کا کام تیزی سے کر رہی ہے اور بہت جلد ہم اپنے عظیم
منصوبے پر کام شروع کر دیں گے اور تم لوگ دیکھو گے کہ کایا کس
طرح پلٹتی ہے۔ یہ لوگ کب تک بھوک برداشت کر لیں گے۔ زیادہ
سے زیادہ چوبیس گھنٹے گزار لیں گے۔ اس کے بعد بھوک انہیں اس
طرح ستائے گی کہ گولی کھاتے ہی بن پڑے گی، لہذا یہ بھی میرے
غلاموں کی صف میں شامل ہو جائیں گے، جس طرح تم ہو گئے تھے۔"

"ہوں، پھر تو ٹھیک ہے باس، لیکن ان کے بارے میں ہدایات
کیا ہیں؟" لی کاف نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"بھئی، یہ ہمارے مہمان رہیں اور کیا۔" باس کی ہنسی کی آواز

سنائی دی اور انسپکٹر جمشید کی پیشانی پر بل پڑ گئے — ان کی آنکھوں
میں چونک جانے والے آثار تھے — یہ بات محمود، فاروق، فرزانہ
نے بالکل صاف طور پر محسوس کی۔

"میں — بھلا میں کیا چاہ سکتا ہوں — چاہنے کا حق تو یہاں
صرف آپ کو ہے باس، جو آپ فرمائیں کیا جائے۔"

"نہیں لی کاف، تم میرے پسندیدہ غلام ہو، لہذا میں تمہاری
خواہشات کا احترام ضرور کروں گا — بولو، تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں اور میرے ساتھی ان سب سے جنگ کرنا پسند کریں گے۔
ہم نے اپنی دنیا میں ان کے ہاتھوں کئی بار شکست کا منہ دیکھا ہے۔
ہم ان تمام شکستوں کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔"

"تم لوگوں کو اس مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے — قیدی
دنیا کے تمام لوگ یہ مقابلہ دیکھ سکتے ہیں، لیکن میں اپنی قوم کو
یہ تماشا نہیں دکھا سکتا۔ اس کا دودھیا دیوار کے اس طرف آنا
مناسب نہیں، اس سے کئی الجھنیں پیدا ہوں گی؛ تاہم یہ مقابلہ میں
ضرور دیکھوں گا۔"

"لیکن باس، اس مقابلے کا کوئی انعام بھی تو ہونا چاہیے۔"
لی کاف بولا۔

"ٹھیک ہے، تم جو انعام چاہو گے، مل جائے گا۔" باس بولا۔

"نہیں باس، انعام پہلے ہی طے ہو جانا چاہیے۔" لی کاف نے

بے چینی کے عالم میں کہا۔

"چلو ٹھیک ہے، جیتنے کی صورت میں تم کیا انعام پسند کرو گے۔"

"جب سے یہاں آیا ہوں، مجھے میری خوراک نہیں ملی ۔ میں بہت بے تاب ہوں۔"

"تمہاری خوراک، کیا مطلب ؟"

"میرا مطلب سانپوں سے ہے ۔ آپ مجھے اجازت دے دیں گے کہ میں سانپوں کے اکھاڑے میں سے چند سانپ روزانہ کھا لیا کروں، یہی میری خوراک ہے۔"

"یہ ۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو ؟" دوسری طرف سے حیرت بھرے انداز میں کہا گیا۔

"شاید آپ کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا۔" لی کاف بولا۔

"ہاں، میں نہیں جانتا کہ سانپ تمہاری خوراک ہیں، کمال ہے۔"

"میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا باس ۔" لی کاف نے گڑگڑا کر کہا اور وہ حیران رہ گئے ۔۔ لی کاف جیسا بڑا جاسوس بچوں کی طرح گڑگڑا رہا تھا ۔۔

"لیکن لی کاف، اگر میں نے تمہیں سانپ کھانے کی اجازت دے دی تو تم تو ان سب کو کھا جاؤ گے، پھر میں غداروں اور نافرمانوں کو سزا کس طرح دیا کروں گا ۔ سفید گولیاں کس طرح بنا کریں

گی۔" باس کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔ پھر بولا

"یہ سفید گولیاں ایک خاص قسم کے سانپ کے زہر سے بنتی ہیں ۔۔ اس سانپ کا زہر آدمی کو ہلاک نہیں کرتا، لیکن اسے اپنا عادی ضرور بنا لیتا ہے، ایسا عادی کہ پھر اسے استعمال کیے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ دوسری طرف ہمارے پاس سمندری سانپوں کی ایک قسم ہے، اس کا زہر آدمیوں کو ہلاک کرنے کے کام میں لاتے ہیں اور زہریلی سوئیاں اسی زہر میں ڈوبی ہوئی ہیں ۔۔ ایک یہ بات بھی معلوم کی گئی ہے کہ ہلاک کر دینے والے زہر کا اثر ان پر نہیں ہوتا، جو دوسرے سانپوں کا زہر استعمال کر لیتے ہیں، یعنی میرے غلام جو سفید گولیاں کھاتے ہیں، انہیں اگر زہریلی سوئی سے ہلاک کرنے کی کوشش کی جائے تو ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ہاں تو باس، بات ہو رہی تھی میری خوراک کی۔"

"سوری، لی کاف، میں تمہیں یہ اجازت نہیں دے سکتا، کیونکہ اس طرح سانپ ختم ہو جائیں گے اور میرے غلام، غلام نہیں رہیں گے۔ کہیں تمہارا منصوبہ یہی تو نہیں ہے۔" باس نے چونکی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہرگز نہیں باس، میں تو سوچ بھی نہیں سکتا ایسی بات۔" لی کاف نے فوراً کہا اور یہ کہتے وقت ایک رنگ اس کے چہرے

پر آ کر گزر گیا — انسپکٹر کامران مرزا نے اس بات کو بھانپ لیا چنانچہ فوراً ہی بولے:

"جھوٹ نہ بولو مسٹر لی کاف، تمہارا منصوبہ یہی تھا۔"

"میرے خلاف باس کو بھڑکانے کا ارادہ ہے شاید، لیکن تم کیا جانو، باس ایسی باتوں سے بھڑکنے والے نہیں — کیوں باس، میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔"

"ہاں، ٹھیک ہے، لیکن لی کاف، یاد رکھو۔ ایسی کوئی بات سوچنا بھی نہیں ورنہ تکلیف اٹھاؤ گے۔" دوسری طرف سے غصیلے لہجے میں کہا گیا —

لی کاف کانپ کر رہ گیا۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے انسپکٹر کامران مرزا کو دیکھا، لیکن کچھ نہ کہہ سکا۔

"بہر حال، میں تمہاری اس خوراک کا بندوبست نہیں کر سکتا — تمہیں وہی کچھ کھانا ہوگا جو سب کھاتے ہیں۔"

"او کے باس۔" لی کاف نے جھک کر کہا۔

"مقابلہ اسی میدان میں ہوگا — دوسرے قیدیوں کو بھی یہیں بھیج رہا ہوں، تاکہ سب لطف اندوز ہو سکیں۔"

"شکریہ باس۔"

"آتے ہی مقابلے شروع ہو گئے۔ ہمیں کچھ دیر تو آرام کرنے کی مہلت ملنی چاہیے تھی۔" آفتاب نے منہ بنا کر کہا۔

"یہاں تمہاری نہیں، باس کی حکومت ہے۔" آرٹی بناشا نے بھنا کر کہا۔

"اور باس کا منصوبہ کیا ہے۔" شوکی بول اٹھا۔

"پہلے مقابلہ، پھر کوئی دوسری بات۔" باس نے بلند آواز میں کہا۔

"اُف، ارے۔" فاروق اسی وقت پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا؟" محمود نے گھبرا کر کہا۔

"بھبھ — بھو۔" فاروق کے منہ سے نکلا۔ آنکھوں میں خوف دوڑ گیا —

"بھبھ — بھو کیا؟" انسپکٹر کامران نے پریشان ہو کر کہا۔

"کہیں تم نے کوئی بھوت تو نہیں دیکھ لیا۔" فرحت نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"تم ایک بھوت کی بات کر رہے ہو، یہاں تو ہر طرف بھوت ہی بھوت ہیں۔" مکھن منہ بنا کر بولا۔

"کیا مطلب، کیا تم ہمیں بھوت کہہ رہے ہو؟" انورکا چیخا۔

"نن، نہیں تو — میں نے یہ اعزاز آپ کو تو نہیں دیا۔" مکھن کانپ اٹھا۔

"فاروق، تم نے بتایا نہیں، کیا معاملہ ہے؟"

"بھوک، مجھے اچانک شدت کی بھوک محسوس ہونے لگی ہے۔"

"یہ تو تمہاری پرانی عادت ہے، جب دیکھیں، شدت کی بھوک لگی ہے۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"لیکن یہ بھوک اس جیسی نہیں، یہ بہت عجیب سی بھوک ہے۔" فاروق بولا۔

"لیجیے، اب بھوک بھی عجیب و غریب ہونے لگی۔" آفتاب نے منہ بنایا اور پھر خود بھی چیخ پڑا۔

"ارے، یہ کیا؟"

"اب تمہیں کیا ہوا؟"

"مم، مجھے بھی شدید بھوک لگ گئی ہے۔" آفتاب نے بوکھلا کر کہا۔

"وہ مارا، اب آئے گا مزا۔ اب آئے گا میری بات پر سب کو یقین۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"نن، نہیں۔ یہ۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟" مکھن چلا اٹھا۔

"تت، تمہیں کیا ہوا مکھن؟" شوکی گڑبڑا کر بولا۔

"مم، میں بھی ان میں شامل ہو گیا ہوں۔ آنتوں نے اچانک قل ھو اللہ احد پڑھنا شروع کر دیا ہے۔"

"کمال ہے، اچانک تم لوگوں کو بھوک کا دورہ کیوں پڑ گیا؟"

"یہ اس دنیا کی آب و ہوا کی برکت ہے۔" لی کاف مسکرایا۔

اور پھر تو ان سبھی نے پیٹ پکڑ لیے۔

"کیوں بھئی، اب کیا ہے۔ تم نے بیٹھنا کیوں شروع کر دیا۔ کہیں مقابلے سے ڈر کر بھوک لگنے کا بہانہ تو نہیں بنا رہے۔"

"مقابلے کی ایسی کی تیسی، جتنے جی چاہو، کر لو، لیکن ہم اس بھوک کا کیا کریں۔" فاروق بھنا کر بولا۔

"بھوک کا انتظام تو بس ہاس ہی کر سکتے ہیں۔ تمہارے اشارے کی دیر ہے۔ تمہاری بھوک اڑنچھو ہو جائے گی۔"

"گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ پہلے ہم سفید گولیاں کھائیں۔ اس کے بعد ہمیں کھانا دیا جائے گا اور اس کے بعد ہم تم لوگوں سے مقابلہ کریں گے۔ کیوں یہی بات ہے نا۔"

"بالکل، کیا خیال ہے؟" لی کاف مسکرایا۔

"پھر ابا جان، ہم کیا کریں؟" فاروق بولا۔

"بات یہ ہے فاروق، بھوک صرف تمہی کو نہیں۔ سب کو لگی ہوئی ہے۔ سب کا برا حال ہے، لیکن سفید گولیاں کھانا اپنی شکست تسلیم کرنے کے برابر ہے۔ کم از کم میں تو سفید گولی نہیں کھاؤں گا۔ مرنا پسند کروں گا، لیکن غلامی نہیں۔" انسپکٹر جمشید روانی کے عالم میں کہتے چلے گئے۔

"اور نہ میں کھاؤں گا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"یہ بات ہے تو پھر ہم میں سے کوئی بھی نہیں کھائے گا۔" خان رحمان نے گویا اعلان کیا۔

"تو پھر مقابلہ شروع کرو۔" باس کی آواز گونجی۔

"کیا مطلب، ہم بھوک سے مرے جا رہے ہیں۔ ایسے میں مقابلہ کیا خاک کریں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا چلّائے۔

"خیر نہ کرو مقابلہ ۔۔ لی کات، تم اور تمہارے ساتھی مل کر ان لوگوں کو مارو ۔۔ اتنا مارو، اتنا مارو کہ یہ میرے سامنے رحم کی درخواست کرنے لگیں ۔۔ اس طرح تمہارے دلوں کی بھڑاس بھی پوری ہو جائے گی۔"

"شکریہ باس، میں اپنے ہاتھوں پر دستانے چڑھا لوں، ورنہ میرے ہاتھوں سے تو کسی کو خراش آنے کی دیر ہے، وہ ویسے ہی مر جائے گا اور اس طرح ہمیں ذرا بھی لطف نہیں آئے گا۔"

"میں سمجھتا ہوں، یہ انصاف نہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید چلّا کر بولے۔

"کیا مطلب، کیسے انصاف نہیں ہے۔"

"برابر کا مقابلہ صرف اس وقت ہو سکتا ہے، جب ہم بھوکے نہ ہوں ۔۔ پہلے ہمیں کھانا دیا جائے اور اس کے بعد مقابلہ کرایا جائے۔" انہوں نے مطالبہ کیا۔

"پہلے ہی بتایا جا چکا ہے ۔۔ تم اپنے ملک میں نہیں ہو۔ نہ دنیا کے تختے پر کہیں موجود ہو ۔۔ یہ دنیا تو سمندر سے نیچے ایک اور دنیا ہے۔ زمین سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور یہاں میری حکومت ہے ۔۔ اگرچہ میں نے یہاں اپنی مدد کے لیے تمہاری سرزمین کے

آدمی جمع کر رکھے ہیں۔ وہ بھی اس لیے کہ میں اپنی قوم سے کام لے کر تمہاری دنیا کو چونکانا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ میری قوم کے لوگوں کو دیکھ کر ہر طرف سنسنی پھیل جاتی اور دنیا بھر کے سائنس دان اور دوسرے ماہرین ہماری طرف متوجہ ہو جاتے، لہذا میں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ تمہاری دنیا کے لوگوں کو ہی اپنا بنایا جائے، چنانچہ میں نے اپنا ایک نائب اوپر بھیجا ۔۔ اس نے حالات کا جائزہ لیا۔ اسی طرح مجھے کئی نائب بھیجنا پڑے ۔۔ اڑن طشتری قسم کی چیزیں یہاں سے لے کر وہ اوپر جاتے رہے ۔۔ دنیا کے حالات کی اطلاعات لا کر مجھے دیتے رہے۔ اس طرح ایک عرصہ گزر گیا اور میں نے جان لیا کہ کون کون لوگ میرے کام کے ہیں اور وہ کہاں کہاں موجود ہیں، پھر میں نے ان لوگوں کو یہاں جمع کرنا شروع کیا۔ منصوبے کے دوسرے حصوں پر بھی کام ہوتا رہا ۔۔ اب ہم اس پوزیشن میں آ گئے ہیں کہ اصل کام شروع کر دیا ہے، لہذا یہ بات ذہن میں رکھو کہ یہ میری دنیا ہے، یہاں میری مرضی چلتی ہے۔ میرا حکم مانا جاتا ہے۔ مجھے تمہاری ذرا بھر پروا نہیں۔ تم مر بھی جاؤ تو کیا میرے کام رکے رہ جائیں گے، ہرگز نہیں، میرا کام جاری رہے گا۔ تم اس حالت میں اگر لڑ نہیں سکتے تو نہ لڑو۔ مار تو کھا سکتے ہو، لہذا مار سے ہی پیٹ بھرو۔ یہ لوگ تمہیں ماریں گے اور ضرور ماریں گے۔"

وہ دھک سے رہ گئے۔ آنکھوں میں خوف پھیل گیا، کیونکہ اسی

وقت انہوں نے آبادی والے حصے کی طرف سے اور بھی بہت سے لوگوں کو آتے دیکھا تھا۔ صاف ظاہر ہے، یہ لوگ بھی عام لوگ نہیں تھے — یہاں خاص خاص آدمی ہی جمع کیے گئے تھے؛ گویا یہ لوگ بھی اس کارروائی میں شرکت کے لیے آ رہے تھے جو ابھی شروع ہونے والی تھی، یعنی مار کی کارروائی —

ایسے میں انہوں نے محسوس کیا۔ وہ سب کے سب اس وقت بالکل بے بس ہیں۔ اپنے بچاؤ کے لیے کوئی خاص کام نہیں کر سکتے۔

"یہ — یہ کیا ہو رہا ہے ابا جان، کیا ہم واقعی کوئی بہت طویل اور خوف ناک ترین خواب دیکھ رہے ہیں۔" آفتاب بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں تو ایسا نہیں سمجھتا — ہاں، ایک بات ضرور جانتا ہوں۔" انسپکٹر کامران مرزا پرسکون آواز میں بولے — چہرے پر مسکراہٹ بھی تھی —

"اور وہ کیا؟"

"یہ کہ یہ دوسری دنیا ہو یا تیسری، ہماری زمین سے اس دنیا کا کوئی تعلق ہو یا نہ ہو، لیکن اس پوری کائنات کا مالک ایک خدا ہی ہے، جو کچھ زمینوں اور آسمانوں میں ہے، سب کچھ اسی کا ہے اور اس کا حکم ہر طرف چلتا ہے، ان حالات میں میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں مایوس ہو جانا چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک، مایوسی گناہ ہے — اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی ہمارے پیٹ بھرے گا اور ان لوگوں سے مقابلے کے لیے طاقت عطا فرمائے گا۔" منور علی خان بول پڑے۔

"اور مزے کی بات یہ ہے جمشید کہ مجھے بھوک محسوس نہیں ہو رہی۔" ایسے میں پروفیسر داؤد کے جملے نے ان سب کو چونکا دیا۔ انہوں نے یہ جملہ دبی آواز میں کہا تھا، لی کاف اور اس کے ساتھی کافی فاصلے پر تھے —

"جی کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید حیرت زدہ انداز میں بولے۔

جنگ کا آغاز

"ہاں، بالکل یہی بات ہے — کم از کم میں نے ابھی تک خاص بھوک محسوس نہیں کی، نہ جانے اس کی کیا وجہ ہے، بلکہ میں تو اپنے آپ کو بالکل تروتازہ محسوس کر رہا ہوں۔"

"یہ — یہ کیسے ممکن ہے، پھر ہم سب کو اچانک بھوک کیوں ستانے لگی ہے — پہلے تو ہم بھوک کے ہاتھوں اتنا پریشان کبھی نہیں ہوئے تھے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"میں غور کر رہا ہوں کامران مرزا، آپ لوگ انھیں باتوں میں الجھائے رکھیے، شاید میں کوئی بات سمجھ جاؤں۔" انھوں نے دبی آواز میں کہا۔

"یہ لوگ کیا کھسر پھسر کر رہے ہیں باس؟" لی کاف نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"میں ان کی آواز بخوبی سُن رہا ہوں، فکر نہ کرو — ان میں سے ایک شخص ایسا بھی ہے، جس نے اب تک بھوک محسوس نہیں کی

اور لی کاف، یہ بات میرے لیے بھی حیران کن ہے۔"

"جی، کیا مطلب؟" لی کاف اچھل پڑا۔

"ہاں، بھوک تو ان سب کو یکساں لگنی چاہیے تھی، پھر اسے کیوں نہ لگی — یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی — یہاں کی آب و ہوا ایسی ہے کہ جب بھی کوئی اوپر سے آتا ہے، فوری طور پر بھوک محسوس کرنے لگتا ہے۔ تم لوگوں کا حال بھی یہی ہوا تھا، پھر کیا یہ شخص کسی اور ہی دنیا کا ہے۔"

"آپ کس کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟" الوراکا حیران ہو کر بولا۔

"وہ جو ان سب میں بوڑھا ہے۔"

"اوہ، یہ پروفیسر داؤد ہیں — ان کے ملک کے سب سے بڑے سائنسدان۔" لی کاف بولا۔

"لیکن سوال تو یہ ہے کہ اسے بھوک کیوں نہیں لگی۔ سائنسدان ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ انھوں نے اس دنیا میں اب تک سانس نہیں لیا۔"

"ہم خود بھی حیران ہیں باس۔"

"حیران تو خیر یہ لوگ بھی ہیں اور میں بھی، بہرحال اس شخص کو ان سے الگ کر دو، اسے ایک خاص مکان میں بند کر دو اور اس کا دروازہ بند کر دو، تاکہ یہ لوگ ان سے رابطہ قائم نہ کر سکیں —

کہیں یہ بھوک کا کوئی توڑ معلوم نہ کرلیں، جو مجھے بھی معلوم نہیں۔"

"او کے سر، یہ کام اسی وقت شروع کیا جاتا ہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی لی کاف پروفیسر داؤد کی طرف بڑھا۔ وہ گھبرا گئے۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید چلا کر بولے:

"محمود، آصف ۔۔۔ پروفیسر صاحب کو یہاں سے دور کھینچ لے جاؤ۔ جہاں رک کر یہ بھوک نہ لگنے کا راز جاننے کی کوشش کرسکیں۔ ہم ان لوگوں کو روکتے ہیں۔"

"ل، لیکن کیسے روکیں گے؟" محمود ہکلایا۔

"یہ وقت باتوں کا نہیں محمود۔" فاروق چیخا ۔۔۔ اس وقت تک لی کاف کئی قدم اٹھا چکا تھا۔

محمود اور آصف نے پروفیسر داؤد کے ہاتھ تھامے اور کنی کترا کر نکلتے چلے گئے۔ اس وقت تک باقی قیدی یا غلام بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ لی کاف چلا اٹھا

"خبردار، ان لوگوں کو فوری طور پر الگ الگ کرنا ہے۔ اس بوڑھے کو الگ کھینچ لے جاؤ۔" لی کاف غرایا اور ساتھ ہی اس نے انسپکٹر جمشید پر چھلانگ لگا دی ۔۔۔ وہ اگر پہلے ہی ہوشیار نہ ہوتے تو یقیناً اس کی لپیٹ میں آ گئے تھے، کیونکہ چھلانگ انتہائی پھرتی سے لگائی گئی تھی۔ لی کاف منہ کے بل گرا، لیکن اس نے بھی اٹھنے میں دیر نہ لگائی ۔۔۔ مشکل یہ تھی کہ ان میں سے کوئی بھی اس پر وار نہیں

کرسکتا تھا۔ وار کی صورت میں جسم پر خراش آسکتی تھی اور اس خراش سے لی کاف کا جسم رگڑ کھا جاتا تو اس کے جسم کا زہر اثر کرسکتا تھا۔۔۔

ادھر انسپکٹر کامران مرزا کی طرف انورا کا، آرٹی بناشا اور ڈی سائٹ ایک ساتھ جھپٹ پڑے ۔۔۔ ایسے میں فاروق چیخا:

"آفتاب، ترکیب نمبر ۲۔"

"ترکیب نمبر ۲ ۔۔۔ وہ کیا؟" شوکی نے حیران ہو کر کہا۔

"الگ الگ بکھر جاؤ، دور دور تک پھیل جاؤ ۔۔۔ دو دو یا تین تین میں ۔۔۔ اس صورت میں ان کا مقابلہ ہوسکتا ہے۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا اور آصف کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو ہٹتا چلا گیا۔

جو لوگ ان کی طرف بڑھ رہے تھے، وہ بھی ادھر ادھر تقسیم ہونے پر مجبور ہو گئے۔ فاروق اور آفتاب بھاگتے بھاگتے بے دم ہو گئے تو اچانک ایک درخت کے پیچھے رک گئے ۔۔۔ ایک دیو قامت آدمی ان کے تعاقب میں تھا۔ انہیں بے دم ہو کر رکتے دیکھا تو وحشیانہ انداز میں ہنسا۔

"کیوں تھک گئے؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"ہاں، اس لیے کہ ہم بھوک سے نڈھال ہیں ۔۔۔ تمہارے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے؟" آفتاب تھکی تھکی آواز میں بولا۔

"کھانے کے لیے صرف کھانے کے وقت کچھ ہوتا ہے — لو، میرے مکے کھاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے اندھا دھند انداز میں ان پر چھلانگ لگائی۔ دونوں جلدی سے دائیں بائیں ہو گئے — دیو قامت آدمی کا سر درخت سے ٹکرا گیا — اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ ڈھیر ہو گیا —

"ارے بھئی، بس، نکل گیا دم خم۔" آفتاب نے اس کے سر پر جوتے کی نوک پورے زور سے مارتے ہوئے کہا۔

"بھول میں مار کھا گیا بے چارہ — سمجھا تھا کہ ہم تو یوں ہی بھوک سے مر رہے ہیں، ادھر ادھر کیا خاک ہو سکیں گے۔" فاروق نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کی پسلیوں میں ایک ٹھوکر رسید کی۔ انھیں خوف تھا کہ کہیں وہ پھر ہوش میں نہ آ جائے۔ اس پر تابڑ توڑ وار کر کے وہ مڑے ہی تھے کہ ایک اور بھاری بھرکم دشمن کو آتے دیکھا —

"لو بھئی، ایک اور بھائی صاحب چلے آ رہے ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"شاید اپنے ساتھی کی لاش اٹھانے آ رہے ہیں۔" آفتاب گھبرا کر بولا۔

"لاش، کیا کہہ رہے ہو؟ ابھی یہ مرا کہاں ہے؟"

"نہیں مرا تو مر جائے گا، ایسی کون سی جلدی ہے۔"

اتنے میں بھاری بھرکم آدمی ان پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس کے حملے میں بلا کی تیزی تھی — پہلے تو اس نے دونوں ہاتھوں کے مکے ان پر اچھالے، پھر وار خالی جاتے دیکھ کر ایک اونچی چھلانگ لگائی اور اپنے اندازے کے مطابق ان دونوں پر گرا۔ شاید اس کا ارادہ انھیں اپنے نیچے دبا کر پیس ڈالنے کا تھا، لیکن ہوا یہ کہ وہ سینے کے بل گرا — دونوں نے اس پر چھلانگ لگائی اور اچھلنے کودنے لگے۔ بھاری بھرکم آدمی نے ایک پلٹنی کھائی اور دونوں دھڑام سے گرے۔ غلطی ان کی اپنی تھی — یہ کودنے کا کون سا موقع تھا۔ ابھی وہ بے دم تو ہو نہیں گیا تھا — گرتے ہی وہ انھیں دبا بیٹھا۔ اب ان دونوں کی گردنیں اس کے دونوں بازوؤں میں تھیں اور وہ بازوؤں کا دباؤ بڑھائے چلا جا رہا تھا۔

ایسے میں فرزانہ اور فرحت ایک سمت میں ہٹی ہی تھیں کہ شوکی برادرز کو ایک درخت کے پیچھے سہمے ہوئے انداز میں کھڑے دیکھا۔ سیاہ رنگ کا موٹی موٹی آنکھوں والا ایک خوف ناک آدمی ان کی طرف بڑھ رہا تھا اور وہ حیرت زدہ سے کھڑے تھے۔ شاید سوچ رہے تھے، اب کریں تو کیا کریں۔

"آؤ فرزانہ، ان کی مدد کریں۔" فرحت بولی۔

"ہاں ٹھیک ہے — ہمارے حصے میں کوئی دشمن آیا بھی تو نہیں۔"

انکل خان رحمان، منور علی خان اور اکرام کو اکٹھے تین تین آدمیوں نے گھیر رکھا ہے۔ ادھر انکل کامران مرزا سے انورالکا اور آرٹی بناشا بھڑے ہوئے ہیں۔ ان میں مقابلہ کچھ زیادہ ہی خوف ناک ہو رہا ہے اور ان سے بھی زیادہ خوفناک مقابلہ لی کاف اور ابا جان کے درمیان ہے، اُف۔"

"خالی اُف ہی کرتی رہو گی یا کوئی کام بھی دکھاؤ گی۔ ہمیں سب سے پہلے شوکی برادرز کی ہی مدد کرنا ہوگی۔"

دونوں اس درخت کی طرف بڑھی ہی تھیں کہ مکھن کی چیخ سنائی دی۔

"ارے باپ رے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ انھیں نیچے بیٹھتا نظر آیا اور دشمن کا مکا پورے زور سے درخت سے لگا۔ اس کی چیخ نکل گئی — تلملا کر اس نے دوسرا ہاتھ چلایا — اخلاق نے ایک چھلانگ لگائی اور اس مکے کی زد سے صاف بچ نکلا۔ دشمن کا یہ مکا بھی درخت پر ہی لگا۔ وہ بھنا کر پلٹا اور دایاں ہاتھ شوکی کے منہ پر مارا۔ شوکی بوکھلا کر زمین پر لیٹ گیا اور لڑھکتا ہوا دور نکل گیا۔ اس کا پیر نیم دائرے میں چکر کاٹ کر زمین پر لگا اور وہ بُری طرح لڑکھڑا گیا لیکن پھر سنبھل کر بائیں پاؤں سے اشفاق پر وار کیا۔ اشفاق نے بچنے کی پوری کوشش کی، لیکن پیر اس کی پنڈلی پر لگ ہی گیا، لہٰذا وہ دھڑام سے گرا۔ دشمن فوری طور پر اسے چھاپ بیٹھا۔ اشفاق کو نئی سوجھی، اس

نے دونوں ہاتھوں میں مٹی بھر کر اس کی آنکھوں میں جھونک دی۔ وہ چیخا اور اس پر سے فوراً اتر گیا — یہ دیکھ کر شوکی، اشفاق، مکھن اور اخلاق اس کے چاروں طرف ہو گئے۔ وہ ایک کی طرف بڑھتا تو تین طرف سے اس پر مکے برس پڑتے — یہ دیکھ کر فرزانہ اور فرحت کی ہنسی نکل گئی۔

"بھئی، ان لوگوں نے تو کام دکھا دیا۔ میرا خیال ہے اب انھیں ہماری مدد کی ضرورت نہیں۔ یہ اس سے خود ہی نبٹ لیں گے۔ کیوں شوکی بھائی۔"

"معلوم تو یہی ہوتا ہے۔" شوکی مسکرایا۔

"اوہو فرزانہ، ادھر دیکھو — اُف خدا جلدی کرو۔ ہماری مدد کی ضرورت تو آفتاب اور فاروق کو ہے۔" فرحت نے کانپتی آواز میں کہا — فرزانہ نے بھی اس سمت میں دیکھا اور پھر دونوں دوڑ پڑیں۔ آفتاب اور فاروق ایک بھاری بھرکم آدمی کے شکنجے میں بُری طرح کسے ہوئے تھے — ان کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔

وہ اس بھاری بھرکم آدمی کی کمر پر پہنچیں۔ فرزانہ نے تو اس کے بال دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیے اور لٹک گئی۔ فرحت نے اس کی کمر پر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے ناخن گھونپ دیے۔

اس کے منہ سے دل خراش چیخ نکلی — بازوؤں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی — فاروق اور آفتاب ایک جھٹکے سے اس کے بازوؤں سے

نکل آئے — ساتھ ہی بھاری بھرکم دشمن کو ایک جھٹکا لگا، کیونکہ فرزانہ پورے وزن سے لٹک رہی تھی — اس کا دھڑ نیچے کی طرف مڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے پلٹنی کھائی اور ایسا کرتے ہی دونوں ہاتھوں کے مکے فرزانہ پر اچھال دیے۔ دونوں مکے فرزانہ کے پہلوؤں پر لگے اور بال اس کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ دشمن نے اسی پر بس نہیں کیا، تابڑ توڑ کئی مکے دے مارے اور کچھ اس تیزی سے کہ انھیں سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ شاید دشمن لڑائی بھڑائی میں بہت ماہر تھا — انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ دو اطراف میں ہو جائیں تاکہ وہ ایک وقت میں صرف ایک پر حملہ کر سکے، دوسرے پر نہیں، ورنہ ایک ہی وقت میں دونوں اس کی زد میں آ رہی تھیں؛ چنانچہ موقع ملتے ہی فرحت بھاگ نکلی۔ انداز ایسا تھا، جیسے ڈر کر بھاگی ہو — یہ دیکھ کر بھاری بھرکم آدمی ہنسا اور فرزانہ کی طرف لپکا — ادھر فرحت نے ایک چکر کاٹا اور اس کی کمر پر آ گئی — اب وہ ان کی چال سمجھا، لیکن اس وقت تک فرحت سر کی ٹکر اس کی کمر پر رسید کر چکی تھی — وہ لڑکھڑایا۔ فرزانہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی اور تیزی سے جھکتے ہوئے اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔ وہ پہلے ہی لڑکھڑا رہا تھا — دھڑام سے گرا۔

اس وقت تک آفتاب اور فاروق خود پر قابو پا چکے تھے۔ وہ بھی ان کی طرف آ گئے — خود کو ان چالوں میں گھرا دیکھ کر بھاری بھرکم

دشمن نے آنکھیں بند کر لیں، لیکن اس کے آنکھیں بند کر لینے سے بھلا کیا ہو سکتا تھا — اب اس پر چاروں طرف سے ہاتھ اور پیر برس رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ بے دم ہو گیا۔

"بس کرو" فرزانہ چلائی۔

"کیوں، اسے زندہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"مارنے کا بھی کیا فائدہ — ہاں، باندھ ضرور دینا چاہیے، کہیں یہ حضرت پھر سے لڑنے کے قابل نہ ہو جائیں۔"

انہوں نے اسی کی ٹائی سے اسے باندھ دیا۔ اب جو شوکی برادرز کی طرف دیکھا تو وہ چاروں بھی اپنے مقابل کے چاروں طرف کھڑے نظر آئے۔ وہ مسکراتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔

"کیوں، کیا ہوا؟"

"یہ — یہ بے ہوش ہو گیا ہے" اخلاق نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے — آؤ بھئی، اسے بھی باندھ دیں۔ دو تو گئے کام سے۔"

اسے باندھنے کے بعد ان آٹھوں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں، محمود اور آصف پروفیسر داؤد کو کافی فاصلے پر لے گئے تھے، لیکن اس وقت تک ان کی طرف چار دشمن بڑھ چکے تھے؛ گویا ان دو کو چار سے مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا —

"میرا خیال ہے، محمود اور آصف کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔" آفتاب بولا۔

"ہاں، بلکہ نہیں ــــ انکل خان رحمان اور منور علی خان بھی کافی الجھے ہوئے ہیں۔ ہم میں دو دو کو ان کی مدد کے لیے بڑھنا چاہیے اور باقی چار ان دونوں کی طرف جائیں ــــ" فاروق نے کہا۔

"شوکی بھائی، آپ میرے ساتھ آئیں ــــ ہم انکل خان رحمان کی مدد کریں گے۔" فرزانہ بولی۔

"ٹھ ٹھ .... ٹھیک ہے ــــ"

فرزانہ شوکی کو لے کر خان رحمان کی طرف دوڑ گئی۔

"اور میں مکھن بھائی کو لے کر ابا جان کی مدد کے لیے جاتی ہوں۔" فرحت نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" فاروق بولا۔

"ہم چاروں محمود اور آصف کی طرف جاتے ہیں۔"

یہ فیصلہ ہوتے ہی وہ اپنے اپنے محاذ کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

"محمود، آصف، ہم آ گئے ہیں ــــ گھبرانا نہیں۔" فاروق نے بلند آواز میں کہا۔

محمود نے جوں ہی ان کی طرف دیکھا، اس کی ٹھوڑی پر ایک زور دار مکا لگا۔ اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے۔ لڑکھڑاتے ہوئے اس نے کہا:

"تم خاموشی سے نہیں آ سکتے تھے۔"

اسی وقت دوسرا مکا اس کی طرف آیا ــــ لیکن وہ جھک کر رہ گیا ــــ اتنے میں فاروق دشمن کی کمر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے سر کی ایک ٹکر اس کے دبے ماری۔ دوسرا دشمن اخلاق پر جھپٹا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا اور اس دشمن سے ٹکرا گیا، جس کا وار محمود نے جھکائی دے کر بچایا تھا، نتیجہ یہ کہ دونوں دھڑام سے گرے۔ دوسرے دشمن کے سامنے آفتاب آ گیا ــــ اس نے تیزی سے جھکتے ہوئے اس کے پیٹ میں مکا مارا ــــ ایسے میں فاروق نے چلا کر کہا:

"محمود، یوں کام نہیں چلے گا ــــ درخت پر چڑھ جاؤ۔"

"درخت پر چڑھ جاؤ، دماغ تو نہیں چل گیا۔" آفتاب بولا۔

"نہیں، ابھی نہیں چلا ــــ" فاروق بولا۔

"اوہ سمجھا، تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" محمود نے چونک کر کہا، پھر اپنے مقابل کے سامنے سے بھاگ کھڑا ہوا اور ایک درخت پر چڑھتا چلا گیا ــــ اس کی طرف بڑھنے والے دشمن کے راستے میں اخلاق اور اشفاق آ گئے۔

"آؤ دوستو!" وہ شوخ لہجے میں بولا۔

"کک، کہاں ــــ" اشفاق بوکھلا کر بولا۔

ساتھ ہی اس نے ان پر چھلانگ لگائی۔ وہ گھبرا کر دائیں بائیں ہو گئے اور دشمن منہ کے بل گرا ــــ

"یہ ۔۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں ۔۔" یہ کہتے ہوئے اخلاق نے جھک کر اس کی ایک ٹانگ پکڑ لی ۔۔

"اب تم ادھر چلو ۔۔ میں ادھر ۔۔"

دونوں مخالف سمت میں زور لگانے لگے ۔۔ دشمن کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں ۔۔ فاروق اور آفتاب اب دو دشمنوں کے ساتھ الجھے ہوئے تھے ۔۔ ادھر محمود درخت پر چڑھ کر جوتے کی ایڑی میں سے چاقو نکال کر ایک مضبوط اور لمبی سی شاخ کاٹ رہا تھا۔ شاخ کے کٹتے ہی اس نے پکار کر کہا :

"لو فاروق، اپنی عقل مندی کا انعام ۔۔ تم نے بروقت ترکیب بتائی ۔"

فاروق نے اس کی آواز سنی اور مقابل کے سامنے سے جھک کر نکلتے ہوئے اس درخت تک پہنچ گیا ۔۔ محمود نے فوراً ہی شاخ اس کی طرف پھینک دی ۔۔ فاروق نے شاخ لی اور اسے تلوار کی طرح گھماتا آگے بڑھا ۔۔ محمود اب دوسری شاخ کاٹ رہا تھا ۔۔ جلد ہی اس کی آواز سنائی دی :

"آفتاب، تم بھی آجاؤ ۔"

آفتاب بھی سمجھ چکا تھا، لہٰذا وہ بھی اپنے مقابل کو جھکائی دے کر نکلا چلا گیا ۔

"اب آؤ دوستو۔" فاروق یہ کہتے ہوئے نزدیک پہنچ گیا اور تیزی

سے گھومتی ہوئی شاخ ایک دشمن کے سر پر لگی ۔۔ اتنے میں آفتاب بھی شاخ لے کر لوٹ چکا تھا اور ایک دشمن پر شاخ سے حملہ آور ہو چکا تھا ۔۔ ادھر محمود نے آصف، اشفاق اور اخلاق کو آواز دی :

"تم تینوں بھی ایک ایک شاخ لے لو۔ یہی ہماری تلواریں ہیں ۔"

"محمود، نیچے آنے کی ضرورت نہیں ۔۔" فاروق بلند آواز میں بولا ۔

"کیا مطلب، میں درخت پر رہ کر کیا کروں ؟"

"ہتھیار بناتے رہو ۔۔ ہمارے دوسرے ساتھیوں کو بھی ان ہتھیاروں کی ضرورت ہے ۔۔ ان لوگوں سے ہم نبٹ لیں گے ۔"

"اچھی بات ہے ۔"

ایسے میں محمود کی نظریں پروفیسر داؤد کی طرف اٹھ گئیں ۔ وہ اسے وہاں نظر نہیں آئے، جہاں کھڑے تھے ۔۔ چاروں طرف دیکھا اور پھر شاخیں کاٹنے کا کام جوں کا توں چھوڑ کر درخت پر سے چھلانگ لگا دی ۔ کھلا چاقو اس کے دائیں ہاتھ میں تھا اور بے تحاشا دوڑا جا رہا تھا ۔۔

"کیا ہوا محمود، خیر تو ہے ۔۔ میں نے تو کہا تھا ....." فاروق نے کہنا چاہا، لیکن محمود نے اس کی بات کاٹ دی :

"دشمنوں کے مقابلے میں ڈٹے رہو، میرے پیچھے آنے کی کوشش نہ کرنا ۔"

"ہاں، لیکن ۔۔ لیکن تم جا کہاں رہے ہو؟" فاروق نے پریشان ہو

کر کہا۔

محمود نے کوئی جواب نہ دیا — اب وہ بہت دور جا چکا تھا۔ فاروق نے شاخ گھماتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا، لیکن پروفیسر داؤد اسے کہیں بھی نظر نہ آئے۔ اس کے منہ سے نکلا:

"ارے، پروفیسر داؤد کہاں چلے گئے؟"

سامنے کی بات

"پروفیسر داؤد کہاں چلے گئے —" ان سب کے منہ سے نکلا اور ان کی تلاش کے سلسلے میں جو انھوں نے ادھر ادھر دیکھا تو دشمنوں کے مکے ان کی ٹھوڑیوں پر لگے — وہ بھنا اٹھے — پروفیسر داؤد کا خیال چھوڑ کر ڈٹ گئے — مضبوط شاخوں کی وجہ سے جلد ہی انھیں دشمنوں کے مقابلے میں کامیابی ہوگئی۔

"انہیں اس طرح چھوڑ جانا مناسب نہیں ہوگا۔ باندھ دینا چاہیے۔" فاروق بولا۔

"ہاں ٹھیک ہے، آؤ — یہ تو ہمارا پرانا پیشہ ہے، باندھنے کا۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

اور وہ مسکراتے ہوئے اپنے دشمنوں کو انہی کی ٹائیوں سے باندھنے لگے — اس کام سے فارغ ہوتے ہی انھیں پھر پروفیسر داؤد کا خیال آگیا —

"حیرت ہے، پروفیسر صاحب کہاں چلے گئے؟" اخلاق بولا۔

"اور ان کے علاوہ محمود بھی تو غائب ہے۔" اشفاق نے پریشان آواز میں کہا۔

"محمود کو تو خیر میں نے اس طرف جاتے دیکھا تھا اور مجھے یقین ہے، وہ پروفیسر انکل کے پیچھے ہی گیا ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم کیا کریں۔ پہلے اپنے ساتھیوں کا ہاتھ بٹائیں یا ان کی تلاش میں دوڑ پڑیں۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

"آؤ، بڑوں سے مشورہ کرلیں۔ اس طرح صورتِ حال بھی معلوم ہوجائے گی۔" آفتاب نے کہا۔

"مشورہ نیک ہے، آؤ بڑوں کی طرف چلیں۔"

وہ اپنی اپنی شاخیں لہراتے ہوئے دوسری طرف آئے۔ یہاں گھمسان کی جنگ جاری تھی۔ فرحت اور فرزانہ شوکی اور مکھن کو ساتھ لے کر بڑوں کی مدد پر اُتر آئے تھے۔ اکرام انھیں مصیبت میں گھرا نظر آیا۔ دو گرانڈیل قسم کے آدمی مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ چکے تھے۔ پاس ہی ایک تیسرا گرانڈیل بے ہوش پڑا تھا؛ گویا اکرام ان میں سے ایک کو بے کار کرچکا تھا، لیکن تین آدمیوں سے ایک ہی وقت میں مقابلہ، وہ بھی خاص قسم کے لڑاکوں سے اتنا آسان نہیں ہوتا اور اب اس کی حالت بُری تھی۔

"کیا خیال ہے فاروق، کیا اس حالت میں ہم محمود اور پروفیسر انکل کی تلاش میں جا سکتے ہیں۔ انکل اکرام کو مصیبت میں چھوڑ کر۔"

"نہیں، مشکل یہ ہے، اگر ہم نے انکل اکرام کی مدد نہ کی اور ان کی تلاش میں چلے گئے تو شاید انھیں زندہ نہ پا سکیں۔"

"تو پھر آؤ، پہلے ان سے نبٹ لیا جائے۔"

یہ کہہ کر وہ ان کی طرف دوڑے اور شاخیں گھماتے ہوئے ان دونوں پر حملہ آور ہوئے۔ ایک ساتھ ان کی شاخیں دونوں کے سروں اور جسم کے باقی حصوں پر تڑا تڑ پڑیں۔ وہ بوکھلا کر مڑے اور ان پر حملہ آور ہوئے۔ اس طرح اکرام کو سانس لینے کا موقع مل گیا۔ شاخوں کی مدد سے انھوں نے جلد ہی ان دونوں کو زمین دکھا دی اور پھر انہیں بھی باندھ دیا۔

"بہت بہت شکریہ۔" اکرام نے اداس انداز میں مسکرا کر کہا۔

"اس میں شکریے کی کیا بات ہے انکل، بات دراصل یہ ہے کہ اس وقت ہم امدادی پارٹی کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ آپ اب کچھ دیر آرام کریں۔" آفتاب نے مسکرا کر کہا۔

ان تینوں دشمنوں کو مارنے کے بعد انھوں نے انسپکٹر جمشید، خان رحمان اور منور علی خان کا جائزہ لیا۔ تینوں الگ الگ مقام پر جنگ کر رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید اور لی کاف بالکل مرغوں کے انداز میں لڑ رہے تھے اور ان کی لڑائی میں شدت آ گئی تھی۔ لی کاف کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح انسپکٹر جمشید پر ہاتھ ڈال دے اور انسپکٹر جمشید ہر صورت میں اس کے ہاتھوں کی زد سے بچنے کی فکر میں تھے۔

نتیجہ یہ کہ ان کے درمیان عجیب قسم کی اچھل کود جاری تھی۔

انسپکٹر کامران مرزا کا مقابلہ انورا کا، آرٹی بناشا اور ڈی سائٹ سے تھا۔ وہ ان کے مقابل پہلی بار آئے تھے — تینوں بلا کے پھرتیلے تھے۔ ادھر انسپکٹر کامران مرزا بھی کم نہیں تھے، لہذا ان کے درمیان بھی ہولناک جنگ جاری تھی۔

منور علی خان تین دوسرے قیدیوں میں گھرے ہوتے تھے اور وہ بھی زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے تھے۔ انھوں نے تینوں محاذوں کا جائزہ لیا اور ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"کیا خیال ہے، کیا کیا جائے؟"

"تینوں پارٹیوں کی مدد کے لیے فرزانہ، فرحت، شوکی اور مکھن موجود ہیں۔ جہاں ضرورت دیکھتے ہیں، کود پڑتے ہیں۔ لہذا ہمیں پروفیسر انکل اور محمود کی تلاش میں نکل پڑنا چاہیے" فاروق بولا۔

"ہوں، لیکن کیوں نہ ہم انکل کامران مرزا سے مشورہ کر لیں"

"ٹھیک ہے، آؤ — مشورہ کرنے کے لیے بھی تو ان سے نزدیک ہونا پڑے گا"

وہ انسپکٹر کامران مرزا کے نزدیک ہو گئے۔

"انکل، اگر آپ پسند کریں تو ہم آپ سے ایک مشورہ کر لیں" آصف بولا۔

"ایسے میں؟" انھوں نے جھنجھلا کر کہا۔

"جی ہاں، آپ توجہ پوری طرح لڑائی پر رکھیے — لیکن ساتھ میں ہمیں مشورہ بھی دے دیں"

"ہوں، بات تو ٹھیک ہے — بتاؤ کیا بات ہے؟" انھوں نے تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے کہا — ان کا بھرپور مکا انورا کا کی ناک پر لگا اور وہ دوسری طرف الٹ گیا — ساتھ ہی آرٹی بناشا نے اپنے پاؤں کی ٹھوکر ان کی پنڈلی کی ہڈی پر دے ماری — وہ اس وار کو بچا نہ سکے اور لڑکھڑا گئے — اس سے پہلے کہ سنبھل سکتے، ڈی سائٹ نے ایک اونچی چھلانگ لگائی اور ان پر گرا۔ وہ دھڑام سے گرے — ڈی سائٹ ان کے اوپر گرا۔ آرٹی بناشا اور انورا کا نے بھی ان پر چھلانگ لگانے میں دیر نہ لگائی؛ گویا اب وہ ان تینوں کے نیچے دبے ہوئے تھے، وہ مسکرا کر بولے:

"ہاں بھئی، اب بتاؤ، کس سلسلے میں مشورہ کرنا چاہتے ہو"

"مشورہ گیا جہنم میں — پہلے تو ہم تینوں سے دو دو ہاتھ کر لیں"

آفتاب تلملا کر آگے بڑھا اور شاخ کو سر سے بلند کر لیا۔

"نہ — نہ آفتاب، ایسا نہ کرنا۔ فاصلے پر رہو اور مشورہ مانگو"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابا جان، آپ تین دشمنوں کے نیچے دبے ہیں اور ہمیں مشورہ دے رہے ہیں" آفتاب بوکھلا کر بولا۔

"ہاں، مشورہ دینے کے لیے اس سے بہتر وقت کیا ہوگا — جلدی پوچھو، کہیں پھر میں مشورہ دینے کے قابل نہ رہ جاؤں"

"تو پہلے آپ ان کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کریں نا، یا پھر ہمیں اجازت دیں۔" آفتاب نے بے تابانہ لہجے میں کہا۔

"نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"اچھا تو پھر سنیے، پروفیسر انکل غائب ہیں — محمود ان کی تلاش میں نکل گیا ہے — اب ہم کیا کریں — آپ لوگوں کی مدد کے لیے یہاں ٹھہریں یا ان کے پیچھے جائیں؟"

"اوہ، اتنا وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ فوراً اُدھر روانہ ہو جاؤ — پروفیسر صاحب کی زندگی ہم سب کی زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا چلائے — ساتھ ہی انھوں نے پورا زور لگایا اور ایک حیرت ناک منظر سب نے دیکھا — آرٹی بناشا، انواکا اور ڈی سائٹ کئی فٹ اچھل کر پیچھے گرے، لیکن ان کے اوپر نہ گر سکے، کیونکہ وہ تو لڑھکنیاں کھا گئے تھے۔ نتیجہ یہ کہ تینوں زمین پر منہ کے بل گرے۔ انھوں نے انسپکٹر کامران مرزا کو بجلی ایسی تیزی سے اچھل کر کھڑے ہوتے پھر ان پر کودتے دیکھا اور پھر تو گویا ان پر کودنے کا بھوت سوار ہو گیا —

"آؤ بھئی، یہاں سے بھاگ چلیں۔ کہیں ابا جان ان سے فارغ ہو کر ہم پر نہ الٹ پڑیں۔"

"اور شوکی وغیرہ کا کیا کریں؟"

"انہیں یہیں رہنا چاہیے۔" آفتاب نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

اس وقت تک فرزانہ، فرحت، شوکی اور مکھن بھی ان کے پاس پہنچ چکے تھے اور یہ گفت گو سن چکے تھے۔

"تم لوگ ان تینوں کو باندھنے کی تیاری کرو۔ تب تک اباجان کو انکل منور علی خان اور پھر انکل خان رحمان کی بھی مدد کرنی ہے۔ ہم چلے پروفیسر انکل اور محمود کی تلاش میں۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی انھوں نے اس سمت میں دوڑنا شروع کر دیا، جس طرف محمود کو جاتے دیکھا تھا۔

محمود کو درخت پر شاخیں کاٹتے کاٹتے پروفیسر انکل کا جو خیال آیا اور اس نے ان کی طرف دیکھا تو وہ اسے وہاں نظر نہ آئے، جہاں کھڑے تھے۔ چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو بہت دور ان کی ایک جھلک دکھائی دی — کوئی ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچے لے جا رہا تھا — بس پھر کیا تھا، محمود نے اوپر سے ہی چھلانگ لگا دی اور کھلا چاقو ہاتھ میں لیے اس طرف دوڑ پڑا — وہ درخت پر زیادہ اونچائی تک نہیں چڑھا تھا۔ اس لیے اترنے کی بجائے چھلانگ لگانا پسند کیا — اب وہ بے تحاشا دوڑ رہا تھا — شدید حیرت نے اسے اپنی لپیٹ میں

لے گیا تھا — سوچ رہا تھا کہ آخر پروفیسر انکل کو کون کھینچے لے جا رہا ہے۔ جب وہ ان درختوں کے پاس پہنچا، جن میں پروفیسر انکل کی جھلک دکھائی دی تھی تو رک گیا — چاروں طرف دیکھا، لیکن ان کا کہیں نشان نظر نہ آیا — آخر آگے بڑھا اور پھر دو منٹ تک دوڑنے کے بعد مکانات کا سلسلہ شروع ہو گیا — اسے یوں محسوس ہوا، جیسے یہ کوئی مردوں کی بستی ہو۔ کوئی بھی شخص نظر نہیں آ رہا تھا — وہ دوڑتا چلا گیا — یہاں تک کہ کی کاف کے مکان تک پہنچ گیا۔ تمام مکانات کے دروازے بند تھے —

"حیرت ہے، اب کیا کروں — یہاں تو سب دروازے بند ہیں۔" وہ بڑبڑایا اور سوچ میں گم ہو گیا۔ اچانک اسے ایک خیال آیا۔ وہ تیزی سے ایک مکان کی طرف بڑھا اور دستک دے ڈالی، لیکن اندر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی نہ دی۔ اس نے ایک بار پھر دستک دی، لیکن اب بھی کوئی آواز سنائی نہ دی — تیسری بار دستک دینے کے بعد وہ دروازے سے پیچھے ہٹ گیا اور دوڑ کر دروازے کی طرف آیا۔ اس کا کندھا پوری طاقت سے دروازے سے ٹکرایا — کندھے پر شدید چوٹ لگی، لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا — یہ دروازے آٹومیٹک قسم کے تھے۔ بند کرتے ہی ان میں تالا لگ جاتا تھا اور پھر چابیوں کے بغیر دروازے نہیں کھل سکتے تھے۔ محمود نے دوبارہ ٹکر ماری، لیکن کچھ نہ بنا۔ اچانک اسے ہاتھ میں پکڑے چاقو کا خیال آ گیا۔ اس نے چاقو کی

مدد سے دروازے کو کاٹنا شروع کر دیا اور جب اتنا سوراخ ہو گیا، جس میں سے ہاتھ اندر جا سکتا تھا تو ہاتھ اندر ڈال کر دروازہ کھول دینا چاہا، لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔ دروازے میں تو تالا لگا ہوا تھا — اس نے اندر جھانک کر دیکھا، کوئی بھی نہیں تھا — اب اس کے سوا وہ کیا کر سکتا تھا کہ چاقو کی مدد سے سوراخ کو کھلا کرتا چلا جائے — یہاں تک کہ اس کے اندر جانے کا سامان ہو جائے؛ چنانچہ وہ چاقو لیے دروازے پر جٹ گیا — ایک دو بار اس نے پیچھے مڑ کر بھی دیکھا — سوچ رہا تھا کہ شاید مدد کے لیے کوئی آ جائے۔ سوراخ بڑا کرنے میں اسے کافی دیر لگی۔ جس لکڑی سے دروازہ بنایا گیا تھا، وہ بے انتہا مضبوط تھی۔ اسی لیے اتنی دیر ہو گئی اور ایسے میں اس نے اپنے ساتھیوں کو آتے دیکھا، وہ نزدیک آ کر رک گئے۔

"یہ — یہ کیا ہو رہا ہے؟" فاروق حیران ہو کر بولا۔

"دیکھتے نہیں، دروازے میں سوراخ کر رہا ہوں۔" محمود جھنجھلا کر بولا —

"یہ تو خیر مجھے صاف نظر آ رہا ہے — آخر ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" فاروق نے منہ بنایا۔

"تم دیکھ رہے ہو، پروفیسر انکل کا دور دور تک کوئی پتا نہیں۔ میں نے ایک شخص کو ان کا ہاتھ پکڑ کر اس طرف لاتے دیکھا تھا، لہذا میں دوڑ پڑا، لیکن یہاں پہنچا تو تمام مکانات کے دروازے بند

پائے۔ سوچ رہا تھا، انہیں کہاں تلاش کروں اور کس طرح تلاش کروں کہ اچانک مجھے ایک خیال آیا اور میں نے اس دروازے پر دستک دے ڈالی۔"

"اور تمہیں کیا خیال آیا تھا۔ خدا کرے ایسے خیالات تو سبھی کو آئیں۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"بھئی بالکل سیدھی سی بات ہے۔ اب میں کیا بتاؤں۔" اس نے منہ بنایا اور اپنا کام بھی جاری رکھا۔

"کاش، وہ سیدھی سی بات ہماری سمجھ..... اوہو..... اوہ، اچھا تو یہ بات ہے۔" آفتاب گڑبڑا گیا۔

"شکر ہے، تم تو سمجھے۔"

"خیر، ایسی بھی کوئی بات نہیں — میں بھی سمجھ چکا ہوں۔ یہ تو واقعی بالکل سامنے کی بات ہے۔"

"اچھا چھوڑو سامنے کی بات کو — اور اس دروازے کے دوسری طرف پہنچنے کی جدوجہد تیز کر دو۔"

"اپنا چاقو ہٹالو — ہم سب مل کر دھکا لگائیں گے۔" فاروق بولا۔ سب نے مل کر دھکا لگایا، لیکن پھر بھی دروازہ نہ ٹوٹا۔

"بس رہنے دو، اس دروازے کا کام چاقو ہی تمام کرے گا۔" فاروق مسکرایا۔

سب بُرے بُرے منہ بنا کر رہ گئے۔ آخر چاقو سے ہی دروازے کا

سوراخ بڑا ہوا اور ان کے گزرنے کے قابل سوراخ ہو گیا — سب سے پہلے محمود ہی اندر داخل ہوا، لیکن اس سے پہلے وہ چاقو جوتے کی ایڑی میں رکھ چکا تھا —

"آجاؤ بھئی، یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔"

وہ سب ایک ایک کرکے اندر داخل ہوئے — یہ ایک کمرے کا مکان تھا۔ کمرے کے آگے صحن تھا۔ نہ صحن میں کوئی تھا، نہ کمرے میں — انھوں نے دروازے، صحن اور کمرے کا بغور جائزہ لیا اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"کیا، میرا خیال غلط نہیں — یعنی پروفیسر صاحب کو اس مکان میں نہیں لایا گیا۔" محمود بڑبڑایا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" آصف نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تب پھر اس مکان میں کوئی خفیہ جگہ موجود ہے — ہو سکتا ہے، کوئی تہہ خانہ ہو۔" فاروق پر جوش لہجے میں بولا۔

"اوہ، ضرور یہی بات ہے۔" آصف چونکا۔

"تو پھر آؤ، تہہ خانہ تلاش کریں۔"

وہ تہہ خانہ تلاش کرنے میں جٹ گئے۔ پہلے دیواروں کو ٹھوک بجا کر دیکھا، پھر فرشوں کو — آخر میں غسل خانے کی باری آئی۔ غسل خانے کی ایک ایک چیز کا جائزہ لیا گیا — اچانک اشفاق کی آنکھوں میں چمک لہرائی —

"پانی کی ٹنکی کو دیکھ رہے ہیں" وہ بولا۔

"کیوں نہ دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے آنکھیں جو دی ہیں دیکھنے کے لیے" آصف مسکرایا۔

"میرا مطلب ہے، اس کے ارد گرد کی جگہ غسل خانے کی دیواروں کی نسبت صاف ستھری اور گرد کے بغیر نظر آ رہی ہے"

"اوہ ہاں، یہ بات تو ہے" فاروق چونکا۔

آفتاب نے آگے بڑھ کر پانی کی ٹنکی کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اسے ادھر ادھر ہٹانے کی کوشش شروع کر دی، لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔ اب اس نے اسے اوپر اٹھانے کی کوشش کی، لیکن کچھ نہ بنا۔

"بھئی نیچے دبا کر بھی تو دیکھ لو" اخلاق بے چین ہو کر بولا۔

"ہاں کیوں نہیں" اس نے کہا اور ٹنکی کو نیچے دبا دیا۔

دوسرا لمحہ چونکا دینے والا تھا۔ ٹنکی نیچے دبتی جا رہی تھی اور دیوار میں ایک دروازہ نمودار ہوتا جا رہا تھا۔

"وہ مارا" فاروق چلا اٹھا۔

"بھئی آہستہ، کہیں دشمن خبردار نہ ہو جائے" محمود نے منہ بنایا۔

"وہ تو خیر اب ہو گا ہی۔ آخر ہم تہہ خانہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں" آفتاب بولا۔

دروازہ اب پوری طرح نمودار ہو چکا تھا۔ دروازے کے [illegible]

انھیں سیڑھیاں نظر آئیں۔ وہ ان پر اترتے چلے گئے۔ دل دھک دھک کر رہے تھے۔ آخری سیڑھی کے ساتھ ایک کھلا سا کمرہ نظر آیا۔ اس کمرے میں ایک اور دروازہ تھا اور یہ دروازہ بھی بند تھا۔ وہ اس تک آئے۔ ہینڈل پکڑ کر کھینچا، لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ یہ دروازہ دیوار میں نصب تھا۔ دیوار کے رنگ کا تھا، لیکن اس کے باوجود صاف نظر آ رہا تھا، کیونکہ چاروں طرف دروازے کا نشان موجود تھا۔

"اب کیا کیا جائے۔ کیا اس دروازے کو بھی کاٹوں؟"

"اس کے سوا ہم کر ہی کیا سکتے ہیں" فاروق نے کندھے اچکائے۔

"نہیں، اسے کاٹنے کی ضرورت نہیں" آفتاب پر خیال انداز میں بولا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر ایک ساتھ بولے۔

"اگر اس ٹنکی کو دبانے سے اوپر والا دروازہ نمودار ہو سکتا ہے تو یہ دروازہ بھی کوئی بٹن دبانے سے کھلے گا۔ اصل مسئلہ بٹن کو دبانے کا ہے"

"بات معقول ہے" محمود مسکرایا۔

"خدا کا شکر ہے، اس نے بھی کوئی معقول بات کہی" فاروق فوراً بولا۔

"دیکھو، میرے منہ آنے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ وقت اس قسم کی

باتوں کا نہیں ہے۔"

"ہاں، بالکل یہی بات ہے۔ میں ہرگز تمہارے منہ نہیں آؤں گا، لیکن جب یہ وقت گزر جائے گا تو پھر ضرور کوشش کروں گا۔"

"ضرور ضرور۔۔۔ میری طرف سے اجازت ہے۔" آفتاب بولا۔

"بھئی چھوڑو بھی ۔۔۔ آؤ بٹن تلاش کریں۔"

انھوں نے تہ خانے کی دیواروں کو ٹٹولنا شروع کیا اور آخر سیڑھیوں کے نیچے ایک بٹن تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔۔۔ فاروق نے اسے دبایا ہی تھا کہ دروازہ آواز پیدا کیے بغیر کھل گیا۔ انھوں نے اپنے سامنے ایک طویل برآمدہ دیکھا۔۔۔ وہ اس میں داخل ہو گئے اور دبے پاؤں قدم اٹھاتے لگے۔۔۔ تین منٹ تک چلنے کے بعد آخر ایک کمرہ نظر آیا۔۔۔ اس کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور اس کے فرش پر پروفیسر داؤد بے ہوش پڑے تھے۔۔۔ ان پر ایک آدمی جھکا ہوا تھا۔

عین اسی وقت اس نے ان کی موجودگی کو محسوس کر لیا۔۔۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے سیدھا ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"اوہو، تم یہاں تک پہنچ گئے۔"

جال کہاں سے لائیں

"ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔" شوکی نے برا سا منہ بنایا۔

"ہاں! خیال تو مجھے بھی یہی آیا تھا۔" فرزانہ نے جواب دیا۔

"خیال آیا تھا تو پھر ضائع کرتے رہنے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ اس سے تو یہ بہتر تھا، ہم فاروق وغیرہ کے ساتھ چلے جاتے، آخر ہم یہاں کیا کر رہے ہیں۔۔۔ انکل اکرام پر حملہ آور ہونے والے بندھے پڑے ہیں۔۔۔ ہم پر جن لوگوں نے حملہ کیا تھا۔ انہیں بھی باندھ لیا گیا ہے۔۔۔ اب صرف چار محاذوں پر جنگ ہو رہی ہے۔۔۔ انکل جمشید، انکل کامران مرزا، ابا جان اور انکل خان رحمان۔۔۔ میرا خیال ہے۔۔۔ یہ چاروں اپنے دشمنوں سے بخوبی نبٹ رہے ہیں، ان کے درمیان ٹانگ اڑانا مناسب نہیں۔۔۔ کیوں نہ ہم کوئی اور کام کر گزریں۔"

"تجویز بہت مناسب ہے۔۔۔ تو پھر آؤ۔۔۔ ذرا اس وہیل کا جائزہ لے لیں۔۔۔" مکھن نے کہا۔

وہ اس طرف بڑھے ۔ اگرچہ لڑائی کے مناظر سے نظریں ہٹانا آسان نہیں تھا لیکن وقت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ جس قدر معلومات بھی حاصل کر سکیں، اچھا ہے ۔ چنانچہ وہیل کے منہ تک پہنچے ۔ اب جو انھوں نے بٹن دبایا تو منہ فوراً کھل گیا، گویا پہلی مرتبہ اس لیے نہیں کھلا تھا کہ اس وقت آب دوز پہلے ہی نیچے آ رہی تھی ۔ منہ کیا تھا ۔ ایک بہت بڑا غار نظر آ رہا تھا ۔ اندر جھانک کر دیکھا تو پانی نظر آیا ۔

"میرا جی چاہتا ہے ۔ اس پانی میں غوطہ لگاؤں۔" فرزانہ بولی۔

"تو پھر ۔ تمہیں روکا کس نے ہے۔" فرحت نے منہ بنایا۔

"اگر یہ بات ہے تو میں چلی ۔" فرزانہ نے وہیل کے منہ میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے ارے ۔ کیا آپ واقعی چھلانگ لگائیں گی پانی میں۔" کھن نے بوکھلا کر کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے ۔ میں جھوٹ موٹ کہہ رہی ہوں۔" فرزانہ نے برا مان کر کہا۔

"نہیں خیر ۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا، کیونکہ جانتا ہوں ۔ ہم سبھی جھوٹ سے نفرت کرتے ہیں، ہمارا دین ہمیں جھوٹ بولنا نہیں سکھاتا۔"

"تو پھر میں چلی ۔ اگر تم بھی آنا چاہو تو آ جاؤ۔" فرزانہ نے

چھلانگ لگانے کے لیے پر تولے۔

"ٹھہرو فرزانہ، میں بھی آ رہی ہوں۔" فرحت بے تابانہ لہجے میں بولی

فرزانہ رک گئی ۔ فرحت آگے بڑھی ۔ پھر دونوں ایک ساتھ چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہو گئیں، ایسے میں کھن بولا۔

"خدا حافظ!"

"تو تم نہیں آؤ گے!"

"اگر ہماری ضرورت پڑی تو ضرور آئیں گے۔" شوکی مسکرایا۔

انھوں نے چھلانگ لگا دی ۔ اور پانی میں اترتی چلی گئیں ۔ ایک منٹ بعد کافی دور جا کر ابھریں ۔ اور پھر غوطہ لگا گئیں ۔ دوسری مرتبہ جب ایک منٹ گزر گیا تو شوکی گھبرا کر بولا۔

"اف خدایا ۔ کیا وہ ۔ کیا وہ ڈوب گئیں؟"

"ڈوبنے والی لگتی تو نہیں ۔" کھن بولا۔

پھر دو منٹ گزر گئے ۔ ان پہ گھبراہٹ طاری ہو گی ۔ رنگ اڑ گئے ۔ شوکی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آفتاب! ہم ۔ میں اب رک نہیں سکتا ۔ جمشید انکل اور انکل کامران مرزا کو ہم کیا منہ دکھائیں گے ۔ تم ٹھہرو ۔ میں چھلانگ لگا کر دیکھتا ہوں ۔ وہ کہاں رہ گئیں۔"

"ل ۔ لیکن بھائی جان ۔ آپ تیر تو سکتے ہیں ۔ غوطہ نہیں لگا سکتے ۔ میرا مطلب ہے ۔ غوطہ لگانے میں اتنے ماہر نہیں ہیں۔"

"ابھی اب میں اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہوں۔ مجھے غوطہ لگانا ہی ہو گا۔ خدا حافظ۔"

"تب پھر۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔" مکھن نے درد بھری آواز میں کہا۔

"نہیں مکھن۔ یہ مناسب نہیں ہو گا۔ چھلانگ ہم میں سے بس ایک کو لگانی چاہیے۔ میں بڑا ہوں، میرا حق بنتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے شوکی نے بھی پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اور مکھن کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ وہ بے تابانہ انداز میں گھڑی دیکھنے لگا۔ آدھ منٹ بعد شوکی پانی پر ابھرا، اس کی طرف ہاتھ ہلایا اور پھر غوطہ کھا گیا۔ کچھ دیر بعد پھر ابھرا، اور پھر غوطہ کھا گیا۔ اس مرتبہ پورا ایک منٹ گزر گیا۔ لیکن شوکی نہ ابھرا تو آفتاب کی جان پر بن گئی۔ رنگ اڑ گیا۔ اور دو منٹ گزرنے پر تو اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اچانک وہ بڑبڑایا۔

"نن۔ نہیں۔ میں اب رک نہیں سکتا۔ مم۔ میں بھی چھلانگ لگا کر رہوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے چھلانگ لگا دی۔

منور علی خان اس وقت تک دو دشمنوں کو بے دم کر چکے تھے اور اب ان کے مقابلے میں صرف ایک رہ گیا تھا۔ اچانک انھیں اپنے تھیلے کا خیال آ گیا تھا۔ وہ چونک اٹھے اس جنگ کے شروع ہونے سے پہلے تھیلا انھوں نے ایک درخت کی شاخ سے لٹکا دیا تھا۔

"ارے! میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔"

"کیا مطلب۔" ان سے جنگ کرتے ہوئے دشمن نے کہا۔

"ٹھہرو۔ ابھی مطلب بتاتا ہوں۔" یہ کہتے ہی انھوں نے ایک جھکائی دی اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

"یہ کیا۔ بزدل۔ بھاگ رہے ہو۔" دشمن ہنسا اور ان کے پیچھے دوڑا۔

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر بھاگ سکتا ہوں۔ مجھے تو اپنی عقل پر رونا آ رہا ہے۔ میرے تھیلے میں کئی بہترین ہتھیار موجود ہیں۔ ان کو نکالنے اور کام میں لانے کا خیال تک نہیں آیا۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔" دشمن چونک کر بولا اور اپنی رفتار بڑھا دی تاکہ وہ ہتھیار نہ نکال سکیں، لیکن اس وقت تک وہ تھیلے میں ہاتھ ڈال چکے تھے۔ دوسرے ہی لمحے ان کے ہاتھ میں لوہے کی ایک زنجیر لہراتی نظر آئی۔ اس زنجیر میں

جگہ جگہ لوہے کے کانٹے ابھرے ہوئے تھے۔ اس زنجیر پر نظر پڑتے ہی دشمن خوف زدہ ہو گیا۔ لیکن بھاگا پھر بھی نہیں، اپنی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا۔

"حیرت ہے۔ تم اس زنجیر کو دیکھ کر ڈرے نہیں۔"

"ڈر کر بھی کیا کر لوں گا۔" اس نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہو کر بولے۔

"بھاگنے کی صورت میں اور بھی ذلت آمیز سزا ملے گی۔ باس مجھے کب چھوڑیں گے۔ اس لیے کیوں نہ میں تم سے لڑتے لڑتے ہی مارا جاؤں۔"

"تو پھر آؤ۔" انھوں نے زنجیر گھماتے ہوئے کہا۔

اس نے بچنے کی کوشش کی۔ ایک جھکائی دی۔ اور دوسری طرف نکل گیا۔ وہ اس کی طرف جھپٹے اور پھر زنجیر سے وار کیا۔ وہ فوراً ایک درخت کے پیچھے ہو گیا۔ زنجیر درخت سے ٹکرائی اور اس سے لپٹ گئی۔ دشمن نے زنجیر پر ہاتھ ڈال دیا، پھر چیخ کر اسے چھوڑ دیا۔ کیونکہ اس کے کانٹے اس کی ہتھیلی میں دھنس گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا منور علی خان نے زنجیر اس کے سر میں دے ماری۔ اس کے حلق سے ایک دل ہلا دینے والی چیخ نکلی اور تڑپنے لگا۔ اب وہ خان رحمان کی طرف لپکے۔

"ہیلو خان صاحب۔ کیا میں مدد کر سکتا ہوں۔"

"نہیں شکریہ۔ میں ان سے خود ہی نبٹ لوں گا۔"

"شکریہ! اگر مدد کی ضرورت محسوس ہو تو آواز دے لیجیے گا۔ کیونکہ میں فارغ ہو چکا ہوں۔" انھوں نے کہا۔

"مبارک ہو۔" خان رحمان مسکرائے اور ہاتھ چلانے لگے۔ وہ بھی اس وقت تک دو دشمنوں کو ادھ موا کر چکے تھے۔ البتہ تیسرے کے دم خم ابھی باقی تھے... اور یہ کم بخت طاقت ور تو تھا ہی پھرتیلا بھی بہت تھا۔ ہر وار کو صاف بچا جاتا اور خود وار کر ڈالتا یہ اور بات ہے کہ خان رحمان بھی کچھ کم پھرتیلے نہیں تھے۔ اور انھوں نے بھی ہر وار کو روک کر دکھایا تھا۔ اچانک انھوں نے ایک چھلانگ لگائی۔ اور منہ کے بل گرے۔ ساتھ ہی دشمن نے ان پر چھلانگ لگائی۔ کیونکہ وہ پہلو بچا کر ان کے وار سے صاف بچ گیا تھا، اب اس نے ان پر چھلانگ لگائی۔ خان رحمان کا بھرپور مکا اس کے سر کے پچھلے حصے پر لگا۔ وہ تڑپ کر سیدھا ہو گیا، ان کا دوسرا مکا اس کے سینے پر لگا۔ بس پھر کیا تھا، انھوں نے اسے لاتوں اور مکوں پر رکھ لیا۔ ایک منٹ بعد وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔

"ارے! میں تو لڑائی دیکھنے میں محو ہو گیا۔ مجھے تو کامران مرزا اور جمشید سے پوچھنا تھا۔ انہیں مدد کی ضرورت تو نہیں۔"

منور علی خان چونک کر بولے۔

"تو اب پوچھ لیتے ہیں چل کر ۔۔۔ آئیے میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔"
خان رحمان مسکرائے۔

دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کامران مرزا کی طرف بڑھے ۔۔۔
ان کے مقابلے میں ابھی تک تینوں بڑے مجرم ڈٹے ہوئے تھے۔
مقابلہ زور شور سے جاری تھا اور چاروں کے چاروں خون میں
نہائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

"اوہو۔۔ کامران مرزا۔۔ ان کے ساتھ تم بھی زخمی ہو گئے۔۔ میرا
خیال ہے تم ہٹ جاؤ۔۔ ان سے ہم نبٹ لیتے ہیں۔"

"نہیں بھئی۔۔ یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں ہو گا۔۔ اپنے
اپنے حصے کی لڑائی سب لڑیں گے۔" وہ بولے۔

"تو پھر یہ زنجیر لے لو۔" منور علی خان بولے۔

"نہیں ۔۔ میرے مقابل بھی ہاتھوں اور پیروں سے لڑ رہے
ہیں۔ میں ہتھیار سنبھالتا اچھا نہیں لگتا۔" وہ بولے ۔۔ اور پھر
ایک اونچی چھلانگ لگائی ۔۔ آر ٹی بناشا انوراکا اور ڈی سائٹ
یک دم آگے بڑھے تاکہ انہیں فضا میں ہی مکوں پر رکھ لیا
جائے۔ لیکن انھوں نے فضا میں ایک زور دار جھٹکا اپنے جسم
کو دیا اور ان سے قدرے فاصلے پر گرے۔۔ انوراکا نے یہ
دیکھ کر ان کی طرف چھلانگ لگائی۔۔ انھوں نے فوراً دایاں پیر

اس کی طرف اچھال دیا ۔۔ اور یہ پیر اس کی ناک پر لگا۔۔ وہ چکرا
کر گرا اور اٹھ نہ سکا۔

"ویری گڈ۔۔ یہ ہوئی نا بات۔" منور علی خان مسکرائے۔

اسی وقت ڈی سائٹ نے حملہ کیا، اس کے لیے ان کا دوسرا
پیر تیار تھا۔۔ یہ اس کے سینے پر لگا۔۔ چونکہ پورے زور میں
آیا تھا، اس لیے سینے پر بھی پورے زور کی گی اور وہ
بھی دوسری طرف الٹ گیا ۔۔ اس کے دوبارا اٹھنے کے آثار نظر
نہ آئے۔۔ اب ان کے مقابلے میں صرف آر ٹی بناشا رہ گیا۔
اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں ساتھی ڈھیر ہو گئے۔۔ وہ پھر
بھی نہ گھبرایا۔۔ اور مردانہ وار آگے بڑھا۔

"آؤ مسٹر آر ٹی بناشا۔۔ اب بس تم ہی رہ گئے ہو۔۔ یا پھر
انسپکٹر جمشید کے مقابلے پر لی کاف ۔۔"

"تم بھول رہے ہو۔۔ ابھی باس موجود ہیں۔ اور تم ان تک نہیں
پہنچ سکو گے۔" آر ٹی بناشا ہنسا۔

"چلو خیر۔۔ ہم اس تک نہیں پہنچ سکیں گے، وہ تو ہم تک آ سکتا ہے
ہم اسے دعوت دیں گے کہ ہماری طرف آئے۔" انسپکٹر کامران
مرزا مسکرائے۔

"خیر تم پہلے میرا یہ مکا سنبھالو۔" یہ کہتے ہی اس نے دائیں
ہاتھ سے مکا ان کی ٹھوڑی پر مارا ۔۔ وہ ترچھے ہو گئے۔۔ مکا

ان کی ٹھوڑی سے صرف نصف انچ کے فاصلے سے گزرتا چلا گیا۔ انھوں نے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال کر اسے آگے کی طرف دھکا دیا۔ آرٹی بناشا لڑکھڑا گیا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف مڑے اور دایاں پیر اس کی کمر پر رسید کر دیا۔ وہ اوندھے منہ گرا۔ انھوں نے اس کی کمر پر چھلانگ لگائی اور خود بھی اوندھے منہ گرے، کیونکہ وہ کروٹ بدل گیا تھا۔ ان کے گرتے ہی آرٹی بناشا ان پر سوار ہو گیا اور دونوں ہاتھ گردن پر جما دیے۔ انسپکٹر کامران مرزا نے فوراً اپنی ٹانگیں اس کے سر کی طرف لانے کی کوشش کی۔ لیکن گویا ان پر بجھ گیا اور ان کا یہ وار خالی گیا۔ اب انھوں نے دونوں ہاتھوں کا زور زمین پر لگایا اور اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ چند انچ اٹھے بھی۔ لیکن اس وقت تک گردن پر دباؤ بہت بڑھ گیا تھا۔ لہٰذا دھب سے گر گئے۔

یہ دیکھ کر منور علی خان نے بوکھلا اٹھے۔

"کامران مرزا۔ میں اب رک نہیں سکتا۔"

"لیکن یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں ہو گا کہ آپ ایسے موقع پر دخل دیں۔" خان رحمان بولے۔

"وہ کیوں؟" منور علی خان حیران ہو کر بولے۔

"کیا خبر۔ کامران مرزا اس وقت تک چال چلنے کی فکر میں ہوں۔ آپ کی دخل اندازی کی وجہ سے ان کا داؤ الٹ پڑ سکتا ہے۔"

"اوہ ہاں! آپ کی بات ٹھیک ہے۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔"

ان کی نظریں آرٹی بناشا اور انسپکٹر کامران مرزا پر جم گئیں۔ اچانک انسپکٹر کامران مرزا کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ ساتھ ہی آرٹی بناشا کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے سمجھ لیا کہ انسپکٹر کامران مرزا تو گئے کام سے۔ دوسرے ہی لمحے وہ اچھل کر گرا۔ اور انسپکٹر کامران مرزا بجلی کی سی تیزی سے اس پر جا پڑے اب ان کے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر جم گئے۔ وہ گردن پر دباؤ ڈالتے ہی چلے گئے۔ آرٹی بناشا نے گردن پر سے ان کے ہاتھ ہٹانے کی بہتیری کوشش کی۔ لیکن اس کو کامیابی نہ ہوئی اور پھر بالکل ان کے انداز میں اس کے بھی ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔

"خبردار! کامران مرزا۔ ہو سکتا ہے، یہ بھی چال چل رہا ہو۔" منور علی خان چلّائے۔

"فکر نہ کرو دوست۔ میں پوری طرح ہوش میں ہوں۔"

پورے ایک منٹ تک گردن دبائے رکھنے کے بعد انسپکٹر کامران مرزا اس پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ ساکت پڑا رہا۔

"ابھی یہ مرا نہیں۔ ہاں مکمل طور پر بے ہوش ضرور ہو گیا ہے۔ اس لیے اسے باندھ دینا چاہیے۔" وہ بولے۔

"آج ہم اور کام ہی کیا کر رہے ہیں۔" خان رحمان مسکرائے۔ اور انھوں نے آرٹی بناشا، الزاکا اور ڈی سائٹ کو باندھ دیا۔

"گویا اب لی کاف اور باس بچ گئے ہیں۔" خان رحمان بولے۔

"ہاں! اوہو — بچہ پارٹی میں سے تو کوئی بھی نظر نہیں آ رہا — کیا سبھی پروفیسر داؤد کی تلاش میں چل دیے — کمال ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"خیر آؤ۔ پہلے لی قاف اور انسپکٹر جمشید کا مقابلہ دیکھ لیں۔"

وہ ان کی طرف بڑھے — اور پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکے — انسپکٹر جمشید لڑتے لڑتے وہیل کے منہ تک پہنچ گئے تھے اور لی قاف اب ان کی طرف اس انداز میں بڑھ رہا تھا کہ وہ ادھر اُدھر سے نہیں نکل سکتے تھے — گویا بچنے کے لیے انھیں وہیل کے منہ میں جانا پڑتا — عین اسی وقت انھوں نے لی کاف کی وحشیانہ ہنسی سنی۔

"آخر تم پھنس ہی گئے انسپکٹر جمشید — اب کہاں جاؤ گے؟"

"آؤ — حملہ کرو۔" انسپکٹر جمشید پرسکون آواز میں بولے۔

لی کاف نے ان پر چھلانگ لگائی — شاید اس کا خیال تھا کہ اس سے بچنے کے لیے وہ وہیل کے منہ میں اور اندر چلے جائیں گے — لیکن انھوں نے یہ نہیں کیا — بلکہ یک دم نیچے گر گئے اور لی قاف ان کے اوپر سے گزرتا ہوا وہیل کے منہ میں چلا گیا — انھوں نے باہر کی طرف چھلانگ لگا دی اور وہیل کا منہ بند کرنے

کے لیے بٹن کی تلاش شروع کر دی — لیکن اسی وقت لی کاف نے باہر کی طرف چھلانگ لگائی — اور انھیں پھر ایک طرف ہونا پڑا۔

"لی کاف اس طرح قابو میں نہیں آئے گا جمشید — ہم سب کو مل کر ہی اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔"

"مجھے ڈر ہے — آپ میں سے کوئی نقصان نہ اٹھا بیٹھے۔"

"گویا تم یہ چاہتے ہو — ہم الگ تھلگ رہیں۔"

"ہاں! تم لوگ پروفیسر داؤد کی تلاش میں نکل جاؤ — چھوٹی پارٹی نے کہیں کوئی مصیبت نہ مول لے لی ہو۔"

"اوہ — لیکن — اس لڑائی سے رخ کس طرح موڑ لیں۔" خان رحمان بولے۔

"ارے ارے — بچیے۔" منور علی خان چلا اٹھے۔

زد میں دیکھ کر لی کاف نے ایک طوفانی چھلانگ لگائی تھی۔ انسپکٹر جمشید بوکھلا کر اچھلے — اس چھلانگ کے نتیجے میں وہ لی کاف سے تو بال بال بچ گئے — لیکن خود ایک درخت سے ٹکرا گئے — ان کا جسم ساکت ہو گیا — لی قاف وحشیانہ انداز میں ہنسا — اس کے خوفناک دانت چمک اٹھے — اب وہ انسپکٹر جمشید کی طرف بڑھا یہ دیکھ کر خان رحمان، منور علی خان اور انسپکٹر کامران مرزا تڑپ کر آگے بڑھے —

"پہلے ہم سے مقابلہ کر لو، لی کاف — پھر انسپکٹر جمشید کی طرف

بڑھنا۔" خان رحمان دھاڑے۔

"آؤ آؤ۔ آج تم سب کی موت آ گئی ہے۔" لی کاف یہ کہہ کر خان رحمان کی طرف پلٹا۔ اور بلا کی رفتار سے اچھلا۔ خان رحمان بھڑک کر ایک طرف کو بھاگے۔ انسپکٹر کامران مرزا کو یہ دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ انھوں نے فوراً ہنسی پر قابو پایا اور انسپکٹر جمشید کو اٹھا کر قدرے فاصلے پر ایک درخت کے دوسری طرف لٹا دیا۔ اس وقت لی کاف کا رخ خان رحمان کی طرف تھا۔ اب وہ فوری طور پر انسپکٹر جمشید کے جسم پر خراش نہیں ڈال سکتا تھا۔ ادھر خان رحمان بے تحاشا انداز میں دوڑے جا رہے تھے۔

"اوہو۔ منور علی خان۔ میں خان رحمان پر ہنس رہا تھا۔ لیکن ہنسنے کی بجائے مجھے ان کی تعریف کرنی چاہیے تھی۔" وہ حیران ہو کر بولے۔

"کیا مطلب؟" منور علی خان چونک اٹھے۔

"یہ لی کاف سے ڈر کر نہیں بھاگ رہے۔ بلکہ اسے انسپکٹر جمشید سے دور لے جا رہے ہیں۔"

"اوہو!" منور علی خان کے منہ سے نکلا۔

"اور۔ ہم بھی اس طرف ہی دوڑ چلیں۔ تاکہ لی کاف ادھر کا رخ ہی نہ کر سکے۔"

دونوں نے دوڑ لگا دی۔ یہاں تک کہ لی کاف کے نزدیک

پہنچ گئے۔ وہ ان کے قدموں کی آواز سن کر مڑا اور ان پر حملہ آور ہوا۔ دونوں بھڑک کر پیچھے ہٹے۔ خان رحمان بھی رک گئے۔ اور ادھر اُدھر کسی ہتھیار کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ اچانک ان کی نظر ایک شاخ پر پڑی۔ انھوں نے جلدی سے شاخ اٹھا لی۔ شاید یہ شاخ چھوٹی پارٹی میں سے کسی سے گری تھی۔ ان کے ہاتھ میں شاخ دیکھ کر انسپکٹر کامران مرزا چلا اٹھے۔

"نہیں خان رحمان۔ اس پر شاخ سے وار نہ کیجیے گا۔"

"کیوں؟ اس میں کیا خطرہ ہے؟"

"اگر شاخ لگنے سے اس کے خون نکل آیا اور وہ خون ہم میں سے کسی کے زخم پر لگ گیا تو ہم بے موت مارے جائیں گے۔ اسے تو زخمی کیے بغیر پکڑنا ہے۔"

"ایسا تو پھر کسی جال کی مدد سے ہو سکتا ہے۔" خان رحمان بولے۔

"ارے ہاں۔ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔" کامران مرزا مسکرا کر بولے۔

"لیکن ہم یہاں جال کہاں سے لائیں؟" منور علی خان بولے۔

"کوئی بات نہیں۔ یہاں نہیں تو کسی اور موقع پر ہم

اس کے لیے جال کا انتظام کر لیں گے۔"

"اب وہ وقت نہ آیا۔ تم لوگ میرے ہاتھوں سے بچ نہیں سکو گے۔"

یہ کہتے ہوئے لی کاف نے ایک بار پھر چھلانگ لگائی۔

اسی وقت انھوں نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔

غلط بالکل غلط

انھوں نے دیکھا، وہ گماٹا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا خنجر تھا۔ آنکھوں میں وحشت تیر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ بوکھلا اُٹھے۔

"خ خ۔ خیر تو ہے مسٹر گماٹا۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔"

"تم یہاں تک آ کیسے گئے۔" گماٹا کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی

"جس طرح آپ آ گئے۔"

"میرے پاس تو دروازے کی چابی تھی۔ اس سے دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔ لیکن تم نے دروازے کس طرح کھولا۔"

"میرے پاس بھی ایک چابی تھی۔" محمود مسکرایا۔

"غلط بالکل غلط۔" گماٹا نے محمود کو گھورا۔

"یہ بات بالکل ٹھیک کہی آپ نے۔" فاروق خوش ہو کر بولا۔

"کک۔ کیا مطلب؟" گماٹا نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ کہ محمود کی بات بالکل غلط ہے۔ غلط اور بالکل غلط بات

کہنے کی اسے بہت پرانی عادت ہے۔" وہ بولا۔

"فاروق! یہ تم کیا کہہ رہے ہو، دماغ تو نہیں چل گیا۔" محمود نے بھنا کر کہا۔

"اوہ۔ شاید میں بھی کچھ غلط ہی کہہ گیا۔ تب پھر شاید" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ کیونکہ محمود نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورنا شروع کر دیا تھا۔

"آپ تب کہہ رہے تھے۔ غلط۔ بالکل غلط۔"

"ہاں! بالکل یہی بات ہے۔ یہ بھی ہو نہیں سکتا کہ میرے دروازے کو کوئی اور چابی لگ جائے۔ یہ تالے تو اس دنیا کے کاریگروں کے بنائے ہوئے ہیں پھر بھلا تمہاری دنیا کی کوئی چابی اس دنیا کے تالے کو کس طرح کھول سکتی ہے۔" گھاٹا کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔

"اعتراض آپ کا بھی بجا ہے، لیکن آپ کو شاید یہ بات معلوم نہیں کہ ایک ماسٹر چابی بھی ہوتی ہے۔ ایسی چابیاں عام طور پر چور حضرات اپنے پاس رکھتے ہیں۔"

"تو یوں کہو۔ تم چور ہو اور تمہارے پاس ایک عدد ماسٹر چابی ہے، لیکن نہیں تمہاری دنیا کی کوئی ماسٹر چابی بھی ہمارے کسی تالے کو نہیں لگ سکتی۔"

"تب پھر ہم جادو کے ذریعے اندر داخل ہوئے ہوں گے۔

خیر یہ راز آپ پر کھل جائے گا جب آپ اپنے گھر کے دروازے کا جائزہ لیں گے۔ اس وقت تو یہ بتایئے کہ آپ کیا کر رہے تھے۔"

"باس کا حکم ہے کہ پروفیسر کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ پہلے اس نے حکم دیا تھا کہ اسے لڑائی کے میدان سے ہٹا کر یہاں لے آیا جائے اب اس نے حکم دیا ہے کہ اس کا کانٹا ہی نکال دوں تاکہ تم لوگ کبھی بھی یہ نہ جان سکو کہ پروفیسر داؤد نے بھوک کیوں محسوس نہیں کی۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔ تب پھر اپنے باس سے کہہ دو کہ ہم پروفیسر صاحب سے یہ بات کبھی نہیں پوچھیں گے۔ جیتے جی مر جائیں گے۔ لیکن ان کی زندگی داؤ پر نہیں لگائیں، لہذا اپنا فیصلہ واپس لے لیں۔"

"باس جب ایک بار کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر واپس نہیں لیتے یہ ان کی خاص عادت ہے۔"

"تو یوں کہیے۔" محمود نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب، کیا کہوں۔" گھاٹا حیران ہو کر بولا۔

"اب بننے سے کچھ نہیں ہو گا۔ آپ ہی اس دنیا کے باس ہیں ہمیں چکر نہیں دے سکتے۔ ہمارا آپ کا پہلے بھی آمنا سامنا ہو چکا ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے کہ میں پہلے بھی تم لوگوں کے مقابل آیا تھا۔

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دنیا کا باس میں نہیں ہوں۔ میں
ہو بھی کس طرح سکتا ہوں، میں تو تمہاری دنیا کی مخلوق ہوں ،
اس دنیا کی نہیں۔"

"تب پھر اس دنیا کی مخلوق کا ساتھ کیوں دے رہے ہیں۔ اس
باس کے غلام کیوں بن کر رہ گئے ہیں؟"

"مجبوری ہے۔ سفید گولی سب کرا سکتی ہے۔"

"نہیں مسٹر گماٹا! آپ غلط کہہ رہے ہیں، آپ ہی باس ہیں۔
میں دلیل پیش کر سکتا ہوں۔" آصف نے بھنا کر کہا۔

"ضرور ضرور میں سننے کے لیے تیار ہوں۔"

"تو پھر سنیئے۔ باس کی اس عمارت۔۔۔ تک باس کے علاوہ کوئی
بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اور آپ ہمیں اس عمارت میں نظر آ رہے
ہیں۔ اس عمارت اور اس پوری آبادی میں ضرور ٹیلیویژن کیمرے
نصب ہیں، ان کے ذریعے آپ تمام مناظر دیکھتے رہتے ہیں۔
جب آپ نے دیکھا کہ سب لوگ لڑائی میں الجھے ہوتے ہیں تو
سوچا، کیوں نہ پروفیسر داؤد کو خود میدان سے اڑا لیا جائے
لہذا آپ نے ایسا ہی کیا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر آپ
باس نہیں ہیں تو پھر لڑائی کے میدان میں کیوں نہیں
پہنچے تھے۔"

"بہت خوب! دونوں دلیلیں زور دار ہیں، لیکن جواب ان کا

یہ ہے کہ باس نے اس عمارت تک آنے کی اجازت دے رکھی ہے۔
یہاں کے لوگوں کو گولیاں میں ہی دیتا ہوں اور یہاں سے مجھے ملتی
ہیں۔ کیونکہ کوئی نہ کوئی تو یہاں آئے گا ہی۔ ورنہ لوگوں کو گولیاں
کس طرح مل سکیں گی۔"

"باورچی کے ذریعے۔ گولیاں تو سب کو دے دیتا ہے۔"

"ہاں! لیکن باورچی کو میں دیتا ہوں۔ اور دوسری دلیل کہ میں
لڑائی کے میدان میں کیوں نہیں پہنچا تو یوں ہے کہ۔ باس نے
مجھے محفوظ دستے کے طور پر رکھ لیا تھا۔ جیسا کہ لڑائی کے موقعوں
پر کیا جاتا ہے۔"

"ہوں۔ جواب آپ کے بھی معقول ہیں، خیر یہ بتائیے، اگر
آپ باس نہیں ہیں۔ اور باس کی خاص اجازت کے تحت یہاں
آتے ہیں تو کیا آپ نے باس کو دیکھا ہے۔"

"ن۔ نہیں۔ میں نے انھیں اس عمارت میں آج تک نہیں
دیکھا۔ نہ جانے وہ کہاں بیٹھ کر بات چیت کرتے ہیں۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے باس آپ ہی ہیں اور ہم سے
چھپا رہے ہیں۔ خیر۔ اب ہماری سنیئے، پروفیسر صاحب ہمارے
لیے بہت اہم ہیں۔ ان کی خاطر ہم سب اپنی جانیں قربان کرنے
کے لیے تیار ہیں، لہذا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ آپ ہماری
آنکھوں کے سامنے انھیں ہلاک کر دیں۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی محمود نے خنجر کی پروا نہ کرتے ہوئے
گماٹا پر چھلانگ لگا دی۔ آصف نے فوراً اس کا ساتھ دیا، اور
گماٹا نے چاقو والا ہاتھ لہرایا۔ چاقو محمود کی قمیص کاٹتا ہوا نکل
گیا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے جھکا اور گماٹا کی ایک ٹانگ
پر دونوں ہاتھ جما کر اپنی طرف کھینچے۔ گماٹا لڑکھڑایا، لیکن
فوراً ہی محمود کی ٹھوڑی پر ایک مکا جڑ دیا۔ محمود کو یوں لگا
جیسے کسی نے لوہے کا گرز ٹھوڑی پر دے مارا ہو، وہ دوسری
طرف الٹ گیا۔۔ اس وقت تک آصف نزدیک آ چکا تھا۔
آصف کو اور تو کچھ نہ سوجھی، اس نے ایک ٹکر اس کے پیٹ
میں ماری ادھر گماٹا کا چاقو والا ہاتھ چل گیا۔ چاقو کی نوک آصف
کے پیٹ کو کاٹتی چلی گئی ۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گرا۔
گماٹا فوراً پروفیسر داؤد کی طرف مڑا، لیکن ادھر فاروق اور
آفتاب سامنے کھڑے تھے۔

"ہم تمہارے راستے کی دیواریں گماٹا صاحب۔" فاروق جل
کر بولا۔

"تمہارے دو ساتھی تو بے کار ہو گئے ہیں۔ اب تم دونوں کتنی
دیر تک ٹک سکو گے۔"

"یہ تو اللہ کو ہی معلوم ہے۔ آؤ آصف۔ ہمیں پروفیسر
صاحب کو بچانا ہے۔"

دونوں دائیں اور بائیں سے اس کی طرف آئے۔ گماٹا نے فاروق
کی طرف چاقو والا ہاتھ گھمایا اور بائیں ہاتھ سے مکا آفتاب کی
طرف اچھالا۔ دونوں یک دم نیچے بیٹھ گئے اور بیٹھتے ہی
دوسری طرف لڑھک گئے۔ مقصد یہ تھا کہ گماٹا پروفیسر صاحب
کے نزدیک نہ رہے۔ گماٹا کو بھی مجبوراً ان کی طرف جھپٹ
پڑنے کے لیے پروفیسر صاحب کے پاس سے ہٹنا پڑا۔ اب
وہ پوری طرح فاروق اور آفتاب کی طرف متوجہ تھا۔ اس کی
آنکھیں گویا ان پر گڑی تھیں۔

"تم۔ تم بچ نہیں سکو گے۔"

"اچھا۔ کیا واقعی۔" فاروق چہکا۔

"چند منٹ بعد تم اپنا خون چاٹ رہے ہوں گے۔ اس
وقت چہک کر دکھانا، تب مانوں گا۔" گماٹا مسکرایا اور فاروق پر
چھلانگ لگائی۔ فاروق بھڑک کر پیچھے ہٹا۔ ایسے میں محمود
کو کچھ ہوش آ گیا۔ اس نے گماٹا کو فاروق کی طرف جھپٹتے دیکھا
تو بے ساختہ انداز میں اپنی ٹانگ آگے کر دی۔ گماٹا اس کی
طرف سے بے خبر تھا اور اس خیال میں تھا کہ اب وہ ہوش
میں نہیں آئے گا۔ بلکہ اس کے ساتھ آصف بھی۔ اس لیے دھڑام
سے گرا۔ محمود اس کی کمر پر سوار ہو گیا اور خنجر والے ہاتھ پر
ہاتھ ڈال دیا۔ اتنے میں فاروق اور آفتاب اس کی طرف بڑھ

آئے ــ اور لگے ٹھوکروں پر ٹھوکریں رسید کرنے ــ اسی وقت اس نے زور سے محمود کو اپنے اوپر سے اچھال دیا، فاروق اور آفتاب کی ٹھوکروں کو اپنے ہاتھوں پر روکا اور انہیں دور دھکیل دیا ــ اب وہ پھر سیدھا کھڑا تھا ــ ایسے میں آصف نے حرکت کی ــ اس کی قمیص پیٹ پر سے سرخ نظر آ رہی تھی ــ چہرے پر خوفناک آثار تھے ــ ادھر مشکل یہ تھی کہ خنجر ابھی تک گماٹا کے ہاتھ میں تھا ــ محمود بھی اس کے ہاتھ سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا ــ آصف کو خون میں لت پت دیکھتے ہوئے ــ گماٹا مسکرایا اور اس کی طرف چھلانگ لگاتے ہوئے پھر خنجر گھمایا، آصف نے تیزی سے جھکائی دی، جونہی چاقو اس کے سر پر سے گزرا، وہ زور سے اچھلا، اس کا سر گماٹا کی ٹھوڑی سے پوری طاقت سے ٹکرایا ــ یہ ایک ایسا وار تھا جس نے گماٹا کے ہوش بھی کچھ دیر کے لیے گم کر دیے ــ وہ اندھوں کی طرح دو چار قدم پیچھے کی طرف ہٹا، پھر اس نے ایک جھرجھری لی اور آنکھیں کھول دیں ــ اس کے ہونٹوں کے دونوں کناروں سے خون بہہ نکلا تھا ــ شاید ٹکر نے جبڑے کے اندر سے بھی زخمی کر دیا تھا، ٹھوڑی پر بھی خون نظر آ رہا تھا ــ ایسے میں وہ حد درجے خوفناک لگا ــ کسی ڈریکولا سے بھی زیادہ خوفناک اور وہ خوفناک انداز میں آگے بڑھا ــ آصف نے اس سے بچنے کے لیے پیچھے کی طرف قدم اٹھایا ــ ادھر فاروق

اور آفتاب اس کی کمر پر پہنچ گئے ــ انھوں نے ایک ساتھ اس کی کمر پر سر کی ٹکریں دے ماریں، لیکن یہ ان کی غلطی تھی ــ گماٹا کا منہ اگرچہ آصف کی طرف تھا ــ لیکن شاید وہ پیچھے بھی دیکھ سکتا تھا ــ بلا کی رفتار سے نیچے بیٹھ گیا ــ آفتاب اور فاروق اس کے اوپر گر کر آگے کی طرف لڑھک گئے ــ ادھر آصف آگے بڑھ چکا تھا ــ وہ ان میں الجھ گیا ــ تینوں گڈمڈ ہو کر رہ گئے ــ موقع دیکھ کر گماٹا نے ان پر چھلانگ لگائی، لیکن ایک بار پھر محمود اس کے سامنے تھا ــ اس نے بھنا کر خنجر والا ہاتھ گھمایا، محمود نے چھلانگ لگائی اور وار صاف بچا گیا، اس نے چاقو والا ہاتھ الٹا گھمایا، اس بار وہ فرش پر گویا بچھ سا گیا، خنجر اس کے اوپر سے نکل گیا ــ ساتھ ہی اس نے گماٹا کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹ لیں ــ گماٹا دھڑام سے گرا ــ اور اس وقت محمود نے اپنے پاؤں کی ایک زوردار ٹھوکر اس کے خنجر والے ہاتھ پر ماری ــ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل گیا ــ اتنے میں فاروق، آفتاب اور آصف اٹھ چکے تھے ــ تینوں ان کی طرف بڑھے اور گماٹا پر چھپٹ پڑے، لیکن وہ بھی بلا کا طاقت ور تھا ــ انھیں ایک ہی جھرجھری میں ادھر ادھر کر دیا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا ــ نہ صرف کھڑا ہو گیا ــ بلکہ بجلی کی سی تیزی سے ان پر ٹوٹ پڑا ــ انھیں اٹھ کر کھڑا ہونا بھی نصیب نہ ہوا تھا کہ اس کی لاتوں نے گویا بارش شروع کر دی ــ ہاتھ بھی بجلی کی

طرح برسنے لگے۔ انھوں نے اتنا پھرتیلا آدمی اپنی زندگی میں شاید
ہی کبھی دیکھا تھا۔ وہ تابڑ توڑ مکے ان کے لگے کر پل بھر میں
انھیں تارے نظر آ گئے۔ ایسے میں محمود کو اخلاق اور اشفاق کا
خیال آ گیا۔ وہ غصے میں بھر گیا۔ ان دونوں نے اب تک اس
لڑائی میں قطعاً حصہ نہیں لیا تھا، اس نے چلا کر کہا۔

"تم دونوں کیا کر رہے ہو۔ آگے کیوں نہیں بڑھتے۔ کیا
پھر پچھلی بار کی بزدلی کو آواز دے رہے ہو۔ کیا انکل منور علی
خان کی ہمت کا بھی تم نے کوئی اثر نہیں لیا۔"

محمود کی آواز گونج کر رہ گئی۔ لیکن اشفاق اور اخلاق کی
طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ اس نے برستے مکوں کی
اوٹ میں سے اس طرف دیکھا۔ جس طرف اشفاق اور اخلاق
کھڑے تھے اور نزدیک ہی پروفیسر داؤد پڑے تھے۔ لیکن
نہ اسے پروفیسر نظر آئے، نہ اشفاق اور اخلاق، اس کے منہ
سے بے ساختہ نکل گیا۔

"ارے! یہ۔ کہاں چلے گئے۔"

گماٹا نے چونک کر ادھر دیکھا۔ اور پھر گھبرا کر بولا۔

"ہائیں۔ پروفیسر کہاں گئے۔"

اور پھر وہ سرنگ کی طرف دوڑ پڑا۔

"تت۔ تو۔ تو کیا اشفاق اور اخلاق پروفیسر صاحب کو نکال

لے گئے۔" محمود ہکلایا۔

"اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔" آصف بڑبڑایا۔

"تب تو وہ کام دکھا گئے۔ آؤ چلیں۔ کہیں گماٹا انھیں راستے
میں ہی نہ جا لے۔" فاروق پرجوش لہجے میں بولا۔

"بالکل ٹھیک۔" آفتاب چلایا۔

چاروں میں اگرچہ ہمت نہیں رہی تھی۔ جوڑ جوڑ درد کر رہا
تھا۔ ایسے میں ایک قدم اٹھانا بھی دشوار تھا۔ لیکن یہ معاملہ تھا
پروفیسر صاحب کی زندگی کا۔ لہذا وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔
بے تحاشا بھاگتے ہوئے وہ تہہ خانے سے اوپر آ گئے اور گماٹا
کے مکان سے نکل کر میدان کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ دور
بہت دور انہیں چند سائے سے دوڑتے نظر آئے۔ یقیناً یہ
اشفاق، اخلاق، پروفیسر داؤد اور گماٹا تھے۔

"ہم بہت دور رہ گئے۔ ہمارے وہاں پہنچنے تک گماٹا ان
تک پہنچ جائے گا۔" محمود نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

"جان توڑ کر بھاگو۔ مایوسی گناہ ہے۔" آصف بولا۔

چاروں اس قدر تیزی سے دوڑے کہ کیا کبھی دوڑے ہوں
گے۔ نزدیک پہنچ کر وہ دبے پاؤں آگے بڑھنے لگے۔ اور آخر
ان لوگوں تک پہنچ ہی گئے۔ نزدیک پہنچتے ہی انھوں نے ایک
عجیب منظر دیکھا۔ پروفیسر صاحب ہوش میں تھے اور سیدھے کھڑے

تھے۔ لیکن ان کے سامنے اشفاق اور اخلاق ڈٹے کھڑے تھے۔ اور گماٹا کہہ رہا تھا۔

"بہت خوب۔ تو پروفیسر سے پہلے تم جان دو گے۔"

"ہاں! اس کے سوا ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟" اشفاق بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

چاروں نے ایک ساتھ گماٹا کو دھکا دیا۔ وہ منہ کے بل گرا۔ اور وہ ایک بار پھر بھاگے تھے۔ انھوں نے دیکھا۔ اب پروفیسر صاحب بھی بہت تیز دوڑ رہے تھے۔ انہیں بہت حیرت ہوئی۔

"آپ۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے پروفیسر انکل؟" فاروق حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

"کک۔ کیا ہو گیا ہے؟" انھوں نے بوکھلا کر کہا۔

"اس قدر تیز کس طرح دوڑ رہے ہیں۔"

"اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے۔" وہ مسکرائے۔

انھوں نے گماٹا کے قدموں کی آوازیں اپنے سروں پر محسوس کیں تو پلٹ پڑے، ساتھ ہی محمود چلّایا۔

"انکل۔ آپ دوڑنا جاری رکھیں۔"

"یہ۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے، میں تم لوگوں کو موت کے حوالے کر کے کس طرح جا سکتا ہوں۔"

"گماٹا ہمارے لیے موت کا ہرکارہ ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آپ کو نکل جانا چاہیے، ہم بھی آپ تک پہنچنے کی کوشش جاری رکھیں گے۔"

"اچھا خیر۔ یونہی سہی۔" انھوں نے کہا اور پھر دوڑنے لگے۔ ادھر گماٹا نے ایک بار پھر ان پر حملہ کیا۔ وہ سب اِدھر اُدھر ہٹ گئے گویا کائی کی طرح چھٹ گئے۔ بالکل سامنے صرف محمود رہ گیا۔ اس نے تملا کر محمود کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ ایسا اس نے نہایت پھرتی سے کیا۔ اس تیزی سے جھکا کہ محمود کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے محمود اس کے ہاتھوں پر تھا اور وہ ہاتھوں کو سر سے بلند کر چکا تھا۔

"ہم۔ محمود۔ تمہیں مینارے پر چڑھنے کا شوق کیا اس وقت ہونا تھا۔" فاروق کانپ کر بولا۔

اس وقت گماٹا نے محمود کو نیچے پٹخ دیا۔ اس کی کمر زمین سے ٹکرائی اور ساکت ہو گیا۔ اب وہ آصف کی طرف بڑھا۔

داؤ اس پر بھی آزمانے کی کوشش کی۔ لیکن آصف نے اپنی جگہ سے دوڑ لگا دی۔ گماٹا بھی اس کی طرف دوڑا۔ اور فاروق یک دم اس کے راستے میں آ گیا، دونوں پورے زور سے ٹکرائے اور دھڑام سے گرے۔

"بھائی محمود! آپ ٹھیک تو ہیں؟" اخلاق نے کانپ کر پوچھا۔

"اوہ! ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔ چند لمحوں کے لیے ذہن

تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"خدا کا شکر ہے۔ آیئے چلیں۔ گماٹا کا اٹھنے کا پروگرام نظر نہیں آ رہا۔"

"ارے۔ کیا واقعی۔" محمود خوش ہو کر بولا۔

"ہاں! نظر تو یہی آتا ہے۔"

ایک بار پھر وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ گماٹا واقعی لیٹا رہ گیا اس میں اٹھنے کے کوئی آثار نہیں رہ گئے تھے۔ دوڑتے دوڑتے وہ پروفیسر داؤد تک پہنچ گئے اور پھر انہیں اپنے ساتھی نظر آنے لگے۔ ان پر جوش کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اب وہ اور بھی زور سے بھاگنے لگے۔ ایک بار جو اخلاق نے مڑ کر دیکھا تو چلا اٹھا۔

"گماٹا پھر آ رہا ہے۔"

○

فرزانہ نے محسوس کیا۔ وہ پانی کے ایک گول سے حوض میں ہے۔ اب جو وہ ابھری تو خود کو اس حوض کے کنارے پایا۔ یہ واقعی ایک گول حوض تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کچھ ہی فاصلے پر فرحت تیر رہی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے

اپنی طرف بلایا۔ کیونکہ پانی میں وہ آواز تو سن نہیں سکتی تھی۔ جلد ہی فرحت بھی کنارے پر آ گئی۔ دونوں پانی سے نکل آئیں۔

"یہ۔ یہ ہم کہاں پہنچ گئیں۔" فرحت تپ کر بولی۔

"ادھر دیکھو۔ دائیں طرف ایک سفید عمارت ہے۔"

"ارے۔ یہ تو وہی عمارت ہے۔ یعنی باس کی عمارت۔" فرحت چونک اٹھی۔

"اوہو اچھا۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بے چارے شوکی اور مکھن تو وہیں کھڑے رہ گئے۔" فرحت بڑبڑائی۔

"خیر آؤ۔ اب یہاں تک پہنچ گئے ہیں تو ذرا آگے بڑھ کر بھی دیکھ لیں۔"

اس وقت انھوں نے پانی میں کچھ آوازیں سنیں۔ چونک کر دیکھا تو شوکی اور مکھن چلے آ رہے تھے۔ دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ہائیں۔ یہ لوگ تو یہاں پہنچ گئے۔ کمال ہے۔"

"اور ہم کیا کرتے۔ واپس جا کر بڑوں کو کیا جواب دیتے۔ جب وہ ہم سے آپ دونوں کے بارے میں پوچھتے۔"

"ہوں۔ تو آپ کو غوطہ لگانا آتا ہے۔"

"اگر نہ آتا تو ہم یہاں کیونکر نظر آ سکتے تھے۔"

"ہوں! بات تو ٹھیک ہے۔ اس سفید رت کو دیکھ رہے ہیں۔"

"ارے باپ رے۔ یہ تو وہی سفید عمارت ہے۔ وہیں ہم نے اس دنیا کے باس سے باتیں کی تھیں۔" شوکی حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

"ہوں۔ تو پھر آؤ۔ ذرا دیکھیں۔ اس میں باس کہاں بیٹھتا ہے۔"

وہ چاروں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے۔ گیلے کپڑوں میں انھیں ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔ مکھن کے تو باقاعدہ دانت بجنے لگے۔

"بھئی! یہ تم جلترنگ کیوں بجانے لگے۔" فرحت مسکرائی۔

"جلترنگ۔ اوہ۔ آپ میرے دانتوں کی آواز کو کہہ رہی ہیں۔ مجھے موسیقی کا کوئی شوق نہیں۔" مکھن مسکرایا۔

"حیرت ہے۔ ہم اس قدر آسانی سے باس تک پہنچ گئے۔ کمال ہے۔"

"دراصل اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتا کہ کوئی اس طرف سے بھی آ سکتا ہے۔"

"شاید یہی بات ہے۔"

وہ عمارت کے برآمدے پر پہنچے ہی تھے کہ دروازہ کھل گیا۔ اور وہ حیران رہ گئے۔

"کمال ہے۔ دروازہ تو ادھر بھی اسی طرح کھلا ہے۔ جس

طرح سامنے کی طرف کھلا تھا۔" شوکی بڑبڑایا۔

"بھئی پوری عمارت کا نظام ایک ہی ہو گا۔ ہر دروازے کے لیے الگ الگ نظام تو نہیں ہو سکتا۔" فرحت بولی۔

"ہاں! یہ بات ٹھیک ہے۔"

وہ دروازہ عبور کر کے اندر کی طرف بڑھے۔ ان کے سامنے ایک برآمدہ تھا۔ برآمدہ کافی طویل تھا۔ آگے چل کر سامنے دیوار میں ایک اور دروازہ نظر آیا۔

"اس سمت میں بھی عمارت بالکل اس طرح ہے جس طرح سامنے کی طرف ہے۔ گویا ہم باس کے کمرے کی طرف چلے جا رہے ہیں۔" مکھن نے کانپ کر کہا۔

"جب اوکھلی میں سر دیا موصلوں کا کیا ڈر۔ بڑھے چلو۔" فرزانہ بولی۔

یہ دروازہ بھی خودبخود کھل گیا۔ وہ اس کمرے کو بھی پار کر گئے اور اس طرح اس کمرے میں داخل ہو گئے۔ جس میں انھوں نے باس سے بات چیت کی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ وہ بوکھلا کر مڑے۔ اور پھر منہ دوسری طرف کر لیے۔ اب کمرے سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسی وقت انھوں نے باس کی آواز سنی۔

"بہت خوب دوستو! تم یہاں تک بھی آ گئے۔ بھئی بات دراصل

یہ ہے کہ اس دنیا میں آنے کے راستے تو بالکل کھلے ہیں۔ جانے کا کوئی راستہ نہیں — تم لوگ آ تو گئے ہو، جا نہیں سکتے — لو اب ذرا جنگ کے مناظر دیکھو — دیکھو تو تمہارے ساتھی کس طرح جنگ لڑ رہے ہیں اور ابھی کیا ہے — ابھی تو نہ جانے کب تک اور کس کس سے لڑنا پڑے گا — میں دیوار میں نصب ٹی وی آن کیے دیتا ہوں — واضح رہے کہ میں خود بھی اس وقت ٹی وی دیکھنے میں مصروف ہوں۔

"لیکن آپ ہیں کہاں — ہمیں نظر کیوں نہیں آتے —" فرزانہ بولی۔

"مجھے دیکھنے کی تمنا نہ کرنا — کامیاب نہیں ہو سکو گے۔"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی دیوار پر تصویر نظر آنے لگی۔ اور انھوں نے جنگ کے میدان کو اپنی آنکھوں کے بالکل سامنے پایا — ان کی نظریں سکرین پر جم کر رہ گئیں — ان کے ذہنوں سے یہ خیال بھی نکل گیا کہ وہ باس کی عمارت میں ایک کمرے کے قیدی ہیں — سکرین کسی سینما جتنی بڑی تھی — اور اس وقت ان کے سامنے منظر تھا انسپکٹر جمشید اور لی کاف کی لڑائی کا۔ ان کے درمیان ایک خونی جنگ چھڑی ہوئی تھی — تھوڑی دیر بعد منظر بدل گیا اور انسپکٹر کامران مرزا، انوراکا، آرٹی بناشا اور شوبرا ڈی سائٹ سے لڑتے نظر آئے — چند منٹ تک

یہ منظر سامنے رہا، پھر انھیں خان رحمان تین قوی ہیکل آدمیوں سے لڑتے نظر آئے — اور اس کے بعد منور علی خان بھی دکھائی دیے۔

"اُف خدا — کس قدر ہولناک جنگ ہو رہی ہے۔" مکھن کانپ اٹھا۔

"اور ہم یہاں آ پھنسے ہیں — دھت تیرے کی —" فرزانہ نے بھنا کر کہا۔

"ہائیں بالکل — فرزانہ — یہ جملہ تم نے کہا ہے۔"

"ہاں! شاید اب مجھ میں محمود کی روح حلول کر گئی ہے۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"ارے! یہ انکل منور علی خان کیا کر رہے ہیں —" شوکی حیرت زدہ انداز میں بولا۔

انھوں نے منور علی خان کو اپنے قبیلے کی طرف دوڑتے دیکھا۔

خیریت کا ارے

انھوں نے آواز کی سمت دیکھا — پروفیسر داؤد اور چھوٹی پارٹی دوڑے چلے آ رہے تھے۔

"لو بھئی — یہ لوگ تو پروفیسر صاحب کو لے آئے۔" منور علی خان بولے۔

"یہ ان کی بہت بڑی کامیابی ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے مسکرا کر کہا۔

اتنے میں لی کاف خان رحمان کے سر پر پہنچ گیا۔

"خان رحمان — بچو!" انسپکٹر کامران مرزا چلائے۔ ان کے الفاظ سنتے ہی خان رحمان نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور لی کاف سے دور جا گرے — اس نے بھی چھلانگ لگائی، اتنی دیر میں انسپکٹر کامران مرزا اور منور علی خان بھی نزدیک پہنچ چکے تھے — لیکن بھلا لی کاف کو ان کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔ وہ تو اس پر وار کر بھی نہیں سکتے تھے۔

"خبردار مسٹر لی کاف — اب ہم تم سے نبٹ لیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"کیسے نبٹ لو گے۔ انسپکٹر کامران مرزا — تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔"

"نہیں — فکر نہ کرو۔" وہ ہنسا۔

اچانک اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہو گئے۔ پھر وہ بڑبڑایا۔

"کک — کہیں میری ناک مجھے دھوکا تو نہیں دے رہی۔"

اس کے ہاتھ پیر رک گئے تھے۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ لڑائی کو بھول گیا ہو —

"ناک دھوکا دے رہی ہے — کیا مطلب۔" انسپکٹر کامران مرزا حیران ہو کر بولے۔

"نہیں — میری ناک دھوکا نہیں دے رہی — لیکن خیر — پہلے تو مجھے تم لوگوں سے نبٹنا ہے — تب ہی میں کوئی فائدہ اٹھا سکوں گا۔" اس نے پر اسرار انداز میں کہا۔

"فائدہ اٹھا سکوں گا — آخر کس بات سے۔" خان رحمان بولے

"آؤ — مجھ سے دو دو ہاتھ کر لو — جلد از جلد میرے ہاتھوں مارے جاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے پھر خان رحمان کی طرف چھلانگ لگائی۔

وہ اچھلے۔ اب انسپکٹر کامران مرزا اس کے سامنے آ گئے۔ اس
کے جھپٹتے ہی وہ جھکائی دے گئے۔ اتنے میں منور علی خان
اس کے سامنے آ چکے تھے۔ لی کاف دانت پیستے ہوئے ان
کی طرف بڑھا۔ اور بھیانک انداز میں چھلانگ لگائی۔ منور
علی خان گھبرا کر پیچھے ہٹے۔ اور انسپکٹر کامران مرزا بلا کی تیزی
سے اچھلے اور پھر زمین پر جھکتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے
مٹی اس کی آنکھوں کی طرف اچھال دی۔ ان کا یہ وار خالی
گیا، کیونکہ ہوا کا رخ انہی کی طرف تھا، خان رحمان
فوراً چلائے۔

"بھئی۔ اس سے اچھی ترکیب ہو ہی نہیں سکتی۔ مٹھیوں میں
مٹی بھر لو۔"

منور علی خان اور خان رحمان نے فوراً مٹھیوں میں مٹی لے
لی اور چکر کاٹ کر دوسری طرف آ گئے۔ انسپکٹر کامران مرزا
نے دوڑ لگا دی اور چکر کاٹ کر ان تک پہنچ گئے۔
انھوں نے بھی دونوں مٹھیوں میں مٹی بھر لی۔

پہلی بار انھوں نے لی کاف کی آنکھوں میں الجھن کے
آثار دیکھے۔

"خیر تو ہے مسٹر لی کاف۔ تم کچھ پریشان ہو گئے۔" انسپکٹر
کامران مرزا مسکرائے۔

اس وقت انھوں نے دوڑتے قدموں کی آواز قریب ہی محسوس
کی۔ مڑ کر دیکھا تو پروفیسر داؤد اور چھوٹی پارٹی ان تک پہنچ
چکی تھی۔

"اوہو۔ مسٹر گاٹا بھی ان کے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔"

"ہاں! ہم اس کے قبضے سے پروفیسر صاحب کو نکال کر
لائے ہیں اور ہمیں زندگی اور موت کی جنگ لڑنا پڑی ہے۔"
محمود بولا، پھر چونک اٹھا۔

"ارے ابا جان کہاں ہیں؟"

"وہ اس طرف ہیں۔ ٹھیک ہیں، فکر کی ضرورت نہیں۔"

"کیا وہ چوٹ کھا بیٹھے ہیں؟" فاروق بے چین ہو اٹھا۔

"ہاں! لی کاف کے مقابلے کے دوران درخت سے ٹکرا
گئے تھے۔"

"ارے!" محمود اور فاروق اس سمت میں دوڑ پڑے۔ اور
پھر انسپکٹر جمشید کو دیکھ کر رک گئے۔ وہ ہوش میں تھے۔
انھیں دیکھ کر مسکرائے۔

"آپ۔ آپ ٹھیک تو ہیں ابا جان؟"

"ہاں! وقتی طور پر بے ہوش ہو گیا تھا، اب میں پھر سے
جنگ کے قابل ہوں۔ لی کاف کا کیا بنا۔"

"ابھی تک ڈٹا ہوا ہے۔"

"ہوں! مصیبت یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ہتھیار نہیں — آؤ دیکھتے ہیں۔"

تینوں باقی لوگوں تک پہنچے۔

"جمشید تمہیں صحیح سلامت دیکھ کر خوشی ہوئی — اور تم بھی یہ جان کر خوش ہو گے کہ ہم نے مسٹر لی کاف کے خلاف ایک ہتھیار تلاش کر لیا ہے۔"

"ارے — کیا واقعی؟"

"ہاں! اسی لیے تو مسٹر کاف رک گئے ہیں اور ہماری طرف نہیں بڑھ رہے ہیں۔"

"اور وہ ہتھیار کیا ہے؟" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"مٹی — ہم نے مٹھیوں میں مٹی بھر لی ہے — اگر یہ حضرت ہماری طرف آئیں گے تو ہم ان کی آنکھوں میں مٹی جھونک دیں گے۔"

"اوہ — ویری گڈ — یہ ہوئی نا بات —"

اسی وقت گماٹا نزدیک آ گیا۔

"لیجیے — اس نئی دنیا کے باس سے ملیے۔" محمود بولا۔

"کیا!!" وہ زور سے چلائے۔

"ہاں! ہماری اس سے ملاقات سفید عمارت کے اندر ہوئی تھی۔"

"نہیں دوستو! میں باس نہیں ہوں — ہاں! میں اور لی کاف مل کر تم دونوں کی چٹنی مزدور بنا دیں گے۔"

"نہیں مسٹر گماٹا — اس وقت میں لڑائی میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔"

"کک — کیا مطلب — کیا تم ڈر گئے لی کاف۔"

"ایسی بات نہیں — میری خوراک مجھے آواز دے رہی ہے۔ میری ناک غلطی پر نہیں ہے — مجھے درست خوشبو آ رہی ہے — باس نے مجھ پر احسان کیا ہے — خوراک نہ ملنے کی وجہ سے میں بہت کمزور ہو گیا تھا — میں ذرا اپنی خوراک کھا آؤں — اس کے بعد ان لوگوں کو تگنی کا وہ ناچ نچاؤں گا کہ انھیں کبھی کسی نے نہیں نچایا ہو گا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی لی کاف ایک سمت کو بھاگ کھڑا ہوا۔

"ارے ارے — مسٹر لی کاف — آپ کو ہو کیا گیا ہے —" گماٹا کے لہجے میں حیرت تھی۔

"مجھے لی کاف کے الفاظ یاد آ رہے ہیں — اس نے باس سے درخواست کی تھی — کہ اسے اس کی خوراک مہیا کر دی جائے — یعنی سانپ —" ایسے میں محمود بولا۔

"ارے! تو کیا وہ سانپ کھانے گیا ہے — لل — لیکن — سانپ تو ایک باقاعدہ جنگلے میں بند رہتے ہیں اور اس

جنگلے کو باس کے سوا کوئی نہیں کھول سکتا اور اگر باس نے اس جنگلے کو کھول دیا تو یہاں ہر طرف سانپ ہی سانپ نظر آئیں گے ۔۔ وہ تو ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔" گماٹا نے کانپتی آواز میں کہا۔

"تب ۔ تب تو ہم سب سانپوں کی لپیٹ میں آنے والے ہیں ۔۔"

"ہاں ! یہ ٹھیک ہے ۔۔ لیکن گماٹا ۔ سانپوں کے آنے سے پہلے تم ان سے فیصلہ کر لو ۔ میں نہیں جانتا تھا کہ لی کاف سانپوں کی خوشبو سونگھ کر ہی بھاگ کھڑا ہو گا ۔۔ چلو خیر ۔ وہ آتا ہی ہو گا ۔۔" باس کی آواز نے سناٹا طاری کر دیا چند لمحوں تک وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے ۔ آخر انسپکٹر جمشید نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے، یہاں سب کے سب سانپوں کی لپیٹ میں آنے والے ہیں ۔۔ سوائے لی کاف کے۔"

"اور سوائے باس کے۔" خان رحمان بولے ۔

"ہاں ۔۔ وہ بھی اپنی عمارت میں محفوظ ہے ۔۔ ارے۔" فاروق کہتے کہتے چونک اٹھا ۔

"خدا کرے یہ ارے ۔۔ خیریت کا ارے ہو۔" آفتاب گھبرا کر بولا۔

"مم ۔ مم ۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فرزانہ کہاں ہے؟"

"فرزانہ ۔۔ ارے باپ رے ۔۔ فرزانہ ہی نہیں ۔ فرحت بھی غائب ہے ۔۔"

"صاحبو ۔ تم لوگوں نے دھیان نہیں دیا ۔ بھائی جان شوکی اور مکھن بھی غائب ہیں۔" اشفاق بولا۔

"حیرت ہے ۔۔ یہ چاروں کہاں چلے گئے۔" محمود بڑبڑایا۔

"فرزانہ ۔ تم کہاں ہو۔" فاروق حلق پھاڑ پھاڑ کر چلا اٹھا۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا ۔

"مسٹر باس ۔ تم ان چاروں کے بارے میں ضرور جانتے ہو گے ۔ وہ کہاں ہیں؟"

"ہاں ، جانتا تو ہوں ۔" باس کی شوخ آواز سنائی دی ۔

"تب پھر بتاؤ نا ۔۔ وہ کہاں ہیں۔" محمود بے تابانہ بولا۔

"وہ میرے پاس پہنچ چکے ہیں اور ٹی وی سکرین کے آگے بیٹھے تم سب کو دیکھ رہے ہیں۔"

"اوہ !" ان سب کے منہ سے نکلا ۔

"گماٹا ! کیا ہوا ۔ تھک گئے کیا۔"

"ن ۔ نہیں باس ۔۔ میں مرتے دم تک ان سے لڑوں گا ۔۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں ۔" باس بولا۔

گمانا ان پر ٹوٹ پڑا۔ لیکن بھلا اتنے لوگوں میں اس کی کیا دال گلتی۔ انھوں نے اسے لاتوں اور مکّوں پر رکھ لیا۔ اگر انھیں سانپوں کا فکر نہ ہوتا تو ضرور ان میں سے صرف ایک اس کا مقابلہ کرتا، لیکن وہ ان حالات میں گمانا سے مقابلے کو طول نہیں دے سکتے تھے۔ جلد ہی گمانا بھی لیٹا نظر آیا۔ تاہم انھوں نے اسے جان سے نہیں مارا تھا۔ ہاں مکمل طور پر بے ہوش ضرور کر دیا تھا۔

"ہم سانپوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔" منور علی خان نے گویا اعلان کیا۔

"وہ کیسے ؟" اس پر فاروق نے چونک کر کہا۔

"درختوں پر چڑھ کر۔ شاخیں ہاتھوں میں لے کر۔ جو سانپ بھی درختوں پر چڑھیں گے، ہماری شاخوں کا شکار ہو جائیں گے۔"

"ویری گڈ۔ یہ ہوئی نا بات۔" خان رحمان خوش ہو کر بولے۔

اسی وقت انھوں نے کسی کے چیخنے اور چلّانے کی آواز سنی۔ آواز کی سمت میں دیکھا تو لی کاف چیخ رہا تھا۔ چلّا رہا تھا، اچھل کود رہا تھا۔ اور اس کے جسم کو دیکھتے ہی وہ لرز اٹھے۔ اس کے سارے جسم سے سانپ ہی

سانپ لپٹے ہوئے تھے۔ اور وہ اسے بار بار ڈس رہے تھے۔ لیکن جو سانپ بھی اسے ڈستا، مردہ ہو کر نیچے گر پڑتا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اتنا ہولناک اور سنسنی خیز منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔

○

"یا اللہ رحم۔ یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔" فاروق کی آواز میں کپکپی تھی۔

"یہ۔ یہ واقعی دنیا کا خوفناک ترین آدمی ہے۔" آصف نے بھی کانپ کر کہا۔

ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دو تین سانپ کھا گیا۔ اب اس پر دیوانگی کی حالت طاری تھی۔ اب جو انھوں نے زمین کی طرف دیکھا تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہزاروں پھن دار سانپ ان کی طرف رینگ رہے تھے۔

"اُف خدا۔ اتنے سانپ۔" منور علی خان بولے۔

"کیا خیال ہے منور علی۔ کیا ہم ان سے خود کو بچا سکیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ابھی سانپ کافی دور ہیں۔ اگر ہم صرف ایک درخت پر چڑھ جائیں تو بچنے کے امکانات ہیں، اگر ایک ایک دو دو آدمی مختلف درختوں پر چڑھے تو ان کے لیے اپنا اپنا بچاؤ کرنا مشکل ہو گا۔ اور ہاں محمود۔ تم فوراً شاخیں کاٹنا شروع کر دو۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کم از کم دو دو شاخیں ہونی چاہییں۔"

"جی بہتر۔" محمود بولا۔

"لاؤ محمود۔ چاقو مجھے دو۔ میں شاخیں کاٹوں گا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

وہ شاخیں کاٹنے کا کام بجلی کی سی تیزی سے کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ہر ایک کو دو دو شاخیں مل گئیں۔ اب وہ ایک تن آور درخت پر چڑھ گئے اور سانپوں کے استقبال کے لیے تیار ہو گئے۔ ادھر لی کاٹ اسی طرح اچھل کود رہا تھا۔ سانپ اسے ڈس ڈس کر گر رہے تھے۔ اور پھر وہ بے دم سا ہو کر گر پڑا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

"اسے زہر کا نشہ ہو گیا ہے۔" منور علی خان بولے۔

اب سانپ سیدھے اس درخت کی طرف بڑھنے لگے۔ انھوں نے کسی دوسرے درخت یا کسی اور سمت کا رخ تک نہ کیا۔

"یہ کیا منور علی خان۔ یہ تو صرف اس درخت کی طرف آ رہے ہیں؟" انسپکٹر کامران مرزا کانپ اٹھے۔

"ہاں! شاید یہ انسانوں کی بو پر آئے ہیں۔ ہم چونکہ اس درخت پر موجود ہیں اس لیے وہ اس طرف آ رہے ہیں۔"

"اور۔ اور اپنے دشمن جو ہم نیچے بے ہوش چھوڑ آئے ہیں۔"

"وہ سب کے سب ان سانپوں کا شکار ہو چکے ہوں گے۔ بھلا وہ کس طرح بچ سکتے ہیں۔" منور علی خان بولے

"اوہ! اس کا مطلب انوراکا، آر ٹی بناشا اور ڈی سائٹ تو گئے کام سے۔"

"ہاں گماٹا بھی جانے والا ہے۔ سانپ پہلے اس کو چاٹیں گے بس لی کاٹ زندہ رہ جائے گا۔"

"دھت تیرے کی۔" محمود نے بھنا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

"کیوں کیوں۔ بے چاری ران کی شامت کیوں۔"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آخر یہ لی کاٹ کیوں نہیں مرتا۔ اس کے لیے تو ہمیں کوئی خاص ہتھیار ہی بنانا پڑے گا۔"

"بھئی یوں تو ہم اسے پستول کی گولی کا نشانہ بنا سکتے ہیں چاقو یا خنجر سے مار سکتے ہیں۔ لیکن اس طرح مارنے والا بھی

خطرے میں پڑتا ہے۔"

"بس تو پھر اس کے لیے تو وہی جال والی ترکیب ہی ٹھیک رہے گی۔" خان رحمان بولے۔

اس وقت انھوں نے دیکھا۔ سیکڑوں سانپ گماٹا کو لپٹ گئے تھے۔ اسے تڑپنے یا ہلنے جلنے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔

"لو بھئی! گماٹا رخصت ہوا۔" محمود بولا۔

"اور اب سانپ صرف اور صرف اس درخت پر حملہ آور ہوں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

اور واقعی۔ سانپوں کا لشکر اب ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایسے میں باسن کی آواز سنائی دی۔

"زہریلی سوئیاں ان سانپوں کے زہر سے ہی تیار کی جاتی ہیں۔ اور جن سانپوں کے زہر سے سفید گولیاں تیار کی جاتی ہیں، وہ سفید رنگ کے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کا زہر انسان کو ہلاک نہیں کرتا، اس لیے اس وقت میں نے انھیں تکلیف نہیں دی۔ تم لوگ اب ان سانپوں سے مقابلہ کرو۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ تمھارے چار چھوٹے ساتھی میرے پاس آچکے ہیں، ان کے بارے میں بھی کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں، جب چاہوں گا، انھیں بھی مسل دوں گا۔"

"شکریہ مسٹر باسن۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اس قسم کے دعوے ہماری دنیا میں لوگ عام طور پر کرتے ہی رہتے ہیں، لیکن زندگی اور موت تو بس ایک خدا کے ہاتھ ہے۔"

"ہو گی، یہاں میرے ہاتھ میں ہے سب کچھ۔" آواز آئی۔

"خیر۔ دیکھا جائے گا۔"

سانپ درخت سے ابھی کچھ فاصلے پر تھے کہ نہ جانے منور علی خان کو کیا سوجھی۔ یک دم درخت سے چھلانگ لگا دی۔

"ارے ارے۔ منور علی خان۔ یہ کیا۔ کیا تم سانپوں سے دست بدست جنگ کرو گے۔ ایک آدھ سانپ سے دست بدست جنگ تو خیر ہو سکتی ہے، لیکن اتنے سانپوں سے مقابلہ ناممکن ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے چلا کر کہا۔

"ہاں! میں جانتا ہوں۔ لیکن تم فکر نہ کرو کامران مرزا، میری بھی ساری زندگی جنگلوں میں کٹی ہے۔" انھوں نے جواب دیا اور ایک دوسرے درخت تک پہنچ گئے۔ اپنے تھیلے میں سے کوئی چیز نکال کر درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر نہ جانے کیا کرنے لگے۔ سب انھیں حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"خبردار منور علی خان۔ سانپ اب تمھارے نزدیک پہنچا ہی چاہتے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے گھبرا کر کہا۔

"بس میں بھی فارغ ہونے ہی والا ہوں۔" انھوں نے کہا۔

اور چند سیکنڈ میں اس درخت کے پاس سے ہٹ کر پھر اُس درخت کے نیچے پہنچ گئے جس پر سب چڑھے ہوئے تھے۔ اور جلدی جلدی اوپر چڑھنے لگے۔

"آخر تم نے اس درخت کے نیچے کیا کیا ہے؟" انسپکٹر کامران مرزا نے حیران ہو کر کہا۔

"بس دیکھتے جائیں۔"

"دیکھ تو ہم بہت غور سے رہے ہیں انکل۔ لیکن پلّے کچھ بھی نہیں پڑا۔" فاروق بولا۔

"کوئی بات نہیں۔ پلّے بھی پڑ جائے گا۔" وہ بولے۔

اس وقت سانپ درخت کے چاروں طرف آ گئے۔ وہ کانپ اٹھے، انھوں نے اپنی زندگی میں اتنا سنسنی خیز منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ اتنی بڑی تعداد میں کبھی سانپ ہی دیکھے تھے۔

"اف خدا۔ ہم ان سے کب تک لڑیں گے؟"

"جب تک زندگی ہے۔ ہمت ہے۔ ہمیں لڑنا ہی ہوگا ورنہ یہ تو چند منٹ میں اوپر آ جائیں گے اور ہمیں چٹ کر جائیں گے۔" خان رحمان بولے۔

"یا اللہ رحم!" اکرام کی کانپتی آواز سنائی دی۔

سانپ اب درخت پر چڑھ رہے تھے۔

"حملے کے لیے تیار ہو جائیں۔" منوّر علی خان چلّائے۔

انھوں نے اپنی اپنی شاخیں ہاتھوں میں لے لیں، دوسرے ہاتھ سے درخت کی شاخوں کو تھام لیا۔ اور نیچے کی طرف جھک گئے۔ جونہی سانپ ان کی شاخوں کی زد میں آئے انھوں نے تڑاتڑ شاخیں چلانا شروع کر دیں۔ سانپ چوٹ کھا کھا کر گرنے لگے۔ لیکن ان کے درخت پر چڑھنے کے عمل میں کوئی فرق نہ پڑا۔ وہ بدستور چلے آ رہے تھے۔ پھن اٹھا اٹھا کر انھیں دیکھ رہے تھے اور بڑھ رہے تھے، شاید وہ بھی انسانی خون کے پیاسے تھے۔

"بہت مشکل ہے۔ بہت مشکل ہے۔" خان رحمان کانپ کر بولے۔

"کیا بہت مشکل ہے انکل؟" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"ہم شاخیں چلاتے چلاتے تھک جائیں گے، لیکن سانپوں کے چڑھنے کا سلسلہ ختم نہیں ہو گا۔ سانپ اس قدر ہیں کہ ہماری شکست صاف نظر آ رہی ہے۔"

"ہاں، خان رحمان کا خیال درست ہے۔ میں نے یہ بات اس لیے نہیں کہی تھی کہ کہیں آپ لوگ شروع میں ہی ہمت نہ ہار جائیں۔"

"اوہ۔ پھر۔ پھر ہم کیا کریں؟"

"فاروق — تمھاری جیب میں لائٹر تو ہو گا۔"

"اس کی جیب میں تو دنیا جہان کی چیزیں ہوتی ہیں۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"اور تمھارا اپنی جیب کے بارے میں کیا خیال ہے۔" فاروق فوراً بولا۔

"بھئی اب جیبوں پر لڑنا نہ شروع کر دینا۔ لڑنے کے لیے سانپ ہی کیا کم ہیں — فاروق، میں نے تم سے لائٹر مانگا تھا۔" خان رحمان جھلا کر بولے۔

"جی ہاں — بالکل مانگا تھا — لیکن یہ حضرت دینے دیں، تب نا — ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے اپنا دایاں ہاتھ اسی وقت سے جیب میں ڈال رکھا ہے — اور امید ہے کہ بہت جلد لائٹر تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"وحشت تیرے کی — ایسی جیب کا آخر کیا فائدہ —" محمود تلملا کر بولا۔

"یہ کہ کسی بھی موقع پر اس میں سے کام کی کوئی بھی چیز نکالی جا سکتی ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"ایک لائٹر تو مل نہیں رہا۔ اور تو تم کیا نکالو گے؟" آفتاب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اچھا یہ بات ہے — تو یہ لو۔" یہ کہتے ہی فاروق نے جیب

میں سے ہاتھ نکالا اور خان رحمان کی طرف بڑھا دیا۔

"لیجیے انکل لائٹر۔"

"انکل لائٹر — دیکھا آپ نے انکل — آپ کو لائٹر کہہ رہا ہے۔" آصف چہکا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا، بھلا انکل لائٹر ہو سکتے ہیں۔" فاروق جھلا اٹھا۔

"ہو تو نہیں سکتے — تم تو کہہ رہے ہو۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"تم تینوں تو میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو۔"

"لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔" اخلاق کی آواز ابھری اور وہ مسکرا دیے۔

"ارے بھئی یہ کیا؟" انھوں نے خان رحمان کی آواز سنی۔

"جی کہاں — کیا؟"

"یہ میرے ہاتھ میں — تم نے جو چیز دی ہے، وہ کم از کم لائٹر نہیں ہو سکتا — ہاں یہ پنسل تراش ضرور ہو سکتا ہے۔"

"دیکھا — میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا، ایسی جیب کا کیا فائدہ۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"اس سے تو بہتر تھا، تم جیب میں صرف لائٹر رکھ لیتے — اس موقع پر کام تو آ جاتا — اور جیب سے نکالنے میں دیر تو نہ لگتی۔" آفتاب بولا۔

"واقعی فاروق! یہ تو بہت بڑی بات ہے۔ تم نے لائٹر کی بجائے پنسل تراش انکل کو دے دیا۔" آصف نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

"سب میرے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئے۔ یاد رکھو۔ میں بہت بڑی طرح انتقام لوں گا۔" فاروق نے غصے میں آ کر کہا۔

"یہ بات یاد رکھے گا فاروق بھائی۔ کہ ہم نے پنجے جھاڑ کے نہ ہاتھ دھوئے۔" اشفاق نے جلدی سے کہا۔

"ہاں۔ شکریہ۔ اب سنیے۔ میں ان کی باتوں کا کس قدر منہ توڑ جواب دیتا ہوں۔ انکل اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ پنسل تراش ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ لائٹر بھی ہے۔ آپ اس سے لگا سیاہ رنگ کا بٹن دبا کر تو دیکھیں۔ شعلہ نکلتا ہے یا نہیں۔"

"ارے!!! ان سب کے منہ سے نکلا اور پروفیسر داؤد اور خان رحمان بے ساختہ انداز میں مسکرا دیئے۔ انسپکٹر جمشید نے بُرا سا منہ بنایا اور بولے۔

"نہ جانے خان رحمان، لائٹر سے کیا کرنا چاہتے ہیں، تم نے بلا وجہ اتنا وقت ضائع کر دیا۔ پہلے ہی یہ بات کیوں نہ بتا دی۔"

"ان لوگوں نے مہلت ہی کب دی ابا جان۔" فاروق نے مسمسی

صورت بنائی۔

ان باتوں کے ساتھ ساتھ وہ بلا کی رفتار سے چھریاں بھی چلا رہے تھے اور سانپوں کو دھڑا دھڑ نیچے گرا رہے تھے۔ اب تک ایک سانپ بھی ان تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ ایسے میں خان رحمان کی آواز ابھری۔

"فاروق۔ تم درختوں پر چڑھنے میں سب سے زیادہ ماہر ہو۔ ذرا میرے ساتھ اوپر والی شاخوں پر آؤ۔"

"کیا ارادہ ہے انکل؟"

"بس تم آؤ۔"

وہ ان کے ساتھ اوپر چڑھنے لگا۔ باقی لوگ اپنی اپنی جگہ جمے رہے اور سانپوں پر شاخیں برساتے رہے۔

"اس طرف۔ درخت کا یہ حصہ بہت سوکھا ہوا ہے۔ یہیں بھی بہت باریک باریک شاخیں۔ لو فاروق تم ان شاخوں کو توڑ توڑ کر ایک گٹھا سا ہاتھ میں بنا لو۔"

"اور پھر آپ اس میں آگ لگائیں گے۔" فاروق بولا۔

"ہاں۔ اس قسم کے گٹھے بنا بنا کر ہم درخت کے چاروں طرف پھینک دیں گے، اس طرح سانپوں کی یلغار رک جائے گی۔"

"بھئی واہ۔ بہت شاندار ترکیب ہے۔" منور علی خان بولے۔

"تب پھر خان رحمان۔ تم ایک دو اور کو اپنے ساتھ ملا لو۔

تاکہ گٹھے جلدی جلدی تیار ہو جائیں۔"

"ٹھیک ہے، اشفاق، اخلاق۔ تم بھی اوپر آ جاؤ اور باریک باریک شاخیں توڑنا شروع کر دو۔"

"جی بہتر۔ لیکن ہم درختوں پر چڑھنے میں اتنے ماہر نہیں ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم تیزی نہ دکھاؤ۔ احتیاط سے اوپر آؤ۔" وہ بولے۔

ادھر فاروق پہلا گٹھا تیار کر چکا تھا، خان رحمان نے لائٹر سے اسے آگ دکھا دی۔ اس نے فوراً آگ پکڑ لی۔

"بھئی واہ۔ یہ تو بہت ہی کام کا ہتھیار ثابت ہو گا۔" فاروق خوش ہو کر بولا۔

"ہاں واقعی۔ یہ ترکیب خالی نہیں جائے گی۔"

"پھینک دو فاروق۔ اس درخت سے کچھ فاصلے پر پھینک دو۔" خان رحمان بولے۔

"لیکن انکل۔ اسے پھینکنا تو مناسب نہیں ہو گا۔"

"اور کیا اسے چاٹو گے۔" آفتاب نے جل کر کہا۔

"نہیں۔ چاٹنے کا شوق تمھی کو مبارک۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس طرح تو ہر مرتبہ لائٹر جلانا پڑے گا۔ اور اس طرح لائٹر کا پٹرول ختم ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے ہمیں

لائٹر کی کسی اور جگہ بھی ضرورت پڑے۔ اس لیے کیوں نہ انکل اس جلتے ہوئے گٹھے کو ہاتھ میں پکڑے رہیں اور ہم گٹھے بنا بنا کر اس سے جلاتے رہیں اور نیچے پھینکتے رہیں۔"

"بہت خوب۔ یہ اور بھی مناسب ہو گا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

اور انھوں نے اس ترکیب پر عمل شروع کر دیا۔ جونہی جلتے ہوئے گٹھے نیچے گرنا شروع ہوئے، سانپوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ وہ آگ سے دور بھاگنے لگے۔ لیکن جلد ہی انھوں نے اس طرف بھی گٹھے پھینک دیے۔ اور درخت کے چاروں طرف آگ کا ایک حلقہ سا روشن ہو گیا۔

سانپوں کی یلغار اب مکمل طور پر رک گئی تھی۔ البتہ جو سانپ حلقے کے اندر تھے، وہ بدستور درخت پر چڑھنے میں مصروف تھے۔ لیکن ان کی تعداد بھی کتنی تھی اور یہ کب تک ٹک سکتے تھے۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر وہ ان کا صفایا کر چکے تھے۔

اب ان کے سامنے ایک ہولناک ترین منظر تھا۔ سانپ آگ کے حلقے کے چاروں طرف جمع تھے۔ اور ایک جگہ رک گئے تھے۔ البتہ ایسے میں بھی ان کے جسم کلبلا رہے

تھے۔

"اف خدا۔ آخر ہم کب تک آگ روشن رکھ سکیں گے۔"

"فکر نہ کرو۔ اب گٹھے بنا بنا کر دور دور پھینکنا شروع کر دو۔ ان کے اوپر برسانا شروع کر دو۔ اب ہم سب فارغ ہو چکے ہیں، سب کے سب یہ کام شروع کر سکتے ہیں۔ اب گٹھے بہت تیزی سے بنیں گے اور زیادہ تعداد میں بنیں گے۔" انسپکٹر جمشید بلند آواز میں بولے۔

اب وہ سب کے سب خشک شاخوں کو توڑ توڑ کر آگ دکھا دکھا کر سانپوں پر پھینکنے لگے۔ سانپوں میں طوفان سا مچ گیا۔ وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر بھاگے۔ اب دھواں بھی بہت پھیل گیا تھا اور یہ دھواں ان کی آنکھوں کو بھی لگ رہا تھا۔ اچانک آگ کے شعلے اس درخت کی شاخوں تک پہنچ گئے جس پر وہ سوار تھے۔

"ارے باپ رے۔ درخت نے آگ پکڑ لی ہے۔ اب ہمیں نیچے چھلانگیں لگانا ہوں گی۔" خان رحمان بولے۔

"کوئی بات نہیں۔ سانپ اب اس قابل نہیں رہے کہ ہماری طرف رخ بھی کر سکیں۔ اب انھیں اپنی پڑی ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

جب انھوں نے دیکھا کہ درخت نے کافی حد تک آگ پکڑ لی

اور اب اس پر ٹھہرے رہنا ناممکن ہو گیا ہے تو انھوں نے ہاتھوں میں جلتا ہوا ایک ایک گٹھا لیا اور چھلانگیں لگا دیں۔

"اس درخت کے نزدیک ہرگز نہ جانا۔ جس کے نزدیک میں نے کوئی کام کیا تھا۔" منور علی خان چلائے۔ اور انھوں نے رخ بدل لیے۔

نزدیک ہی ایک درخت آگ سے محفوظ کھڑا تھا۔ اب وہ اس کی طرف بڑھ گئے۔ لیکن اس پر چڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ اسی وقت انھوں نے یہ عجیب منظر دیکھا تھا کہ سانپ گویا دم دبا کر بھاگ رہے تھے۔ چند منٹ میں ہی میدان سانپوں سے خالی ہو گیا، ہاں۔ مردہ اور زخمی ہونے والے سانپ ضرور پڑے رہ گئے تھے۔ یہ بھی ان کے لیے خطرناک تھے۔ اس لیے انھوں نے ان سے دور ہو جانے کے لیے قدم اٹھائے ہی تھے کہ ٹھٹھک کر رک گئے۔

سامنے لی کاف کھڑا تھا۔ اور اس کا حلیہ عجیب ہو رہا تھا۔

باس

"بھئی واہ ۔ اب آئے گا مزا ۔" لی کاٹ ہنسا۔
"کیا مطلب ۔ مسٹر لی کاٹ ۔" فاروق نے کانپ کر کہا۔
ان کی نظریں لی کاٹ پر جم کر رہ گئیں ۔ اس کے چہرے پر جگہ جگہ سانپوں کے کاٹنے کے نشانات تھے ۔ ان نشانات پر سیاہ رنگ کا خون جم گیا تھا ۔ گویا ایسے نشانات اس وقت اس کے پورے جسم پر تھے ۔
"مزا تو پہلے ہی آ رہا ہے ۔ مدت بعد مجھے پوری خوراک ملی ہے ۔ اور اگر باس مجھے سانپوں کے باڑے میں آزادانہ جانے کی اجازت دے دیں تو میں ساری زندگی باس کے پاؤں دھو دھو کر پینے کے لیے تیار ہوں۔"
"پاؤں تو اس وقت دھو دھو کر پی سکتے ہو جب باس تمہارے سامنے آتا ہو مسٹر لی کاٹ ۔ اسے تو تم نے آج تک دیکھا بھی نہیں ۔" فاروق بولا۔

"تو پھر ٹھیک ہے ۔ ہاں تو سنو ۔ اب میری طاقت ہزار گنا بڑھ گئی ہے ۔ نہ جانے کتنے سانپوں کا زہر اس وقت میری رگوں میں دوڑ رہا ہے ۔ میرے اندر آگ سی لگی ہوئی ہے، یہ آگ کس قدر پرلطف ہے ۔ میں بیان نہیں کر سکتا ۔ آؤ ۔ دوستو ۔ اب میں تمہاری چٹنی بنا کر رکھ دوں ۔ تم کتنے ہی پھرتیلے کیوں نہ ہو ۔ میں تم تک ضرور پہنچوں گا۔"
یہ کہتے ہی اس نے ان پر چھلانگ لگا دی ۔ وہ بھڑک کر ادھر ادھر بھاگے ۔ انہیں زخمی اور مردہ سانپوں سے بھی خود کو بچانا تھا ۔ اور لی کاٹ سے بھی ۔ سب کے سب ادھر ادھر ہو گئے ۔ بلکہ ایک دائرے میں کھڑے ہو گئے ۔ لی کاٹ اکیلا اس دائرے میں کھڑا رہ گیا۔
"آؤ نا بھئی ۔ میری طرف کیوں نہیں آتے ۔" وہ ہنسا۔
"ہم ۔ میں ۔ میں آؤں گا تمہارے مقابلے میں ۔" منور علی خان بولے۔
"نہیں منور علی خان ۔ تم اس سے مقابلہ نہیں کر سکو گے ۔ ٹھہرو ۔ میں دیکھتا ہوں ۔ یہ کتنا خطرناک ہے ۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے اور دائرے سے نکل کر آگے بڑھے۔
"نہیں انسپکٹر کامران مرزا ۔ یہ حق میرا ہے کہ اس سے مقابلہ کروں ۔ ہاں میری موت کے بعد آپ ضرور میدان میں آ

جائے گا۔"

"خیر — جیسے آپ کی مرضی —" انھوں نے کندھے اچکائے۔

"م م — میں تو کہتا ہوں — مجھے مقابلہ کرنے دیا جائے۔" منور علی خان بے چین ہو کر بولے۔

"نہیں منور علی خان — تم نہیں لڑ سکو گے —" انسپکٹر کامران مرزا نے پھر فوراً جواب دیا۔

اتنی دیر میں انسپکٹر جمشید دائرے کے درمیان میں آ گئے۔ لی کاف پہلے ہی تیار کھڑا تھا — اس سے پہلے کہ وہ حملہ کرتا — خان رحمان چلا اٹھے۔

"میری ایک تجویز ہے مسٹر لی کاف۔"

"کیا مطلب — کیسی تجویز۔"

"یہاں اِدھر اُدھر سانپ ہی سانپ بکھرے پڑے ہیں — کیوں نہ ہم یہاں سے ہٹ کر یہ جنگ لڑیں۔"

"نہیں — مقابلہ یہیں ہو گا — اگر تم نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو میں تمھاری پشت پر آن کی آن میں پہنچ جاؤں گا۔"

"میرا بھی خیال ہے — مقابلہ یہیں ٹھیک رہے گا۔" منور علی خان بول اٹھے۔

"یہ — یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں منور علی خان —" خان رحمان

نے حیران ہو کر کہا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں — وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں یہ جنگ جس قدر جلد ممکن ہو جیت لینی چاہیے — کیونکہ اس کے بعد صرف باس بچ جائے گا — وہ اگر مقابلے پر نہ آیا تو ہم لانچ میں بیٹھ کر یہاں سے نکل سکیں گے۔"

"اور باس کو اس طرح چھوڑ کر جا سکیں گے — اور باس کے پاس فرزانہ، فرحت، شوکی اور مکھن جو پہنچ گئے ہیں، ان کے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے —" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"اوہ ہاں — یہ بات تو میں بھول ہی گیا — خیر یہ بعد کی بات ہے — پہلا مسئلہ تو مسٹر لی کاف سے نبٹنے کا ہے۔"

اسی وقت لی کاف نے طوفان کی سی تیزی سے انسپکٹر جمشید پر چھلانگ لگائی — ادھر وہ اپنی جگہ سے اچھلے — دونوں گرنے سے بال بال بچے — اب پھر لی کاف نے چھلانگ لگائی — اس دفعہ انسپکٹر جمشید نے اپنی جگہ سے چھلانگ نہیں لگائی — البتہ جھکائی دے کر لی کاف کے پہلو سے نکل گئے — لی کاف تیزی سے پلٹا اور دائیں ہاتھ کا مکا ان کے منہ پر مارا — وہ لڑھک کر اس مکے کو بچا گئے — لی کاف نے ان پر گرنے کے لیے چھلانگ لگائی اور منہ کے بل زمین پر آ رہا — انھوں نے اس کی ناک سے سیاہ خون نکلتے دیکھا — اب جو وہ اٹھا تو پہلے سے کئی گنا

زیادہ خوفناک لگ رہا تھا۔ اس بار اس نے ایک اندھا دُھند قسم کی چھلانگ لگائی، ادھر انسپکٹر جمشید نے اس سے بچنے کے لیے ایک درخت کی طرف چھلانگ لگائی۔ یہ دیکھ کر منور علی خان بجلی کی سی تیزی سے تڑپے اور ان کی طرف بڑھے۔ دوسرے ہی لمحے انھوں نے ان کا بازو تھام لیا۔ انھیں ایک زور دار جھٹکا لگایا اور درخت کی طرف بڑھنے سے رک گئے۔ نہ صرف رک گئے بلکہ درخت کے راستے سے ایک طرف بھی ہو گئے۔ اور لی کاف انھیں زد میں لینے کے لیے درخت کی طرف گویا اڑا چلا آ رہا تھا۔

"یہ۔ یہ آپ نے کیا کیا۔" انسپکٹر جمشید چلا اٹھے۔

دوسروں کا بھی مارے حیرت کے بُرا حال تھا۔ لیکن پھر فوراً ہی ان سب کو جواب مل گیا کہ منور علی خان نے ایسا کیوں کیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے انھوں نے لی کاف کی بھیانک چیخ کی آواز سنی۔ اور اسے منہ کے بل گرتے دیکھا۔ منور علی خان کے چہرے پر ایک دل کش مسکراہٹ تیر گئی۔

انھوں نے دیکھا۔ لی کاف کی ایک ٹانگ میں لوہے کا ایک آنکڑا پھنسا ہوا تھا۔ یہ وہی درخت تھا جس کے پاس رک کر منور علی خان کوئی کارروائی کر گئے تھے۔

○

"اُف خدا۔ یہ۔ یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"انکل منور علی خان نے اپنا کام دکھا دیا۔ لی کاف کو درندوں کے انداز میں پکڑ لیا۔" فاروق ہنسا۔

"تو آپ اسی لیے اس وقت درخت سے اتر کر اس طرف گئے تھے۔ اور اسی لیے کہہ رہے تھے کہ لڑائی اس جگہ مناسب رہے گی۔" آفتاب نے کہا۔

"ہاں! یہی بات تھی۔" وہ بولے۔

ان کی نظریں لی کاف پر جم گئیں۔ وہ اپنی ٹانگ آنکڑے میں سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے چہرے پر شدید غصے اور جھنجھلاہٹ کے آثار تھے۔ چہرہ مارے غصے کے بالکل سیاہ نظر آ رہا تھا۔

"مشکل ہے۔ مسٹر لی کاف۔ تم اس آنکڑے سے اپنی ٹانگ نہیں نکال سکو گے۔ اس کی تو بس اب ایک ہی صورت ہے۔ یا میں آگے بڑھ کر تمھاری ٹانگ چھڑا دوں۔ یا پھر تم اپنی ٹانگ کو اس جگہ سے کاٹ ڈالو۔ کاٹنے کے لیے تمھارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہو گا۔ لہٰذا تمھیں جھٹکے مار مار کر اپنی ٹانگ

کو اس جگہ سے کاٹنا پڑے گا۔ جو شاید دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہو گا۔ زندگی کے باقی دن اس درخت سے ٹیک لگا کر گزار دو۔ یا پھر آواز دو اپنے اس باس کو۔ جس کے تم پاؤں دھونے کے لیے تیار تھے۔ کیا وہ تمھاری مدد کے لیے نہیں آئے گا؟" منور علی خان کہتے چلے گئے۔

"باس۔ آپ سن رہے ہیں؟"

"ہاں لی کاف۔ سن رہا ہوں۔ اور اب میں وہ قدم اٹھانے لگا ہوں۔ جس کے بارے میں میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا؟" باس کی آواز سنائی دی۔

"کون سا قدم باس۔" لی کاف نے حیران ہو کر کہا ادھر وہ سب چونک اٹھے۔ ان کے دل دھک دھک کرنے لگے۔

"میں دوسری دودھیا دیوار اوپر اٹھانے لگا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چلّا کر بولے۔

"مطلب یہ کہ اس دودھیا دیوار کے دوسری طرف میری قوم بکھری ہوئی ہے۔ وہ تعداد میں اس قدر بڑھ گئی ہے کہ رہائش کی جگہ نہیں بچی۔ وہ ایک دوسرے کو بھنبھوڑ ڈالتی ہے۔ مار ڈالتی ہے۔ لیکن تعداد ہے کہ پھر بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ یہی ہے میرا مسئلہ۔ ہم نے سائنس میں تو بے تحاشا ترقی کر لی۔ لیکن اپنی تعداد کو کم کرنے کے قابل نہیں ہو سکے۔ اس سلسلے

میں جو بھی قدم اٹھائے گئے، ان کے نتیجے الٹے نکلے۔ اب دودھیا دیوار کے دوسری طرف اربوں کے حساب سے مخلوق موجود ہے۔ ان کے لیے مجھے ایک وسیع دنیا کی ضرورت ہے۔ کیونکہ میں ان کا بادشاہ ہوں۔ وہ مجھے اپنا خدا مانتے ہیں، میرے آگے سر جھکاتے ہیں۔ لہذا میرا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ میں انھیں ایک بڑی دنیا خالی کر دوں۔ بڑی دنیا تم لوگوں کے پاس ہے۔ اب اس کو خالی کرانے کا مسئلہ تھا۔ اس کے لیے میں نے بہت غور و خوض کیا۔ اور پھر ایک بہت بڑا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے پر عمل کی وجہ سے تم لوگ یہاں تک پہنچ گئے ہو۔ میں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ اس سفید گولی کے ذریعے اوپر اپنے ہزاروں غلام بنائے۔ پھر ان غلاموں کے ذریعے کام لینا شروع کیا۔ ہر ملک کی قیمتی ترین چیزیں اڑائیں۔ اور اب دوسرا قدم یہ اٹھاؤں گا کہ تمام ملکوں میں آپس میں غلط فہمیاں پیدا کر دوں گا۔ یہ کہ اس کی قیمتی چیزیں، اس کے پاس ہیں اور اس کی قیمتی چیزیں فلاں کے پاس ہیں۔ اس طرح ان میں آپس میں جنگ شروع ہو جائے گی۔ پوری دنیا جنگ کی بھٹی میں کود پڑے گی۔ یوں بھی یہ جنگ ایٹمی جنگ ہو گی۔ اس میں تمھاری دنیا کی آبادی کا بہت بڑا حصہ تہس نہس ہو جائے گا۔ جو بچ جائے گا۔ اسے بھی بدگمانیاں پھیلا پھیلا کر آپس میں لڑوا دوں گا اور پھر یہ

ہو گا کہ اوپر کی دنیا میری قوم کے لیے خالی ہو جائے گی۔ پھر ہم اوپر چلے جائیں گے۔ پوری دنیا پر ہمارا قبضہ ہو گا۔ اور تم لوگوں کا کہیں نام و نشان تک نہیں ہو گا۔ یہ ہے میرا منصوبہ۔ کہو۔ کیسا ہے؟"

وہ کانپ اٹھے۔ جسموں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"تو اسی لیے ہمارے ملک کا ریکارڈ چوری کیا گیا۔ سونے کا جہاز اڑایا گیا۔" انسپکٹر جمشید بول اٹھے۔

"ہاں۔ جہاز کی چوری کا خیال تمہارے ایک دشمن ملک کی طرف منتقل کر دوں گا اور ریکارڈ کی چوری کا الزام دوسرے دشمن ملک کی طرف۔ اس طرح دو دشمن ملکوں میں تمہاری ٹھن جائے گی۔ اسی طرح ان دونوں ملکوں کی کچھ قیمتی ترین چیزیں پہلے ہی اڑا چکا ہوں۔ ان کا الزام تمہارے دوست ملکوں پر لگا دیا جائے گا۔ لہذا وہ بھی اس جنگ میں شریک ہو جائیں۔ اس طرح یہ سلسلہ پوری کی پوری دنیا میں پھیل جائے گا اور ایک ہی وقت میں ساری دنیا میں جنگ چھڑ جائے گی۔ جس میں جدید ترین ہتھیاروں کا استعمال بے دریغ ہو گا۔ اس قدر خوفناک اور ہولناک جنگ دنیا کے تختے پر کبھی نہ پھیلی ہو گی۔"

باس خاموش ہو گیا۔ وہ ساکت رہ گئے۔ چند سیکنڈ بعد باس

کی آواز ابھری۔

"میں نے اپنی قوم کو اس حصے میں آنے کی کبھی اجازت نہیں دی۔ لیکن آج تم لوگوں کے خاتمے کے لیے ان لوگوں کو اس طرف لانا ہو گا۔ کیونکہ تم نے میرے تمام غلاموں کو ختم کر دیا ہے۔ اب میں اپنی قوم کے لوگوں کے ذریعے تمہیں ختم کر دوں گا۔ وہ دیکھو۔ تم اس دودھیا دیوار کو دیکھ رہے ہو نا۔ جو آسمان کی بلندی تک جا رہی ہے۔ اب وہ اوپر اٹھنا شروع ہو گی۔ میں نے اپنی قوم کو پہلے ہی دیوار کے پاس پہنچ جانے کی ہدایت کر دی ہے۔ جونہی دیوار اٹھے گی۔ وہ بھرا مار کر ادھر آ جائیں گے اور اتنی بڑی تعداد میں آ جائیں گے کہ یہاں تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں بچے گی۔ تم لوگوں کو وہ ایک ایک ہاتھ بھی رسید کر دیں گے تو تم مر جاؤ گے۔ آخر کتنے ہاتھ روک سکو گے۔"

وہ لرز کر رہ گئے۔ اسی وقت انھوں نے دور، بہت دور سفید دیوار کو آہستہ آہستہ اٹھتے دیکھا، بالکل اس طرح جیسے لوہے کا کوئی دروازہ اوپر اٹھتا ہے۔ یا سینما کی سکرین کے آگے ڈالا گیا فاضل پردہ اوپر اٹھایا جاتا ہے۔

"اف خدا۔ اب کیا ہو گا؟" اخلاق چلایا

"ہو گا کیا۔ بس موت آ گئی۔" اکرام بولا۔

"ہم۔ ہم لانچ کو چلا سکتے ہیں۔" فاروق نے چلّا کر کہا۔

"ہاں۔ آؤ جلدی کرو۔" خان رحمان چلّائے۔

"ل۔ لیکن خان رحمان۔ تم بھول رہے ہو۔ فرزانہ، فرحت شوکی اور مکھن کا کیا کیا جائے۔ ہم ان کے بغیر کس طرح جا سکتے ہیں۔"

"اور ویسے بھی۔ جب تک میں نہ چاہوں۔ وہیل کے منہ پر لگا ہوا بٹن نہیں دبا سکتے۔" باس کی آواز سنائی دی۔

وہ دھک سے رہ گئے۔ دیوار کی طرف نظریں اٹھ گئیں۔ دیوار ابھی صرف ایک فٹ اٹھی تھی۔ لیکن دوسری طرف موجود قوم اس ایک فٹ خلا میں سے بھی نکل نکل کر ادھر آنے لگی۔ انسپکٹر جمشید، محمود اور فاروق تو اچھل ہی پڑے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ان سب لوگوں کی شکل صورت اس ارٹیکا جیسی تھی جس سے ان کی ٹکر کچھ عرصہ پہلے ہوئی تھی۔ جب وہ گماٹا کو آلۂ کار بنا کر[1] لائے تھے۔

"اُف خدا۔ یہ تو سب کے سب ارٹیکا ہیں۔"

"ارٹیکا۔ کیا مطلب؟" انسپکٹر کامران مرزا حیران ہو کر بولے۔

---

[1] انوکھی چال اور چال کا جواب پڑھیئے۔

انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی ارٹیکا سے مقابلے کی کہانی سنا ڈالی۔

"وہ ارٹیکا مر گیا تھا، لیکن اس نے کہا تھا۔ ایک میں ختم ہو گیا تو کیا ہے۔ ابھی تو نہ جانے کتنے ارٹیکا موجود ہیں۔ اس وقت ہم نے یہ سمجھا تھا کہ وہ بڑھانک رہا ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ خان رحمان۔ اب ہم کیا کریں۔"

"ہم۔ مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے جان دیں گے جمشید۔ اس کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ ان شاخوں اور محمود کے چاقو کے علاوہ ہمارے پاس ہتھیار بھی تو کوئی نہیں۔"

"اللہ مالک ہے۔"

اب بے ہنگم سا شور گونجنے لگا۔ وہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں اس طرف آ چکے تھے اور چلّاتے شور مچاتے ہاتھ ہلاتے دوڑے چلے آ رہے تھے۔

"میرا خیال ہے۔ ہمیں وہیل کے منہ کے پاس ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ ورنہ ہم ان کے ریلے میں ہی دب جائیں گے۔"

"ہوں۔ یہی مناسب رہے گا۔"

"مسٹر باس۔ کیا یہ مناسب نہیں ہو گا کہ ہمارے جو چار

ساتھی تمھارے پاس موجود ہیں، انھیں بھی ہمارے پاس بھیج دو۔"
انسپکٹر جمشید بلند آواز میں بولے۔

"نہیں — یہ نہیں ہو سکتا۔" باس بولا۔

"خیر جیسے تمہاری مرضی۔"

باس کی قوم لمحہ بہ لمحہ نزدیک آ رہی تھی — وہ وہیل کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔

"ان — جمشید — ہمارے بچ نکلنے کے کوئی امکانات نہیں — کیونکہ ہم کہیں بھاگ بھی تو نہیں سکتے۔" انسپکٹر کامران مرزا کے لہجے سے مایوسی صاف جھلک رہی تھی۔

"یہ کیا خان رحمان — تم مایوس ہو گئے۔"

"تو اور کیا کروں۔" وہ بولے۔

"لیکن انکل — مایوسی تو گناہ ہے۔" فاروق بولا۔

"اور ہاں — میں یہ بھی جانتا ہوں — لیکن ان حالات میں مایوس نہ ہوں تو کیا کروں۔" خان رحمان بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"اللہ پر بھروسا۔" اشفاق فوراً بولا۔

"ہوں — بات تو ٹھیک ہے — اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے — وہ تو سب کچھ کر سکتا ہے۔" خان رحمان کی آواز میں زندگی دوڑ گئی۔

لیکن پھر اچانک ان کے ہاتھ رک گئے — وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹے۔ ان کے چہروں پر خوف دوڑ گیا — انھوں نے دیکھا — ایک سفید دھواں سفید عمارت سے بادل کی صورت میں اٹھا تھا — اس بادل کو دیکھ کر وہ وہشت زدہ ہو گئے اور سر پہ پیر رکھ کر بھاگے۔

"ارے — یہ انھیں کیا ہوا؟" محمود نے مری مری آواز میں کہا

"شش — شاید — انہیں سفید دھواں ہو گیا۔" فاروق لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔

وہ سب گر چکے تھے — بے دم تھے — سانس بھی مشکل سے لے رہے تھے — لیکن ایسے میں بھی حیرت کا عالم انہیں اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا — کہ آخر وہ لوگ واپس کیوں پلٹ گئے — اور پھر سفید بادل ان کے اوپر سے گزر گیا — یہ دھواں سا تھا — یہ دھواں ان کے نتھنوں میں بھی لگا اور پھر ان کے سر زور سے چکرائے — دوسرے ہی لمحے ان کے ذہن تاریکیوں میں ڈوب گئے۔

کتنی ہی دیر وہ ساکت کھڑے رہے — آخر سب سے پہلے انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا کی آنکھیں کھلیں — پھر سبھی نے آنکھیں کھول دیں۔

"آپ لوگ ٹھیک تو ہیں۔" ایک آواز ابھری۔

"محمود۔ تم اپنا چاقو مجھے دے دو۔"

"جی بہتر۔" اس نے کہا اور چاقو انہیں دے دیا۔

اب دشمن بہت نزدیک آ گیا تھا۔ وہ سب کے سب نہتے تھے۔ دشمن بھی نہتا تھا۔ لیکن تعداد میں ہزاروں گنا زیادہ تھا۔ ان کے چہرے عجیب و غریب سے تھے۔ لمبوترے۔ گال پچکے ہوئے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ اس وقت کسے فرصت تھی کہ ان کے حلیوں پر نظر کرتا۔ اس وقت تو سب کو اپنی جانوں کی پڑی تھی۔ اور ان کے لیے گویا چھوٹی قیامت آ گئی تھی۔

انسپکٹر جمشید چاقو ہاتھ میں لے کر چند قدم آگے بڑھ گئے۔ ایسے میں خان رحمان بولے۔

"ایک دائرہ بنا لو۔ منہ ان لوگوں کی طرف کر لو۔ اس طرح یہ صرف سامنے سے ہم پر حملہ کر سکیں گے۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔"

وہ فوراً دائرے کی صورت میں کھڑے ہو گئے۔ اور اس وقت دشمن ان کے سروں پر پہنچ گئے۔ ان پر تابڑ توڑ ہاتھ پڑنے لگے۔ انھوں نے بھی خوب ہاتھ پیر چلائے۔ لیکن کب تک۔ آخر کب تک چلاتے۔ آہستہ آہستہ ان کے ہاتھ سست پڑنے لگے۔ سروں پر پڑنے والے ہاتھوں کی بارش اور تیز ہو گئی۔

"ہاں فرزانہ۔ خدا کا شکر ہے۔ ہم ٹھیک ہیں۔" خان رحمان بولے پھر اچھل پڑے۔

"ارے۔ مگر۔ فرزانہ۔ تم یہاں کیسے۔ پہنچ گئیں۔ تم تو باس کے پاس تھیں۔"

"صرف میں ہی نہیں۔ میرے ساتھ فرحت، شوکی اور مکھن بھی ہیں۔ بلکہ ایک اور صاحب بھی ہیں۔"

اب انھوں نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں۔ وہ چاروں ایک آدمی کے گرد کھڑے نظر آئے۔ وہ شخص اوندھے منہ پڑا تھا۔ اور شاید مکمل طور پر بے ہوش تھا۔

"یہ۔ یہ کون ہے۔" محمود ہکلایا۔

"باس!!!"

"کیا!!!" وہ ایک ساتھ چلائے

تم ایک سانپ ہو

وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھیل گئیں۔ انسپکٹر جمشید نے جلدی سے باس کو سیدھا کر دیا اور پھر ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا.

"ارٹیکا؟"

"ہاں! یہ ارٹیکا ان سب کا سربراہ ہے۔" فرزانہ نے کہا.

"لیکن فرزانہ۔ یہ سب ہوا کیسے؟" انسپکٹر کامران مرزا بولے.

"ہم وہیل کے منہ سے پانی میں کود گئے تھے۔ اور ایک تالاب کے کنارے پہنچ گئے۔ یہ تالاب اس سفید عمارت کے پچھلی طرف ہے۔ اور شاید باس نے اپنے آنے جانے کے لیے بنایا تھا۔ لیکن عمارت کا دروازہ کھلنے کی وجہ سے باس کو پتا چل گیا کہ ہم عمارت تک پہنچ گئے ہیں۔ اس نے ہمیں ایک کمرے میں بیٹھ کر ٹی وی سکرین پر سارا نظارہ کرنے کی ہدایت کی۔ ہم بیٹھے سب کچھ دیکھتے رہے۔ پھر میں غیر محسوس طور پہ کرسی سے

کمرے کے فرش پر بیٹھ گئی اور لیٹ کر کمرے کے درمیانی حصے کی طرف بڑھی۔ یہاں ایک گنبد نما ابھار سا بنا ہوا تھا۔ باس اس وقت اپنی قوم کو دیوار پار کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس لیے میری طرف توجہ نہ دے سکا۔ میں نے اس گنبد میں جھانکا تو نیچے باس بیٹھا نظر آیا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ اور تو کچھ نہ سوجھا۔ گنبد میں داخل ہو کر اس پر چھلانگ لگا دی۔ میں عین اس کے سر پر گری۔ وہ بالکل بے فکر تھا۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں، وہ ہم سب کو ٹی وی سکرین پر بخوبی دیکھ رہا ہے، لہٰذا اس کے علم میں آئے بغیر ہم کوئی حرکت نہیں کر سکتے۔ لیکن وہ بھول گیا۔ کہ جرأت کرنے والے کسی سے پیچھے رہنا نہیں جانتے۔ چنانچہ سبھی نے جرأت سے کام لیا اور اس پر چھلانگ لگا دی۔ فرحت نے بھی دیر نہ لگائی اور کود گئی۔ ہم دونوں اس سے گتھم گتھا ہو گئیں۔ ایسے میں شوکی اور ممن نے بھی کمال جرأت کا مظاہرہ کیا۔ اور نیچے آ گئے۔ اسی وقت میرے ہاتھ پھل کاٹنے والی چھری لگ گئی۔ وہ پھلوں کی پلیٹ میں رکھی تھی۔ بس پھر کیا تھا۔ میں نے چھری اس کے پہلو میں گھونپ دی۔ یہ تکلیف سے دوہرا ہو گیا۔ میں نے اسی وقت چھری کی نوک اس کے دل پر رکھ دی۔ اور کہا کہ اپنی قوم کو واپس جانے پر مجبور

کر دے۔ اس نے خوف زدہ ہو کر ایک بٹن دبا دیا۔ اس کے دبتے ہی سفید عمارت سے سفید دھوئیں کا ایک بادل نکلا۔ اور اس کی قوم بھاگنے لگی۔ اس کے بعد ہم نے اس سے کہا کہ دیوار نیچے گرا دے۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ بس اس کے بعد ہم اسے یہاں لے آئے۔"

"وہ مارا۔ اُف۔ کیا کام دکھایا۔" خان رحمان بچوں کی طرح اچھل پڑے۔

"ابھی یہ زندہ ہے۔ اور ہمارے قبضے میں ہے۔ ہم آبدوز نیچے منگوا سکتے ہیں۔ ستون کے راستے بھی اوپر جا سکتے ہیں۔ اور اس کے بعد آپ سوچ بھی سکتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہو گا۔" فرزانہ یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"پہلے تو اسے ہوش میں لانا ہو گا۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید اس پر جھک گئے اور پھر اتنے زور سے اچھلے کہ کئی فٹ دور جا گرے، ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ارٹیکا بجلی کی طرح تڑپا تھا، اٹھتے ہی اس نے دونوں ہاتھ گھمائے ایک مکا انسپکٹر کامران مرزا کے لگا، تو دوسرا خان رحمان کے۔

دونوں الٹ گئے، اب اس نے منور علی خان کی طرف چھلانگ لگائی لیکن اس کے راستے میں اکرام آ گیا۔ اکرام کے پیٹ میں اس کی ایک لات لگی اور وہ دھڑام سے گرا۔ اب منور علی خان اس کے سامنے تھے، اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے، ارٹیکا ان پر جا پڑا اور وہ چاروں شانے چت زمین پر آ رہے۔ ان کے منہ اور سینے پر تابڑ توڑ مکے برسا کر وہ پھر اٹھا اور ان کی طرف بڑھا۔ وہ بوکھلا کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ ارٹیکا نے محمود کی طرف چھلانگ لگائی۔ محمود بھڑک کر ایک طرف ہٹا اور آفتاب سے ٹکرا گیا، دونوں دھڑام سے گرے، اتنے میں وہ آصف پر حملہ آور ہو چکا تھا، اچانک اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا، انھوں نے دیکھا، اس کے سر کے بال انسپکٹر جمشید کے ہاتھ میں تھے اور وہ اسے پیچھے کی طرف کھینچ رہے تھے، اس کا سر کمر کی طرف مڑتا چلا گیا، یہاں تک کہ وہ نیچے گرا، نہ جانے کیا بات تھی۔ بال ہاتھ میں آتے ہی گویا اس کا سارا دم خم نکل گیا، انہیں بہت حیرت ہوئی۔

"ارے بھئی کیا ہوا، یا تو اتنے زور شور سے لڑائی شروع کی تھی یا صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ ایسا بھی کیا۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

"اپنے والد سے کہو، میرے بال چھوڑ دیں، پھر دیکھو، میں تم سب کو کیسا ناچ نچاتا ہوں۔"

"کیوں۔ کیا تم خود بالوں کو نہیں چھڑوا سکتے۔" مکھن حیران ہو کر بولا۔

"نہیں۔ یہی تو مشکل ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو لو۔ میں تمہارے بال چھوڑ رہا ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے اور اس کے بال چھوڑ دیے۔ وہ فوراً ان سے کئی قدم دور چلا گیا اور پھر ان کی طرف آیا۔ لیکن اب شاید اس کا ستارہ گردش میں آ چکا تھا۔ منہ کے بل زمین پر گرا اور ساتھ ہی انسپکٹر جمشید نے اپنا پاؤں اس کی کمر پر دے مارا۔ وہ بھینسے کی طرح ڈکرایا اور پلٹتے ہوئے دونوں پیر ان کے سینے پر دے مارے، وہ لڑکھڑا گئے۔ اسی وقت انسپکٹر کامران مرزا نے ارٹیکا پر چھلانگ لگائی۔ اور الٹ کر گرے، اس نے دونوں پیروں پر انھیں اچھال دیا تھا۔ یہ دیکھتے ہی خان رحمان حرکت میں آئے اور اس کے سر کی طرف سے حملہ آور ہوئے، ابھی وہ اٹھ نہیں پایا تھا کہ انھوں نے سر کے بال پکڑ لیے اور انھیں کے بل پر اسے سیدھا کھڑا کیا، پھر دوسرے ہاتھ کی مدد سے اسے سر سے بلند کیا اور ایک درخت پر دے مارا۔ اس کا سر درخت سے

ٹکرا گیا۔ ایک زوردار آواز آئی اور خون گویا سر سے ابلنے لگا۔

"خان رحمان۔ تم نے یہ کیا کیا۔" انسپکٹر جمشید چلائے۔

"کک۔ کیوں۔ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی۔" وہ گھبرا کر بولے۔

"ہاں خان رحمان۔ اب یہ بچ نہیں سکے گا، اس کی مدد سے ابھی ہمیں اوپر جانا تھا۔ اور بھی کئی کام لینے تھے۔ اب ہم ان آلات کو کس طرح کنٹرول کر سکیں گے۔" ان کے لہجے میں افسوس تھا۔

"جمشید۔ تم بھول رہے ہو، میں بھی یہاں موجود ہوں۔" ایسے میں پروفیسر داؤد کی آواز سنائی دی۔

"اوہ ہاں۔ واقعی یہ تو میں بھول ہی گیا، لیکن کیا آپ ان کے آلات کو سمجھ لیں گے۔"

"ہاں! کیوں نہیں، تم فکر نہ کرو۔"

"پھر تو مجھے اس کے مرنے پر کوئی افسوس نہیں۔"

"فرزانہ! تم مجھے ان آلات تک لے چلو۔ میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔ ارے ہاں۔ بھئی تم لوگوں نے اب تک مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ مجھے بھوک کیوں محسوس نہیں ہوئی تھی۔"

"اس لیے کہ وہ ہماری ایک چال تھی۔ ہم نے بھوک ضرور

محسوس کی تھی، لیکن اس حد تک نہیں کہ جسم سے جان نکلتی محسوس ہوتی۔ ظاہر یہ کرنا چاہتے تھے جیسے اب ہم ادھ موئے ہو گئے ہوں اور لڑنے بھڑنے کے قابل نہ رہ گئے ہوں۔ ایسے میں جب آپ نے یہ اعلان کیا کہ مجھ کو بالکل بھوک نہیں لگ رہی تو باس اور اس کے ساتھی چونک اٹھے۔ وہ یہ سمجھے کہ آپ نے کوئی ایسی چیز کھائی ہے جس کی وجہ سے بھوک نہیں لگی، لہٰذا اس چیز کو ہم سے دور رکھنا ضروری تھا۔ اس لیے میں نے حکم دیا کہ آپ کو ہم سے الگ رکھا جائے اور اس طرح جنگ شروع ہو گئی۔ جنگ تو خیر ویسے بھی ہونی تھی۔ ہم نے بھی سوچا، کیوں نہ اس موقعے پر ان لوگوں سے نبٹ لیا جائے۔ بعد میں تو ہماری کمزوری میں اضافہ ہی ہو سکتا تھا۔" وہ کہتے چلے گئے۔

"اوہ تو یہ بات تھی۔" پروفیسر داؤد نے لمبا سانس کھینچا۔

"اور وہ جنگل کس طرح جھلس گیا تھا۔"

"ان کے تجربات سے کچھ تابکار شعاعیں اس طرف پہنچی ہوں گی جنھوں نے جنگل کو جھلس دیا یا پھر انھوں نے خود شعاعوں وغیرہ کے ذریعے جنگل کو جھلس دیا ہو گا تاکہ درندوں وغیرہ سے پاک ہو جائے۔ آخر انھیں تو اس طرف سے آنا جانا ہی پڑتا ہو گا۔ بالکل اس طرح جس طرح انھوں نے آنے جانے

کے لیے ماہی گیروں کی بستی کے پاس چٹانوں کے درمیان آبدوز کے لیے جگہ بنا رکھی تھی۔"

"ہوں۔ ایک بات اب تک سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمارے ہاں سے ریکارڈ چوری کرانے والا کیا خود ارٹیکا تھا؟" فاروق نے پوچھا۔

"نہیں۔ ارٹیکا کے لیے تو لی کاف اور آرٹی بناشا جیسے لوگ کام کر رہے تھے، بہرحال میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ گماٹا تھا۔ گولڈن کلب سے بھاگتے وقت وہ ٹیپ کیا ہوا کوئی پیغام چھوڑ آیا تھا۔ اس پیغام کو سن کر اس بات کا ثبوت مل جائے گا کہ وہ گماٹا تھا۔ ٹیپ میں اس نے یہی کہا ہو گا کہ ہم ملک کے مشرقی حصے میں جا رہے ہیں۔ ہمت ہو تو وہیں آ جاؤ لیکن ہم نے تو وہ سنی بھی نہیں۔ اور وڈراٹر کی طرف نکل آئے تھے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"اور وڈراٹر میں سانپ کہاں سے آ گئے تھے؟"

"جونی یا گماٹا نے چھوڑے ہوں گے۔ ان کے پاس سانپوں کا کوئی پٹارا رہا ہو گا۔ یہ تو صاف ظاہر ہے، ان کا رابطہ ارٹیکا سے باقاعدہ تھا۔ لہٰذا وہ نیچے سے ایک پٹارا سانپوں کا بھر کر لا سکتے تھے۔ اس میں کیا مشکل ہے؟"

"ہوں ــ آپ کے پاس تو ہر بات کا جواب تیار ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"لیکن ان لوگوں کو خفیہ پیغام کے ذریعے سونے کے جہاز کی گم شدگی کی اطلاع دینے کی کیا ضرورت تھی۔" محمود نے سوال کیا۔

"گماٹا کی پالیسی یہ تھی کہ ہمیں اس قدر بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دے کہ ہم کچھ سمجھ بوجھ بھی نہ سکیں۔" انھوں نے جواب دیا۔

"اور اب کیا پروگرام ہے۔" آصف نے پوچھا۔

"واپسی کے پروگرام کے سوا اور کیا پروگرام ہو سکتا ہے۔" فاروق بول اٹھا۔

"میں نے تم سے نہیں انکل سے پوچھا ہے۔" اس نے جھلا کر کہا۔

"آپ جواب دے دیجیے۔" فاروق نے جھلا کر کہا۔

"ہاں بھئی ــ ٹھیک تو ہے ــ واپسی ہی کا پروگرام ہے۔" انھوں نے کہا۔

ایک گھنٹے کی محنت کے بعد پروفیسر داؤد آلات کو سمجھنے اور کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو گئے ــ اور واپسی کا سفر شروع ہوا۔

"اور لی کاف کا کیا کریں ــ کیونکہ اس پوری مہم میں بس

وہی ایک زندہ بچا ہے۔"

"رہنے دو اسے اس درخت سے بندھا، ہم اس کا کیا کریں گے ــ قید میں رکھ کر بھی خطرہ ہی مول لینا پڑتا ہے ــ یہ لوگ فرار ہونے کے لیے بھی کوئی نہ کوئی چکر چلا لیتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"گویا دنیا کا خوفناک ترین آدمی دنیا کے بیچ چھوڑا جا رہا ہے۔" شوکی بولا۔

"ہاں! اور کیا کریں۔"

"اور سونا ــ وہ کہاں ہے۔"

"وہ سفید عمارت میں موجود ہو گا ــ ہاں اسے لے جانا ضروری ہے ــ لیکن یہ کام ہماری حکومت کے کارکن بخوبی کر لیں گے۔"

"آؤ بھئی ــ ذرا لی کاف سے الوداعی ملاقات کر لیں، کیونکہ پھر اس سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔" ایسے میں محمود بولا۔

سب نے اس رائے کو پسند کیا اور اس درخت تک آئے جہاں لی کاف ابھی تک منور علی خان کے آنکڑے میں الجھا ہوا ہاتھ پیر مار رہا تھا۔

"ہیلو مسٹر لی کاف ــ کہو کیا حال ہے۔"

"تم ــ مجھے اس مصیبت سے نجات دلاؤ۔" وہ دھاڑا۔

"سوری مسٹر لی کاف ــ تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ

ہم نے پاس کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا ہے، اس قوم کو دودھیا دیوار کے اس طرف دھکیل دیا ہے ۔ اور اب ہم اپنی دنیا میں جا رہے ہیں ۔ گویا ایک طرح سے ہم نے اس قوم کا راستہ بند کر دیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آئندہ آنے والی نسلوں کو محفوظ فرمائے ۔ آمین ۔" محمود نے جلدی جلدی کہا ۔

"تو ۔ تم اوپر جا رہے ہو اور میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا گیا ہے ۔"

"تم ہمارے ہی نہیں، ہمارے دین، مذہب، قوم اور ملک کے دشمن ہو، اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمھیں اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے ۔"

"نن نہیں ۔ نہیں ۔ یہ ظلم ہے ۔"

"ظلم کا جواب کیوں نہیں کہتے ۔" آصف نے منہ بنایا ۔

"ویسے کیا خیال ہے ۔ تم اس آنکڑے سے خود کو نکال سکتے ہو یا نہیں ۔"

"نن نہیں ۔ جتنا زور لگاتا ہوں، یہ میری پنڈلی میں اور دھنستا جاتا ہے ۔ اصل مصیبت تو یہ ہے، میرے پاس کوئی چاقو بھی نہیں ۔ کہ میں اپنی پنڈلی کو ہی کاٹ ڈالوں ۔ محمود ۔ اپنا چاقو مجھے دے دو ۔" اس نے گڑگڑا کر کہا ۔

"افسوس! میں ایسا نہیں کر سکتا ۔ کیونکہ اس صورت میں ہمیں پھر

تم سے لڑنا پڑے گا ۔ آخر ہم یہ جھنجھٹ کیوں مول لیں ۔ اچھا الوداع ۔ آؤ بھئی چلیں ۔"

"سنو ۔ سنو ۔ میری بات سن لو ۔" لی کاف نے کانپ کر کہا ۔ لیکن انھوں نے اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا اور بڑی پارٹی کے پاس آ گئے، اس وقت شوکی بولا ۔

"کیا لی کاف کو زندہ چھوڑ جانا عقل مندی ہے ۔"

"کیا مطلب ؟" وہ چونک کر بولے ۔

"ہمارے جانے کے بعد ہماری حکومت کے لوگ بار بار یہاں آئیں گے ۔ سونا وغیرہ نکالنے کے لیے ۔ کہیں لی کاف ان کے ساتھ کوئی چال نہ چل جائے اور ایک بار پھر ہمیں مصیبت نہ مول لینی پڑے ۔" اس نے کہا ۔

"بات تو ٹھیک ہے ۔ تو پھر آؤ ۔ اسے ختم ہی کر دیتے ہیں ۔" انسپکٹر جمشید نے کہا ۔

"لیکن کس طرح ۔ اسے کس چیز سے ختم کریں ۔ اس کے خون کے چھینٹے ہم پر پڑ سکتے ہیں ۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے ۔

"ہاں ۔ یہی تو مصیبت ہے ۔ ٹھہرو ۔ میری سمجھ میں ایک ترکیب آئی ہے ۔ محمود اپنا چاقو مجھے دو ۔"

"چاقو ۔ آپ چاقو کا کیا کریں گے ۔"

"اس سے اس کے دل کا نشانہ لوں گا ۔"

"لیکن اس طرح میرا چاقو ضائع ہو جائے گا۔" اُس نے فکر مند ہو کر کہا۔

"فکر نہ کرو۔ ایسا ہی چاقو اور بنوا لیں گے۔"

اس نے چاقو انھیں دے دیا، اب سب لی کاف کی طرف چلے۔ لی کاف نے انھیں دیکھا تو بول اٹھا۔

"تو تم لوگوں نے مجھے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا؟"

"نہیں لی کاف ۔ تم ایک سانپ ہو۔ اور سانپ پر بھروسہ کرنا بے وقوفی ہے ۔ یہ میرے ہاتھ میں دیکھ رہے ہو۔ کیا ہے۔" انھوں نے چاقو لہرایا۔

"ہاں ۔ محمود کا چاقو ہے ۔ تم ۔ مجھے اس کی بہت ضرورت ہے۔ دے دو انسپکٹر جمشید ۔ یہ مجھے دے دو ۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ ساری زندگی تمھاری غلامی میں گزار دوں گا، تمھارے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔"

"میں کہہ چکا ہوں ۔ تم ایک سانپ ہو۔"

"تب پھر تمھارا ارادہ کیا ہے ؟"

"تمھیں اس تکلیف سے نجات دلانے آئے ہیں۔"

"کیا مطلب ؟" وہ زور سے چونکا ۔ اس کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید کا ہاتھ حرکت میں آیا ۔ بجلی کی طرح چاقو لی کاف کی طرف گیا اور اس کے سینے میں دھنس گیا۔

"اُف ۔ یہ کیا کیا ؟" لی کاف کے منہ سے نکلا، پھر اس نے جلدی سے چاقو سینے سے کھینچ لیا اور غصے میں آ کر انسپکٹر جمشید پر کھینچ مارا ۔ لیکن وہ پہلے ہی ہوشیار تھے اور اندازہ لگا چکے تھے کہ لی کاف اب یہ ضرور کرے گا، لہٰذا فوراً نیچے گر گئے۔ چاقو ان کے سر پر سے گزرتا دور جا گرا۔

"یہ اچھا ہوا، میرا چاقو مجھے مل گیا ہے ۔" یہ کہہ کر محمود چاقو کی طرف لپکا۔

"خبردار محمود ۔ چاقو کو ہاتھ نہ لگانا ۔ اس پر لی کاف کا خون لگا ہوا ہے ۔ آؤ اب چلیں۔"

"تو کیا چاقو یہیں چھوڑ دیں ؟"

"ہاں بھئی ۔ میں نے کہا نا ۔ بالکل ایسا ہی چاقو تمھیں مل جائے گا۔"

تھوڑی دیر بعد وہ آب دوز میں بیٹھے اوپر اٹھ رہے تھے اور اس مہم کا ایک ایک لمحہ ان کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہا تھا، انھیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی فلم دیکھ رہے ہوں ۔ خود اپنی فلم ۔

"میں تو اب بھی یہ محسوس کر رہا ہوں کہ یہ ایک خواب تھا۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"ہاں چاقی، بھلا اور ہماری دنیا میں کون اس بات پر یقین

کر سکے گا کہ دنیا سے باہر نکل کر ایک اور دنیا بھی ہے۔
اور اس دنیا کے اربوں لوگ ہماری دنیا پر قبضہ کرنے کے
لیے بُری طرح بے تاب ہیں۔" منور علی خان بولے۔
"لیکن میرا خیال ہے کہ میں انھیں یقین دلا سکوں گا۔" انسپکٹر
جمشید سوچ میں گم لہجے میں بولے۔
"جی! وہ کیسے؟" محمود چونک کر بولا۔
"قرآن شریف میں یاجوج ماجوج قوم کا ذکر ہے۔ اسی طرح یہ
بھی ناممکن نہیں کہ ہماری اس دنیا سے باہر بھی کوئی دنیا ہے۔
آخر زمین کے علاوہ دوسرے سیاروں پر بھی تو آبادی کے
امکانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ قیامت کے نزدیک یاجوج
ماجوج پوری دنیا پر چھا جائیں گے۔ کیونکہ اس وقت ان کا
مقابلہ کسی کے بس کی بات نہ ہو گی، اس وقت حضرت عیسیٰؑ کا
آسمان سے نزول ہو چکا ہو گا، اللہ تعالیٰ انھیں حکم دیں
گے کہ طور کی طرف مسلمانوں کو جمع کر لیں، چنانچہ وہ ایسا ہی
کریں گے۔ یاجوج ماجوج اتنی بڑی تعداد میں اور اتنی تیزی
سے نکلیں گے کہ ہر بلندی سے پھسلتے ہوئے معلوم ہوں گے،
وہ شہروں کو روند ڈالیں گے، زمین میں جہاں پہنچیں گے
تباہی مچا دیں گے اور جہاں کہیں پانی دیکھیں گے، اسے پی
لیں گے، یہاں تک کہ ان کی ابتدائی جماعت جب بحیرہ طبریہ

پر گزرے گی تو اس کا پورا پانی پی جائے گی اور جب ان کی آخری
جماعت وہاں سے گزرے گی تو اس جگہ کو دیکھ کر کہے گی یہاں
کبھی پانی کا اثر تھا۔ یہاں تک کہ یاجوج ماجوج یہ کہنے لگیں
گے کہ ہم اہلِ زمین پر تو غلبہ پا چکے آؤ اب آسمان والوں
سے جنگ کریں۔ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان
کے ساتھی کوہِ طور کے پاس گھرے ہوئے ہوں گے، غذا کی
سخت قلت ہو گی، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام یاجوج ماجوج
کے لیے بد دعا فرمائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کی گردنوں
اور کانوں میں ایک کیڑا نکال دیں گے، جس سے وہ سب
کے سب پھٹ جائیں گے اور وہ سب اچانک مر جائیں گے
اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی
زمین پر اتریں گے مگر پوری زمین یاجوج ماجوج کی لاشوں اور
بدبو سے بھری ہو گی جس سے مسلمانوں کو تکلیف ہو گی۔
تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی دعا کریں گے،
اس وقت اللہ تعالیٰ ایک ہوا اور لمبی گردنوں والے بڑے
بڑے پرندے بھیج دیں گے جو ان کی لاشیں اٹھا کر
جہاں اللہ حکم دیں گے پھینک دیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ
ایسی بارش برسائیں گے کہ زمین دھل کر صاف ہو جائے گی۔"
انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

"آپ نے تو بہت ہی دلچسپ تفصیل سنا دی۔ لیکن ابا جان۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں، ارٹیکا کی قوم دراصل یاجوج ماجوج ہیں۔"

"نہیں، میں نے یہ نہیں کہا۔ یہ الفاظ قرآن اور احادیث کے ہیں، سنانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ آخر وہ یاجوج ماجوج بھی تو کسی جگہ سے آئیں گے ہی۔ اور وہ اتنی تعداد میں ہوں گے کہ دنیا کے لوگوں کے لیے ان کا مقابلہ کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ جب اس قسم کی ایک قوم کے ظہور کا ذکر قرآن اور حدیث سے ثابت ہے تو پھر ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ نہ جانے اس کائنات میں کس کس قسم کے اسرار بھرے پڑے ہیں۔ انسانی عقل تو ان تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ جو کچھ ہمارے ساتھ بیتی، وہ کوئی خواب نہیں ایک حقیقت ہے۔"

"میں تو ارٹیکا کی طاقت پر حیران ہو رہی ہوں۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ ہم میں سے کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اگر کہیں زخمی نہ ہو گیا ہوتا اور ہمیں اس سے مقابلہ کرنا پڑتا تو کیا ہوتا۔" فرزانہ نے کانپ کر کہا۔

"وہ واقعی بہت تیز، طرار اور طاقت ور تھا۔ خدا کا شکر ہے۔ ہم اسے شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔ ورنہ سوچ ہی سکتے ہو۔ کیا ہوتا۔" فرحت نے سر ہلایا۔

"اُف!" وہ کانپ اٹھے۔

"خیر اب اُف وف کی بھی کوئی ضرورت نہیں، اب تو ہم مزے سے آپ دوڈز میں سفر کر رہے ہیں اور بدستور اوپر جا رہے ہیں۔" فاروق منہ بنا کر بولا۔

"اور اس سفر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ لی کاف سے بھی نجات مل گئی۔" آصف بولا۔

"ہاں! اس سے مقابلے میں یہ بڑی الجھن تھی کہ ہم تو اس پر وار کر ہی نہیں سکتے تھے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اور اس کے ساتھ ہی آر ٹی بناشا، انورا کا، ڈی سائٹ اور سام لٹ بھی دوسری دنیا کو سدھار گئے۔" اب رہ کون گیا ہے سارے بین الاقوامی مجرم تو ختم ہو گئے۔" شوکی نے منہ بنایا۔

"اس کا مطلب پتا ہے کیا نکلتا ہے۔" فرزانہ مسکرا کر بولی۔

"مطلب نکالنے میں تو بس ایک تم ہی ماہر ہو، ہم بے چارے کیا مطلب نکالیں گے۔ لہٰذا تم ہی وضاحت کر دو، کیا مطلب نکلتا ہے۔" فاروق نے تلملائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم ہر وقت کاٹ کھانے کو کیوں دوڑتے ہو۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"یہ بھی ایک ہی رہی۔ میں اپنی جگہ بالکل آرام سے بیٹھا

ہوں، حرکت تک نہیں کی۔ اور تم کہہ رہی ہو، کیوں دوڑ پڑتے ہو، بھئی واہ۔" فاروق نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"فرزانہ تم کسی بات کا مطلب بتانے چلی تھیں۔ وہ بات تو درمیان میں ہی رہ گئی، مجھے ڈر ہے، کہیں وہ تمھارے ذہن سے ہی نہ نکل جائے۔" فرحت نے جلدی سے کہا۔

"میں اتنی کند ذہن نہیں ہوں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔ اگر کند ذہن ہوتیں تو ترکیبیں کس طرح بتا سکتیں۔" محمود مسکرایا۔

"وہ بات پھر بھی رہی جاتی ہے۔" آصف بولا۔

"تڑاتڑ تو جملے برس رہے ہیں۔" فرزانہ جھلّا اٹھی۔

"جملے نہ ہوئے، اولے ہو گئے۔" مکھن بولا۔ فرزانہ نے اسے تیز نظروں سے گھورا اور باقی مسکرا دیے۔

"معلوم ہوتا ہے، تمھیں اولوں کا بہت شوق ہے۔"

"یہ۔ یہ اندازہ کس طرح لگایا تم نے۔" مکھن بوکھلا کر بولا۔

"دھت تیرے کی۔ اب تو وہ بات واقعی مٹی میں ملتی نظر آتی ہے۔"

"سنا تم نے فرزانہ۔ تمھاری بات کو مٹی میں ملانے پر تل گیا ہے محمود۔" آفتاب نے شریر انداز میں کہا۔

"محمود۔ میں تمھیں ایسا نہیں خیال کرتی تھی۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا۔ آفتاب تمھیں بلاوجہ تاؤ دلانے کے چکر میں ہے۔" محمود نے منہ بنا کر کہا۔

"کیوں آفتاب کیا تم واقعی اس چکر میں ہو۔"

"ن۔ نہیں تو۔" آفتاب ہکلایا۔

"دیکھو۔ جھوٹ نہ بولنا، جھوٹے پر خدا کی ویسے بھی لعنت ہوتی ہے۔"

"ہاں بالکل! میں ہرگز جھوٹا نہیں ہوں گا۔ محمود نے بھی یہ بات تمھیں تاؤ دلانے کے لیے کہی ہے۔"

"یا اللہ رحم۔ آج سبھی مجھے تاؤ دلانے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں کیا۔"

"تو کیا ہوا۔ تم تاؤ کھاتی ہی کیوں ہو؟" خان رحمان ہنسے۔

"اور کیا پتھر میں بھی بھلا کبھی جونک لگتی ہے۔" شوکی بول اٹھا۔

"لو۔ اب شوکی تمھیں پتھر کہہ رہا ہے۔" اشفاق بولا۔

"شوکی بھائی۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔"

"اوہ۔ ارے باپ رے۔ م۔ مجھے افسوس ہے کہ تمھیں

مجھ سے ایسی اُمید نہیں تھی۔" شوکی گڑبڑا گیا۔
"کیا مطلب ۔" فرزانہ جھلا کر بولی۔
"مم میرا مطلب ہے ۔ میں غلط کہہ گیا ۔ تم پتھر ہو ہی نہیں سکتیں ۔ توبہ توبہ ۔" اس نے اپنے گال پیٹ ڈالے ۔
"اب بے چارے گالوں کی شامت لانے کا کوئی فائدہ ہے ۔ الفاظ تو وہ تیر ہیں جو کمان سے نکلنے کے بعد واپس نہیں آتے ۔" فرحت نے ہمدردانہ لہجے میں کہا ۔
"ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ کہ اب ہم وہ بات فرزانہ کے منہ سے کبھی نہیں سن سکیں گے ۔ جو وہ کہنا چاہتی تھی۔" انسپکٹر کامران مرزا نے سرد آہ بھری ۔
"اگر یہ بات ہے تو میں سب کو سختی سے خاموش ہونے کی ہدایت کیے دیتا ہوں ۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور پھر ان کی طرف مڑے ۔
"سنا تم نے ۔ اب ہم سے کوئی نہیں بولے گا ، سوائے فرزانہ کے ۔ ہاں فرزانہ ۔ تم کیا کہنا چاہتی تھیں ۔"
"کہ سب سے بڑے مجرموں کے مرجانے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب ہم ایک جگہ جمع نہیں ہو سکیں گے ۔ میرا مطلب ہے کسی مہم کے سلسلے میں ۔"
"اوہ ہاں ! یہ تو ہے ۔ یہ بڑے بڑے مجرموں کی تو

مہربانیاں تھیں کہ ہم کبھی کبھار آپس میں مل بیٹھتے تھے ۔ یہ تو فرزانہ نے واقعی بہت افسوس ناک بات سنائی ۔" فرحت نے فوراً کہا ۔
"تو پھر ان میں سے ایک دو مجرموں کو زندہ رہنے دیا ہوتا ۔" فاروق جل کر بولا ۔
"کیسے رکھ لیتے ۔ اوّل تو یہ کہ ان کی موت آ چکی تھی ، اور جن کی موت آ جاتی ہے ، انھیں کوئی کس طرح زندہ رکھ سکتا ہے ۔ دوسرے یہ کہ ہم نے تو ان لوگوں کو جان سے مارا ہی نہیں ۔ انھیں باندھ باندھ کر ضرور اِدھر اُدھر ڈالتے رہے ہیں ۔ وہ لوگ تو مارے گئے ان سانپوں کی مہربانی سے ، سانپوں سے بھی اگر وہ بچ جاتے تو اڑیکا کی قوم کے پاؤں تلے روندے جاتے ۔ سانپوں سے ڈسے جانے کی صورت میں ان کی لاشیں روندی گئی ہیں ۔ لہٰذا اس میں ہمارا کیا قصور ۔" محمود نے جلدی جلدی کہا ۔
"بات یہ نہیں ۔ میں نہ صرف یہ کہہ رہی تھی کہ اب کسی مہم کے سلسلے میں ہماری ملاقات کے امکانات تقریباً ختم ہو چکے ہیں ۔" فرزانہ نے تنگ آ کر کہا ۔
"بھئی فرزانہ میں اس بات کو نہیں مانتا ۔" انسپکٹر جمشید بول اٹھے ۔

"جی کیا مطلب ؟" فرزانہ چونک کر بولی۔

"مطلب یہ کہ اس دنیا میں نیکی اور بدی ازل سے شروع ہے۔ حضرت آدمؑ کے بیٹوں ہابیل اور قابیل سے یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ تو پھر بین الاقوامی مجرموں کا سلسلہ کس طرح ختم ہو سکتا ہے۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ ایک سے ایک بڑھ کر مجرم ابھی دنیا میں موجود ہیں۔ اڑیکا سبھی کو تو اپنی دنیا میں نہیں لے آیا تھا۔ ویسے مجھے اڑیکا پر حیرت ہوتی ہے اس نے اتنا بڑا منصوبہ کس طرح بنا لیا۔ پہلے تو اسے ہماری دنیا میں آ کر رہنا پڑا ہو گا۔ انگریزی اور دوسری زبانیں سیکھنا پڑی ہوں گی اور اس غرض کے لیے وہ میک اپ کر کے ہماری دنیا کے لوگوں میں رہا ہو گا۔ نہ جانے اس نے کتنے پاپڑ بیلے ہوں گے۔ اور پھر اپنی دنیا کے سائنس دانوں کے ذریعے ایسے ایسے کام کیے کہ ہم بھی دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے، ہم پروفیسر صاحب کو ساتھ لے آئے تھے۔ ورنہ ہم تو دوسری دنیا میں پھنس گئے تھے۔ اُف خدا۔ اس صورت میں کیا ہوتا۔"

"ہوتا کیا۔ بس ہم وہیں تڑپ تڑپ کر مر جاتے۔ اور ہمارے اور اس دنیا کے بارے میں ہماری دنیا میں کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوتی۔" فاروق بولا اور وہ مسکرانے

لگے۔

اسی وقت انھوں نے خود کو سمندر سے ابھرتے دیکھا۔

"لو بھئی مبارک ہو۔ ہم اپنی دنیا میں آ گئے۔"

آب دوز کا دروازہ کھل گیا۔ اور وہ اس سے نکل آئے۔ لیکن ابھی چٹانوں سے باہر نہیں نکلے تھے کہ ایک گرجدار آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"خبردار۔ ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ تم میں سے کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔"

انھوں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ ان کے سامنے گھانسی اور اس کے ساتھی غوطہ خور کھڑے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ مطلب یہ کہ ان سب کو پوری طرح زد میں لیے ہوئے تھے۔

لڑکو

"کیا پروگرام ہے دوستو؟" انسپکٹر جمشید پُرسکون آواز میں بولے۔

"ہم نے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ تم لوگ آب دوز کے ذریعے نیچے اتر گئے ہو۔ اور آب دوز آخر کار تم لوگوں کو اوپر لے بھی آئے گی، باس بھلا تم لوگوں کو اپنی دنیا میں رکھے گا۔ اس نے ہمیں خبردار بھی کر دیا تھا۔ اس لیے ہم یہاں موجود ہیں اب تم سمجھ ہی سکتے ہو کہ ہمارا پروگرام کیا ہوگا؟" گھانسی بولا۔

"لیکن تمہیں یہ سن کر افسوس ہو گا کہ تمہارا باس مارا جا چکا ہے۔ اس دنیا کے جو لوگ اس نے اپنے غلام بنا رکھے تھے۔ وہ سب بھی مارے جا چکے ہیں۔"

"ارے کیا واقعی۔" گھانسی نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"ہاں! اگر یقین نہیں تو اپنے باس سے رابطہ قائم کر کے دیکھ لو۔ اگر اس کی طرف سے جواب مل گیا تو پھر ہم جھوٹے۔"

"ٹھہرو۔ میں دیکھتا ہوں۔ ویسے میں اس بات پر یقین نہیں

کر سکتا۔"

"تو پھر رابطہ قائم کر لو نا۔" فاروق نے جل کر کہا۔

اس نے جیب سے ایک ننھا سا آلہ نکالا اور اس کا بٹن دبا کر ہیلو باس ہیلو باس کرنے لگا۔ لیکن پانچ منٹ کی کوشش کے بعد اس نے تنگ آ کر آلہ جیب میں رکھ لیا۔

"تو یہ درست ہے۔ باس مارا جا چکا ہے۔"

"ہاں! اب تم لوگ بھی خود کو قانون کے حوالے کر دو۔"

"اگر باس مارا جا چکا ہے۔ تب تو بہت ہی مزے کی بات ہے۔ بلکہ یہ ہمارے لیے خوش خبری ہے۔"

"وہ کیسے۔؟" انسپکٹر کامران مرزا چونک کر بولے۔

"نیچے موجود سفید گولیوں کے سارے ذخیرے پر ہم قبضہ کر لیں گے اور ان گولیوں کے ذریعے بے شمار لوگوں کو اپنا غلام بنا لیں گے۔ اس کے علاوہ نیچے اور بھی بے شمار قیمتی چیزیں موجود ہیں۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ تمہارا خیال بہت زوردار ہے لیکن اتنا ہی خوفناک بھی ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"وہ۔ وہ کیسے۔" گھانسی نے گھبرا کر کہا۔

"فرض کیا نیچے پہنچ کر اس آب دوز میں کوئی خرابی ہو جاتی ہے۔ پھر تم کیا کرو گے۔ رہ جاؤ گے نا بیچ میں پھنس کر۔"

"اوہ!" وہ دھنس کر رہ گئے۔

"اب باس تو زندہ بھی نہیں کہ وہ لانچ کو درست کروا دے گا۔"

"ہوں! چلو خیر۔ ہم لانچ کے ذریعے نیچے جانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ہم خود کو قانون کے حوالے کیوں کریں، خود کو جیل میں کیوں پہنچائیں۔ جب کہ یہ اس سے بہت آسان اور اچھا طریقہ ہے کہ ہم تم لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر سمندر میں غرق کر دیں۔ اور خود مزے کریں۔ کسی کو معلوم بھی نہیں ہو سکتا کہ تم لوگوں کو ہم نے ہلاک کیا۔" گھانسی نے کہا۔

"ہاں! تمہاری یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔ اور تم نے اس بات پر غور نہیں کیا۔" انسپکٹر جمشید سوچ کے انداز میں کہا۔

"اور وہ کیا؟" گھانسی کا انداز اب بھی مذاق اڑانے والا تھا۔

"ہم پیکٹ کے ذریعے حمید خان تک پہنچے تھے اور حمید خان نے ہمیں تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ کیونکہ پوسٹ آفس والوں نے ہمیں تمہارا حلیہ بتایا تھا۔ جب ہم نے حمید خان کا حلیہ وہ نہ پایا تو اس سے ذکر کیا کہ اس حلیے کا کون شخص ایسا ہو سکتا ہے جو اس کا نام اور پتا پیکٹ پر استعمال کر سکتا ہے۔ اس نے تمہارے بارے میں بتا دیا اور ہم یہاں آ گئے۔ جب اخبارات میں ہماری گمشدگی کا چرچا ہو گا اور حمید خان وہ اخبارات پڑھے

گا۔ بلکہ گورنمنٹ کی طرف سے انعام بھی مقرر کیا جائے گا تو وہ انعام حاصل کرنے کے لیے پولیس تک ضرور پہنچے گا، اس طرح پولیس تم تک پہنچے گی اور پھر تم پولیس سے کچھ نہیں چھپا سکو گے۔ مطلب یہ کہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے تو تم اس طرح بھی پہنچ کر رہو گے۔ اب کیا کہتے ہو۔" انسپکٹر جمشید روانی کے عالم میں کہتے چلے گئے۔

گھانسی کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار نظر آئے۔ چند لمحے تک وہ سوچ میں ڈوبا رہا۔ آخر اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں نے سوچ لیا ہے۔"

"کیا سوچ لیا ہے۔" خان رحمان بولے۔

"یہ کہ تم لوگوں کو ختم کرنے کے بعد میں حمید خان کا بھی کانٹا نکال آؤں گا۔"

"اس طرح ڈاک خانے والے متوجہ ہو جائیں گے۔"

"کچھ بھی ہو۔ ہم تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یہی ہمارا فیصلہ ہے۔"

"ارے۔ شوکی۔ تم کہاں چلے گئے۔" انسپکٹر جمشید چلا کر بولے ساتھ ہی انہوں نے چاروں طرف دیکھا اور ان کے ساتھ ہی گھانسی اور اس کے تمام ساتھی بھی چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اور یہی وہ لمحہ تھا۔ جس کا انہیں انتظار تھا۔ بے تحاشا انداز میں انہوں

نے ان پر چھلانگیں لگا دیں۔ چند منٹ تک ایک بے ہنگم سی لڑائی ہوتی رہی اور پھر انسپکٹر جمشید نے گھانسی کو پانی میں پھینک دیا۔ ادھر کامران مرزا اس کے دو ساتھیوں کو پانی میں اچھال چکے تھے۔ باقی لوگ گھبرا گئے اور چلا اٹھے۔

"ہم۔ ہم شکست تسلیم کرتے ہیں۔"

ساتھ ہی انھوں نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ گھانسی اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی باہر نکال لیا گیا۔ ان سب کو باندھنے کے بعد شوکی کے شہر کی حدود کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

سب کا آب روز کے پاس ٹھہرنا ضروری تھا۔ آخر شہر سے انوار عالم صاحب پورا دستہ لے کر پہنچ گئے۔ اور اس طرح وہ ساحل کے پاس سے ہٹنے میں کامیاب ہو سکے۔

"اس موقعے پر میری ایک درخواست ہے۔ انکل صاحبان اور برادران صاحبان سے۔" شوکی بولا۔

"تمھاری سو درخواستیں بھی ہوں تو بھی ہم سننے کے لیے تیار ہیں۔ کیونکہ اس وقت ہمیں اور کام بھی کیا ہے۔" فاروق نے خوش دلی سے کہا۔

"فی الحال ایک ہی سن لیں۔ شکر گزار ہوں گا۔"

"تو یوں کہو نا۔ تمھارے پاس لے دے کے درخواست ہی ایک ہے۔" آفتاب بولا۔

"چلیے خیر یونہی۔"

"ایسا نہ کہیے بھائی جان۔ یہ لوگ مجھے تاؤ دلا رہے ہیں۔ میں ہزاروں درخواستیں اسی وقت پیش کر سکتا ہوں۔" آصف تلملا اٹھا۔

"لو بھئی۔ یہ لوگ تو پڑ گئے درخواستوں کے پیچھے۔ اور شوکی بے چارے کی واحد درخواست رہ گئی۔" فرزانہ ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

"ان لوگوں میں بس یہی تو بری بات ہے۔ بات بے بات کسی نہ کسی چیز کے پیچھے ضرور پڑتے ہیں۔ چاہے پیچھے پڑنے کا موقع ہو یا نہ ہو۔"

"دھت تیرے کی۔ کوئی ہے۔ جو چپ رہنے پر تیار ہو۔" محمود نے جھنجھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

"اور تم تو جیسے کچھ بولے ہی نہیں۔" فرزانہ نے جل بھن کر کہا۔

"آخر اس میں اس قدر تلملانے اور جلنے بھننے کی کیا ضرورت ہے.... آپس میں بات ہو رہی ہے۔"

"جلتی ہے میری جوتی۔" فرزانہ نے پاؤں پٹخے۔

"بس بھئی شوکی۔ تم اپنی درخواست کو گول ہی کر جاؤ۔" فرحت مسکرائی۔

"نہیں خیر۔ یہ تو نہیں ہو سکتا، زندگی میں پہلی بار تو شوکی درخواست کرنے لگا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تو پھر سنیے انکل — اب میں ان لوگوں میں سے کسی کو بھی بولنے کا موقع دیے بغیر اپنی درخواست بیان کرتا ہوں۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ سب لوگ کچھ دیر کے لیے ہمارے گھر چلیں۔"

"چلو — منظور ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"انکل کامران مرزا۔" شوکی نے بلند آواز میں کہا۔

"زندہ باد۔" وہ چلا اٹھے۔

"ارے ارے — کیا کر رہے ہو بھئی — میں کوئی سیاسی لیڈر نہیں ہوں۔" انسپکٹر کامران مرزا گھبرا کر بولے۔ اور وہ مسکرا دیے۔

آخر وہ شوکی برادرز کے گھر کے دروازے پر پہنچے — شوکی نے دستک دی — ایک منٹ بعد ہی دروازہ کھلا اور فوراً باریک آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"لڑکو! تم کسی کام کے بھی ہو یا بالکل نکمے ہی ہو — ارے مگر — اتنے بہت سے لڑکے اور لڑکیاں کیونکر نکمے ہو سکتے ہیں ارے — یہاں — یہاں تو —"

اس سے آگے شوکی کی والدہ کچھ نہ کہہ سکیں — اسی وقت مشتاق احمد خان کی آواز سنائی دی۔

"کیا ہوا بیگم... اس قدر گھبراہٹ میں مبتلا ہونے کی کیا خاص ضرورت پیش آ گئی۔"

ان کے جملے پر وہ سبھی مسکرا دیے اور ان کی مسکراہٹیں گہری ہوتی چلی گئیں۔

جزیرے کا سمندر کا

انعامی سوال

س : ص۱۶۷ پر پروفیسر داؤد کی تلاش کے دوران محمود کو اچانک کیا خیال آیا تھا ؟

درست جواب پر مبلغ /۵۰۰۰ روپے کے نقد انعامات تقسیم کیے جائیں گے — انعامات کی تفصیلات گزشتہ ماہ کے ناولوں میں درج کی جا چکی ہے —

(ادارہ)

آیندہ ناول کی ایک جھلک :

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۱۱۸

نیلاب پل

مصنف : اشتیاق احمد

- اس ناول پر مبلغ /۱۰۰۰ روپے انعام دیا جا رہا ہے —
- ایک ایسے مجرم سے ملیے جو شیطانی ذہن کا مالک تھا ۔
- اس نے اپنے شیطانی ذہن سے آپ کے محبوب کرداروں کو شکست پر شکست دی ۔
- ہر ہر لمحے آپ کا دل دھڑکے گا — ایک خوفناک سازش کی کہانی —
- فاروق جب میدانِ عمل میں کودا تو کیا گزری ؟

قیمت : ۶ روپے

آئندہ ناول کی ایک جھلک :

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۱۱۹

آخری تصویر

مصنف : اشتیاق احمد

- لڑکی کی بات سن کر انسپکٹر جمشید چونک اٹھے۔
- محمود، فاروق اور فرزانہ کی ایک سیٹھ سے پراسرار ملاقات۔
- ایک ہی نام کی دو لڑکیاں ایک میز پر بیٹھی تھیں۔
- ایک خطرناک آدمی جو انتہائی بھیانک کاروبار کرتا تھا۔
- محمود، فاروق اور فرزانہ کی اس خطرناک آدمی سے جھڑپ۔
- نتیجہ کیا رہا — آخری تصویر کا راز کیا تھا۔

راز کھلنے پر آپ بے تحاشا اچھل پڑیں گے۔

قیمت : ۶ روپے

آئندہ ناول کی ایک جھلک :

آفتاب، آصف، فرحت اور انسپکٹر کامران مرزا سیریز ۴۱

جہنم کا بھوکا

مصنف : اشتیاق احمد

- ایک عجیب مجرم جس کا مقصد معلوم نہیں تھا۔
- جنگل کے درختوں کے درمیان ایک نوعمر لڑکا بے ہوش پڑا تھا۔
- ایک پراسرار ہوٹل، جس پر دو بار چھاپہ پڑا۔
- آفتاب، آصف اور فرحت تفتیش کے گھوڑے دوڑاتے کہاں تک پہنچے؟
- آخر میں انسپکٹر کامران مرزا نے کس طرح مجرم کو پکڑا۔
- ایک دردناک ناول۔

قیمت : ۶ روپے

آئندہ ناول کی ایک جھلک :

شوکی سیریز ۱۳

ڈائری کا بھوت

مصنف : اشتیاق احمد

- اس مرتبہ انھیں ایک عجیب کیس ملا تھا۔
- کیس کیا تھا، انھیں چکرانے کا اچھا بھلا سامان تھا۔
- ایک ڈائری کی کہانی، جس کے لیے کتنے ہی لوگ دیوانے ہو رہے تھے۔
- اس ڈائری میں کیا تھا ؟
- آخر میں جب شوکی نے راز سے پردہ اٹھایا تو کیا ہوا ؟

حیرت کا سمندر لیے ایک کہانی۔

قیمت : ۶ روپے

کار کی تلاش کا جواب

جواب یہ تھا :

فرزانہ کے منہ سے قید کے دوران 'ارے' فاروق کو غائب پا کر نکلا تھا۔

قرعہ اندازی کے بعد /۲۵۰ روپے نقد انعام کے مستحق:

احسان عثمان ربڑو معرفت محمد عثمان ربڑو وکمل نزد شالیمار سینما گڈس ناکہ حیدر آباد (سندھ)

قرار پائے — انھیں انعام روانہ کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

ہیرا دیوی کا جواب

جواب یہ تھا:

اور تم ہندو مت قبول کر لو۔

○

موصول ہونے والے تمام درست جواب کی قرعہ اندازی کے بعد /۲۵۰ روپے نقد انعام کے مستحق:

سہیل احمد خان۔ مکان نمبر ۲۰۔بی عقب شمس فوٹو سٹوڈیو جمشید روڈ ۲، کراچی نمبر ۵۔

قرار پائے۔ انھیں انعام روانہ کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

خوف کا شکار کا جواب

جواب یہ تھا:

اس ناول میں خوف کا شکار نظام دین تھا۔

○

موصول ہونے والے تمام درست جملوں کی قرعہ اندازی کے بعد /۲۵۰ روپے نقد انعام کے مستحق:

محمد افضال کلیم ۱۱/۷۔ایچ بلاک ۲ — پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس کراچی ۲۹

قرار پائے۔ انہیں انعام روانہ کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

پستول کا ہنگامہ کا جواب

جواب یہ تھا :

شوکی نے انکل کاشان کو فون کیا تھا۔

○

موصول ہونے والے تمام درست جملوں کی قرعہ اندازی کے بعد

۲۵۰/ روپے نقد انعام کے مستحق :

شبیر احمد معرفت اے حمید ایم۔ اے۔ ایم۔ ایڈ محلہ چاہ بھنڈڑ گجرات۔

قرار پائے ___ انھیں انعام روانہ کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

قیامت کب آئیگی؟

___ تالیف : اشتیاق احمد ___

- قیامت کے بارے میں کون ہے جو نہیں سوچتا ؟
- یہ سوال رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی کیا گیا تھا۔
- غیب کا علم اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیغمبرؐ کو بھی نہ بتایا، لیکن .....
- آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیامت کے بارے میں بڑی پتے کی باتیں بتائی ہیں۔
- قرآن کریم اور احادیث کی روشنی میں اس سوال کا جواب پڑھیے کہ:

قیامت کب آئے گی ؟ بچوں کے لیے اس موضوع پر پہلی بار ایک کتاب، لیکن بڑے بھی اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے۔

جاسوسی ناولوں سے زیادہ حیرت انگیز اور دلچسپ ترین ___ یہ مصنف کا دعویٰ ہے۔

قیمت : ۶ روپے
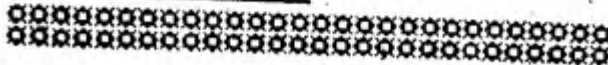
خطوط کے آئینے میں

نوٹ: انعامی خطوط سے پہلے چند اہم نوعیت کے خطوط ملاحظہ فرمائیں —

ڈیئر انکل، السلام علیکم —

اس ماہ کے ناول ہیرا دیوی، کار کی تلاش، خوف کا شکار، پستول کا ہنگامہ ملے — تقریباً ہر ناول اپنی مثال آپ تھا — یوں کہہ لیجیے کہ اس ماہ کے ناول سپرہٹ تھے — اتنے اچھے ناول لکھنے پر آپ کو مبارک باد قبول ہو اور خدا آپ کو توفیق دے کہ آپ اس سے بھی اچھے ناول لکھ سکیں — آمین۔

ہری چند۔ غوثیہ جنرل سٹور — شارع لیاقت، سبّی۔

پیارے انکل اشتیاق احمد، السلام علیکم —

اس دفعہ کے چاروں ناول بہت ہی اچھے تھے — خاص کر کے ہیرا دیوی — ہمیں آج پتا چلا کہ آپ کو ہندوؤں کے بارے میں اتنی معلومات ہیں — ہیرا دیوی کے آخر میں جو نظم دی گئی، اس نے تو ناول میں چار چاند

لگا دیے۔ آپ کے ناول میں ایک ہی دن میں ختم کر لیتا ہوں، شاید اسی وجہ سے میں اردو اچھی طرح بول سکتا ہوں — میں نے آپ کے کسی ناول میں کسی ہندو کا خط شائع ہوتے نہیں دیکھا — آپ خود سمجھتے ہیں کہ میں آگے کیا کہنا چاہتا ہوں — فقط۔

سنیل کمار۔ ڈوانی۔ مون لائٹ جنرل سٹور۔ مین روڈ کندھ کوٹ۔
ضلع جیکب آباد۔ سندھ

ا ہندو بھائیوں کے خط کئی بار شائع ہو چکے ہیں۔

دو ہندو بھائیوں کے خط آپ نے پڑھے۔ اس میں ہیرا دیوی کی پسندیدگی کا خاص طور پر ذکر ہے۔ اب ملاحظہ فرمائیں ایک مسلمان بھائی کے دو خط — ان خطوط کو مختصر کر کے شائع کیا جا رہا ہے، کیونکہ دونوں خط تقریباً دس فل سکیپ پر لکھے گئے ہیں —

ڈیئر اشتیاق بھائی، السلام علیکم۔

اس ماہ کے چاروں ناول ملے۔ ہیرا دیوی کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کر رہا ہوں — اس قسم کے ناول لکھنا مفید نہیں — ہیرا دیوی میں ہندوؤں کی ایک سازش بیان کی گئی ہے، کیا اس سے ہندو قارئین پر برا اثر نہیں پڑے گا۔ مذہبی نظریات پر ناول نہ لکھا کریں۔

فقط والسلام، فاروق احمد ۳۸ سی۔ بلاک این نارتھ ناظم آباد، کراچی۔

اس خط کا میں نے یہ جواب دیا کہ "میرا دیش" میں ایک تیسری طاقت کی
سازش بیان کی گئی ہے جو دو پڑوسی ملکوں کو لڑانا چاہتی ہے۔ ثبوت کے طور
پر ناول کے آخری صفحات ۱۲۳ وغیرہ بغور پڑھیں۔ میرے اس خط کا جو جواب
موصول ہوا، وہ ملاحظہ فرمائیں — چھ صفحات کا خط ہے، پورا شائع کرنا بہت
مشکل ہے، لہٰذا مختصر طور پر شائع کیا جا رہا ہے، تاہم پورا خط ہی پڑھنے کے
قابل ہے۔ ذرا دیکھیے تو سہی، ہمارے مسلمان نوجوان کی سوچ کیا ہے؟

ڈیر اشتیاق بھائی السلام علیکم —

آپ کا خط ملا۔ "میرا دیش" میں نے بغور پڑھی ہے۔ اس میں ہندوؤں
پر کیچڑ اچھالا گیا ہے۔ ہندوؤں کو بطور ایک خونی دشمن پیش کیا گیا ہے۔ نئی
نسل کے کچے ذہنوں میں اگر غیر مذاہب کے خلاف کدورت بھر دی تو آئندہ
چل کر وہ ان کی طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھائیں گے — ہندو قتل تھامیں
گے۔ آپ نے میرا دینی نقطۂ نظر پوچھا ہے۔ میں تو انسانیت پر یقین رکھتا ہوں۔
میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ مذہب کے نام پر کیوں لڑتے ہیں۔ اللہ،
رام، بھگوان، گاڈ ایک ہی عظیم تر قوت کے نام ہیں۔ اندرا گاندھی کو گالیاں
دینے والے جانتے نہیں کہ وہ کتنی آزاد خیال تھی — اب ہندوستان میں مسلمانوں
کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا، کیونکہ اندرا مر گئی ہے۔ اب اس کی قدر معلوم ہو گی۔
آپ نے پوچھا ہے، کیا میں کمیونسٹ ہوں، سوشلسٹ ہوں، تو سنیے، مذہب
اور سوشلسٹ کا آپس میں کوئی تعلق نہیں — سوشلزم معاشی نظام ہے اور

اسلام مذہب — میں نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ مذہب کی آزادی اور تبلیغ کی
اجازت ہر مذہب کو ہر جگہ ہونی چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بھارت میں مسلمانوں
تبلیغ کرنے پر مار دیا جاتا ہے، لیکن کیا آپ کے ملک پاکستان میں ہندوؤں،
عیسائیوں، قادیانیوں کو تبلیغ کی اجازت ہے۔ اگر آنحضرتؐ نبی ہو سکتے ہیں تو
مرزا غلام احمد قادیانی بھی قادیانیوں کے نبی ان کے عقیدے کے مطابق ہو
سکتے ہیں۔ آپ تو بس یہ چاہتے ہیں کہ سارے مذاہب کو بزورِ قوت ختم کر کے
اسلام کا جھنڈا گاڑ دیا جائے — آپ کو یہ بات مان لینی چاہیے کہ اسلام بزور
تلوار پھیلا — آپ ڈرتے ہیں کہ اگر کوئی اور مذہب پیدا ہو گیا یا کوئی اور
نبی پیدا ہو گیا (نعوذ باللہ) تو اس سے آنحضرتؐ کا وقار اور حیثیت کم ہو جائے
گی۔ آخر ایسا کیوں ہے — آپ کا ایمان اتنا کمزور کیوں ہے۔ سوشلزم اور
کمیونزم کے خلاف ہم صرف اس لیے ہیں کہ یہ امریکی پروپیگنڈا ہے اور صاف
ظاہر ہے، ہمارا ملک بھی امریکی چمچوں میں شامل ہے — آپ کے جواب کا
انتظار رہے گا۔

فاروق احمد — ۳۸۔سی، بلاک۔ ایچ نارتھ ناظم آباد، کراچی۔

آپ نے ایک مسلمان بھائی کے دو خط پڑھے۔ اس سے پہلے دو ہندو
بھائیوں کے بھی دو خط پڑھے — ہندو ہوتے ہوئے انہیں "میرا دیش" میں
ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی، جب کہ مسلمان ہوتے ہوئے فاروق صاحب کو
دنیا بھر کی برائیاں اس میں محسوس ہو گئیں۔ فاروق صاحب سے میں نے

سوال کیا تھا کہ ان کا مذہب کیا ہے، لیکن انہوں نے میرے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کا خط ان کی خواہش پر شائع کیا جا رہا ہے۔

اور اب انعامی خطوط ــــ مندرجہ ذیل تین خطوط انعامی قرار پائے ــــ انہیں مبلغ ۷۵، ۲۵ روپے بذریعہ منی آرڈر روانہ کیے جا رہے ہیں۔

انکل اشتیاق، السلام علیکم ــــ

جیرال کی طرح ہمیشہ با اصول رہو، جیتال کی طرح چالاک رہو، لیکن کالی آنکھ کی طرح عیار بننے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہمارے خیالات اور مشورے خطوط کے ذریعے اغوا کرو۔ اپنے قلم کو رے راٹا کی طرح تیز دوڑاؤ، تاکہ ہمیں ناول موٹے تازے ملیں۔ اپنے ناولوں کی غلطیوں کو دور کرنے کے لیے سلاٹر جیسی آنکھوں سے کام لو، اسامیہ کی طرح ہمیشہ ذہین اور ہوشیار رہو، لیکن میرے اس خط کا جواب دیتے وقت اپنے الفاظ کو لی کاف کی طرح زہریلے مت بنانا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ خیال کر رہے ہوں گے، یہ خط پڑھ کر آپ نے اپنا قیمتی وقت برباد کیا اور یہ کہ کاش، اس خط کو پڑھنے کی بجائے ناول لکھتے رہتے لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو آپ پڑھ چکے ــــ فقط :

محمد عمران احمد خان ۱۴۳/۱۶۲ بنگلہ ۱۶ سول لائن، حیدر آباد۔

محترم اشتیاق صاحب آداب ــــ انکل، پہلے آج کی تاریخ سن لیں ــــ

آج ۲۵، جولائی [illegible] ہے۔ اکیسویں صدی کا زمانہ ہے اور آپ کو فوت ہوئے عرصہ گزر چکا ہے ــــ اس کے باوجود آپ کے ناول اسی جوش و خروش سے پڑھے جا رہے ہیں۔ آپ کا ڈھانچہ عرصہ دراز سے لاہور کے عجائب گھر میں پڑا ہے اور یقین کریں، جس شوق سے لوگ آپ کے ڈھانچے کو دیکھتے ہیں اور کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے۔ آج کل امریکہ سے ایک ٹیم ہمارے ملک آئی ہوئی ہے اور آپ کی کھوپڑی پر ریسرچ کر رہی ہے کہ اس چھوٹی سی کھوپڑی نے اتنے زیادہ ناول کس طرح لکھ لیے۔ اتنے جاسوسی ناول کہاں سے سوچ لیے۔ آج کل ایک نقلی اشتیاق احمد بھی منظر عام پر آ چکے ہیں، لیکن آپ کی مہربانی سے ہم پہلے ہی کافی ہوشیار ہو چکے ہیں۔ آپ کی جو تصویر ناولوں پر چھپی ہوتی ہے، وہ صرف رنگین ہے، لیکن آج کل تو ایسے کیمرے ایجاد ہو چکے ہیں کہ تصویر سے پرفیوم کی خوشبو آتی ہے اور اگر پھولوں کی تصویر ہو تو ان کی خوشبو بھی آتی ہے۔ آپ کا قلم بھی عجائب گھر کی زینت بنا ہوا ہے اور بہت خوش ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ آپ اسے بہت تکلیف دیا کرتے تھے، یہاں ردی کی ٹوکری میں موجود ہے۔ آج کل اسے بدہضمی نہیں ہوتی ــــ شام کا وقت ہے۔ میرا شام کی سیر کے لیے چاند پر جانے کا وقت ہو رہا ہے۔ آپ کا ایک ناول ساتھ لے جا رہا ہوں جو واپس آنے تک ختم کر لوں گا۔ اب اجازت ــــ جنت کی گیلری میں آپ ہمارے خطوط پر کہاں نظر ڈالتے ہوں گے۔ آپ کے لیے دعا گو :

خالد امتیاز۔ بنگلہ ۱۹ چونڈہ کالونی ــــ سیالکوٹ کینٹ، سیالکوٹ۔

ج : خدا مجھے غریق رحمت کرے۔

الفاظ کے اچھے کھلاڑی اشتیاق احمد، سلام ایمپائر زادہ —

۴۰ روپے ماہانہ کا ٹکٹ خرید کر آپ کا دوسرے مصنفین کے مابین ٹیسٹ میچ میں دو تین سال سے دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے ہر ماہ کے چوکے میں لے دیکھے ہیں، اور آپ کی ہر بولنگ ستائش کے قابل ہے۔ خاص نمبر کے لمبے لمبے چھکوں سے تو قارئین کے دل سٹیڈیم کے پار گرتے ہیں۔ آپ الفاظ کے اچھے بلیر ہیں اور قارئین کی تنقید کے بولروں سے صاف بچ نکلتے ہیں۔ اگر کوئی قاری بال بھی پھینکے تو بڑے اعتماد سے اسے روک لیتے ہیں۔ مزاح کی زور آور شارٹس اور محاورات کی عمدہ اننگ آپ کے کھیل کی خاص بات ہے۔ بلاشبہ آپ ہی مین آف محاورہ ہیں — آپ کے خلاف کئی ایک اپیلیں ہوئیں، مگر آپ بدستور وکٹ پر موجود ہیں اور اپنے ٹوٹل سکور میں ماہ بہ ماہ اضافہ کر رہے ہیں — میری دعا ہے کہ آپ یونہی دن دگنا رات چوگنا سکور کرتے رہیں۔

والسلام — ایک تماشائی :

کلیم اللہ خلش — محلہ سادھو مسجد کرم دین جلال پور جٹاں، گجرات۔

پیارے انکل اشتیاق — سلام کے بعد پہلی دھمکی، لیکن نہیں۔ یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے — خیر، دھمکی کی بات چھوڑیں، دو باتیں کی بات کریں۔ اس ماہ کی دو باتیں بہت خوب صورت اور ردی کی ٹوکری کے قابل تھیں — ویسے ناول بہت اچھے تھے — خاص طور پر پیرا ڈیوی لکھنے پر مبارک باد دیتا ہوں۔ الحمد وہ دھمکی تو رہ ہی گئی۔ خبردار جو اس خط کو ردی کی ٹوکری کے حوالے کیا —

محمود اعجاز۔ ۲۰ ایم اے آر ڈیجمنٹ آرٹلری، راولپنڈی۔

پیارے ماموں جان، ڈھیروں آداب — خدا کرے ہو زورِ قلم اور زیادہ آمین — آپ نے میرا ایک خط پتے سمیت شائع کر دیا اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں گمنام خط لکھے جانے لگے۔ پہلے تو ہم نظر انداز کر گئے، لیکن آج پھر اسی قسم کا خط موصول ہوا ہے۔ بہت غصہ آیا، صدمہ بھی ہوا اور شرمندگی بھی کہ ہمارے ماموں جان کے ناول پڑھنے والے ایسے ہیں کہ ان پر آپ کی نصیحتیں، آپ کے کرداروں کی پیاری پیاری باتیں اور سب سے بڑھ کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ بھی چکنے گھڑوں پر پانی ثابت ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اچھا ادب پڑھنے سے بھی بُری فطرت نہیں بدل سکتی — کیا صرف اپنی بہن اور بیٹی ہی قابلِ احترام ہوتی ہے، کیا مادرِ وطن کی بیٹی کو دینِ محمدی کی پیروی کرنے والی کو قابلِ احترام خیال نہیں کرنا چاہیے — کیا ہم یہ سمجھیں کہ اس پاک وطن میں بھی عورت کو آزادی حاصل نہیں — ہم تو اپنے والدین کی اجازت سے کسی کو خط بھی نہیں لکھ سکتیں، کیونکہ اس کے جواب میں صرف اس ہستی کا ہی نہیں اور بھی لوگوں کے خطوط موصول ہونے لگتے ہیں۔ جنہیں پڑھ کر مارے شرمندگی کے نگاہیں جھک جاتی ہیں — آپ نے جاسوسی ادب کی دنیا میں اخلاقیات کی جو نئی طرح ڈالی ہے اور قوم کے بچوں اور نوجوانوں کی اصلاح کا جو طریقہ اپنایا ہے، اب تو ہمیں اس میں بھی کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ خدارا ایسے لوگوں کا کچھ کیجیے۔ ہم تو بیرنگ خطوط کا جرمانہ ادا کر کے بھی تنگ آ چکے

ہیں اور پوسٹ مین کو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ بھیا اسے واپس لے جاؤ۔
ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ خدا حافظ۔ نام اور پتا لکھ کر کیا کروں
گی۔ ....

ج : آپ کا خط پڑھ کر سر شرم سے جھک گیا۔ ایسا محسوس ہوا، جیسے
یہ ذلیل حرکتیں کرنے کا ذمے دار میں خود ہوں، لیکن ایسے گندے
لوگ چند ایک ہوتے ہیں۔ سبھی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔
شکریہ۔

جاسوس ذہن، جاسوس آنکھوں اور جاسوس دل کے مالک انکل آداب
وہت تیرے کی۔ آپ نے اتنے سارے ناول لکھ ڈالے اور میں دیکھتی رہ
رہ گئی۔ آپ کا ذہن یا کسی روبوٹ کا مشینی دماغ کہ ایک ماہ میں مزے
سے چار ناول لکھ ڈالتے ہیں اور ہمارا چوبیس روپے کا خرچ کروا ڈالتے
ہیں۔ ویسے آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ سے جلتی ہوں۔ جلتی ہے میری جوتی
آپ کے ناولوں نے میرے دل اور دماغ پر ایسا ڈیرہ جمایا ہے کہ سائنس کی
طالبہ ہو کر آپ کے ناول بڑے شوق سے پڑھتی ہوں اور گھر والوں کی جھڑکیاں
سنتی ہوں۔ جھڑکیاں سنتے وقت آپ پر بھی غصہ آتا ہے کہ خواہ مخواہ آپ
کے ناول پڑھنا شروع کر دیے۔ خدا حافظ۔
شازیہ پونم جناح کالونی، فیصل آباد۔

ڈیر انکل، السلام علیکم۔
دسویں خاص نمبر کے اشتہار کی جھلک نوٹ بک میں پڑھی۔ امید ہے،
دسویں خاص نمبر کے آخر میں یہ جھلک ہوگی۔ ہوشیار، گیارھویں خاص نمبر دس کے
دس خاص نمبروں کے برابر ہوگا اور قیمت ۵۴/۹۹ روپے ہوگی، ابھی سے جمع
کرنا شروع کر دیں۔
بند محل پڑھی۔ سوال نے پریشان کیا۔ دوسرا ناول سرخ تحریر آپ نے
اندھی قید کے صفحے چرا کر شروع کیا۔ وادیٔ مرجان نے پریشان کیا۔ جنگ
کرائی ختم ہوا۔ آخر میں پھر وہی زرد لفافہ۔ آخر آپ کے پاس کتنے زرد
لفافے ہیں۔ پھر نوٹ بک کی باری آئی۔ الٹا سیدھا جواب لکھا اور اس
طرح یہ خط مکمل ہوا۔ خدا حافظ!
محمد عادل منہاج ۱۰۰/۵ ۔ جی نیو کراچی۔ کراچی

محترم اشتیاق احمد، السلام علیکم۔
اس ماہ کے ناولوں میں جس ناول نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔
یقیناً آپ بھی جانتے ہوں گے، وہ وادیٔ مرجان تھا۔ ایک انوکھا، اچھوتا اور
سب سے بڑھ کر یہ کہ بروقت لکھا گیا ہے۔
موضوع کے اعتبار سے یہ کافی طویل بھی ہو سکتا تھا، مگر وقت
یقیناً اس کی اجازت نہ دیتا؛ بہرحال اس سنگین مسئلے پر قلم اٹھانے پر
میری طرف سے دلی مبارک قبول فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں باطل قوتوں کے

مقابلے میں عزم و ہمت، جوانمردی اور سرخروئی عطا فرمائے۔
حبیب احمد فاروقی، گجرات۔

اچھے انکل، السلام علیکم۔

اس ماہ (ستمبر) کے ناول پڑھے — چاروں ناول اچھے تھے جبکہ چند ماہ سے ایک یا دو ناول کام کے آرہے تھے — یعنی کبھی جمشید، کبھی کامران اور کبھی شوکی سیریز کا — مگر اس ماہ چاروں ناول قابل مطالعہ تھے۔ اگر قابل مطالعہ نہ بھی ہوتے، ہمیں تو بہرحال پڑھنے تھے۔ اگر ہر ماہ اسی قسم کے ناول شائع کریں تو کیا کہنے — نوٹ بک میں صفحہ نمبر ۱۴۱ پر نوٹ بک کا رنگ سیاہ لکھا ہے، جبکہ سرورق پر نوٹ بک کا رنگ سرخ دکھایا گیا ہے، امید ہے، وضاحت فرمائیں گے۔

نئے سلسلے اشتیاق کے قاری اور آپ سے انٹرویو اچھے ہیں —

"جنگ" میں آپ کا انٹرویو پڑھا تھا، خوب تھا — اب آپ سے انٹرویو اس سے بھی خوب یعنی خوب تر ہوگا، کیونکہ اس میں تمام قارئین شرکت کر سکیں گے، جب کہ جنگ فورم کے تحت ہونے والے انٹرویو میں لاہور ہی کے قارئین شرکت کر سکے تھے۔ آپ کو خط لکھا تھا اور سالانہ چندے کے متعلق بھی پوچھا تھا، مگر ابھی تک جواب نہیں ملا — امید ہے، جلد جواب سے نوازیں گے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم میانوالی سے ایک میگزین "شاہین" نکالتے ہیں۔

آپ کو کہانی کے لیے لکھا تھا تو آپ نے جواب دیا تھا کہ کوئی شائع شدہ کہانی چھاپ لیں — اس مرتبہ آپ کی کہانی "ملاقات" لگائی ہے۔ اگر کہیں تو ہر شمارے میں ایک آدھ کہانی لگا دیا کریں۔

"آپ سے "شاہین" کے لیے انٹرویو بھی کرنا ہے — اگر سوال لکھ کر بھیج دیں تو؟ ورنہ کہیں تو کبھی ہفتے کے دن لاہور حاضر ہو جائیں — امید ہے، ہمارے لیے کچھ وقت ضرور نکال لیں گے۔ اب اجازت چاہوں گا۔

والسلام

خلوص کیش: ایم طارق ندیم — نگران اعلیٰ "مکتبہ شاہین" ایف ۵۱۳ ایم سی ہائی سکول سٹریٹ، میانوالی۔

ڈیر انکل اشتیاق احمد، السلام علیکم۔

اس مہینے کے چاروں ناول پڑھے، صرف نوٹ بک پسند نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کا کوئی پرانا ناول پڑھ رہے ہیں۔ باقی تینوں ناول بہت اچھے تھے۔ خاص کر "وادی مرجان" اور "بند محل" تو بہت پسند آئے — وادی مرجان جیسا ناول وقت کی اہم ضرورت تھا، کیونکہ آج کل یہودی دنیا میں جس طرح مسلمانوں کے خلاف سازش کر رہے ہیں — وہ ساری دنیا جانتی ہے۔ میری طرف سے خوب صورت ناول لکھنے پر مبارک باد قبول کریں — فقط آپ کا قاری:

نوشاد کریم، گلشن اقبال، کراچی ۴۷

محترم اشتیاق انکل ـــ

مئی کے دوسرے ہفتے سے آپ کی ہنگامہ خیز، مزاح سے بھرپور کہانیاں پڑھنے کا اتفاق ہوا ـــ میں ایک ڈپلوما ہولڈر ہوں یعنی میں نے ڈپلومہ آف ایسوسی ایٹڈ ان ٹکنیکل کا آخری امتحان دیا ہے۔ رزلٹ کا انتظار ہے۔ آج کل بے روزگار ہوں اور آپ کی جاسوسی کہانیاں پڑھنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔ اب تک آپ کی قریباً سب ہی کہانیاں پڑھ چکا ہوں اور مزید پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں ـــ مجھے آپ کی سب سے بہترین کتاب نگری نگری سازش لگی ـــ میری دعا ہے کہ خدا آپ کے قلم کو ترقی دے اور آپ ہمارے لیے مزید کہانیاں تحریر کر سکیں۔ میری دیکھا دیکھی میرے بڑے بھائیوں نے بھی آپ کی کتب کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا ہے ـــ میرا خیال ہے کہ آپ کے ناول پڑھنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہے، اس لیے کہ میں نے آپ کی کتابیں بہت بڑی بڑی عمر کے لوگوں کو بھی پڑھتے دیکھا ہے، واقعی آپ کا دماغ سمجھ میں نہ آنے والی شے ہے۔

فقط آپ کا ہم عمر قاری :

طاہر الرحمٰن، فضل الرحمٰن، مجیب الرحمٰن ۳۔ڈی ۳۳/۲۸ ناظم آباد، کراچی نمبر ۱۸

میٹھے انکل، السلام علیکم ـــ

جب سے میں نے آپ کے ناولوں کا کورس شروع کیا ہے، ان سے

جان چھڑانا مشکل ہو گیا ہے۔ اکٹھے چار ناول ہمارے گھر میں ہر ماہ دستک دیتے ہیں۔ ایک میں پکڑ لیتی ہوں، ایک بھائی جان اور ایک امی۔ چھوٹا بھائی کہتا ہے میں بڑا ہو کر انسپکٹر جمشید بنوں گا ـــ آپ کا خاص نمبر "دنیا کے قیدی" پڑھا۔ سب سے پہلے بھائی جان نے لیا ـــ رات کو امی نے ـــ امی نے رات کے تین بجے ختم کیا ـــ اگلے روز میری باری آئی ـــ صبح شروع کیا تھا، رات کو ختم ہوا ـــ اللہ آپ کو یونہی لکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وادی مرجان پڑھ کر دل بہت خوش ہوا۔

فریحہ ناز۔ پروگریسو پبلک سکول سرگودھا۔

ڈیئر انکل، السلام علیکم ـــ

امید ہے، خیریت سے ہوں گے ـــ آپ کی خیریت پوچھے بغیر چارہ نہیں، ورنہ آپ جواب نہیں دیتے ـــ جواب دیتے ہیں تو دو تین سطر پر ٹرخا دیتے ہیں۔ مثلاً "ناول پسند کرنے کا شکریہ ـــ نئے ناول پڑھ کر اپنی رائے سے نوازیں۔ مخلص اشتیاق احمد" ـــ یہ ہوتا ہے آپ کا جواب، لیکن کیا کریں، صبر کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں ـــ میرا ایک کزن ہے، اسے آپ کے ناول پڑھنے کا شوق تھا، پھر ختم ہو گیا ـــ اس کے گھر والوں نے سکون کا سانس لیا، پھر بے چارہ آپ کو خط لکھ بیٹھا۔ آپ نے اسے جواب دے دیا ـــ اسی خوشی میں اس نے آپ کے ناول پھر شروع کر دیئے ہیں۔ ہے کوئی تک ـــ مخلص :

احسن ضیاء۔ ۱۴۴۱ اے ـــ جے گلی نمبر ۲ ڈھوک الٰہی بخش مری روڈ، راولپنڈی۔

آپ سے انٹرویو

عبید الرحمٰن امر پورہ، راولپنڈی:

س: آپ اپنی پیشانی پر بالوں سے چاند سا کیوں بناتے ہیں؟

ج: بناتا نہیں، بن جاتا ہے۔

فیصل رشید، نیو مسلم ٹاؤن، لاہور

س: آپ نے مکتبہ اشتیاق سے علیحدگی کیوں اختیار کی؟

ج: ذہنی سکون کے لیے۔

ہری چند۔ شارع لیاقت، سبی

س: انکل، آپ مصنف کی بجائے کامیڈی فن کار ہوتے تو؟

ج: اس صورت میں بھی آپ کی تفریح کا سبب بنتا۔

محمد زاہد حبیب قریشی، حیدر آباد

س: پڑھنے والوں کو آپ کے ناولوں سے ایک شکایت ہے کہ آپ کے ناولوں میں کتابت کی غلطیاں بہت ہوتی ہیں

ج: اس سلسلے میں پوری احتیاط کی جاتی ہے، لیکن پھر بھی رہ جاتی ہیں — اب مزید کوشش کی جا رہی ہے۔

ندیم غوری۔ اورنگ آباد، کراچی

س: جب آپ نے اپنی زندگی کا پہلا ناول لکھا تو آپ کیا محسوس کر رہے تھے کہ چھپ بھی سکے گا یا نہیں؟

ج: جی نہیں، بچوں کا پہلا ناول تو لکھا ہی ایک پبلشر کی فرمائش پر تھا۔ ہاں اس سے پہلے ایک رومانی ناول لکھا تھا۔ اس کے بارے میں ضرور یہ خیال تھا اور آج تک وہ نہیں چھپ سکا۔

عبدالوحید زند، اسلام آباد:

س: انکل آپ کا اصول —

ج: ہر کام میں اپنے دین کو پیش نظر رکھنا۔

عامر بیگ۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی:

س: آپ کی زندگی کا وہ لمحہ، جب آپ نے ہر طرف سے مایوس ہو کر اللہ سے مدد مانگی؟

ج: جی ہاں، ایسا لمحہ آیا تھا — میری کہانی میں اس کا تفصیل سے ذکر ہے۔

ارشاد حسین، مظفر گڑھ

س: شروع میں آپ اپنے ناولوں کی اصلاح کس سے کراتے تھے؟

ج: کبھی اصلاح نہیں لی۔

منظر علی۔ صرافہ بازار، راولپنڈی

س: آپ کی سالانہ آمدنی کیا ہے؟

ج: کم و بیش ہوتی رہتی ہے، اس لیے کس طرح بتاؤں۔

بینا غزل، لاہور ____

س: آپ کا پسندیدہ مصنف، پسندیدہ کتاب، پسندیدہ لباس، پسندیدہ پھول اور پسندیدہ مشغلہ کیا ہے؟

ج: آپ نے تو پسندیدہ کی لائن لگا دی — لیجیے، اگاتھا کرسٹی، قرآن مجید، شلوار قمیص، مچھلی، گلاب، سفید، ناول لکھنا۔

سید حسن علی شاہ۔ عید گاہ روڈ، لالہ موسیٰ ____

س: آپ کے دو کردار، محمود اور آصف ہر وقت اپنے پاس نوٹ بک کس طرح رکھتے ہیں؟

ج: جیبی نوٹ بک —

محمد شفیق ناز، سرگودھا ____

س: سچ سچ اپنی عمر بتائیں۔

ج: اس میں بھلا جھوٹ بولنے کی کیا بات ہے۔ ۴۰ سال ہے۔

مظفر بیگ۔ رشید آباد، ملتان ____

س: ناول لکھنے کے علاوہ آپ کے مشاغل کیا ہیں؟

ج: ڈاک پڑھنا، خطوط کے جواب دینا۔

رشید یاسین، بہاول نگر ____

س: جاسوسی ناول لکھنے کا خیال آپ کو کب اور کیسے آیا؟

ج: بارہ تیرہ سال پہلے — خیال دلایا گیا۔

____

احسن ملک۔ فیڈرل بی ایریا، کراچی ____

س: انکل، کبھی آپ اداس ہوں تو سب سے زیادہ کون یاد آتا ہے؟

ج: اپنی موت —

محمد سفیان ناصر، لسبیلہ چوک، کراچی ____

س: اگر آپ فلمی ہیرو ہوتے تو، کیا پھر بھی ناول لکھتے؟

ج: ہیرو تو خیر میں ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ہاں کامیڈین کی بات کرتے تو کچھ جچتی بھی؛ بہرحال اس صورت میں میں ناول کس طرح لکھتا۔

علی عمران۔ بیراج کالونی، حیدرآباد ____

س: آپ کا اپنا لکھا ہوا کونسا ناول آپ کو زیادہ پسند ہے؟

ج: میری پسند کی اپنے ناولوں کے سلسلے میں بھلا کیا اہمیت ہو سکتی ہے، تاہم مجھے جعلی آدمی پسند آیا تھا۔

سید شکیل حسین شاہ بخاری، لاہور کینٹ ____

تبسم زہرہ رضوی، کراچی ____

محمد عظیم بھٹی، راولپنڈی ____

س: آپ کا سب سے پہلا ناول کونسا تھا اور کب شائع ہوا؟

ج: پیکٹ کا راز — ۱۹۷۲ء میں —

عباس علی چنا، شاہ بیگ لائن، کراچی ____

س: آپ مصنف نہ ہوتے تو کیا ہوتے؟

ج: انسان کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ بھلا میں کیا بتا سکتا ہوں کہ اس

صورت میں ہیں کیا ہوتا — یوں اپنا ذاتی ادارہ شروع کرنے سے پہلے تک میں میونسپل کارپوریشن میں ملازم تھا۔

طاہر محمود۔ جی ٹی روڈ، گوجرانوالا ______

س: آپ ناولوں میں احادیث اور دوسری دینی باتیں لکھتے ہیں۔ کیا اس سلسلے میں کسی سے مدد حاصل کرتے ہیں یا خود اپنی دینی تعلیم ہی استعمال کرتے ہیں؟

ج: اپنی معلومات قرآن اور احادیث کی کتب —

توصیف احمد۔ ٹی اینڈ ٹی کالونی، ہری پور ہزارہ ______

س: آپ نے کس سن میں میٹرک کیا اور نتائج کیا رہے؟

ج: [illegible]ء میں — ہائی فسٹ ڈویژن —

ایم اعظم ملک۔ ملک سٹریٹ، سیالکوٹ ______

س: اگر آپ انسپکٹر جمشید ہوتے تو کیا محسوس کرتے؟

ج: بے پناہ خوشی —

زاہد علی۔ مارچ بازار سکھر ______

س: آپ کا قد کتنا ہے، تعلیم کتنی ہے، مصنف بننے کا خیال کیوں آیا؟

ج: قریباً ۵ فٹ، میٹرک، لکھنے کا شوق تھا، اس لیے خیال آ گیا۔

نثار احمد۔ اردو بازار، کراچی ______

س: زندگی کا پہلا ناول کس سن میں لکھا اور زندگی کا آخری ناول کب لکھ رہے ہیں؟

ج: [illegible] میں — آخری ناول کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

ظفر عباس۔ حسینہ چوک، ڈیرہ اسماعیل خان ______

س: آبائی گاؤں اور والدین کے متعلق بتانا پسند کریں گے؟

ج: پانی پت۔ والدہ صاحبہ وفات پا چکی ہیں۔ والد صاحب حیات ہیں۔

شمیم اختر، ڈیرہ اسماعیل خان ______

س: پہلا ناول لکھتے وقت ایک دو ناول لکھنے کا خیال تھا یا مستقل طور پر لکھنے کا؟

ج: اس وقت تو یہی خیال تھا کہ ایک دو ناول لکھوں گا —

اے لطیف عباسی، کراچی ______

س: آپ سے انٹرویو کس قسم کا لیا جا سکے؟

ج: جس قسم کا آپ کا جی چاہے —

نویدہ انجم — اچھرہ، لاہور ______

س: آپ نے اب تک جتنے ناول لکھے ان سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج: پسند آپ کی —

سید شجاعت علی نقوی، کراچی ______

س: آپ کو کتابیں لکھنے کا خیال کس طرح آیا؟

ج: پڑھ پڑھ کر —

اسد خان۔ سٹی لائٹ ٹاؤن، کوئٹہ ______

س: آپ کب پیدا ہوئے؟

ج: ۵/جون ۱۹۴۴ء۔

منیر اینڈ برادرز لیاقت روڈ، لاڑکانہ

س: آپ کتنے سالوں سے کہانیاں لکھ رہے ہیں؟

ج: قریباً بیس سال سے۔

سراج حبیب، کراچی

س: آپ نے اب تک جمشید کے کتنے ناول لکھے ہیں؟

ج: دسمبر کے کسی ناول میں یہ تفصیل شائع ہو چکی ہے۔

مرتضیٰ علی خان، صدر کراچی

س: آپ کون سا قلم استعمال کرتے ہیں؟

ج: میرے پاس کئی قسم کے قلم ہیں۔

سید محمد جعفر رضوی۔ ملتان روڈ، لاہور

س: کیا آپ کے ہر ناول کا مرکزی خیال آپ کا اپنا ہوتا ہے؟

ج: سو فیصد میرا اپنا۔

عنبرین لئیق احمد خان، حیدر آباد

س: آپ اپنی دو باتیں تو ابتدائی صفحات میں چھاپ دیتے ہیں۔ اگر ہم دو باتیں جیسا اوٹ پٹانگ خط لکھ دیں تو اسے انتہائی صفحات میں بھی جگہ نہیں ملتی۔

ج: میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہے ۔۔۔ شائع ہونے والے خطوط پڑھ کر دیکھ لیں۔

فاروق احمد، شادمان کالونی، لاہور

س: شہد کی طرح میٹھے اور نیم کی طرح کڑوے تمہاری کامیابی کا راز؟

ج: اسی مٹھاس اور کڑواہٹ میں۔

شبنم نقوی، مظفر گڑھ

س: آپ کی عمر کتنی ہے۔ آپ ایک ماہ میں کتنا کما لیتے ہیں؟

ج: ۴۰ سال ۔۔۔ اللہ کا شکر ہے۔

توصیف احمد قریشی، پنڈی گھیپ

س: آپ کو دیکھنے کے لیے کتنی طاقت کی خوردبین خریدنا پڑے گی؟

ج: یہ سوال خوردبین کے کسی ماہر سے پوچھیے۔

محمود حسن۔ بندوق والا روڈ، کراچی

س: آپ نے اپنے لیے یہ لکھنے لکھانے کی لائن کیوں چنی؟

ج: یہ لائن خود بخود ہی اختیار ہو گئی۔

مظفر احمد، عبدالغفار پرنس روتی، کراچی

س: ہم لوگوں کو آپ کے لیے ناول پڑھنے کے بعد دل چاہتا ہے کہ دوبارہ پڑھیں۔ آپ کے محسوسات ناول لکھنے کے بعد کیا ہوتے ہیں؟

ج: ناول لکھنے کے بعد تو بس کتابت کے لیے دے دیا جاتا ہے۔ رائے دینا آپ کا کام ہے۔

مس سنبل اعجاز۔ بھمبر روڈ، گجرات

س: آپ کو کونسی سیریز لکھتے وقت مزا آتا ہے؟

ج: تینوں۔

مشہور و معروف مصنف اشتیاق احمد